خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

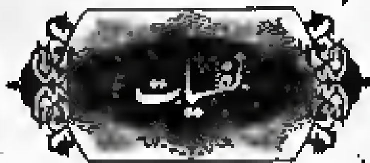
مئی 2014

سالگرہ نمبر 2



میری بیاض سے

پکوان





مئی 2014

جلد 42 شمارہ 1

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر



خواتین ڈائجسٹ مئی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

وقت کا کوئی بھی لمحہ جو گزر جائے، پلٹتا نہیں ہے۔ کچھ یادوں کا ڈھیر دامن میں ڈال کر وقت آگے بڑھتا جاتا ہے۔ یادیں ان غموں اور خوشیوں کی جن سے ہم گزرتے ہیں۔ ان محبت کرنے والے لوگوں کی جو ہم سے بچھڑ جاتے ہیں۔ آتے جاتے موسم یادوں کے یہ نقش دھندلاتے نہیں، ان کو گہرا کرتے جاتے ہیں۔

محمود ریاض صاحب ایسی ہی شخصیت تھے۔ گزرتا وقت ان کی یادوں کو دھندلا نہیں پایا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک ادارہ تھے۔

ریاض صاحب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا تھا۔ وہ روزنامہ امروز میں کالم لکھتے تھے۔ امروز کا شمار اس دور کے اچھے اخبارات میں ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ ملازمت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ پھر ملازمت چھوڑ کر انہوں نے پبلشنگ کا آغاز کیا۔ اور کئی معروف ادیبوں کی کتابیں شائع کیں۔

اسی دوران انہوں نے ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی بنیاد رکھی۔ خواتین کے لیے اس دور میں جو پرچے شائع ہوتے تھے، وہ میگزین سائز کے تھے۔ خواتین ڈائجسٹ اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلا اور منفرد پرچا تھا جس کا مقصد گھر کی چار دیواری میں رہنے والی خواتین کو عملی زندگی کے مسائل اور حقائق سے روشناس کرانا تھا۔

خواتین ڈائجسٹ کے اجراء کے بعد کرن اور شعاع نے اسی مشن کو آگے بڑھایا۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے پرچوں کے ذریعے بے شمار خواتین کی تخلیقی صلاحیتیں سامنے آئیں۔ آج پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا میں جو نام جگمگا رہے ہیں، ان میں سے بیشتر خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے ہی متعارف ہوئے۔

محمود ریاض صاحب نے جس مشن کا آغاز کیا تھا، تمام زندگی اس کے لیے دیانت داری سے کام کیا اور کامیاب بھی رہے۔ ان کے متعین کردہ اصولوں کی روشنی میں یہ سفر آج بھی جاری ہے۔

10 مئی 2001ء کو ریاض صاحب اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور جنت میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ آمین۔

سائرہ رضا کا ناول،

اس ماہ نایاب جیلانی کا ناول غیر معمولی طوالت اختیار کر گیا جس کی بنا پر ہم سائرہ رضا کا مکمل ناول شامل نہ کر سکے۔ آئندہ ماہ جون کے شمارے میں سائرہ رضا کا مکمل ناول آپ پڑھ سکیں گی (ان شاء اللہ)

اس شمارے میں،

- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول - عہدِ الست، ٭ نایاب جیلانی کا مکمل ناول - عدل اور جزا،
- آمنہ ریاض اور رضیہ مہدی کے ناولٹ، ٭ عنیزہ سید اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- نگہت سیما، صدف آصف، عافیہ فیاض اور سدرہ اروڑہ کے افسانے،
- معروف ٹی وی فنکارہ سجل علی سے ملاقات، ٭ منشا پاشا سے باتیں،
- رہ نوردِ شوق - مصنفین سے سروے،
- کرن کرن روشنی - احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر دلچسپیاں شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا، خطوط کے ذریعے اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابو داؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

خیر کی خوش خبری دینا اور مبارکباد کہنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"میرے ان بندوں کو خوش خبری دے دے جو بات کو غور سے سنتے ہیں' پھر اس میں سے سب سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔" (جیسے برائی کرنے والے کو معاف کرنا اور تنگ دست مقروض کو مہلت دینا یا قرض ہی معاف کر دینا' وغیرہ۔) (الزمر۔17-8)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"انہیں ان کا رب خوش خبری دیتا ہے۔ اپنی رحمت' رضامندی اور ایسے باغات کی جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہیں۔" (التوبہ۔2)

نیز فرمایا۔

"اور تمہیں خوش خبری ہو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔" (فصلت۔30)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ہم نے اس (ابراہیم) کو انتہائی بردبار بچے کی خوش خبری دی۔" (الصافات۔101)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور البتہ تحقیق ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس خوش خبری لے کر آئے۔" (ہود۔69)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور ابراہیم کی بیوی کھڑی تھی' وہ ہنسی اور ہم نے اسے اسحاق اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوش خبری دی۔" (ہود۔71)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"زکریا کو فرشتوں نے پکارا جب کہ وہ حجرے میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ تجھے یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے۔" (آل عمران۔39)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"جب فرشتوں نے کہا' اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ تجھے اپنے کلمے (عیسیٰ علیہ السلام) کی خوش خبری

دیتا ہے اس کا نام مسیح ہے... الخ۔"

(حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا کلمہ اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کی پیدائش بغیر باپ کے کلمہ "کن" سے ہوئی ہے جو ایک اعجازی ولادت ہے۔)

اور اس باب میں متعدد مشہور آیات ہیں۔ احادیث بھی بکثرت ہیں اور صحیح (بخاری و مسلم) میں موجود ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

جنت کی خوش خبری

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

میں نے اپنے گھر میں وضو کیا اور باہر نکل گیا۔ (اپنے دل میں) کہا کہ میں ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہوں گا اور آج کا دن آپ کے ساتھ ہی گزاروں گا۔ وہ مسجد میں آئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت (لوگوں سے) پوچھا تو صحابہ نے بتلایا کہ آپ نے اس طرف کا رخ فرمایا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

پس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے نشانات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھتا ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نکل کھڑا ہوا' حتیٰ کہ آپ بئر اریس (قباء کے قریب ایک باغ) پہنچ گئے۔

میں دروازے پر بیٹھ گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قضائے حاجت کے بعد وضو فرمالیا تو میں آپ کی طرف گیا۔ دیکھا کہ آپ بئر اریس کی منڈیر پر بیٹھے ہیں اور پنڈلیوں کو ننگا کر کے کنویں میں لٹکایا ہوا ہے۔

میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا اور پھر واپس آکر دروازے پر بیٹھ گیا اور میں نے (دل میں) کہا کہ میں آج ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دربان رہوں گا۔

اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آگئے۔ انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

میں نے پوچھا "کون ہے؟"

انہوں نے فرمایا "ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔"

میں نے کہا "ٹھہریے۔"

پھر میں گیا اور کہا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' اندر آنے کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انہیں اجازت دے دو اور جنت کی خوش خبری (بھی) دے دو۔"

چنانچہ میں آیا اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا "تشریف لائیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔"

چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اندر تشریف لائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منڈیر پر آپ کی دائیں جانب بیٹھ گئے اور اپنے دونوں پیر کنویں میں لٹکا لیے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور اپنی پنڈلیاں ننگی کرلیں۔

میں پھر واپس آکر (دروازے پر) بیٹھ گیا۔ اور میں (گھر سے نکلتے وقت) اپنے بھائی کو وضو کرتا چھوڑ کر آیا تھا کہ مجھے خود ہی آکر مل جائے گا۔ تو میں نے (دل میں) کہا اگر اللہ تعالیٰ فلاں' یعنی میرے اس بھائی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمائے گا تو اسے یہاں لے آئے گا۔

اتنے میں کوئی شخص آیا اور دروازہ ہلانے لگا۔ میں نے کہا۔

"کون ہے؟"

اس نے کہا "عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ"

میں نے کہا "ذرا ٹھہریے۔"

میں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ کو سلام عرض کیا اور کہا۔

"یہ عمر بن خطاب ہیں اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کر رہے ہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"انہیں اجازت اور جنت کی خوش خبری دے دو۔"

چنانچہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا اور کہا۔

"آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اندر آنے کی) اجازت اور جنت کی خوش خبری دی ہے۔"

وہ تشریف لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منڈیر پر آپ کی بائیں جانب بیٹھ گئے اور اپنے دونوں پیر کنویں میں لٹکا لیے۔ میں پھر واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اور (دل میں) کہا اگر اللہ تعالیٰ فلاں' یعنی اس کے بھائی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمائے گا تو اسے (یہاں) لے آئے گا۔

اتنے میں کوئی اور شخص آیا۔ اس نے دروازہ ہلایا تو میں نے پوچھا "کون ہے؟"

اس نے کہا "عثمان بن عفان۔" میں نے کہا۔ "اچھا ٹھہریے۔"

اور میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آکر اطلاع دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"انہیں اجازت دے دو اور ایک بلویٰ (حادثے) کے ساتھ جو انہیں پیش آئے گا' جنت کی خوش خبری سنا دو۔"

چنانچہ میں آیا اور ان سے کہا "تشریف لائیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ایک حادثے کے ساتھ جو آپ کو پیش آئے گا' جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔"

چنانچہ وہ اندر تشریف لائے تو دیکھا کہ کنویں کی منڈیر پر ہو گئی ہے (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں دونوں جانب جگہ نہیں ہے) پس وہ آپ کے سامنے دوسری جانب بیٹھ گئے۔

حضرت سعید بن مسیب (مشہور تابعی اور حضرت ابو موسیٰ سے روایت کرنے والے راوی) فرماتے ہیں کہ میں نے اس سے ان کی قبروں کی تاویل کی (یعنی ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قبر میں بھی اسی طرح ساتھ ہوں گے جب کہ عثمان کی قبر الگ ہوگی۔) (بخاری و مسلم)

اور ایک روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دروازے کی نگرانی کا حکم فرمایا اور اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جب خوش خبری سنائی تو انہوں نے اللہ کی حمد بیان کی اور فرمایا۔ اللہ ہی اس لائق ہے کہ اس سے مدد طلب کی جائے۔

فوائد و مسائل : اس حدیث کا تعلق باب سے واضح ہے کہ اس میں بھی خوش خبری دینے کا اثبات ہے۔

2۔ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو' ان کے جنتی ہونے کی بشارت دے دی گئی۔ اس کے بعد بھی ان کے ایمان میں شک کرنا' شقاوت ازلی کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے۔

3۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بابت جس بلوے کی پیش گوئی فرمائی' وہ ان کی خلافت کے آخر میں پیش آیا' جب کہ عبداللہ بن سبا یہودی اور اس کے مکروہ اور بے بنیاد پروپیگنڈے سے متاثر فسادی گروہ نے حضرت عثمان کا محاصرہ کرلیا اور بالآخر آپ کو شہید کر دیا ——— اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیل ہے۔

4۔ بیداری کے عالم میں بھی تاویل و تعبیر جائز ہے' اسے فراست کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں تمثیل میں من کل الوجوہ' مشابہت یا برابری ضروری نہیں' چنانچہ شیخین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجرۂ عائشہ میں اور حضرت عثمان بقیع الغرقد (جنت البقیع) میں مدفون ہیں۔

کلمہ پر ایمان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد بیٹھے تھے' اور ہمارے ساتھ (لوگوں میں) حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ تو (اچانک) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان سے اٹھ کر چلے گئے اور ہمارے پاس واپس آنے میں آپ نے کافی دیر فرمائی تو ہم ڈر گئے کہ ہماری غیر موجودگی میں آپ کو قتل نہ کر دیا

گیا ہو اور ہم گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور میں سب سے پہلے گھبرانے والا تھا۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلا' یہاں تک کہ میں انصار کے قبیلے بنو نجار کے باغ کی چار دیواری پر پہنچ گیا۔ میں اس کے اردگرد گھوما کہ مجھے کسی دروازے کا سراغ مل جائے لیکن مجھے کوئی دروازہ نہیں ملا' تاہم ایک چھوٹے سے نالے پر نظر پڑی جو باغ سے باہر ایک کنویں سے نکل کر باغ کے اندر جارہا تھا۔ اور ربیع چھوٹی نہر یا چھوٹے سے نالے کو کہتے ہیں۔ میں اس میں سے سمٹ سمٹا کر اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مجھے دیکھ کر) فرمایا۔

"ابو ہریرہ!"

میں نے کہا۔ "جی ہاں' یا رسول اللہ!"

فرمایا "کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرما تھے' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے اٹھ کر چلے گئے اور واپسی میں آپ نے دیر فرما دی تو ہمیں ڈر محسوس ہوا کہ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری غیر موجودگی میں قتل نہ کر دیا گیا ہو' چنانچہ ہم گھبرا اٹھے' گھبرانے والوں میں سب سے پہلا آدمی میں تھا۔ اس لیے میں اس باغ تک آ گیا اور (اندر داخل ہونے کے لیے) اس طرح سمٹ سکڑ کر جس طرح لومڑی سمٹتی سکڑتی ہے اور لوگ میرے پیچھے ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے ابو ہریرہ!" اور آپ نے مجھے اپنے دونوں جوتے دے کر ارشاد فرمایا "جاؤ' میرے یہ دونوں جوتے ساتھ لے جاؤ' اس باغ کی دیوار کے باہر جو بھی ملے جو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اس پر اس کے دل میں پورا یقین ہو تو اسے جنت کی خوشخبری دے دو۔" اور لمبی (پوری) حدیث ذکر کی۔ (مسلم)

فوائد و مسائل: 1۔ دل کی گہرائی سے اللہ پر ایمان رکھنے والا' اگر اس نے شرک کا ارتکاب نہیں کیا ہو گا تو وہ یقیناً' جنت میں جائے گا' یا تو پہلے مرحلے ہی میں چلا جائے گا' اگر اللہ کی مشیت ہوئی' بصورت دیگر سزا بھگت کر جنت میں جائے گا۔ اس کا دائمی گھر جہنم نہیں' جنت ہی ہو گا۔

2۔ اس حدیث میں خوش خبری کے اثبات کے علاوہ مومن کے بہر حال جنتی ہونے کی نوید ہے۔

خوش خبری

حضرت ابن شماسہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ وہ قریب الوفات تھے۔ وہ کافی دیر تک روئے اور اپنا چہرہ دیوار کی طرف کر لیا۔ تو ان کا صاحبزادہ کہنے لگا۔

"ابا جان! کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں خوش خبری نہیں دی تھی' کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں خوش خبری نہیں دی تھی؟ (دو مرتبہ انہوں نے کہا۔)

چنانچہ آپ نے اپنا چہرہ اس طرف پھیرا اور فرمایا۔

"بے شک سب سے افضل (توشہ آخرت) جو ہم تیار کریں' وہ ہے اللہ کی توحید کی گواہی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ مجھ پر تین قسم کے حالات آئے (یعنی میں تین ادوار سے گزرا)

1۔ میں نے اپنا یہ حال دیکھا کہ مجھ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھنے والا کوئی نہ تھا' اس وقت سب سے زیادہ محبوب بات میرے لیے یہی تھی کہ اگر میں آپ پر قابو پالوں تو آپ کو قتل کر دوں۔ اگر میری موت اسی حالت میں آجاتی تو یقیناً" میں جہنمیوں میں سے ہوتا۔

2۔ پھر جب اللہ نے اسلام کی محبت میرے دل میں ڈال دی تو میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا کہ آپ اپنا دایاں ہاتھ پھیلائیں تاکہ میں آپ کی بیعت کر لوں۔

آپ نے اپنا ہاتھ پھیلایا تو میں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے عمرو! کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "میں ایک شرط کرنا چاہتا ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بتلاؤ' تمہاری کیا شرط ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ کہ میرے گناہ بخش دیے جائیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام پہلے کے گناہوں کو گرا دیتا (ختم کر دیتا) ہے اور ہجرت اپنے ما قبل کے گناہوں کو گرا دیتی ہے اور حج پہلے کے گناہوں کو گرا (مٹا) دیتا ہے۔"

(چنانچہ اسلام قبول کر کے میں نے آپ کی بیعت کر لی' اس کے بعد یہ حال ہو گیا کہ) مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب اور میری نظر میں آپ سے زیادہ جلیل القدر کوئی نہ تھا۔ آپ کی عظمت و جلالت کا نقش اس طرح میرے دل میں تھا کہ میں نظر بھر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا اور اگر مجھ سے آپ کا حلیہ مبارک بیان کرنے کو کہا جائے تو میں اسے بیان نہیں کر سکتا' اس لیے کہ میں نے کبھی نظر بھر کر آپ کو دیکھا ہی نہیں۔ اگر میری موت اسی حال میں آجاتی تو یقیناً" امید تھی کہ میں جنتیوں میں سے ہوتا۔

3۔ (اس کے بعد) پھر ہم کئی چیزوں کے ذمہ دار بنائے گئے (حکومتی مناصب پر فائز ہوئے) میں نہیں جانتا ان کے بارے میں میرا کیا حال ہو گا؟ پس جب میں فوت ہو جاؤں تو میرے جنازے کے ساتھ نہ تو کوئی نوحہ کرنے (رونے پیٹنے) والی عورت ہو اور نہ کوئی آگ اور جب تم مجھے دفنا چکو تو مجھ پر تھوڑی تھوڑی کر کے مٹی ڈالنا' پھر میری قبر پر اتنی دیر کھڑے رہنا کہ جتنی دیر میں ایک اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت بانٹ دیا جائے تاکہ میں تم سے مانوس رہوں اور دیکھوں کہ اپنے رب کے بھیجے ہوئے فرشتوں کو کیا جواب دیتا ہوں۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کے تین دور بیان فرمائے ہیں۔ ایک اسلام سے قبل' دوسرا اسلام کے بعد اور تیسرا' جب وہ حکومت کے ذمہ دارانہ مناصب (گورنری وغیرہ) پر فائز ہوئے۔ اس تیسرے دور کی گراں بار ذمہ داریوں سے وہ خوف زدہ تھے کہ ان میں کوتاہیوں کا ارتکاب نہ ہو گیا ہو جن کی وجہ سے بارگاہ الٰہی میں گرفت ہو۔ رضی اللہ عنہ۔

2۔ اسلام سے قبل کی شدید عداوت' قبول اسلام کے بعد شدید محبت میں تبدیل ہو گئی۔

3۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و جلالت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں نقش تھی۔

4۔ موت کے وقت تقصیر (کمی کوتاہی) کے خوف اور اللہ کی رحمت کی امید سے رونا جائز ہے۔

5۔ اللہ کی رحمت کی بشارت کے ذریعے سے قریب الموت شخص کی تسکین خاطر کا اہتمام کرنا چاہیے۔

6۔ اسلام' ما قبل کے سارے گناہوں کو مٹا دیتا ہے' بشرطیکہ اس کے بعد صحیح معنوں میں اسلام و ایمان کے تقاضوں کو بروئے کار لایا جائے۔ اسی طرح ہجرت' حج اور نماز وغیرہ سے انسان کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

7۔ میت پر بین اور نوحہ کرنا منع ہے۔

8۔ موت سے پہلے وصیت کرنا مستحب ہے بالخصوص ان بدعات و رسومات کی بابت' جن کے ارتکاب کا اندیشہ ہو۔

9۔ قبر میں منکر نکیر فرشتوں کے سوال کرنے کا اثبات' جیسا کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے۔

10۔ دفنانے کے بعد قبر پر دیر تک کھڑے رہنا اور میت کے لیے ثابت قدمی کی دعا کرنا' سنت ہے' جیسا کہ دوسری روایات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے بارے میں حکم موجود ہے۔

11۔ دفنانے کے فوراً بعد قبر پر نیک لوگوں کی موجودگی سے صاحب قبر کو تسکین ہوتی ہے اور سوال جواب میں آسانی' اس لیے حدیث میں تاکید ہے کہ کھڑے ہو کر اس کے لیے ثابت قدمی کی دعا کرو۔ ❀

وہی روشنی کے نقیب ہیں، وہی تیرگی کے رقیب ہیں
شبِ آگہی اتری راہ میں جو چراغ ہم نے جلا دیے

خاموش رہو

انشا جی

کچھ کہنے کا وقت نہیں یہ ۔ کچھ نہ کہو، خاموش رہو
اے لوگو خاموش رہو ۔ ہاں اے لوگو خاموش رہو

سچ اچھا، پر اس کے جلو میں، زہر کا ہے اک پیالا بھی
پاگل ہو؟ کیوں ناحق کو سقراط بنو، خاموش رہو

حق اچھا، پر اس کے لیے کوئی اور مرے تو اور اچھا
تم بھی کوئی منصور ہو جو سُولی پہ چڑھو؟ خاموش رہو

اُن کا یہ کہنا سورج ہی دھرتی کے پھیرے کرتا ہے
سر آنکھوں پر، سورج ہی کو گھومنے دو ۔ خاموش رہو

مجلس میں کچھ حبس ہے اور زنجیر کا آہن چبھتا ہے
پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، خاموش رہو

گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں، من میں کیا کیا موسم ہیں
اس بگیا کے بھید نہ کھولو، سیر کرو، خاموش رہو

آنکھیں موند کنارے بیٹھو، من کے رکھو بند کواڑ
انشا جی، لو دھاگا لو اور لب سی لو، خاموش رہو

وہ جو دلوں میں زندہ ہیں

حیا بخاری



زندگی بے شک ایک مختصر سفر کا نام ہے۔ ایک عارضی گزر گاہ' جسے ہم دنیا کے نام سے جانتے ہیں۔ بے حد مختصر پڑاؤ کا نام ہے زندگی' لیکن اس مختصر سفر میں بھی اکثر ہمارا واسطہ کئی ایسے انجان لوگوں سے ہوتا ہے' بلکہ بعض اوقات تو صرف غائبانہ تعارف ہی ہوتا ہے کہ جن سے جان پہچان نہ ہونے کے باوجود ان لوگوں میں ہم اپنائیت کا ایک گہرا احساس پاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ نہ ہوتے ہوئے بھی یہ لوگ ہمارے اذہان کے پردوں پر ایسے ان مٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں کہ جن کے طلسم سے باہر آنا ممکن ہی نہیں رہتا۔



اپنائیت کا بالکل ایسا ہی احساس میرے دل میں جاگا' جب میں پہلی بار محمود ریاض صاحب کی شخصیت سے متعارف ہوئی۔

مجھے ٹھیک سے سال یاد نہیں' مگر مئی کا ہی مہینہ تھا اور ادارہ خواتین کا ہی کوئی شمارہ جس میں ذکیہ بلگرامی صاحبہ کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ مجھے ہمیشہ کہانیوں سے زیادہ خطوط' کالم اور یادداشتیں پڑھنے میں بے حد مزا آتا ہے کیونکہ کہانیاں چاہے جتنی بھی حقیقت پر مبنی کیوں نہ ہوں پھر بھی انہیں دلچسپی کے لیے افسانوی ٹچ دینا ہی پڑتا ہے' لیکن خطوط اور یادداشتیں سراسر دل کی آواز پر مبنی ہوتے ہیں۔ انسان کی سوچ اور احساسات پر۔ تب ہی اس مضمون نے بھی میری توجہ کھینچ لی۔

مضمون کا عنوان محمود ریاض صاحب ہی تھے۔ سو میں فوراً" سمجھ گئی کہ کوئی یادداشت ہی ہوگی۔ اس مضمون نے محمود ریاض صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو اجاگر کیے۔ اس پہلی ملاقات کے بعد اگلی تمام یادداشتوں سے میں انہیں مزید جاننے لگی اور آج جب میں اس ادارے سے منسلک ہو چکی ہوں تو دل میں بے اختیار حسرت سی جاگ اٹھتی ہے کہ کاش... کاش! کہ ان کی ہمہ جہت شخصیت سے محبت' حوصلے اور امید کے چند جگنو میری مٹھی میں بھی سمائے ہوتے۔

بقول ذکیہ بلگرامی صاحبہ کے ایک افسانے پر انہوں نے انعام جیتا اور رقم نہ ملنے پر ان کی ذرا سی شکایت پر محمود ریاض صاحب خود چل کر انہیں وہ رقم دینے ان کے گھر گئے۔ عمدہ اخلاق' نرم دل اور دوسروں کی پروا کرنے والا دل رکھنے کی اس سے بہترین مثال بھلا کیا ہو سکتی ہے۔

زندگی کی راہ گزر پہ مسافر آتے جاتے رہتے ہیں کہ یہاں مستقل ٹھکانا ممکن ہی نہیں' لیکن بہت کم خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جو زندگی کو کامیابی سے جیتے ہیں اور امر ہو جاتے ہیں اور ان کی روشن کامیابیاں آنے والوں کے لیے روشن مشعلوں کا کام دیتی ہیں۔

محمود ریاض صاحب چلے گئے' مگر خواتین کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کر گئے جہاں نہ صرف وہ زندگی کے تلخ حقائق سے پردہ اٹھا سکیں بلکہ اپنے حق کے لیے اپنی آواز بھی دنیا تک پہنچا سکیں۔ جو لوگ صرف اپنے لیے جینے کے بجائے دوسروں کی بھلائی کے لیے اپنی زندگی صرف کر دیں اور ان کی راہ میں کبھی نہ بجھنے والے علم و محبت کے دیے روشن کر جائیں' ایسے لوگ کبھی نہیں مرتے۔ بلکہ محبت اور عقیدت کی صورت لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

اللہ تعالٰی محمود ریاض صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور انہیں علم و آگہی کی ایسی خوب صورت شمعیں روشن کرنے پر اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔



رہ نوردِ شوق

امت الصبور

زندگی کا تسلسل جاری رہتا ہے اور تخلیق کا عمل بھی۔
تخلیق... انسانوں پر بیتنے والی واردات کا آئینہ بھی ہے اور اپنی ذات کا اظہار بھی۔
منصور بن حلاج نے کہا ہے۔
"لکھنا بھی اظہار ہے اور اس اظہار کی توفیق اسی کو حاصل ہوتی ہے جو حقیقت کو پہچان لیتا ہے۔"
لیکن عورت پر بہت عرصے تک اظہار کے دروازے بند ہی رہے پھر اظہار کی اجازت ملی بھی تو بہت سی پابندیوں کے ساتھ۔

ڈری سہمی عورت نے جھجکتے جھجکتے قلم اٹھایا تو تہذیب، فکر اور سوچ کے نئے زاویے سامنے آئے اور اس حوالے سے جڑی خواب دیکھنے والی آنکھیں بھی تحریروں میں منعکس ہوئیں، محبتوں کے نرم کومل، مدھر احساسات فطری نسوانی دھیمے لہجے میں ہی بیاں ہوسکتے تھے۔

وقت کچھ اور آگے بڑھا عورت کو آزادی ملی تو فکر و شعور کی نئی جہتیں سامنے آئیں۔ آج حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر خوابوں کا ہر طلسم بکھر چکا ہے۔ آج کی تخلیق کار زیادہ حقیقت پسند ہے۔ آج دیگر میدانوں کی طرح ادب کے میدان میں بھی عورت نے خود کو منوالیا ہے۔

بارہا ایسا ہوا کہ کوئی اچھا شعر، اچھی کتاب پڑھ کر سوچا کیا اس سے بہتر لکھا جاسکتا ہے؟ کیا اس سے اچھا کوئی لکھ سکتا ہے؟ پھر کوئی نئی تحریر، کوئی نئی کتاب سامنے آجاتی ہے... کوئی اور تخلیق کار ابھرتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ میں لکھنے والی مصنفین کی ایک کہکشاں سی ہے۔ بہت سے درخشندہ ستارے جگمگائے اور آسمان ادب پہ اپنی پہچان ثبت کرگئے۔ بہت سے نئے ستارے ابھر رہے ہیں، نئے نام سامنے آرہے ہیں کہ زندگی کا تسلسل جاری ہے اور اس سے جڑی کہانیاں بھی...

اس بار سالگرہ نمبر میں ہم نے ان نوعمر مصنفین سے سروے کیا ہے جنھوں نے ابھی لکھنے کا آغاز کیا ہے اور آگے مزید روشن امکانات ہیں۔
سروے کے سوالات یہ ہیں:
(1) خواتین ڈائجسٹ کے لیے پہلی تحریر بھجواتے ہوئے کیا احساسات تھے؟ وہ شائع ہوئی تو کیسا لگا؟
(2) کیا آپ کو توقع تھی کہ اتنی پذیرائی ملے گی؟
(3) خواتین ڈائجسٹ کی کن سینئر مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟
(4) ادارہ خواتین کے علاوہ دیگر کن مصنفین کو پڑھتی ہیں؟ پسندیدہ کتابیں؟
(5) لکھنے کے علاوہ دیگر مشاغل کیا ہیں؟ زندگی کے روز و شب، معمولات، تعلیم کیا ہے؟
آیئے دیکھتے ہیں ہماری مصنفین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

مصباح خادم

1

خوشبو اک آوارہ جھونکا
اس جھونکے کو ٹھیرے کون
کیسے میں بتلاؤں تم کو
تم ہوتے ہو میرے کون

خواتین ڈائجسٹ سے واقعی ایسا تعلق ہے جس کی گہرائی کو خوشبو کی طرح صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ لفظوں میں ڈھالنے سے شاید اس کا حق ادا نہ ہوسکے۔ شعور کی دنیا میں قدم رکھتے ہی جب غیر نصابی مطالعے سے واسطہ پڑا تو پہلا رشتہ خواتین اور شعاع سے ہی قائم ہوا... ابو میرے کبھی بھی سخت گیر والد نہیں رہے۔ پڑھائی پر توجہ کی شرط کے ساتھ انہوں نے کبھی بھی معقول مطالعے سے منع نہیں کیا، بلکہ خود بھی کافی شوق رکھتے تھے اور لکھنے میں بھی انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی... شکریہ ابو اور پھر تعلق ایسا قائم ہوا کہ پھر چھوٹ کر ہی نہ دیا اور مضبوط اتنا کہ اس کے سامنے اور کوئی چاہ کر بھی ٹھہر نہ سکا۔ اسی لیے جب پہلی تحریر لکھی تو سب سے پہلا خیال بھی اسی بہترین دوست کا آیا... مگر کوئی دھانسو قسم کا یقین نہیں تھا کہ مجھ جیسی عظیم رائٹر کو تو کوئی انکار کر ہی نہیں سکتا وغیرہ وغیرہ۔

ابو کو پوسٹ کرنے کے لیے دے کر چپکی بیٹھ رہی... سوچا کہ میں اتنی ٹیلنٹڈ کہاں کہ خواتین ڈائجسٹ میں جگہ پاسکوں مگر بھلا ہو اس معصوم سی امید کا، جو کسی بھی حال میں پیچھا نہیں چھوڑتی... یہاں بھی ساتھ ساتھ رہی... اگلے ماہ ڈائجسٹ معمول سے کچھ لیٹ ہوگیا... نہ چاہتے ہوئے بھی دل میں ایک بے چینی سی لگی تھی کہ کیا پتا شاید...

اور پھر جب ڈائجسٹ ہاتھ میں آیا تو وہ معصوم سی امید اپنی فتح پر مسکرانے لگی... افسانہ نگاروں کی فہرست میں اپنا نام دیکھ کر دل کتنی ہی دیر بے یقینی کے سمندر میں ڈوبتا رہا۔ مطلوبہ صفحہ کھولا کہ کہیں کوئی غلط فہمی... لیکن وہ سو فیصد میری ہی تحریر تھی۔ خوشی اور بے یقینی نے آنکھیں نم کردیں۔ بعد میں بھی کتنی ہی بار اپنی تحریر اور نام کو کھول کھول کر دیکھتی رہی۔ (تب میں مصباح گل کے نام سے لکھتی تھی) دل تیز تیز دھڑک رہا تھا یا بے چارہ ٹھہر گیا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ گھر والوں کو بتایا تو وہ بے چارے بھی میری طرح ڈائجسٹ کھول کر یقین کرنے لگے۔ اور مجھ سے بھی پوچھا کہ پکی بات ہے تمہاری ہی کہانی ہے ناں...؟ (لوکر لو گل) سنبھلتے ہی سب نے مبارک باد دی... ای اور بہن نے انعام دیا، ابو مٹھائی لے آئے اور یوں میری پہلی کامیابی کو سیلیبریٹ کیا... آج بھی وہ لمحہ اور وہ کیفیت جیسے دل کے ساتھ بندھی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

الجھیں گے کئی بار ابھی لفظ سے مفہوم
سادہ ہے بہت وہ، نہ سمجھ آسان بہت ہوں

میرے ذہن میں بھی بارہا لفظ الجھے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ مجھے لکھنے کے لیے بہت کم موافق حالات میسر آئے۔ کبھی بہت دل چاہا تو وقت اور موقع نہیں ملا... اور جب وقت نے ساتھ دیا تو دل دغا دے گیا۔ اسی لیے میں زیادہ نہیں لکھ پائی... اور جو لکھا، اس میں سے بھی کچھ کو پذیرائی ملی اور کچھ کو نہیں... لیکن جتنی بھی پذیرائی ملی، اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ خواتین والوں کا شکریہ کہ انہیں میرے عام سے لفظ اس قابل لگے کہ وہ شعاع اور خواتین کی زینت بن سکیں اور سب سے زیادہ شکریہ میرے اللہ کا کہ جس کی مدد کے بغیر میں کبھی قلم اٹھانے کی بھی جسارت نہیں کرپاتی... میری طرح میرے لفظ بھی اسی کے محتاج ہیں اور جو بھی اس نے مجھے عطا کیا، محض اس کا کرم ہے اور یقیناً "میری اوقات سے بہت زیادہ...

3

خواب لفظوں میں ڈھل نہیں سکتے
کاش آنکھیں پڑھا کرے کوئی
لوگ تسخیر بھی ہو سکتے ہیں
لفظ دل سے ادا کرے کوئی

جی ہاں! دل سے ادا ہوئے لفظوں کے سحر سے بچ پانا واقعی بہت مشکل ہے اور ہماری سینئر مصنفین نے یہ کام بخوبی کیا اور بہت بار کیا... خواہ وہ فرحت اشتیاق کی محبت سے گندھی تحریریں ہوں، یا آسیہ رزاقی کی بے ساختگی سے بھرپور... عنیزہ سید کے تصوف کا رنگ لیے کردار ہوں یا نگہت سیما کے حب الوطنی سے لبریز... ثمرہ بخاری کے مخصوص ماحول کی کہانیاں ان کے خاص انداز میں... نبیلہ جواری تو شاید ہی کسی کے فیورٹ نہ ہوں، رخسانہ نگار عدنان

کی مجھے سلسلے وار سے زیادہ سنگل اسٹوریز پسند ہیں اور راحت جبیں کی رنگوں اور موسموں کی ہلکی پھلکی تحریریں۔ فاخرہ جبیں کو میں کافی شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ ان کی تحریر کی طرح ان کے کردار بھی بظاہر سادہ اور بذلہ سنج ۔۔۔ لیکن اندر سے بہت گہرے' آسانی سے پکڑائی نہ دینے والے ۔۔۔ وہ جس بھی رنگ میں لکھیں' رنگ جما دیتی ہیں ۔۔۔ سفال گر کے بعد بشریٰ سعید کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ بہت عرصے بعد ایک ایسی تحریر آئی کہ جس نے بار بار چونکایا اور ایک لمحے کے لیے بھی خود سے جدا نہیں ہونے دیا ۔۔۔ بشریٰ کی ایک تحریر ہزاروں تحریروں پر بھاری ہے ۔۔۔ اور سائرہ رضا ۔۔۔ پتا نہیں آپ نئی ہو یا پرانی لیکن ہیں بہترین ۔۔۔ اور اب آخر میں میری ہمیشہ سے موسٹ فیورٹ ' بولتے لفظوں سے ساکت کر دینے والی عمیرہ احمد 'انداز تحریر بہت قیمتی 'بہت نایاب۔ محبت ہو 'نفرت یا انتقام ۔۔۔ شدت پسندی جن کے کرداروں کا خاصا ہے 'انہیں اور خاص بنانے کے لیے ۔۔۔ وہ جو بھی لکھیں کمال کر دیتی ہیں ۔۔۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے بہت عرصے سے ہمارے لیے کچھ نہیں لکھا ۔۔۔ مگر ان کی جگہ ہنوز انہی کی ہے۔ ان کے نکاح کے لیے بہت بہت مبارک باد' اور آنے والی زندگی کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

4

یہ جو سرگشتہ سے پھرتے ہیں کتابوں والے
ان سے مت مل کہ انہیں روگ ہیں خوابوں والے

ادارہ خواتین کے علاوہ جس مصنف کو میں نے بہت پڑھا وہ نسیم حجازی ہیں۔ ان سے بہتر تاریخی ناولز لکھنے والا شاید پاکستان میں کوئی نہیں آیا۔ قاری کو کرداروں سے جوڑنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ منظر نگاری تو غضب کی ہوتی ہی ہے ۔۔۔ ان کے بیشتر ناولز مجھے بہت پسند ہیں ۔۔۔ خواہ وہ آخری معرکہ ہو یا آخری چٹان ۔۔۔ خاک و خون ہو یا قافلۂ حجاز شاہین ۔۔۔ ہر ناول اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے علاوہ اشفاق احمد کو پڑھنے سے زیادہ سننے کا اتفاق ہوا ۔۔۔ کیا تعریف کروں ان کی' جو درویشی ان کے مزاج میں ہے ۔۔۔ وہی تحریروں سے بھی صاف جھلکتی محسوس ہوتی ہے۔

5

عمر ساری تضاد میں گزری
ہونا کچھ اور' سوچنا کچھ اور
تیرے غم میں حساب عمر رواں
جلنا چھوڑا' بکھر گیا کچھ اور

لکھنے کے علاوہ دیگر مشاغل کا پوچھا امثل آپی نے ۔۔۔ سچ بتاؤں تو لکھنا بھی زیادہ تر مشغلہ نہیں رہتا میرے لیے ۔۔۔ بڑی ذمہ داری والا اور اچھا خاصا مشکل کام لگتا ہے مجھے۔ اور دیگر مشاغل میں زندگی کو سمجھ کر برتنے اور برت کر سمجھنے کا مشغلہ سرفہرست ہے۔ یقین مانئے تو زندگی سے مشکل نصاب میں نے کہیں اور نہیں دیکھا ۔۔۔ جس میں بعض اوقات ساری زندگی کی جدوجہد اور جان توڑ محنت کے باوجود آپ پاسنگ مارکس بھی نہیں لا پاتے ۔۔۔

اس سب سے ہٹ کر میوزک سننا اچھا لگتا ہے' ٹی وی دیکھتی ہوں' شاعری پڑھنا بھی پسند ہے۔ کچھ عرصے سے فیس بک بھی استعمال کرنے لگی ہوں اور شعاع' خواتین کا ساتھ تو ہے ہی ۔۔۔ موڈ کے مطابق کچھ من پسند کھانے کو مل جائے تو وہ بھی مشغلہ ہی لگتا ہے اور معمولات میں جلدی سونے اور جلدی اٹھنے کی عادت ہے شروع سے ہی' اس کے علاوہ بتانے کو کچھ بھی خاص نہیں۔

آپ سب کا بہت شکریہ مجھے پڑھنے اور برداشت کرنے کے لیے۔ چلتی ہوں' خوش رہیں ۔۔۔ اللہ حافظ۔

ریما علی سید

سب سے پہلے تو ادارے کو خواتین ڈائجسٹ کی کامیابی کا ایک اور سال مکمل ہونے پر دلی مبارک باد اور ڈھیروں دعائیں کہ حوصلے' یقین اور شعور کا یہ چراغ یونہی آب و تاب کے ساتھ جلتا رہے۔ آمین۔

وقت نے بہت عجیب انداز میں وسیع و عریض دنیا کو گلوبل ویلیج بنا دیا ہے۔ عام طور پر استعمال کی جانے والی یہ ترم کہنے اور بولنے میں جتنی بھی بھلی لگتی ہو لیکن اتنی ہے نہیں۔ آج کا انسان اجتماعی طور پر اس گلوبل ویلیج کا باسی ہے جس نے اسے تاریخ کی کامیاب ترین' ترقی یافتہ اور قابلیت کی سب سے اونچی چوٹی پر کھڑا کر دیا ہے۔ جہاں اسے اپنے پیروں تلے کوہ ہمالیہ بھی روئی کے معمولی گالے سے زیادہ نظر نہیں آتا ہے۔ ٹیکنالوجی کے سیلاب میں انسان اور زندگی کی بقا کے لیے تباہ کن ہتھیاروں سے لے کر نت نئے کھانوں کی تراکیب تک ہر چیز انسان کی انگلیوں پر ہے۔ کون سی چیز ہے جس کے بارے میں آج کا انسان نہیں جانتا لیکن اس کے باوجود علم نہیں ہے۔ یوں چودہ سو سال پہلے کی جانے والی پیش گوئی کہ "علم اٹھا لیا جائے گا" بھی سچ ثابت ہو چکی ہے۔

آج کا دور مقابلے کا دور ہے' نہ جانے وہ کون سی چیز ہے جس کے حصول نے انسان کو عجیب طرح کے گورکھ دھندے میں الجھا دیا ہے۔ ایسے میں اگر انسان کو فرصت کا ایک لمحہ بھی مل جائے تو وہ تفریح چاہتا ہے۔

میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ خواتین ڈائجسٹ تفریح کے ساتھ ساتھ افراد کی ذہنی بالیدگی کا وہ کام کر رہا ہے جو کسی بھی تہذیب یافتہ اور فعال معاشرے میں بڑے بڑے دانشور کرتے ہیں اور یہ ایسا کام ہے جو قابل تحسین بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

بہرحال آتے ہیں جوابات کی جانب۔

1۔ احساسات ملے جلے تھے۔ اس کے شائع ہونے کے بارے میں مجھے ایک قریبی دوست صائمہ احمد کے ٹیکسٹ کے ذریعے علم ہوا تھا۔ خوشی اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ یقین بھی حاصل ہوا کہ ہاں! میں لکھ سکتی ہوں۔

2 ہرگز نہیں۔

3 نگہت عبداللہ' آسیہ رزاقی اس لیے کہ ان کی تحریروں سے اپنی اردو کو بہتر بنانے کا موقع ملتا ہے۔ عنیزہ سید' فاخرہ ارشد کے علاوہ کچھ نام ایسے بھی ہیں جو ممکنہ طور پر نئے پڑھنے والوں کے لیے نامانوس ہوں' جیسے کہ نویدہ نازش' خالدہ اسد' نوربانو محجوب ۔۔۔ لبنیٰ غزل' غزالہ نگار' ہما کوکب بخاری ۔۔۔ یہ سب لکھنا چھوڑ چکی ہیں (اسی اور نوے کی دہائی کے چند رسالے ہاتھ لگے تو مجھے ان کو پڑھنے کا موقع ملا اور مزید پڑھنے کی خواہش ہوئی) رفعت ناہید سجاد کو پہلی بار "چراغ آخر شب" کے ذریعے پڑھا اور شدت سے احساس زیاں ہوا کہ کیوں ان کو پہلے نہیں پڑھ سکے۔ کاش وہ اب لکھنا جاری رکھیں۔ سیکنڈ لاٹ میں فائزہ افتخار' فرحت اشتیاق' تنزیلہ ریاض' بشریٰ سعید' آمنہ ریاض' ثروت نذیر' آمنہ مفتی' نبیلہ ابر راجہ ۔۔۔ جبکہ اس فہرست میں سائرہ رضا اور سمیرا حمید بھی شامل ہیں۔ اگر یہ کہوں کہ یہ سب بے حد خوب صورت اور متنوع موضوعات پر لکھتی ہیں تو خاصی گھسی پٹی سی بات ہوگی ۔۔۔ ان کے علاوہ ایک رائٹر ایسی ہیں جن پر میں صرف پاکستانی ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر مصنف پر فوقیت دیتی ہوں اور وہ ہیں عمیرہ احمد۔

4 خاصا مشکل سوال' کیونکہ اس پر میں بہت طویل جواب بھی دے سکتی ہوں ۔۔۔ بہرحال پاکستانی ادب میں اشفاق احمد کی "زاویہ" من چلے کا سودا" بانو آپا کا "حاصل

ھاث "آمنہ صدیقی کا "آخری زمانہ"۔۔۔ پاپولر فکشن کی اگر بات کی جائے تو "پیر کامل" "عنیزہ آپا کا "دل من مسافر من" "بشریٰ سعید کا "سفال گر" انگریزی میں الکیمسٹ ڈیسپائیڈ ٹوڈائے اور دا سیکرٹ لیٹر۔

حالیہ دنوں میں ہی پڑھی ہیں اور پسندیدہ ترین کتابوں میں سرفہرست ہیں۔ کہانیوں سے ہٹ کر اوریا مقبول جان صاحب کے کالمز بھی بے حد شوق سے پڑھتی ہوں۔

5 کتابیں پڑھنا، چاہے پاپولر فکشن ہو یا شاعری، آٹوبائیوگرافیز ہوں یا کرنٹ افیئرز سے متعلق۔۔۔ کتابیں پڑھنا ایک ایسا کام ہے جو کئی سالوں سے میری زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کوئی بہت اچھی فلم، پاکستانی اور انگریزی میری پہلی ترجیح ہوتی ہیں۔

ڈرامے میں بہت شوق سے دیکھتی ہوں لیکن صرف مخصوص، البتہ اگر کبھی پی ٹی وی پر پرانے ڈرامے چل رہے ہوں اور مجھے پتا چل جائے تو پھر اسے دیکھنے کے لیے اہم ترین کام بھی پس پشت ڈال سکتی ہوں (ذاتی نوعیت کے کام) وصی شاہ کا "رات گئے" بھی خاصا منفرد اور دلچسپ پروگرام تھا، اس کے علاوہ کرنٹ افیئرز بے حد شوق اور دلچسپی سے دیکھتی ہوں۔ میوزک اور انٹرنیٹ کو بھی مشغلہ سمجھ لیجئے۔ پاکستانی موسیقی، کچھ سالوں تک پینٹنگ کا بھی شوق تھا لیکن اب نہیں۔

روزمرہ کے معمولات اور روز و شب وہی ہیں۔ جیسے کہ ہر عام پاکستانی لڑکی کے ہوتے ہیں۔ فراغت ڈھونڈنے کی قائل نہیں ہوں۔ ایم اے انگریزی ادب اور بین الاقوامی تعلقات۔

آخر میں ایک بار پھر خواتین ڈائجسٹ کی سالگرہ کی بہت بہت مبارک باد اور ڈھیروں دعائیں۔

گل افشاں رانا

1 خواتین ڈائجسٹ کے لیے پہلی تحریر بھجواتے ہوئے یقین اور مان کا احساس سب سے بھاری تھا کہ اگر قابل ہوئی تو ضرور قبول کرلی جائے گی اور جب ادارہ خواتین نے قبولیت کی سند بخشی تو بہت اچھا لگا۔

2 دین مبین میں دو عورتوں کی گواہی کو کافی قرار دیا ہے لیکن جب اتنی ساری بہنوں نے بھرپور انداز میں پذیرائی بخشی تو سچ میں خوشی سے آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں ان سب بہنوں کی ہمیشہ شکر گزار رہوں گی باخصوص صباسحر صاحبہ کی جنہوں نے میری تحریر کو سراہا اور میری محبتوں کے کارواں میں شامل ہوگئیں۔

3 سینئر مصنفین جن کی تحریریں میں شوق سے پڑھتی ہوں عمیرہ احمد، نمرہ احمد، فرحت اشتیاق، کنیز نبوی، رخسانہ نگار عدنان، جبین سسٹرز، افشاں آفریدی، سعدیہ عزیز آفریدی، شازیہ چوہدری، سائرہ رضا نئے لکھنے والوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ بنی رہیں گی ان شاء اللہ۔

4 ادارہ خواتین کے علاوہ میں اپنے ملک کے تمام نامور مشہور و معروف قابل سب ہی لکھنے والوں کو لائیک کرتی ہوں۔ خاص طور پہ حق و سچ لکھنے والوں کو، خواہ ان کا تعلق اسلام سے ہو ادب سے ہو یا صحافت سے ہو۔

پسندیدہ کتابوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ کیونکہ مطالعے کا شوق بچپن سے ہی ہے، قرآن، احادیث کے علاوہ۔ اللہ کے ولیوں کے احوال پڑھ کے بھی ہدایت ملتی ہے۔ غموں کی اماوس زدہ راتوں میں ایسی کتابیں پڑھ کے روشنی ملتی ہے۔ دل کو ڈھارس ملتی ہے۔ اللہ کی رسّی کو مزید مضبوطی سے تھامنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے۔ رحمتہ اللعالمین، قصص انبیا، جنت کے حسین مناظر، موت کا منظر، بہشتی زیور، رحیق المختوم، کشف المحجوب، ترجمہ قرآن، اقوال و افعال و مبین، زاویہ، شہاب نامہ، زندگی جب شروع ہوگی، جاوید چوہدری کے سب ہی زیرو پوائنٹ اور بھی بہت ساری ہیں۔ آج کل راشد بھائی کی گفٹ کی ہوئی کتاب "غم نہ کر" زیر مطالعہ ہے اور تصوف کی کتابیں مولانا روم کا کلام، سلطان العارفین، میاں محمد بخش، بابا بلھے شاہ کا کلام بچپن سے ہی مجھ پر سحر طاری کردیتا ہے۔۔۔

5 مشاغل میں پہروں بیٹھ کے سوچتی ہوں۔ الجھتی ہوں، کڑھتی ہوں، روتی ہوں کہ اس دنیا کے غم جانے کب ہوں گے کم؟ خواہشات زن، زر، زمین کے لیے مسلمان کو مسلمان کی گاجر مولی کی طرح جان و مال عزت و آبرو چھینتے دیکھتی ہوں تو کانپ جاتی ہوں۔ سہم جاتی ہوں۔

ہم خاک سے بنے، خاک میں مل جانے والے خاکی پتلے ہیں کیا؟ اور بنے کیا ہوئے ہیں؟ الامان الحفیظ۔

ناول نگاری کے علاوہ اپنی شاعری پر سنجیدگی سے کام کر رہی ہوں۔ کبھی سفید کبوتروں کے پروں پر پینٹنگ کیا کرتی تھی۔ گھر کو پھول دار پودوں سے سجایا کرتی تھی۔ کوکنگ میں نت نئی ڈشز ٹرائی کیا کرتی تھی۔ آپس کی بات ہے میں کھانا بہت اچھا بنالیتی ہوں۔ میرے ہاتھ کی بنی چکن تندوری ایک بار کھانے والا اپنی انگلیاں ضرور چاٹتا ہے۔

اور زندگی کے شب و روز، معمولات، خیالات، جب تک پیاری ماں حیات تھیں تب تک اور تھے اور اب اور ہیں۔

میرے پیارے باباجان فجر کے ٹائم میرے روم کا دروازہ ناک کرکے آواز دیتے ہیں۔ "بیٹا! نماز کے لیے اٹھ جاؤ۔" تو میری صبح کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ایڈ اینڈ پرنسز آمنہ کو اٹھا کے ناشتہ کروا کے اسکول بھیجتی ہوں۔ پھر چائے کا مگ ہاتھ میں لے کے بابا، نوید بھائی، پیاری بھابھیوں صدف اور انعم سویٹ سسٹر علیشہ کے ساتھ گپ شپ ہوتی ہے۔

تفہیم القرآن کا کورس شروع کیا ہوا ہے بھابھیوں کے ساتھ لنچ کی تیاری میں تھوڑی بہت ہیلپ کرواتی ہوں، پھر آمنہ آجاتی ہے اس کے ساتھ لاڈ شاڈ ہوتے ہیں۔ اس کو چینج کروا کے لنچ کرواتی ہوں۔ پھر اس کے ساتھ وڈیو گیمز یا کچھ دیر کارٹون دیکھتی ہوں۔ گھر میں ایرانی بلیاں ہیں، ان کی شرارتوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ پھر آمنہ کے قرآن پڑھنے اور ٹیوشن کا ٹائم ہو جاتا ہے۔ پھر لکھنے پڑھنے کا کام اسٹارٹ کردیتی ہوں۔ جو رات گئے تک جاری رہتا ہے۔

مغرب کے وقت سب ایک بار پھر اکٹھے ہوتے ہیں۔ گپ شپ ڈنر ہوتا ہے۔ عشاء کے بعد آمنہ کو سلادیتی ہوں۔ لکھنے پڑھنے کا موڈ نہ ہو تو خود بھی سو جاتی ہوں آمنہ کے ساتھ ہی اور پھر رات کے کسی پہر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ تو پھر نیند سے بیدار ہو کے رب رحمن سے راز و نیاز کرنا مناجات کرنا۔۔۔ اور اپنے تخیل میں آئیڈیل پرسن سے گلے شکوے کرنا کہ تم ہو کہاں؟ روح کا ساتھی ملا تو ٹھیک، ورنہ زندگی کا سفر سنگل گزارنے کا پکا فیصلہ ہے۔۔۔ رات کی تنہائی سکون اور خموشی مجھے بہت پسند ہے۔۔۔ بابا اور بھائی (سہیل اور راشد بھائی) جب پاکستان میں ہوں تو زندگی میں خوشیوں کی گہما گہمی ہلچل سی رہتی ہے۔ ہر دوسرے دن کہیں نہ کہیں آؤٹنگ کا پروگرام بنا ہوتا ہے۔

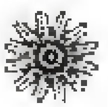
میری اب تک کی زندگی کا سب سے خوب صورت انمول یادگار وہ طویل ترین دور تھا، جب میں اپنی فیملی کے ساتھ جدہ میں زندگی کی خوشیوں سے بھرپور دن گزار رہی تھی ہر ویک اینڈ پر مکے یا مدینے جانا۔۔۔ وہ پل جیون کے سفر میں میرے لیے اب زادِ راہ ہیں۔ وہ دور میں نے ایک پرنسز کی طرح گزارا ہے۔ مجھے سمندر بہت پسند ہے۔ دنیا کے کسی بھی سمندر کنارے جب اور جس وقت بھی مجھے جانے کا موقع ملے گا میں انکار نہیں کروں گی۔ آل ٹائم ہائی فیورٹ پکنک اسپاٹ ہے۔

میں اپنے بابا اور بھائیوں کے بغیر کبھی بھی گھر سے باہر نہیں نکلی۔ میری دنیا میرے گھر کی چار دیواری تک محدود ہے۔ فیس بک پر بھی تانک جھانک کرلیتی ہوں۔

تعلیم۔۔۔ تو انتہائی کم ہے۔ بتاتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ میں نے دوبارہ تعلیم کا سلسلہ شروع تو کیا ہے۔ لیکن فی الحال ابھی کورس کی کتابوں میں دل نہیں لگ رہا۔۔۔ سو وہ بے چاری جوں کی توں پڑی ہیں۔۔۔

الحمدللہ میں خوب صورت ہوں۔ مالی طور پر بھی خوش حال، عزت دار، دین دار گھرانے کی تیس سالہ بیٹی ہوں۔ لیکن پچھلے دس سال سے اپنے پاؤں پر چلنے کی عظیم نعمت سے محروم ہو چکی ہوں۔ یہ بات صرف اس نیت سے بتا رہی ہوں کہ شاید میری کسی بہن کو ڈھارس ملے، شکر اور قناعت کا حوصلہ بڑھے۔

پیاری بہنو! آج کے دور میں اگر آپ ایک دین دار، محبت و عزت کرنے والے گھرانے میں پیدا ہوئی ہیں۔۔۔ مناسب شکل و صورت، تعلیم ہے تو خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھئے آج کے آفتوں، فتنوں پُر آشوب دور میں جو گھڑیاں عزت سے سکون سے گزر جائیں تو اللہ کا شکر ادا کریں۔ آخرت کی فکر اور قناعت اختیار کیجئے اور مجھے اپنی پُرخلوص دعاؤں میں یاد رکھیے۔





باصلاحیت فنکارہ

منشا پاشا سے باتیں

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"منشا پاشا۔"
2 "پیار کا نام؟"
"زیادہ تر تو منشا ہی بلاتے ہیں کبھی منشو بھی کہہ دیتے ہیں۔"
3 "تاریخ پیدائش/شہر؟"
"19 اکتوبر 1985ء/حیدر آباد۔"
4 "ستارہ؟"
"میزان۔"
5 "بہن بھائی/آپ کا نمبر؟"
"میری تین بڑی بہنیں ہیں۔ میرا نمبر آخری ہے۔"
6 "تعلیمی قابلیت؟"
"زیبسٹ سے میڈیا سائنس میں بیچلر کیا۔ اسکالر شپ ملی تو میں امریکہ گئی۔ وہاں ایک سال پڑھا اور گریجویشن کیا۔"
7 "شادی/بچے؟"
"ابھی ایک سال ہی ہوا ہے شادی کو۔"
8 "شوبز میں آمد؟"
"اپنی تعلیم کی وجہ سے فیلڈ میں آئی۔ موبل پروڈکشن میں پروڈیوسر تھی۔ پھر اداکاری کی طرف آئی۔"
9 "پہلا پروگرام/وجہ شہرت؟"
"زندگی گلزار ہے/اور اسی نے شہرت دی۔"
10 "پہلی کمائی/کہاں خرچ کی؟"
"جب یونیورسٹی میں تھی تو "ہم" میں ہی انٹرن شپ کی پانچ یا چھ ہزار ملے تھے اور یاد نہیں کہاں خرچ کیے۔"
11 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
"منحصر ہے اس بات پر کہ صبح کیا کرنا ہے۔ اگر شوٹ ہو تو جلدی اٹھ جاتی ہوں ورنہ بارہ بجے تک اٹھ جاتی ہوں۔"
12 "آپ کی رات کب ہوتی ہے؟"
"یہ بھی منحصر ہے کام پر جلدی جانا ہو تو رات کو جلدی سو جاتی ہوں۔"
13 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"کہ ناشتہ کرلوں۔"
14 "گھر والوں کی کوئی بات جو بری لگتی ہو؟"
"بہت سی باتیں بری بھی لگتی ہیں اور بہت سی باتیں اچھی بھی لگتی ہیں۔"
15 "اپنے ملک کا کون سا قانون اچھا لگتا ہے؟"
"اس ملک کا کون سا قانون اچھا ہے۔"
16 "کون سے تہوار اچھے لگتے ہیں۔ قومی یا مذہبی؟"
"مذہبی تہواروں میں مجھے عید اچھی لگتی ہے اور قومی تہوار میں 14 اگست یوم آزادی۔"
17 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"
"میں تو اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں اور کبھی نہیں سوچتی کہ مجھ میں یہ کمی ہے یا وہ کمی ہے۔"
18 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"میں بہت چڑچڑی ہو جاتی ہوں جب مجھے بھوک لگتی ہے اور کھانا نہ ملے تو۔ ایسا شوٹ پہ ہوتا ہے۔"
19 "کس دن کا شدت سے انتظار رہتا ہے؟"
"چھٹی کے دن کا۔"
20 "شدید تھکن میں کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے؟"
"اپنے بستر پر سونے کے لیے۔"
21 "خوشی کے اظہار کے لیے کیا کرتی ہیں؟"
"کچھ خاص نہیں۔ ہنستی ہوں' خوش رہتی ہوں۔"
22 "کب دماغ کا میٹر گھوم جاتا ہے؟"
"نہیں ایسا کچھ نہیں ہوتا' کیونکہ مجھے غصہ بہت کم آتا ہے۔"



23 "کب اپ سیٹ ہو جاتی ہیں؟"
"کبھی بھی انسان کسی بھی بات سے اپ سیٹ ہو سکتا ہے ——— پھر جس وجہ سے ہوتی ہوں اس کو اپنی دوست کے ساتھ شیئر کرلیتی ہوں۔"
24 "مردوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
"بہت ساری باتیں ہیں مگر جب وہ عورتوں کو عزت دیتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔"
25 "اور کون سی بات بری لگتی ہے؟"
"غصہ۔"
26 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"
"تو وہ بڑا ہی بدتمیز ہوگا۔"
27 "پرائز بانڈ لینے کا شوق ہے؟"
"نہیں..... ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔"
28 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
"اپنے شوہر کے غصے سے۔"
29 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"

"میرا نہیں خیال کہ مجھے وقت سے پہلے کچھ ملا ہو' ہر چیز اپنے وقت پر ہی ملی ہے۔"

30 "محبت کا اظہار کھل کر کرتی ہیں؟"

"بہت زیادہ کھل کے اور پیار کرکے۔"

31 "کس ملک کی شہریت لینا چاہتی ہیں؟"

"میں اپنے ملک میں بہت خوش ہوں۔"

32 "جب شاپنگ پہ جاتی ہیں تو سب سے پہلے کیا خریدتی ہیں؟"

"مجھے شاپنگ کا بہت زیادہ کریز نہیں ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اسی کو خریدنے بازار جاتی ہوں۔"

33 "پیسہ خرچ کرتے وقت کچھ سوچتی ہیں؟"

"کہ جو چیز میں لے رہی ہوں وہ اتنی ضروری ہے یا نہیں یا اس کے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے۔"

34 "کبھی کرائسز میں وقت گزرا؟"

"بہت بار..... بہت سارے وقت گزارے ہیں۔"

35 "ایک پسندیدہ شخصیت جس کے ساتھ ایک شام گزارنا چاہتی ہیں؟"

"قائد اعظم محمد علی جناح۔"

36 "کون سا وقت بہت اچھا گزرتا ہے؟"

"جب میں اپنی نند کے ساتھ بیٹھ کر گپیں لگاتی ہوں۔"

37 "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"

"کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ اپنے بھی اور پرائے بھی۔"

38 "چھٹی کا دن کہاں گزارنے کا موڈ ہوتا ہے؟"

"اگر چھٹیاں زیادہ ہوں تو ملک سے باہر جا کر یا شہر سے باہر جا کر گزارنا اچھا لگتا ہے اور اگر کچھ ہی دن ہوں تو پھر گھر سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔"

39 "آج کل کے لباس میں کیا پسند ہے؟"

"لانگ شرٹ اور پینٹ۔"

40 "اپنی شخصیت کے لیے کوئی دو لفظ؟"

"ایمبیشس اور سینس ایبل۔"

41 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"کوئی ایک کونا نہیں ہے۔ پورے گھر میں سکون ملتا ہے۔ کبھی کچن میں مزہ آتا ہے۔ اچھا لگتا ہے۔ کبھی اپنے کمرے میں 'کبھی جہاں سب مل بیٹھ کر باتیں کر رہے ہوں۔"

42 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتی ہیں؟"

"جس میں کوئی کام کی بات ہو' جس میں کسی نے کچھ پوچھا ہو۔"

43 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟"

"مجھے مطالعہ کا شوق ہے۔ اس لیے کتاب پڑھتی ہوں۔"

44 "ایک کردار جو ہٹ ہوا؟"

"میرے سارے ہی کردار پسند کیے گئے ہیں۔"

45 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"

"میں ان ہی لوگوں کو نمبر دیتی ہوں جن کو میں جانتی ہوں ہر ایک کو نمبر نہیں دیتی۔"

46 "مہمانوں کی اچانک آمد؟"

"بری نہیں لگتی۔"

47 "اگر آپ پاور میں آجائیں تو؟"

"تو اُن لاز کو تبدیل کروں گی جو ہماری خواتین کے لیے اچھے نہیں ہیں۔"

48 "کیا چیز جمع کرنے کا شوق ہے؟"

"چیزیں جمع کرنے کا شوق بالکل نہیں ہے اور میری یہ ہمیشہ سے عادت رہی ہے کہ جو چیز۔ خواہ وہ نئی ہو یا پرانی اگر میں استعمال نہیں کر رہی ہوتی تو وہ دے دیتی ہوں کسی نہ کسی کو۔"

49 "کوئی نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"جب لوگ آپ کی سچویشن سمجھے بغیر آپ کو نصیحت کرتے ہیں وہ بری لگتی ہے اور ہمیشہ لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔"

50 "کبھی لیٹ ہو جائیں تو؟"

"تو سوری کر لیتی ہوں۔ ویسے میں زیادہ تر وقت کی پابندی کرتی ہوں۔"

51 "کن لوگوں پر خرچ کرنے کو دل چاہتا ہے؟"

"لوگ عموماً" اپنے بچوں پر کرتے ہیں تو میرے لیے ابھی ایسی کوئی سچویشن نہیں ہے کہ میں دل کھول کر خرچ کروں۔"

52 "اپنی کمائی سے قیمتی چیز کیا خریدی اپنے لیے؟"

"نہیں ابھی تک تو کوئی قیمتی چیز نہیں خریدی۔"

53 "کھانے کا مزہ کہاں آتا ہے۔ چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟"

"کہیں بھی بس کھانا اچھا ہونا چاہیے۔"

55 "اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو آپ کیا لینا پسند کریں گی؟"

"ایک بہت ہی اچھا سا گھر لے لوں گی۔"

56 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟"

"نارمل ہوں بہت کریز نہیں ہے۔"

57 "ایک کھانا جو بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟"

"میں کانٹی نینٹل کھانے بہت اچھے پکا لیتی ہوں۔ ابھی کچھ دن پہلے پاستا اور سیلڈ بھی بہت اچھا بنایا تھا۔"

58 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"

"زیادہ تر تو خواتین ہی نرم دل ہوتی ہیں۔"

59 "ایک شخصیت جس کو اغوا کرنا چاہتی ہیں اور تاوان میں کیا لینا چاہتی ہیں؟"

"میں سمجھتی ہوں کہ یہ سوچ ہی غلط ہے انسان کو ایسا سوچنا ہی نہیں چاہیے۔ مجھ میں اتنا لالچ نہیں ہے کہ کسی کو اغوا کرکے کسی سے کچھ حاصل کروں۔"

60 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"مجھے کیڑوں سے ڈر نہیں لگتا اور اپنے گھر میں کیڑے میں ہی مارتی ہوں۔"

61 "خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟"

"میں ایسے لوگوں کو جج نہیں کرتی کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ کبھی کبھی انسان کے مینٹل پرابلمز بھی ہوتے ہیں۔"

62 "کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟"

"جب کوئی منہ پہ جھوٹ بولتا ہے 'کوئی فریب دیتا ہے دُکھ دینے کے لیے۔"

63 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"

"نکاح۔"



64 "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"

"یہ تو لوگوں پر منحصر ہے جو ان کو بہتر لگتا ہے وہ ہی دیتے ہیں۔"

65 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"

"اپنے ہاتھ کا پکا ہوا۔"

67 "اپنا فون نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کیا؟"

"چار پانچ سال سے تو ایک ہی نمبر ہے۔"

68 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"

"سیل فون 'پرس 'والٹ۔"

69 "پبلک میں اپنے آپ کو کیسا محسوس کرتی ہیں؟"

"ان کے جیسا ہی میں بھی ایک عام انسان ہوں۔"

70 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"

"جی بالکل۔"

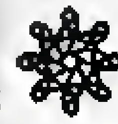
71 "آپ کی کوئی اچھی اور بری عادت؟"

"اچھی تو یہ ہے کہ میں بہت ایمان دار ہوں اور یہی میری بری عادت بھی ہے کہ ہر ایک سے مخلص ہوں۔"

72 "کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟"

"شکر ہے ایسی عادت نہیں ہے۔"

73 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"غصے میں تو نہیں لیکن جب میں اپ سیٹ ہوتی ہوں تب۔"
74 "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"
"جب آپ اس کو سر پر چڑھا لیتے ہیں۔"
75 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟"
"منحصر ہے اس بات پر کہ دماغ میں کیا چل رہا ہے' کتنا پرسکون ہے۔"
76 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟"
"سیل فون' کتاب' چارجر اور لیمپ۔"
77 "خدا کی حسین تخلیق؟"
"ہر چیز' مگر انسان کے اندر جو یقین اور امید ہے وہ سب سے حسین ہے۔"
78 "زندگی بری لگتی ہے؟"
"جب سمجھ نہیں آتی۔"
80 "زندگی کب بدلی؟"
"جب میں اس فیلڈ میں آئی۔"
81 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"تو غصہ آتا ہے' چڑ ہوتی ہے۔"
82 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"
"جب کسی کا دل نہ دکھانا ہو تب۔"
83 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرتی ہیں؟"
"جب میں نیند پوری کرکے اٹھتی ہوں۔"
84 "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"کہ کپڑے بدل کر فریش ہو جاؤں۔"
85 "جس دن موبائل سروس آف ہو تو؟"
"سکون ملتا ہے۔"
86 "کبھی سی این جی کی لائن میں لگیں؟"
"کبھی نہیں۔"
87 "سینما میں پہلی فلم کب دیکھی تھی؟"
"جب کافی چھوٹی تھی تو جراسک پارک دیکھی تھی میں۔"
88 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟"
"اس وقت دیکھتی ہوں کہ ہاتھ میں کتنے ہیں۔"
89 "اپنی شخصیت میں کیا بدلنا چاہتی ہیں؟"
"Honest (ایماندار) بہت ہوں اور یہ چیز کبھی نقصان بھی پہنچاتی ہے۔ تھوڑا کم کرنا چاہتی ہوں۔"
90 "لائٹ چلی جائے تو کیا بولتی ہیں؟"
"ہائے ہائے پھر لائٹ چلی گئی۔"
91 "اچانک چوٹ لگ جائے تو؟"
"اُوفوہ۔"
92 "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہو"
"ترکی اچھا ہے۔"
93 "کردار کے لیے ریسرچ کہاں سے کرتی ہیں؟"
"اپنے اردگرد سے۔"
94 "ہم عموماً" کن کاموں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟"
"یہ سوچ کر کہ لوگ کیا سوچیں گے۔"
95 "شاپنگ کے لیے پسندیدہ جگہ؟"
"کوئی خاص نہیں ہے۔ بہت سی جگہوں پہ جاتی ہوں۔"
96 "پسندیدہ چینل؟"
"موڈ پر..... کہ کیا دیکھنا ہے۔"
97 "پسندیدہ پروفیشن؟"
"جس میں میں ہوں۔"
98 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"تو ویسے ہی ڈیل کروں گی جیسے شہرت آئی تھی تو ڈیل کیا تھا۔ ہر چیز میں اللہ کی مرضی شامل ہوتی ہے۔"







عفت سحر طاہر

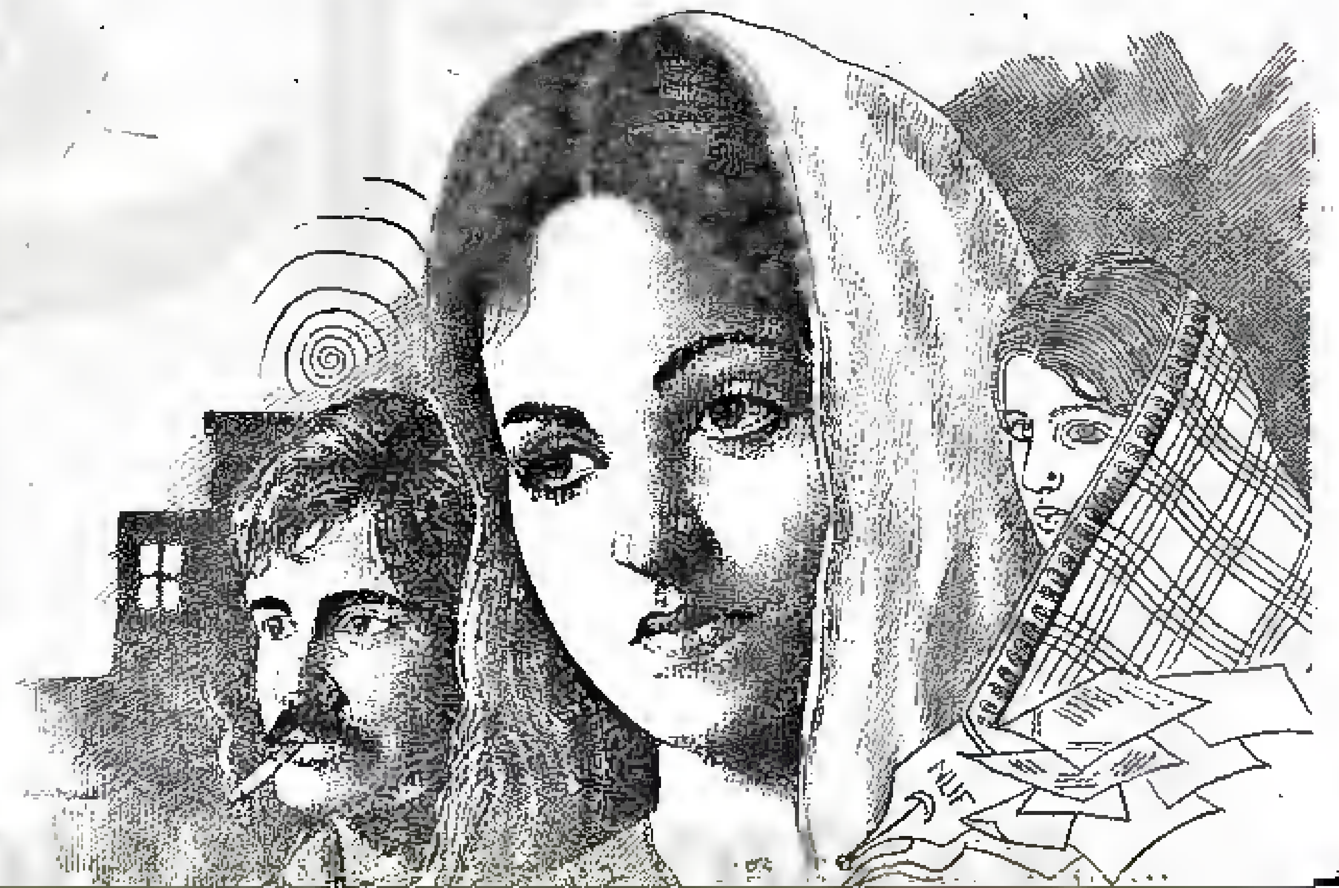
عصر کی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ایزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی اور سفینہ کو یقین ہے کہ وہ آج بھی ان کے دل میں بستی ہے۔ صالحہ مر چکی ہے۔ ابیہا اس کی بیٹی ہے۔ جواری باپ سے بچانے کے لیے صالحہ' ابیہا کو امتیاز احمد کے سپرد کر جاتی ہے۔ تین برس قبل کے اس واقعے میں ان کا بیٹا معیز ان کا رازدار ہے۔

ابیہا ہاسٹل میں رہتی ہے۔ حنا اس کی روم میٹ ہے اور اچھی لڑکی نہیں ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد' ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کر کے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب' معیز میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔

رباب' ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ زارا کے اصرار پر معیز احمد مجبوراً" رباب کو کالج پک کرنے آتا ہے تو ابیہا دیکھ لیتی ہے۔ وہ سخت غصے میں امتیاز احمد کو فون کر کے طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے۔ اتفاق سے وہ فون معیز احمد اٹینڈ کر لیتا ہے۔ ابیہا اپنی اس حرکت پر سخت پشیمان ہوتی ہے۔ معیز رباب میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔

صالحہ ایک شوخ الھڑسی لڑکی ہے۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند ہے مگر اس کے گھر کا ماحول روایتی ہے۔ اس کی دادی اور تائی کو اس کا امتیاز احمد سے بے تکلف ہونا پسند نہیں ہے۔ امتیاز احمد بھی اس بات کا خیال رکھتے ہیں۔ مگر وہ ان کی مصلحت پسندی اور نرم طبیعت کو بزدلی سمجھتی ہے۔ نتیجتاً" وہ امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران اس کی ملاقات اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی سے ہوتی ہے۔ مراد صدیقی اسے اپنے آئیڈیل کے قریب محسوس ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف مائل ہونے لگتی ہے۔ صالحہ کی ضد پر شازیہ اس کی ماں



سے مراد کاذکر کرتی ہے۔ وہ غصے میں صالحہ کو تھپڑ مار دیتی ہیں۔

امتیاز احمد اپنے فلیٹ پر ابیہا کو بلواتے ہیں مگر ابیہا وہاں معیز احمد کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

معیز نے ابیہا کو صرف از خود طلاق کا مطالبہ کرنے پر مجبور کرنے کے لیے وہاں بلایا ہوتا ہے۔ اس کا ارادہ قطعاً" غلط نہ تھا مگر بات پوری ہونے سے قبل ہی امتیاز احمد ڈرائیور کی اطلاع پر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ معیز بہت شرمندہ ہوتا ہے۔ امتیاز احمد 'ابیہا کو لے کر وہاں سے چلے جاتے ہیں۔

ابیہا کالج میں رباب اور اس کی سہیلیوں کی باتیں سن لیتی ہے' جو محض تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے ان سے پیسے بٹور کر بلا گلا کرتی ہیں۔ عموماً" یہ ٹارگٹ رباب کو اس کی خوب صورتی کی وجہ سے دیا جاتا ہے' جسے وہ بڑی کامیابی سے جیت لیا کرتی ہے۔

صالحہ کی ہٹ دھرمی سے گھبرا کر اس کے والدین امتیاز احمد سے اس کی تاریخ طے کردیتے ہیں۔ مگر وہ امتیاز احمد کو مراد کے بارے میں بتا کر ان سے شادی کرنے سے انکار کردیتی ہے۔ امتیاز احمد 'دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کرکے صالحہ کا راستہ صاف کردیتے ہیں مگر شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھانے لگتا ہے۔

ابیہا 'معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتی ہے۔

مراد صدیقی جواری ہوتا ہے۔ وہ صالحہ کا بھی سودا کرلیتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے' مگر پھر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے پولیس مراد کو پکڑ کرلے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کرنے لگتی ہے۔ فیکٹری میں ساتھ کام کرنے والی ایک سہیلی کسی دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے۔ جو امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ صالحہ کی سہیلی اسے امتیاز احمد کا کارڈ دیتی ہے جسے صالحہ محفوظ کرلیتی۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے جب مراد رہا ہو کر واپس آجاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کردیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً" آجاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کرکے اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اس دوران معیز بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ امتیاز احمد 'ابیہا کو کالج میں داخلہ دلوا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کردیتے ہیں۔ صالحہ مرجاتی ہے۔

معیز احمد 'ابیہا کو اسپتال لے کر جاتا ہے مگر وہاں پہنچ کر عون کو آگے کردیتا ہے۔ ابیہا اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ ابیہا کا پرس ایکسیڈنٹ کے دوران کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کرپاتی ہے' نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ امتیاز احمد دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر بحالت مجبوری حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔

وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں' زور زبردستی کرکے ابیہا کو اپنے راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا روتی پیٹتی ہے' مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

امتیاز احمد 'معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آؤ۔ وہ متذبذب ہو جاتا ہے۔ سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد انتقال کر جاتے ہیں۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ روپے' گھر میں حصہ اور دس ہزار ماہانہ کرجاتے ہیں۔ جس سے سفینہ اور ناراض ہو جاتی ہیں۔ معیز 'ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے' مگر وہ اسے نہیں مل پاتی۔ ابیہا کا موبائل بھی حنا کے گھر میں گم ہو جاتا ہے۔ معیز باتوں باتوں میں رباب سے اس کے بارے میں پوچھتا ہے' وہ اس کی رہائش سے لاعلمی کا اظہار کرتی ہے' مگر حسد میں غیر ارادی طور پر اس کی تعریف کرجاتی ہے۔

عون خاندان والوں کے بیچ ثانیہ سے معافی مانگنے کا اعلان کرتا ہے۔ ثانیہ سخت جزبز ہوتی ہے۔

حنا کی میم ابیہا پر بہت سختی کرتی ہیں۔ اسے مارتی بھی ہیں۔ ابیہا کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ مجبور ہو کر سیفی کے آفس میں ملازمت کرنے پر رضامند ہو جاتی ہے۔

معیز کے نظر انداز کرنے پر رباب 'زارا سے اس کا شکوہ کرتی ہے۔ زارا ماں سے تذکرہ کرتی ہے۔ سفینہ 'معیز سے بات کرتی ہیں۔ وہ اس سے واضح لفظوں میں رباب سے شادی کا کہتی ہیں مگر معیز دوٹوک انداز میں انہیں منع کردیتا ہے۔

تاہم ان کے کہنے پر وہ رباب کو منانے پر راضی ہو جاتا ہے۔

عون نے سب کے سامنے یہ کہہ کر معاملہ ٹال دیا کہ اسے ثانیہ کی مرضی اور خوشی مطلوب ہے۔

سیفی 'ابیہا کو زبردستی پارٹی میں لے کر جاتا ہے۔ جہاں معیز احمد بھی عون کے ساتھ آیا ہوتا ہے مگر وہ ابیہا کو بالکل پہچان نہیں پاتے۔ کیونکہ ابیہا اس وقت یکسر مختلف انداز و حلیے میں ہوتی ہے۔ تاہم اس کی گھبراہٹ کو معیز اور عون محسوس کرلیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں بلاوجہ بے تکلف ہونے پر ایک ادھیڑ عمر شخص کو تھپڑ ماردیتی ہے۔ جواباً" سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ ماردیتا ہے۔ عون اور معیز احمد کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔

—۸—

آٹھویں قسط

سیفی نے وہاں تو کیدرنگ کے خیال سے بات نہیں بڑھائی مگر واپس آکے اس نے ساری بات میڈم کو بتائی۔

انہوں نے لرزہ براندام ابیہا کو سرد نگاہوں سے دیکھا۔ پھر سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"میں نے اسے تمہارے حوالے کردیا ہے سیفی! یہ تمہاری مجرم ہے۔ جو دل چاہے کرو اس کے ساتھ۔"

اور اس کے بعد سیفی نے دل کھول کر اپنا غصہ اس پر نکالا۔ تھپڑ گھونسے لاتیں۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا۔ میز کا کونا پیشانی میں کھب گیا۔ خون سے اس کا چہرہ تر ہوگیا۔ رخسار کی ہڈی پہ چوٹ آئی۔

وہ چیختی چلاتی ادھر ادھر بھاگتی رہی مگر اس کی شنوائی نہ ہوئی۔

"عزت دار۔ زیادہ عزت دار بنتی ہے۔" مار مار کے سیفی تھک گیا۔

وہ بے ہوشی کی کیفیت میں کارپٹ پر گر گئی تو میڈم نے ہاتھ اٹھا کر گویا ریسلنگ ختم ہونے کا اشارہ کیا۔

"اسے سمجھالیں۔ آپ کا کاروبار بھی جائے گا اور میرا بھی۔" وہ زہر خندہ لہجے میں کہہ کر چلا گیا۔

میڈم نے آواز دے کر ملازم کو بلایا اور ابیہا کو اٹھا کر اسے کمرے میں لے جانے اور اس کے زخم صاف کرنے کو کہا اور خود اطمینان سے ٹی وی لگا کے چینل بدلنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

وہ رباب کے ساتھ چھٹی منا رہا تھا۔ ساحل سمندر پر دور تک اس کے ساتھ چلتے۔ پانی کی لہروں سے کھیلتے ہوئے وہ اپنا تمام ماضی بھولے ایک نیا معیز بن گیا۔

جسے زندگی سے پیار تھا۔

"دیکھا۔ سمندر میں کیسا جادو ہے۔ تم جیسے سڑیل آدمی کو بھی اس نے خوش مزاج بنادیا۔" رباب اسے چھیڑ رہی تھی۔

"مائنڈ یو۔ میں پہلے سے ہی ایک خوش مزاج آدمی ہوں محترمہ!"

معیز نے مسکرا کر کہا۔

"محترمہ؟" رباب نے ناک چڑھا کر ناگواری سے دہرایا۔

"میں کون سی سیاست دان ہوں جس کے لیے تم اتنے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کررہے ہو۔" وہ نازنین تھی' ناز پرور تھی۔

اس کے پیچھے ڈوبتا سورج اس کے بالوں کو نارنجی کررہا تھا۔ اور وہ سونے کی بنی مورت لگ رہی تھی۔

رات ہونے کو تھی اور سمندر پر جادو اترنے لگا تھا۔ معیز پر بھی یہ جادو اثر کرنے لگا۔

اس نے بے اختیار رباب کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے سامنے کیا۔
"آئم سوری ہنی۔" رباب کا دل عجیب سے انداز میں لرزا۔ وہ بہت سے مردوں کے ساتھ ڈیٹ پہ جاتی رہی تھی مگر ایسی اجازت اس نے کسی کو نہ دی تھی۔ اور یہاں وہ اجازت مانگ ہی کب رہا تھا۔ دندناتا ہوا دل میں گھسا چلا آرہا تھا۔

رباب نے اس کا دوسرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔ ڈوبتے سورج کے سامنے دو سائے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے شاید ایک دوسرے کے دل میں اترنے کو تھے۔
معیز کے موبائل کی رنگ ٹون نے انہیں حواس میں لا پٹخا۔
"ایسے موقعوں کے لیے ہی سائلنس کا آپشن رکھا گیا ہے سیل فون میں۔"
رباب جی بھر کے بد مزا ہوئی تو عون کا نام اسکرین پر جگمگاتے دیکھ کر معیز ہنستے ہوئے اس کی کال اٹینڈ کرنے لگا۔
"ہیلو۔" دوسری طرف وہ بہت پرجوش تھا۔
"یار! میں کل تجھے کہہ رہا تھا نا کہ وہ لڑکی مجھے دیکھی دیکھی لگ رہی ہے۔" معیز کے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ چلتے ہوئے رباب سے تھوڑے فاصلے پر ہو گیا۔
"کیا کہہ رہے ہو۔ کون سی لڑکی؟"
"وہی یار! جو کل رات تمہاری بزنس پارٹی میں دیکھی تھی۔"
"وہاں تو بہت سی لڑکیاں دیکھی تھیں۔" معیز نے رباب کو نگاہوں میں فوکس کرتے ہوئے بات برائے بات کہا۔ اس لمحے کا فسوں تھا کہ اس کا سارا دھیان رباب میں تھا۔ وہ بھی اسی کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔
"ارے یار! وہ جس نے کسی آدمی کو تھپڑ مار دیا تھا۔" عون نے کہا تو معیز کو مجبوراً "حاضر دماغ" ہونا پڑا۔
"ہاں۔ سیفی کی سیکریٹری تھی وہ۔"
"ہاں۔ ہاں۔ وہی۔" عون پرجوش لہجے میں بولا۔
"یار وہی لڑکی آج اسپتال میں دیکھی میں نے۔ خاصا تشدد کیا گیا تھا اس پر شاید۔"
"آگے بول۔ کیوں بے کار کا سسپنس ڈال کے میرا سنڈے خراب کر رہا ہے۔"
"وہ یار! یہ وہی لڑکی ہے جو بارش میں تیری گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ اور بعد میں تو اس کا پرس لوٹانے بھی گیا تھا۔"

عون نے کہا تو معیز کے ذہن کو لحہ بھر لگا حاضر ہونے کو۔ رباب کا چہرہ اس کی نظروں کی سامنے یک لخت ہی گم ہوا۔
"کیا۔ کیا کہا تم نے؟" وہ متوحش سا پوچھنے لگا۔
"ہاں یار! آج اسپتال میں اسے دیکھا تو مجھے یاد آیا۔ کل سے میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ رہا نہیں گیا تو سوچا تمہیں بتا دوں۔"

عون کہہ رہا تھا اور معیز احمد کو لگ رہا تھا جیسے اس کے قدم ریت میں دھنستے چلے جا رہے ہوں۔
"ابیہا مراد۔" وہ ایک بار پھر برے حالوں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ جیسے تین سال پہلے وہ ٹھٹھر سا گیا۔

عون کی بات سن کر معیز کے اعصاب کو شدید جھٹکا لگا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ابیہا مراد، سیفی جیسے شاطر اور اوباش آدمی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔

"تمہیں تو پتا ہے جب تک میرے ذہن کی الجھن سلجھ نہ جائے مجھے نیند نہیں آتی۔ وہ لڑکی میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ اسپتال میں اسے دیکھا تو یاد آگیا۔" عون نے فاتحانہ انداز میں بتایا اور معیز اس کی "الجھن سلجھاؤ" عادت سے اچھی طرح واقف تھا۔ بدقت خود کو سنبھال پایا۔
"ہو سکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔"
"بالکل نہیں۔ اس لڑکی نے ثانیہ کو اپنا نام ابیہا بتایا تھا۔ وہاں نرس سے کنفرم کیا تھا میں نے اسپتال والی لڑکی کا نام بھی ابیہا مراد تھا۔"
عون نے پُریقین انداز میں کہا تو وہ سُن رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

اور معیز احمد سے اب رات گزارنی مشکل تھی۔ ایک ان دیکھی آگ میں جلتے سلگتے اس نے کئی بار ذہن کو جھٹکا۔
"خیر۔ مجھے کیا بھاڑ میں جائے ابیہا مراد۔" مگر ہر "مجھے کیا؟" کے بعد اسے خیال آتا کہ اس لڑکی کے ساتھ اس کا کیا رشتہ تھا اور یہ کہ وہ اب سیفی جیسے بدقماش کے قبضے میں تھی۔
کمرے کے وسط میں کھڑے معیز نے طیش سے مٹھیاں بھینچیں۔
"یا اللہ۔ کیسا امتحان بن گئی ہے یہ لڑکی میرے لیے۔" اس کی غیرت جوش میں آنے لگی۔ وہ لڑکی مر جائے، گمنام ہو جائے، اسے منظور تھا۔ مگر وہ سیفی کے پہلو میں نظر آئے، وہ کسی طور برداشت نہیں کر سکتا تھا۔
اس کا شدت سے جی چاہا کہ مودی صاحب کو فون کرے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ کسی بھی طور سہی اسے قیامت کی یہ رات گزارنی ہی تھی۔ صبح ہی اس مسئلے کا کچھ حل نکل سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ صبح ہی صبح گاڑی اس کی رہائش گاہ کے سامنے کھڑی کیے محوِ انتظار تھا۔ اس نے گاڑی میں لگی گھڑی میں وقت دیکھا۔ وہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی آچکا تھا۔ مگر بہرطور یہ آدھا گھنٹہ اب گزر چکا تھا۔
اس نے دوبارہ گیٹ پر نظریں جمادیں۔
دس، پندرہ سیکنڈوں کے بعد چھوٹا گیٹ کھلا اور وہ باہر نکلی اور نکل کر اسی روانی سے چلتی گاڑی میں آکر نہیں بیٹھی۔ بلکہ پہلے تو سینے پہ بازو لپیٹ کر وہیں کھڑے ہو کر اس نے "ڈرائیور" کو خوب گھور کر دیکھا۔ ڈرائیور کے ہونٹوں پر خوب کھلی کھلی مسکراہٹ آگئی۔ وہ فوراً "اپنی سیٹ" چھوڑ کر نیچے اترا اور آگے سے گھوم کے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔
وہ بے حد کوفت زدہ سی سر جھٹکتی گاڑی میں آ بیٹھی تو وہ احتراماً ذرا سا سر جھکا کر دروازہ بند کر کے اپنی سیٹ پہ آیا اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ اپنا شولڈر بیگ گود میں رکھے وہ یوں ہی بازو لپیٹے سامنے اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔
عون نے کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے صلح جویانہ "اسٹارٹ" لیا۔

"اس وقت تم بالکل ایسے بچے کی طرح لگ رہی ہو جس کا آج اسکول میں پہلا دن ہو۔" ثانیہ نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی اور جب بولی تو انداز میں حد درجہ ناراضی تھی۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو مجھے کس بات کا غصہ ہے۔"

"وہ تو تمہاری بے وقوفی ہے نا۔ اس لیے میں تمہارے غصے کو سیریس نہیں لے رہا۔" عون نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھو۔۔۔ اگر میں جاب کر سکتی ہوں تو کنوینس کا انتظام مشکل نہیں تھا میرے لیے۔ تمہیں یہ نیا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" ثانیہ کو واقعی اچھا نہیں لگا تھا۔

ایک تو اس نے لندن نہ جانے کا ان چاہا فیصلہ کیا' دوسرے یہاں اپنی مرضی کی جاب ملی تو عون نے پھپھو سے واشگاف الفاظ میں کہا کہ چونکہ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے اس لیے وہ اس کے پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری خود نبھائے گا اور پھپھو تو گیا۔ اس رشتے میں پڑتی دراڑوں کے ڈر سے سب ہی نے عون کی اس آفر کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا تھا۔

مگر ثانیہ کا تو دل جل کر خاک ہی ہو گیا۔ جاب کے پہلے ہی دن کا آغاز ان چاہا ہوا تھا۔

"یہ نیا نہیں' بہت پرانا ڈرامہ ہے' بلکہ حقیقت۔۔۔ وہ تو تمہیں ہی اب پتا چلا ہے کہ حقیقت سے نظریں چرانے والے بہت گھاٹے میں رہتے ہیں۔" وہ آہ بھر کے بولا۔

"لیکن میں اپنی زندگی میں ڈسٹربنس نہیں چاہتی۔" ثانیہ جھنجلائی۔

"اچھا۔۔۔ یعنی میں نے تمہیں "ڈسٹرب" کرنا شروع کر دیا ہے۔" عون نے مسکراہٹ دباتے ہوئے بڑے ذو معنی انداز میں کہا تو ثانیہ کو جی بھر کے غصہ آیا۔ دل چاہا اپنا بیگ ہی اٹھا کے اس سر پھرے کے سر پر دے مارے۔

"عون پلیز بی سیریس۔"

"میں تو تمہارے معاملے میں بالکل سیریس ہوں۔ تم جانتی ہوں۔" وہ اس پر گہری نظر ڈالتے ہوئے اسی انداز میں بولا۔

بہار کے سارے رنگ ہی اس کے پیرہن میں نظر آتے تھے اور کھلتا ہوا زرد رنگ اس کے سونے جیسے روپ کو دمکا رہا تھا۔ یہ ایک محبوب کی نظر تھی۔ ایک چاہنے والے کی نظر اور اس نگاہ کو ثانیہ نے فی الفور محسوس کر لیا۔ وہ جز بز سی ہو کر زور سے بولی۔

"سامنے دیکھ کے گاڑی چلاؤ۔" عون زور سے ہنسا تھا۔

"اس پیار سے میری طرف نہ دیکھو۔ پیار ہو جائے گا۔" وہ گنگنا رہا تھا۔

"اسی لیے۔۔۔ اسی لیے میں تمہارے ساتھ آنا نہیں چاہ رہی تھی۔" وہ خفا تھی۔

"میرے راستے میں مت آؤ عون۔"

عون نے فرم کی شان دار عمارت کی پارکنگ میں گاڑی روکتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ بے حد سنجیدگی سے بولی اور دروازہ کھول کر گاڑی سے اترنے لگی تو عون نے اسی مسکراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں تمہارے راستے میں نہیں آ رہا ثانی۔ بلکہ تمہارا راستہ ہی میں ہوں اور میری منزل تم۔۔۔"

"چار دن میں عشق کا بھوت سر سے اتر جائے گا۔ میری طرف سے تم آزاد ہو عون عباس۔ جا کے اپنی زندگی جیو۔" وہ سلگی۔

"ابھی تمہارا آفس سامنے نہ ہوتا اور وہ بڑی تو ندو الا واچ مین ہمیں اتنے غور سے نہ دیکھ رہا ہوتا تو میں تمہاری اس آفر کا بہت خوب صورت جواب دیتا۔"

عون نے بڑے پُرسکون انداز میں کہا تو لب و لہجے کی ذو معنویت واضح تھی۔ ثانیہ نے نیچے اتر کر گاڑی کا دروازہ زور سے بند کیا اور پھر اس کی طرف دیکھے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

عون نے گہری سانس بھری اور طمانیت سے مسکراتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں معیز بیٹا۔" مودی صاحب اس کی بات پر ازحد حیران تھے۔ ایک تو وہ وقت سے پہلے ہی آفس آپہنچا تھا۔ اس پر اس کا اضطراب و بے چینی اس کی ہر ہر حرکت سے ظاہر تھی۔

"انکل پلیز۔ ٹائم ویسٹ مت کیجیے اور کل بلکہ کوشش کرکے آج ہی سیفی کے ساتھ میٹنگ رکھ لیں۔ میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" وہ حد درجہ عاجز تھا۔

"لیکن بیٹا! کوئی ریزن بھی تو ہو میٹنگ کا۔" مودی صاحب پریشان تھے۔

اور واقعی ان کی بات صحیح تھی۔ اگر فون کرکے میٹنگ کا ٹائم لیا جاتا تو پھر کچھ وجہ بھی تو بتانی پڑتی میٹنگ کرنے کی۔ معیز خالی الذہنی کیفیت میں انہیں دیکھنے لگا۔

"کیا آپ ان کے کنٹریکٹ میں انٹرسٹڈ ہیں؟" مودی صاحب نے خود ہی پوچھنا چاہا۔

معیز نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔ پھر دفعتاً" جیسے اسے خیال آیا۔ اس طرح بے سروپا گفتگو کرکے وہ مودی صاحب کو بھی الجھا رہا تھا۔

"ایکچوئلی میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اور بس۔ آپ پی اے سے کہیں آج یا کل کا کوئی ٹائم لے اس سے۔ وہ ریزن نہیں پوچھے گا مودی صاحب۔"

مودی صاحب سمجھ دار انسان تھے۔ لمبی سانس کھینچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر کچھ یاد آنے پہ پوچھا۔

"اس میٹنگ میں۔۔۔ میں آپ کے ساتھ ہوں گا؟"

"نہیں مودی صاحب۔" وہ فی الفور بولا۔ "یہ نان آفیشل میٹنگ ہے۔"

"اوکے۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں ابھی آپ کو انفارم کرتا ہوں۔"

مودی صاحب کے جانے کے بعد معیز نے گہری سانس بھرتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

رات وہ بمشکل کچھ دیر ہی سو پایا تھا۔ ابھی بھی اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔

مگر ایک ہمارا دنا مصیبت اس کے اعصاب پر ایسی سوار تھی کہ کسی کروٹ چین نہ پڑ رہا تھا۔

مودی صاحب نے آفس لائن پہ تھوڑی دیر بعد کال کی۔

"سیفی کے ساتھ میٹنگ طے ہوگئی ہے۔ بلکہ اس نے لنچ پہ انوائیٹ کیا ہے آپ کا نام سنتے ہی۔"

معیز کے تنے ہوئے اعصاب قدرے سکون میں آئے۔

"اوکے مودی صاحب تھینک یو۔" وہ متشکر ہوا۔

مودی صاحب نے لائن کاٹ کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ ان کے چہرے پر ہلکی سی تفکر کی لکیریں تھیں۔

امتیاز احمد ایک تجربہ کار بزنس مین تھے۔ وہ سیفی جیسے کئی اور کو بھی بڑی سمجھ داری سے ساتھ لے کر چلتے تھے۔ مگر معیز احمد جیسے نو آموز کو تو سیفی جیسا شاطر بندہ چٹکیوں میں اڑا دیتا۔

☼ ☼ ☼

اس نے بہت سوچ سمجھ کر عون کو ساتھ لیا۔ حالانکہ اس نے بہتیرے ہاتھ جوڑے۔

"بلکہ تم کہو تو کان بھی پکڑ لیتا ہوں۔ اس روز بزنس پارٹی سے جو "بزنس" کا تجربہ حاصل ہوا' وہ اگلے پانچ سالوں

تک بزنس کرنے کے لیے کافی ہے۔" اس نے باقاعدہ کان پکڑ کے بھی دکھا دیے۔

پُرسکون بیٹھا رہا۔ تحمل سے اس کی اداکاری دیکھی۔

"بس۔۔۔ ختم ہوگئی تمہاری بکواس؟"

"پر میں ہی کیوں؟ مودی صاحب کو لے جاؤ یار۔ کوئی اچھی سی بزنس ٹپ ہی دے دیں گے۔"

وہ اچھا خاصا اڑیل گھوڑا تھا۔

"یہ بزنس میٹنگ نہیں ہے۔"

وہ ٹیبل پر سے اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ یعنی یہ اب اٹھنے کا اشارہ تھا۔ عون ٹھٹکا پھر طنزاً" بولا۔

"تو پھر کون سا تجربہ حاصل کرنے جا رہے ہو۔ معاف کرنا مودی صاحب نے کچھ خاص اچھا نہیں بتایا اس بندے کے متعلق۔"

"ہم اس سے اس لڑکی کا پوچھنے جا رہے ہیں۔" معیز نے عون کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ متحیر ہوا۔

"کون سی لڑکی؟"

"وہی۔۔۔ جسے وہ اس رات پارٹی میں لایا تھا۔"

معیز کا انداز اسے بہت بہکا سا لگا۔ عون الجھا۔

"کم آن معیز۔ میں نے تمہیں بتا تو دیا تھا۔ اس رات وہی روڈ ایکسیڈنٹ والی لڑکی اس کے ساتھ تھی۔"

"وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ سیفی کے ساتھ کس حیثیت میں رہ رہی ہے۔" معیز کا لہجہ یک لخت تیز ہوا اور چہرے کی رنگت بدلی تھی۔

"مائنڈ یو مسٹر معیز احمد!" ٹیبل کی سطح پر ہلکا سا مکا مارتے ہوئے عون آگے کو جھکا۔ "اور یہ ساری انویسٹی گیشن ہم کس رشتے سے کریں گے اور کیوں؟" اس کے لہجے میں استہزا تھا۔

"وہ سب میرا مسئلہ ہے عون۔ باقی کا کیس وہاں جا کے حل کرلینا۔ اب اٹھ جاؤ۔ ہم آل ریڈی لیٹ ہیں۔"

عون حیران ہوا۔ معیز کے انداز نے اسے سنجیدہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

"یعنی ہم محض اس لڑکی کی خاطر اس شخص سے ملنے جا رہے ہیں؟" اسے جیسے یقین کرنے میں دشواری تھی۔

"ہاں۔۔۔ وہ ابو کی کزن کی بیٹی ہے۔" معیز نے یک لخت کچھ اس انداز میں بتا دیا کہ عون کے پاس مزید بحث کرنے کا کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ مگر وہ پھر بھی کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"تو پھر ایکسیڈنٹ والے روز تم نے کیوں نہ بتایا اور اس کے سامنے بھی نہیں گئے؟"

معیز اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹیبل کی سطح پر سے گاڑی کی چابیاں اور موبائل اٹھاتے ہوئے بولا۔

"ہمارے فیملی ریلیشنز (تعلقات) اتنے اچھے نہیں' ابھی بھی میں اسے سیفی کے ساتھ نہ دیکھتا تو۔۔۔" وہ کہتے کہتے لب بھینچ گیا۔

عون نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اسے معیز کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی اور سوجن دکھائی دی۔

"اور پھر ابو اپنی وصیت میں اس کے نام بھی کچھ حصہ چھوڑ گئے ہیں اور میں حق دار کو اس کا حق پہنچانا چاہتا ہوں۔"

معیز نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے باہر کی راہ لی تو سر ہلاتے ہوئے عون بھی اس کے پیچھے بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"میری سمجھ میں تو یہ لڑکا نہیں آتا۔ زندہ ماں سے زیادہ مرے ہوئے باپ سے محبت اور ہمدردی ہے اسے۔"

سفینہ کڑھتے ہوئے بولیں۔ تو ناخن فائل کرتی زارا چونکی۔

"کس کی بات کر رہی ہیں ماما؟"

"معیز کی اور کس کی کروں گی۔ وہی ہے جو اپنے باپ کی بیوہ کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔"

سفینہ کے لہجے میں زہر تھا اور یہ زہر صالحہ کی بیٹی ایبہا مراد کے لیے تھا۔

"ایک لحاظ سے تو اس سلسلے میں بھائی ٹھیک ہی کر رہے ہیں ماما۔ اسے اس کا حصہ دے کر ایک مذہبی فریضہ ادا ہو جائے گا۔ ابو تو ہیں نہیں کہ وہ آکے یہاں رہنے لگے گی۔ حصہ دے کے چلتا کریں گے اسے۔"

زارا نے غیر جانب داری کا مظاہرہ کیا۔ جو انہیں بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ تیز لہجے میں بولیں۔ "ایسے ہی دے دیں گے حصہ۔ اس کے باپ کی نہیں بلکہ تمہارے باپ کی کمائی کا ہے یہ حصہ۔"

"یہ مت بھولیں کہ ابو ہی نے اپنی کمائی میں سے اس کے لیے یہ حصہ چھوڑا ہے۔ بہر حال اس پر ہمارا حق نہیں ہے۔" ایزد ابھی آیا تھا۔

اس نے بھی گزشتہ مہینوں میں اس بارے میں غیر جانب داری سے سوچا تو یہی سمجھ آیا کہ حق دار کو اس کا حق ملنا چاہیے۔ خواہ وہ دوست ہو یا دشمن۔

"بس کرو تم لوگ۔ بھائی کی زبان بولنے لگے ہو۔ مذہب تو جیسے تم ہی لوگوں نے پڑھ رکھا ہے۔ ارے میرے بچوں کا حق کھائے گی وہ ڈائن۔ خود تو مر گئی' بے حیا اپنی بیٹی کو چھوڑ گئی مرتے دم تک میرے سر پہ ناچنے کے لیے۔" سفینہ اس موضوع پر یوں ہی جذباتی ہو جایا کرتی تھیں۔

"مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آتا ماما۔ ابو کو کیا سوجھی اس عمر میں۔ میری عمر کی لڑکی سے شادی کر لی۔" زارا کی آنکھوں میں نمی چمک اٹھی۔

محبت کرنے والے باپ کے متعلق ایسی بات کرنا بھی اسے گناہ لگتا تھا۔ مگر وصیت کے بعد تو جیسے سارا معاملہ ہی کھل کے سامنے آگیا تھا۔

"اب کیا کہوں میں۔ زندہ ہوتے تو لڑتی ان سے۔ اب مرے ہوئے سے کیسے گلے شکوے کروں۔ میرا تو سارا مان' سارا غرور مٹی میں ملا گئے امتیاز احمد۔" سفینہ رو دیں۔

ایزد نے ان کے شانوں پہ بازو پھیلا کر تسلی دی۔

"ابو کو کچھ مت کہیں ماما۔ بھائی نے بتایا تو تھا کہ وہاں حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ ابو کو نکاح جیسا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس لڑکی کا باپ جواری تھا۔ بیچ رہا تھا اپنی لڑکی کو۔"

"میری طرف سے سو دفعہ بیچتا اسے۔ امتیاز احمد نے بھی تو رقم چکائی تھی' کوئی اور چکا کے لے جاتا میری بلا سے۔" وہ نفرت سے بولیں۔

"کم آن ماما۔ ریلیکس۔ فی الحال تو وہ لڑکی ہمارے آس پاس کہیں نہیں ہے۔ اس لیے ٹینشن مت لیں۔" ایزد انہیں ٹھنڈا کرنے لگا۔

زارا کے موبائل پر رباب کی کال آنے لگی تو وہ اٹھ کے اپنے کمرے میں آگئی۔ یہ معاملہ ابھی تک گھر ہی کے لوگوں کے علم میں تھا۔ زارا کی سسرال کو تو ایبہا مراد اور صالحہ کی بھنک بھی نہ پڑنے دی گئی تھی۔

"کیسی ہو۔؟" رباب کی فریش سی آواز نے ہمیشہ کی طرح زارا کے اعصاب کو پر سکون کیا۔

سفیر نے اسے بتایا تھا کہ رباب اس سے کتنی خوش ہے اور ظاہر ہے سفیر بھی خوش تھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔ مگر تم کتنے دنوں سے نہیں آئیں' کہاں گم ہو۔" زارا نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور بستر پہ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز ہو گئی۔

"بس یہ۔ اگیزیمز کی تھکاوٹ اتار رہی تھی اور معیز کو دیکھو۔ ایک بار بھی جو فون کیا ہو۔ زبردستی لانگ ڈرائیو پہ لے گئی تھی میں اور بس۔" رباب نے شکوہ کیا۔

"بس یار۔ وہ مصروف ہی اتنے رہتے ہیں۔"

"اچھا۔ وہ اس کے دوست کی کزن مل گئی کیا؟" رباب کو یاد آیا۔

"کون سی کزن' کون سا دوست؟" زارا کو کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔

"اس کے دوست کی کزن میرے ہی کالج بلکہ میری کلاس میں تھی۔ پھر کچھ پرابلمز کا شکار ہو کر وہ فیس نہیں دے پائی تو کالج سے چلی گئی۔ اسی کا معیز مجھ سے پوچھنے آیا تھا پچھلے دنوں۔" رباب نے اسے تفصیل بتائی۔

"اچھا۔ ہو گا کوئی۔ البتہ دوست تو ان کے صرف عون بھائی ہی ہیں۔" زارا کے لیے یہ گفتگو معمولی تھی۔

"ہاں۔ شاید انہی کی کزن تھی۔ کچھ زیادہ ہی برے حالات ہو گئے تھے بے چاری کے۔ اسی لیے اگیزیمز کی فیس بھی نہیں دے پائی اور اب پتا نہیں کہاں دھکے کھا رہی ہو گی۔"

"اچھا۔ عون بھائی تو اچھے خاصے ویل اسٹیبلشڈ بندے ہیں۔" زارا نے حیرت کا اظہار کیا۔

"لیکن اس کے حالات تو کافی سے زیادہ ہی برے تھے۔ ہاں پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ بلکہ میرے ساتھ تو باقاعدہ کمپیٹیشن چل رہا تھا اس ایبہا مراد کا۔" رباب بڑی فرصت کے عالم میں تھی۔ تب ہی بات سے بات نکالتی جا رہی تھی یا شاید اس روز معیز کا ایبہا کے متعلق پوچھنا اس کے ذہن کے کسی گوشے میں اٹک گیا تھا۔

"ایبہا مراد۔؟" زارا کو کرنٹ سا لگا۔ وہ بے اختیار سیدھی ہو بیٹھی۔

"ہاں۔ ایبہا مراد۔ تم جانتی ہو اسے؟" رباب نے پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی۔

"نہیں۔ ایکچوئلی نام ہی سنا ہے اس کا۔ ابو کی کسی دور پار کی کزن کی بیٹی بھی ہے وہ شاید۔" زارا بے اختیار کچھ کا کچھ کہہ گئی۔

"اچھا۔ تو معیز اسے کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟" رباب کے یقیناً "کان کھڑے ہوئے تھے۔

"یہ تو اب وہ جانیں اور عون بھائی۔ شاید عون بھائی ہی نے کہا ہو ان سے۔" زارا سے اب بات نہ بن پا رہی تھی۔ مگر رباب پر بہر حال یہی تاثر پڑا کہ عون بھی ان کا دور پار کا ہی سہی مگر رشتہ دار ہی ہے۔

"اینی وے۔ اس کے جانے کے بعد میری پوزیشن تو پکی ہے۔" رباب مطمئن تھی۔ زارا نے موضوع بدلتا دیکھ کر گہری سانس بھری تھی۔



سیفی نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔

"نائس ٹو میٹ یو مسٹر معیز۔ مجھے یقین تھا کہ آپ اپنے والد صاحب کے احباب کی قدر کریں گے۔" وہ بڑے تیقن سے کہہ رہا تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ چلتا معیز اس کے آفس کی طرف بڑھتا اس کے اسٹاف کا جائزہ لے رہا تھا۔

"یہ تو زیادتی ہو گئی سیفی صاحب۔ کوئی حسین و جمیل سیکریٹری تو رکھی ہوتی آپ نے۔ جو ہمیں دروازے سے ریسیو کر کے آپ کے آفس تک پہنچاتی۔ میں تو اسی آس میں آیا تھا۔" عون نے نشانہ سیدھا نشان پہ مارا۔ تو سیفی اپنے مخصوص بھدے انداز میں قہقہہ لگا کر بولا۔

"ارے بے فکر رہو۔ ہم نے بھی سیکریٹری نامی حسین بلا پال رکھی ہے۔ بس اس کا ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ کل پرسوں تک آجائے گی۔"

"پھر رونق بڑھے گی آپ کے آفس کی۔" وہ دونوں سیفی کے کمرے میں داخل ہوئے۔
"ارے رونق کیا وہ تو پورا ماحول جگمگا دے گی۔ اتنی خوب صورت ہے وہ۔" سیفی کے انداز میں ایک حسرت سی تھی۔

"انٹرویو کے ذریعے سلیکٹ کیا ہے آپ نے اسے؟" یہ معیز کا پہلا سوال تھا۔ "نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ کہیں سے تحفہ ملا ہے ہمیں۔ مگر بہت ہی نایاب۔۔۔" وہ آنکھ دبا کر بے تکلفی سے بولا۔
"تم لوگوں نے دیکھا ہو گا اسے۔ پارٹی میں میرے ساتھ۔" وہ ان لوگوں کے سوالوں سے ان کی کیٹگری کا اندازہ لگا رہا تھا۔

"ہکچوئیلی معیز بھی ایک اچھی سی سیکریٹری رکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے آپ سے ٹپس لے رہے ہیں۔"
عون کو اس کی سوچ کا اندازہ ہو رہا تھا۔
تب ہی اس نے معیز کو سنبھالا دیا۔ "ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ضرور ٹپس دوں گا۔ پہلے میرے خیال میں ایک ایک ڈرنک ہو جائے' دوستی کے نام پہ؟"
سیفی کو شکار جال میں پھنستا نظر آ رہا تھا اور کھرا سیدھا ابیہا مراد کی طرف جا رہا تھا۔
"تو تھینکس۔۔۔ ہم۔۔۔ "فی الحال" یہ شوق نہیں رکھتے۔" عون اس کا اشارہ سمجھ کر بو کھلا کر بولا۔ "کولڈ ڈرنک ہی چلے گی۔" انتہائی خوب صورتی سے ڈیکوریٹ کیے گئے سٹنگ روم میں ان کی جوسز سے تواضع کی گئی۔
"اب اصل بات کی طرف آئیں سیفی صاحب! یہ سیکریٹری وغیرہ جیسی فضولیات تو بس تمہید میں آ گئیں۔"
معیز نے یک لخت ہی پینترا بدلا۔
"ارے نہیں جناب! اگر آپ چاہیں تو آپ کے آفس میں بھی ایسا ہی خوب صورت بندوبست ہو سکتا ہے۔"
وہ ہنسا۔
"لیکن میں ان فضولیات میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔ آپ کو پتا ہو گا میرے فادر نے آفس میں لیڈیز کا شعبہ الگ رکھا ہے مردوں سے۔" معیز نے خشک لہجے میں کہا۔ پھر موضوع پر آ گیا۔
"مجھے پتا چلا ہے کہ آپ ہمارا مال اٹھا کر بعد میں اپنے مونوگرام کے ساتھ مارکیٹ میں چلا رہے ہیں؟" سیفی سنبھل کر بیٹھا۔
"بہت سی کمپنیاں ایسا ہی کرتی ہیں۔"
"دیکھیں سیفی صاحب! ہم اس مارکیٹ میں اپنی پروموشن کے لیے بیٹھے ہیں نہ کہ آپ کی۔ اب آپ اصل پہ نقل کا لیبل لگا کے بیچیں گے تو کیا گارنٹی ہے کہ اس کی کوالٹی میں بھی فرق نہ ہو گا؟"
"ایسا کچھ نہیں ہے اور پھر اس سے پہلے امتیاز اینڈ سنز سے کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی ہمیں۔" سیفی شاید لنچ کی اس دعوت کو دے کر پچھتا رہا تھا۔
"آپ ہماری کمپنی سے مال اٹھا کر جس قیمت پہ بیچ رہے ہیں' وہ ڈبل ہے۔ جانتے ہیں نا آپ؟" معیز نے طنز کیا۔

"دیکھیں۔۔۔ لوگوں کو مناسب لگتا ہے تو وہ خریدتے ہیں نا۔" سیفی نے اپنا دفاع کیا۔
"لیکن اس سے ہماری کمپنی کی ساکھ کو نقصان پہنچ رہا ہے مسٹر سیفی۔" معیز نے خشک لہجے میں کہا۔
"کوالٹی اور قیمت میں فرق کی شکایات آپ کو نہیں ہماری کمپنی کو ملتی ہیں۔ یہ شاید آپ کے علم میں نہیں۔"
"دیکھیں معیز صاحب۔ آپ ابھی اس فیلڈ میں نئے ہیں۔ آپ کے والد محترم کے ساتھ میں کئی برسوں سے کام کر۔۔۔"

سیفی نے صفائی پیش کرنا چاہی مگر معیز تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ گیا۔
"یہ سب نوٹس مجھے ان ہی کی ڈائری میں سے ملے ہیں سیفی صاحب۔ اور کوئی جواز؟"
سیفی کے پاس واقعی نہ کوئی جواز بچا تھا اور نہ ہی جواب۔
جبکہ عون دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا معیز کو یوں پینترا بدلتے دیکھ رہا تھا۔ گھر سے وہ کچھ کہہ اور سوچ کے نکلا تھا اور یہاں آ کے وہ اور ہی کھاتے کھول کے بیٹھ گیا تھا۔ مگر فی الحال زبان کو بند رکھنے ہی میں عقل مندی تھی۔ سو وہ وہی کر رہا تھا۔



واپسی پر گاڑی میں وہ اس سے خوب الجھا۔
"یہ تم وہاں ابیہا مراد کے متعلق انفارمیشن لینے گئے تھے یا اس کی جھاڑ پونچھ کرنے؟"
"تو لی نا انفارمیشن۔۔۔ وہ اسی کے پاس ہے۔" معیز سنجیدگی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔
"اور یہ بعد میں جو سلسلہ تھا وہ؟" عون نے نکتہ اعتراض اٹھایا۔
"تمہارا کون سا ہونے والا سسر تھا جو تمہیں اتنا غصہ آ رہا ہے۔" معیز نے اسے گھور کر دیکھا۔
"اللہ نہ کرے۔" عون کا دل سہم گیا۔ "خبیث انسان! تجھے پتا ہے میں ثانی کے علاوہ خواب میں بھی کسی اور کا سوچ نہیں سکتا۔"
"اور وہ خواب میں بھی تیرے بارے میں نہیں سوچ سکتی۔" معیز نے لطف لیا۔ عون چند ثانیے اسے گھور گھور کے دیکھتا رہا۔ پھر تھک کر سیٹ پر سیدھا ہو بیٹھا۔
"اب خود ہی بتا دو اس ساری فضول میٹنگ کا مقصد' جس میں صرف کھانا ہی اچھا تھا۔ وہ بھی اس شخص نے تکلفاً "کھلا دیا۔ ورنہ جوتے کھانے کے بعد کون کھانا کھلاتا ہے کسی کو۔"
وہ درحقیقت چڑا ہوا تھا۔
معیز کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ "میں وہاں ابیہا مراد کا پتا کرنے گیا تھا۔ میں اسے ہر قیمت پر وہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں اسے ٹریپ کر کے سیفی کے پاس بھیجا گیا ہے۔"
"ہاں تو بات کرتے نا۔۔۔ کہ میری کزن کو میرے حوالے کرو۔" عون نے کھا جانے والے انداز میں کہا۔
"تمہیں لگ رہا تھا کہ وہ "یوں ہی" اسے ہمارے حوالے کر دے گا؟" معیز نے بڑے تحمل سے پوچھا۔ عون ٹھنڈا پڑ گیا۔
"یہاں کوئی حکمت عملی اپنانی پڑے گی۔ ایسی کہ کسی کو ہم پر شک بھی نہ ہو اور وہ لڑکی بھی وہاں سے نکل آئے۔"
معیز کا انداز پُرسوچ تھا۔



"پتا نہیں اللہ نے اس دنیا میں بے وقوف کیوں بھیجے ہیں اور ناشکرے۔۔۔ تم جیسے۔" حنا مسلسل برہمی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔
سیفی سے مار کھانے کے بعد ابیہا کی حالت بہت بری تھی۔ مگر حنا نے خدا ترسی دکھا ہی دی کہ اتنے دنوں تک کسی دوست ہی کی طرح اس کا خیال رکھا' جب تک کہ اس کے زخموں پر کھرنڈ نہ آ گئے۔
سیفی نے بہت بے دردی سے اسے پیٹا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ مجھے تمہاری طرح عقل مندی کے ساتھ اپنی عزت کو بزنس بنا لینا چاہیے اور اس کے بدلے جو پیسہ ملے وہ وصول کرکے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے؟"

ایپھا نے پھنکارتے ہوئے یک لخت ہی کہا تو حنا جھٹکے سے اٹھ گئی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔" اس نے سنبھلتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"یہ صرف تم ہی کر سکتی ہو۔" ایپھا نے ماتھے پر حنا کی لگائی بینڈیج اتار کر پھینکتے ہوئے نفرت سے کہا۔ "میں جب تک احتجاج کر سکتی ہوں کروں گی جہاں تک میرے اللہ نے میرے اختیار کی حدیں رکھی ہیں اگر میں وہاں تک ہاتھ پاؤں مارے بغیر خود کو حالات کے حوالے کردوں تو تف ہے میری بشریت پر۔"

"ہنہ۔ یہ نام نہاد عزت فاقے تو دے سکتی ہے مگر دو وقت کی روٹی نہیں۔" حنا نے طنز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو سن لو۔ میں عزت کی خاطر بھوکا مرنا پسند کروں گی۔" وہ چیخی۔

"شٹ اپ۔" حنا نے غصے سے اسے دیکھا۔ "میری تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میم تمہیں اتنی چھوٹ کس خوشی میں دے رہی ہیں۔ کسی ڈرائیور یا مالی کے آگے ڈالا ہوتا تو پھر میں دیکھتی تمہاری زبان سے کیسے یہ "صوفیانہ" کلام نکلتا ہے۔"

حنا کے انداز میں حقارت تھی۔ اس کے باعزت ہونے کے لیے اپنی نسائیت کی حفاظت کے لیے نفرت تھی۔ جانے کیسی مردہ ضمیر لڑکی تھی وہ۔



عون کو جیسے کرنٹ لگا۔

وہ اچھل ہی تو پڑا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو یار۔ نشے میں تو نہیں ہو؟" معیز آج اس کے ریسٹورنٹ میں لنچ کے لیے آیا تھا۔ عون نے بڑے لاڈ اور شوق کے ساتھ اپنے بہترین دوست کے ساتھ ایک ہی ٹیبل پہ بیٹھ کے کھانا کھایا اور اب اس کی بات نے ایک دم ہی دماغ گھما دیا تھا۔ "میں سوچ رہا تھا ثانیہ بھابھی کو سیفی کے آفس میں جاب کے لیے بھیجا جائے۔" معیز نے اطمینان سے کہا اور پانی پیتے عون کو اچھو لگ گیا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔ میری بیوی کو اس بے غیرت اور بے حمیت شخص کے آفس میں۔" عون کا دانت پیس پیس کر برا حال تھا۔

"نانسنس۔ میں تم سے اجازت نہیں لے رہا۔ صرف ڈسکس کر رہا ہوں۔ اجازت تو میں بھابھی سے لوں گا۔" معیز نے آرام سے اسے اس کی "حیثیت" جتائی۔

"خبردار معیز! ایسا کچھ مذاق میں بھی مت کہنا جس سے ثانی پر کوئی حرف آئے۔" عون بے حد سنجیدہ تھا۔

"وہاں سے اس لڑکی کو نکالنے کا یہی ایک طریقہ ہے میرے پاس۔" معیز بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"ہم اسے ٹریپ کرکے وہاں سے نکال سکتے ہیں۔" عون نے اعتراض کیا۔

"ان پانچ دنوں میں۔ میں واچ کر چکا ہوں۔ پرسوں سے اس نے آفس آنا شروع کیا ہے اور ڈرائیور اسے اندر تک چھوڑ کے جاتا ہے۔" معیز نے اس کا پلان مسترد کر دیا۔

"اور بھی کئی طریقے ہیں معیز۔"

"میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا ہوں۔ سیفی کو علم نہ ہو کہ ایپھا کو وہاں سے میں نے نکالا ہے۔ ایسے لوگوں کے

لیے کسی کی فیملی یا عزت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔" معیز نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اور تو وہاں میری بیوی کو بھیج رہا ہے۔ حد ہو گئی یار۔۔۔" وہ برہم ہوا۔

معیز نے اسے بغور دیکھا۔ "میں شاید غلط بندے کے پاس پہلے آگیا۔ مجھے پہلے بھابی سے بات کرنا چاہیے تھی۔"

عون نے چونک کر اسے دیکھا۔

معیز اپنے سیل فون پر کوئی نمبر ملا رہا تھا۔

"ثانی کو کال کر رہے ہو؟" معیز نے محض اثبات میں سر ہلایا۔

"یہاں بلا رہا ہوں۔"

"وہ کبھی نہیں آئے گی۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

عون کے خفا خفا سے لہجے میں یقین تھا۔ آج سنڈے تھا۔ وہ گھر پہ ہی ہوتی۔ مگر اس کے ریسٹورنٹ پہ تو کبھی بھی نہ آتی۔ مگر پھر عون نے دیکھا کہ آدھے گھنٹے کے بعد وہ وہاں موجود تھی۔

دونوں کو مشترکہ سلام کرنے کے بعد وہ معیز کی طرف یوں متوجہ ہو گئی جیسے عون وہاں موجود ہی نہ ہو۔

معیز نئے سرے سے الفاظ ترتیب دینے لگا کہ ثانیہ کو کن الفاظ میں سارا مسئلہ بتایا جائے۔ عون منہ پھلائے بیٹھا رہا۔

✲ ✲ ✲

اس نے شاید قسمت سے ہار مان لی تھی۔ بے حسی کا لبادہ اوڑھ لینا بھی تو قسمت سے ہار مان لینا ہی ہوا کرتا ہے۔

میم اور حنا اسے ہر وقت اس کے حسین سراپے کی "قیمت" بتاتی رہتی تھیں۔ وہ شرم سے گڑ گڑ جاتی۔ مگر اس کی زبان لڑکھڑا جاتی۔ وہ کہہ نہ پاتی حنا! اس جسم کے پردے کے بدلے جنت ملے گی۔

اس دنیا میں اس جسم کی قیمت پیسہ اور اگر اس کی آبرو کی حفاظت کی تو جنت۔۔۔

مگر وہ بیوپاریوں میں آن پھنسی تھی۔

یہ فرعون وقت تھے۔ دنیا کو جنت سمجھنے میں ہر "پھل" کا مزہ چکھنے کی ہوس میں مبتلا۔

سیفی نے اسے اس قدر مارا۔ شاید میم نے اس سے جو فاصلہ رکھنے کی تنبیہہ کی تھی' اسی کا غصہ سیفی نے نکالا ہو بہانے سے۔

اب وہ چپ کر کے آفس آجاتی۔ گندی نگاہوں کو اپنے وجود پر رینگتے محسوس کرتی۔ اللہ کے نام کا دل ہی دل میں ورد کرتی اور اپنی چیخوں کا گلا گھونٹتی رہتی۔ اسے اپنی مری ہوئی ماں کی یاد آتی۔

نی مائے' کتنی بھولی تھی تو۔

اپنی طرف سے تو مجھے کتنے محفوظ ہاتھوں میں سونپ کے گئی تھی۔ مگر دیکھ' ان ہاتھوں کی لاپروائی۔ دیکھ ماں! کتنی آسانی سے انہوں نے مجھے کھو دیا۔ دنیا کی بھیڑ میں گم کر دیا۔

یا شاید بھیڑیوں کے بھٹ میں۔۔۔ دروازہ بجا تو وہ اذیت ناک سوچوں سے بمشکل نکلی۔

"مے آئی کم ان میم۔۔۔" کوئی پیاری سی لڑکی دروازہ نیم وا کیے چہرہ اندر ڈالے پوچھ رہی تھی۔

"یس۔۔۔" وہ پل بھر میں خود کو "سمیٹ" کر دنیا دار ایبہا بن گئی۔

"بیٹھیے۔" ایبہا نے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"بکھ جو تلی۔۔۔ مجھے پتا چلا تھا کہ آپ کے آفس میں لیڈیز کے لیے کسی جاب کی ویکنسی نکلی ہے۔ اسی سلسلے میں ٹرائی کرنے آئی ہوں میں۔"

وہ بے تکلفی سے گویا ہوئی تو ایبہا الجھی۔ بغور اسے دیکھا۔ پھر معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

"سوری! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں کوئی ویکنسی نہیں ہے۔"

"اچھا۔۔۔" وہ لڑکی مایوس ہوئی۔ ایبہا کا ذہن تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس لڑکی سے وہ شاید پہلے بھی کہیں مل چکی تھی۔

پھر اس لڑکی نے ایبہا کو دیکھا اور مسکرا دی۔

"آپ کو یاد ہے' میرے کزن کی گاڑی سے آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔"

آف۔ ایبہا کا پھوٹ پھوٹ کے رونے کو جی چاہا۔ اسے یاد آگیا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو ایکسیڈنٹ کے بعد اسے ہاسٹل تک ڈراپ کر کے گئی تھی۔

اور اسی ایکسیڈنٹ نے ایبہا کی زندگی کو ایک بند اور تاریک گلی میں لا کھڑا کیا تھا۔

نہ اس کا ایکسیڈنٹ ہوتا' نہ اس کا پرس گم ہوتا اور نہ وہ کالج اور ہاسٹل سے نکالی جاتی۔

بہت ضبط کرتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

✲ ✲ ✲

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا معیز۔۔۔ کہاں سے ڈھونڈ لیا تم نے اس ناگن کی بیٹی کو۔"

سفینہ کا تو سن کر دماغ ہی گھوم گیا۔ معیز نے ایبہا کے کسی بھی دن آجانے کی اطلاع دی اور ملازم سے انیکسی کی صفائی کا کہا تو وہ اس پر الٹ پڑیں۔

"ریلیکس ماما۔۔۔ کام ڈاؤن۔" معیز نے انہیں شانوں سے تھاما۔ انہوں نے معیز کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"میری زندگی کو مزید امتحان مت بناؤ معیز! ساری عمر تمہارے باپ کی "محبوبہ" نے تڑپایا ہے مجھے۔" سفینہ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"ہم اسے صرف اس کا حق دے رہے ہیں ماما۔ اسے آلینے دیں۔ ہم اسے پیسہ دے کر اس کا حصہ خرید لیں گے۔ پھر وہ یہاں سے چلی جائے گی۔"

معیز نے انہیں بھرپور تسلی دی تو اریز نے بھی اس سے اتفاق کیا۔

"بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں ماما! ہم کیوں غاصب کہلائیں اور اللہ کا شکر ہے' ہمارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ جو ہم اس کے حصے کو ہڑپنے کا سوچیں۔"

"بس تھوڑے دنوں کی بات ہے ماما! ذرا سا صبر اور برداشت سے کام لیں۔ وہ خود ہی چلی جائے گی۔ یہاں کس کے پاس رہنا ہے اس نے۔"

معیز آہستہ آہستہ ان کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

"اس ایکسیڈنٹ کو میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ اسی کی وجہ سے تو میں آج یہاں موجود ہوں۔" نا چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز بھرا گئی۔

"میرا نام ثانیہ ہے۔ آئم سوری' اگر ہماری وجہ سے آپ کے ساتھ کچھ برا ہوا ہو تو۔۔۔" ثانیہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"سنیں۔۔۔ آپ کسی امتیاز احمد کو جانتی ہیں؟" دفعتاً" آگے جھکتے ہوئے ایہا نے سرگوشی میں پوچھا۔ وہ خوف سے اندرونی کمرے میں کھلنے والے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔

ثانیہ گڑبڑائی۔ "نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرے کزن کا نام تو عون ہے۔ عون عباس۔"

"م۔۔۔ میں گم ہو گئی ہوں۔ مطلب۔۔۔ میرے گھر والے۔۔۔ میں ان سے بچھڑ گئی ہوں اور اب ان لوگوں کے قبضے میں ہوں۔"

وہ بعجلت اسے بتا رہی تھی۔ ثانیہ گنگ رہ گئی۔ ایہا کی آنکھوں کا خوف زدہ سا تاثر اور آواز سے جھلکتے نوحے۔۔۔ وہ بخوبی دیکھ اور سن رہی تھی۔

اسی وقت اندرونی دروازہ کھلا اور کوئی تیز قدموں سے چلتا ثانیہ کی پشت پر آ کھڑا ہوا۔

اس نے ایہا کو کھڑے ہوتے دیکھا۔

"کب سے ڈائری لے کر آنے کا کہا ہوا ہے تمہیں اور تم یہاں بیٹھی گپیں لڑا رہی ہو۔۔۔ کون ہیں یہ محترمہ؟" بڑے تیز اور کڑوے لہجے میں کسی نے آتے ہی چڑھائی کر دی۔ یقیناً" ایہا کا باس ہو گا۔

ثانیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ جاب کے سلسلے میں آئی ہیں۔ مگر میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ ہمارے ہاں کوئی ویکنسی نہیں ہے۔" ایہا نے جلدی سے کہا۔ مبادا ثانیہ ہی نہ بول اٹھے۔

مگر ثانیہ کا قطعاً" ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس نے تو پلٹ کے سیفی کا چہرہ بھی نہ دیکھا تھا۔

"آئم سوری۔۔۔ میں نے آپ کا ٹائم ویسٹ کیا میم۔" ثانیہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہوئے ہاتھ برابر ایک پاؤچ ایہا کے سامنے رکھی فائل کے نیچے غیر محسوس کن انداز میں کھسکا دیا اور ایہا کو خفیف سا اشارہ کیا۔

ایہا کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

(کیا یہ لڑکی اس کی کچھ مدد کرنا چاہتی تھی؟) پھر وہ وہیں سے پلٹ کر باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

سیفی نے مشکوک نظروں سے ایہا کو دیکھا۔

"کیا بات ہے۔۔۔ تمہارا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟"

"وہ۔۔۔ تھکاوٹ کی وجہ سے۔۔۔" ایہا کو حلق میں کانٹے اگتے محسوس ہو رہے تھے' جی چاہ رہا تھا۔ یہ جہنمی شخص یہاں سے دفع ہو اور وہ دیکھے کہ وہ لڑکی اس کے لیے کیا چھوڑ کے گئی تھی۔

"ارے۔۔۔ ابھی تھکاوٹ والے کام تم سے میم نے لیے ہی کہاں ہیں۔" وہ بے ہودہ انداز میں ہنسا۔ ایہا کا چہرہ جل اٹھا۔

"جلدی سے ڈائری لے کے آؤ۔ کچھ اپائنٹمنٹس لکھوانی ہیں۔" سیفی اس سے کہتا ہوا پلٹ گیا۔

دروازہ بند ہوتے ہی ایہا نے جھپٹ کر فائل کے نیچے سے وہ پاؤچ نکالا۔ قدرے وزنی پاؤچ کی زپ کھولتے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ وہ بار بار سیفی کے دروازے کو دیکھتی۔۔۔ پاؤچ کھلتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسی وقت سیفی دروازہ کھول کے دوبارہ باہر آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مر جائے اللہ کرے۔ جیسے ماں مر گئی ویسے ہی یہ لڑکی بھی مر جائے۔ جان کا عذاب بن گئی ہیں یہ منحوس میرے لیے۔"

سفینہ کو کسی پل چین نہ تھا۔ زارا نے انہیں زبردستی تھام کر لٹایا اور سر دبانے لگی۔

"کیوں خوامخواہ اپنا بی پی بڑھا رہی ہیں ماما! سر میں درد ہو رہا ہے۔ کچھ الٹا سیدھا مت سوچیں۔" "ارے جب اپنے ہی بچے الٹا سیدھا کرنے لگیں تو پھر میں کیا سیدھا سوچوں۔"

انہیں معیز کے ایکسی صاف کروانے کا بہت غصہ تھا۔

"دیکھ لو تم۔۔۔ تمہارے باپ کی خود تو ہمت نہ ہوئی اپنے گناہ کو گھر میں لانے کی۔ مگر اولاد کتنی فرماں بردار ہے اس کی۔"

"ماما پلیز۔ اپنے مرحوم باپ کی وصیت سے مجبور ہو کر وہ یہ سب کر رہے ہیں۔ ورنہ ان کا کیا تعلق اس سے۔" زارا کو اس موضوع پر بات کرنا بہت تکلیف دہ لگتا تھا۔ مگر سفینہ کیا کرتیں۔ اپنی راجدھانی میں انہیں کسی کی "سوچ" کا آنا بھی پسند نہ تھا اور یہاں تو ایک جیتے جاگتے انسان کا معاملہ تھا۔

"ارے ہٹو۔۔۔" انہوں نے غصے سے زارا کا ہاتھ جھٹکا تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"تمہارے باپ کی شادی میں گواہ بن کے شریک ہوا تھا۔ میں نے خود تمہارے باپ کے منہ سے سنا ہے۔"

"ماما۔۔۔ بچے۔۔۔ بہت مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے ماں یا باپ میں سے کسی کو چننا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ابو نے جو کہا ہو گا بھائی نے کر دیا۔"

"ہاں۔۔۔ تمہارا باپ ہی تو سگا تھا تمہارا۔۔۔ سوتیلی تو بس میں ہی ہوں۔"

سفینہ اور بھڑکیں تو زارا ان سے لپٹ گئی۔ ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کا اس کے بعد فوری طور پر یہی حل تھا۔ غصہ تو ٹھنڈا ہوا یا نہیں مگر وہ خاموش ضرور ہو گئیں اور زارا کے لیے اتنا بھی بہت تھا۔

☆ ☆ ☆

عون اسے دیکھتے ہی بے تابی سے اس کی طرف لپکا۔

"تم ٹھیک تو ہو نا؟" اس کے پر تشویش انداز پر ثانیہ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"میں کون سا محاذ جنگ پہ گئی تھی۔"

"تم نہیں جانتیں۔ وہ بڑا خبیث آدمی ہے۔ حالانکہ اس سے کوئی زیادہ لمبی بات چیت نہیں ہوئی۔ مگر۔۔۔ عورت کی عزت کرنا نہیں جانتا وہ۔"

وہ ثانیہ کے ساتھ گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اس کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے اسے ایک نظر دیکھ کر ثانیہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"اسے واقعی ٹریپ کیا گیا ہے۔ میں معیز بھائی کا کام کر آئی ہوں' اب وہ چیز اس کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائے بس یہی دعا ہے۔"

ثانیہ نے کہا تھا۔ عون گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

"اور کل والی فائل ابھی تک تمہاری ٹیبل پہ رکھی ہے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ سائن کرنے کے بعد لقمان صاحب کو واپس بھیجنی ہے۔"

وہ بولتا ہوا اپنی دھن میں باہر نکلا تھا۔ ایہا نے بڑی پھرتی سے وہ پاؤچ دراز میں ڈالا اور فوراً" ہی ٹیبل کی سطح پہ رکھی فائل اٹھائی۔

"یہ بس میں بھجوانے ہی والی تھی۔ وہ لڑکی اچانک آ گئی تو یہ کام رہ گیا بس۔" سیفی کرسی گھسیٹتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ڈائری نکالو میں یہیں تمہیں اپائنٹمنٹس کی ڈیٹیلز لکھوا دیتا ہوں۔"

اس نے ایبہا کی بدحواسی نوٹ نہیں کی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پین اور ڈائری تھامی تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

(اگر سیفی دیکھ لیتا کہ وہ لڑکی اسے کیا دے کر گئی ہے تو۔۔۔)

وہ آخری حد تک سوچ سکتی تھی کہ سیفی اس کے بعد کس انتہا تک جا سکتا ہے۔

وہ خود کو سنبھالتی ڈائری میں نام اور وقت نوٹ کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"اس لڑکی کے ساتھ واقعی بہت برا ہوا ہے معیز! اور اس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ اپنی مرضی سے وہاں نہیں گئی۔ بلکہ بقول ثانی اسے ٹریپ کیا گیا ہے۔" عون اسے تفصیل بتا رہا تھا۔

"اور کچھ نہیں بتایا اس نے؟"

"موقع ہی نہیں ملا۔ سیفی آ گیا تھا وہاں۔۔۔ پھر بھی ثانی نے بڑی ہوشیاری سے وہ پاؤچ اس تک پہنچا ہی دیا۔ اب آگے اس کی قسمت اور ہمت پہ منحصر ہے۔"

عون نے ثانیہ سے ملی تمام معلومات معیز کو پہنچا دی تھیں۔

"ہوں۔۔۔" وہ خاموش تھا۔ عون نے مزید کہا۔

"وہ کہہ رہی تھی کہ اس روز ایکسیڈنٹ کے بعد وہ ان مصائب کا شکار ہوئی ہے۔" معیز کو یاد آیا۔ ایبہا نے امتیاز احمد کے موبائل پہ آخری کال کی تھی۔ جس میں اس نے اپنا پرس گم ہو جانے کا ذکر کیا تھا۔ مگر تب امتیاز احمد اسپتال میں تھے اور معیز نے بہت بری طرح ایبہا سے بات کی تھی۔ اس کے بعد ہی یقیناً" اسے کالج اور ہاسٹل سے نکل کر اپنی دوست کے ساتھ جانا پڑا۔ اور یقیناً "اسی دوست کی مہربانی سے وہ آج سیفی کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔

معیز نے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے گہری سانس بھری۔

"اوکے۔۔۔ دیکھتے ہیں۔ اب وہ اپنی قسمت سے کیا حاصل کرتی ہے۔"

"ہم پولیس کی مدد بھی لے سکتے ہیں معیز۔" عون نے آئیڈیا دیا۔

"نہیں۔۔۔ بہت سی باتیں پھیلیں گی۔ زارا کی سسرال کا بھی مسئلہ ہے اور پھر ایسے لوگ پیسہ لگا کر کچھ عرصے میں سزا سے فارغ ہو جاتے ہیں تو پھر درخواست گزاروں ہی کی باری آتی ہے بھگتنے کی۔"

معیز نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اس معاملے کو اپنی فیملی تک نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

"اوکے۔۔۔" عون شانے اچکا کے رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

آفس ٹائم بمشکل ختم ہوا۔ ایبہا کو تو وہ تین گھنٹے تین ماہ لگ رہے تھے۔ اس نے پاؤچ دراز میں سے نکال کے اپنے شولڈر بیگ میں ڈال لیا تھا۔

اور اب اسے صرف اور صرف گھر جانے کا انتظار تھا۔ وہ اس تحفہ کو استعمال کر کے ایک بار پھر اپنی قسمت ضرور آزمانا چاہتی تھی۔

اس کی امید پھر سے جان پکڑنے لگی۔ "میں بچ سکتی ہوں۔ اللہ مجھے بچانا چاہتا ہے" وہ چہکی۔

مگر کیا یہ لڑکی مجھے یہ تحفہ دینے ہی آئی تھی؟ تو کیا وہ جاب کا پتہ کرنا محض بہانا تھا؟ اسے کیسے پتا کہ میں ... ہوں؟

تو کیا ایک اور ٹریپ؟
اس کا دل بند ہونے لگا۔
اس نے شکر ادا کیا کہ آج اس کے کمرے میں حنا نہیں تھی۔ طبیعت کی خرابی اور تھکاوٹ کا بہانا کرکے وہ کمرے میں آئی تو احتیاطاً" دروازہ لاک کرلیا۔
بیگ کھول کر لرزتے ہاتھوں سے وہ پاؤچ نکالا اور جلدی سے واش روم میں گھس گئی۔
واش روم کا دروازہ بھی لاک کیا اور زپ کھول کر پاؤچ میں سے اس لڑکی کا دیا تحفہ نکالا۔
یہ ایک چھوٹا۔۔۔ مگر نفیس سا موبائل فون تھا۔ دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ ایہا نے بٹن دبایا تو لائٹ آن ہوگئی۔
یعنی موبائل فل چارج تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی پیکنگ اتار کر دیکھا تو اس میں سم بھی موجود تھی۔ وہ جلدی سے فون کی میموری چیک کرنے لگی۔
اس میں صرف ایک ہی نمبر تھا اور اس نمبر کے ساتھ ثانیہ کا نام لکھا ہوا تھا۔
ایہا کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ اسے لگا "اندھیری قبر میں کوئی تازہ ہوا کا روزن کھلا ہو۔
اس نے موبائل کو واپس پاؤچ میں ڈالا اور واش روم سے باہر آکر اس پاؤچ کو اپنے شولڈر بیگ میں ڈال دیا۔
دروازے کا لاک کھول کر لائٹ آف کرتی وہ اپنے بستر پر آکر لیٹی تو اس کا دل تیزی اور خوف سے دھڑک رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

"یار! تمہیں اپنا نمبر محفوظ کرنا چاہیے تھا فون میں۔ وہ ڈائریکٹ تم سے رابطہ کرتی۔" عون کو خیال آیا۔
"وہ ثانیہ کو کھل کے اپنی پرابلم بتا سکتی ہے۔" معیز نے اس سے نگاہ نہیں ملائی تھی۔
"ویسے سچی بات بتاؤں یار! مجھے تمہاری سنائی ہوئی کہانی خاصی لولی لنگڑی لگ رہی ہے۔ یعنی کہ اس میں کوئی دم نہیں ہے۔ ایکسیڈنٹ والے روز تو اس لڑکی سے بالکل انجان بن کے نکل گئے تھے اور اب اسے شیر کی کچھار میں سے نکالنے کے درپے ہو۔" عون بچہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے کڑیوں سے کڑیاں ملا تا رہا ہوگا۔
"وقت آنے دو۔ سب کچھ بتادوں گا۔ پہلے اسے وہاں سے نکل تو لینے دو۔"
معیز نے اسے صاف ٹالا تھا۔ عون نے اسے گھور کے دیکھا۔
"ابھی اگر میں اپنے سارے خدشات ثانی کو بتادوں تو وہ اپنی مدد کی پیشکش واپس بھی لے سکتی ہے۔" وہ دھمکا رہا تھا۔
"وہ الحمدللہ تم سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔"
معیز نے طنز کیا۔ تو عون نے مکا اس کے شانے پر رسید کردیا۔

✡ ✡ ✡

رات اپنے کتنے ہی پہر گزار چکی تھی۔ ایہا نے اندھیرے کمرے میں دروازے کے ساتھ کان لگا کے سن گن لی۔ باہر سے کوئی آوازیں نہیں آرہی تھیں دروازہ لاک کرکے وہ پورا اطمینان کرتی بیگ میں سے موبائل نکال کر واش روم میں چلی آئی۔
اس نے اپنی قسمت آزمانے کی ٹھان لی تھی۔ لرزتے ہاتھوں سے ثانیہ کا نمبر دبا کر اس نے موبائل کان سے لگالیا۔
دوسری تیسری بیل پر کال اٹینڈ کرلی گئی۔

"ہیلو۔ ایہا۔؟" دوسری طرف سے بے تابانہ پوچھا گیا تو وہ گھبرا سی گئی۔
"میں ثانیہ بات کررہی ہوں۔"
"جی۔ جی۔" وہ کھنکھاری۔ پھر دھیمی آواز میں بولی۔
"میں ایہا بول رہی ہوں۔"
"کیسی ہو تم اور تمہارے پاس کو پتا تو نہیں چلا اس موبائل کے متعلق؟"
"نہیں۔ مگر آپ نے یہ موبائل مجھے کیوں دیا ہے؟" وہ بہت پھونک پھونک کے چلنا چاہتی تھی۔
"تاکہ تم مجھ سے رابطہ کرسکو۔"
"آپ کو کیسے پتا تھا کہ مجھے آپ سے رابطے کی ضرورت ہے؟" سوال در سوال۔ وہ پورا اطمینان چاہتی تھی۔ گڑھے سے نکل کے کھائی میں گرنا اسے گوارا نہ تھا۔
"دیکھو جب کوئی اپنا مصیبت میں ہو تو دل کو فوراً" پتا چل جاتا ہے۔" وہ نرمی سے کہتی ایہا کے زخموں کو چھیڑ گئی۔
"کیا مطلب۔؟"
"مطلب یہ کہ تم وہاں سے نکلنا چاہتی ہو نا؟" ایہا پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ موت کے بعد زندگی پانا کیسا لگتا ہے؟؟ اسے بھی ویسا ہی لگا تھا۔
"مگر آپ۔ اس روز آپ لوگوں ہی کی وجہ سے میرا پرس گم ہوا۔ میں ہاسٹل اور کالج سے نکالی گئی اور پھر اس زندان میں قید کردی گئی۔ اور اب اچانک ہی آپ میرے پیچھے یہاں پہنچ گئیں۔ بنا کسی جان پہچان کے مجھے موبائل فون دیا۔ آپ نجومی تو ہو نہیں سکتیں۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی اتنی مدد کے پیچھے۔" اسے کسی طور یقین نہ

آرہا تھا۔

"بہت عقل مند ہو۔" ثانیہ نے اسے سراہا۔

"ٹھوکریں کھا کے یہ عقل حاصل کی ہے میں نے ثانیہ جی! آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے یہاں سے نکال دیں گی۔ مگر میں آپ کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"میرے ساتھ تو نہ سہی۔ مگر جس نے مجھے تمہارے پاس بھیجا تھا اس کے ساتھ تو جاؤ گی نا؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

ایہہا بن دیکھے بھی اس کی مسکراہٹ اس کے لفظوں سے محسوس کر سکتی تھی۔

"کک۔ کون۔؟" ایہہا کا دم اٹکنے لگا۔

"ابھی میں میٹنگ پہ اس سے بات کرواتی ہوں تمہاری۔"

ثانیہ نے اس سے کہا اور یقیناً" دوسرا نمبر ملانے لگی۔

ایہہا جیسے زندگی اور موت کے دوراہے پہ کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بھائی۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جب زارا نے اسے آواز دی۔ وہ اس کی طرف چلا آیا۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

"تم سوئیں نہیں ابھی تک؟" معیز نے پوچھا۔ وہ شاید اسی کے انتظار میں لاؤنج میں ٹی وی آن کیے بیٹھی تھی۔

"آپ کا ویٹ کر رہی تھی۔ ضروری بات کرنی تھی۔" زارا سنجیدہ تھی۔ معیز نے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔

"ہاں۔ بولو۔" وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"ماما آپ کے فیصلے سے بہت ڈسٹرب ہو گئی ہیں۔" زارا نے کہا تو وہ چونکا۔

"کون سے فیصلے سے؟"

"یہی۔ اس لڑکی کو انیکسی میں رکھنے والے فیصلے سے۔"

"یہ محض مجبوری ہے زارا۔ تم ہی سمجھاؤ انہیں۔ ابو کی روح کو سکون پہنچے گا۔ اور ویسے بھی میں سوچ چکا ہوں کہ اس سے چھٹکارا کیسے حاصل کرنا ہے۔" معیز نے اسے تسلی دی۔

"مگر ہم لوگوں سے کیا کہہ کے تعارف کروائیں گے اس کا؟"

"وہ بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ بلکہ میں نے رباب سے کہا تھا کہ ایہہا عون کی کزن ہے۔ تو تم لوگ بھی سب پہ یہی شو کر سکتے ہو کہ انیکسی کسی ضرورت مند کو رہائش کے لیے دی ہے ہم نے۔" اس نے چٹکی بجاتے ہی مسئلے کا حل اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

زارا کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا۔ ورنہ تو اسے فکر کھائے جا رہی تھی کہ اپنے سسرال والوں سے ایہہا کا کیا تعارف کروائے گی۔

"اب جا کے سوؤ تم ایزد آگیا؟" وہ جاتے جاتے رک کر پوچھنے لگا۔

"جی۔ بس ابھی آدھا گھنٹہ پہلے ہی لیٹا ہے جا کے" وہ مسکرائی۔ تو وہ سر ہلاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

شاور لے کر نائٹ سوٹ پہنے وہ بستر پہ آیا تو طبیعت میں تازگی کے بجائے کسل مندی ہی محسوس کر رہا تھا۔ اور یہ سب یقیناً" ذہنی ٹینشن کا نتیجہ تھا۔

اس نے ثانیہ کے ہاتھ ایہہا کو موبائل بھجوایا تو تھا لیکن اگر وہ سیفی کے ہاتھ لگ جاتا تو۔

اس میں ثانیہ کا نمبر Save تھا۔

معیز نے اسے سختی سے تنبیہہ کی تھی کہ اگر ایہہا کے بجائے سیفی اس سے رابطہ کرے تو وہ اپنی سم فوراً" ضائع کر دے۔

اپنی وجہ سے وہ ثانیہ کو کسی مصیبت میں پھنسانا نہیں چاہتا تھا۔

عون تو پہلے ہی ثانیہ کو اس معاملے میں ملوث کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ تو شکر خدا ثانیہ ذرا ایڈونچر پسند تھی۔ سو فوراً" مان گئی۔

وہ کتنی ہی دیر نہ چاہتے ہوئے بھی اسی معاملے کو سوچتا رہا۔

جب جب وہ ایہہا کا سیفی کے پاس ہونا سوچتا اس کے وجود میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اور سیفی کی بدطینتی سے معیز اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔

تو کیا۔ ایہہا محفوظ تھی؟

اس کا خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ جانے کب ان ہی الٹے سیدھے خیالوں میں الجھا وہ نیند کی وادی میں اتر گیا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اس کا موبائل بجنے لگا۔ سوتے ہوئے بھی اس کے حواس اتنے الرٹ تھے کہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلٹ کر ہاتھ مارا اور موبائل اٹھا کر دیکھا۔

ثانیہ کی ہی کال تھی۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"السلام وعلیکم۔ ثانیہ بات کر رہی ہوں۔"

"ہاں ثانیہ بولو۔" وہ بہ سرعت اٹھ بیٹھا۔

☼ ☼ ☼

ایہہا کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ خوف کے مارے پسیجتے ہاتھوں سے موبائل چھوٹ رہا تھا۔

ثانیہ کسی سے بات کر رہی تھی۔

"میٹنگ پہ اس وقت ایہہا ہے۔ بات کریں۔"

"ہیلو۔" مردانہ لہجہ ابھرا تو ایہہا پوری جان سے لرز گئی کیا ثانیہ اسے ٹریپ کر رہی تھی۔

"معیز احمد بات کر رہا ہوں۔ ایہہا۔ تم سن رہی ہو؟"

بہت معتدل اور پرسکون سا لہجہ اس کے کانوں میں گونجا تو موبائل اس کے ایک دم سے لرزتے ہاتھ سے گر گیا۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑائے جانے کی آواز آنے لگی تو ایہہا کا دل ڈوب سا گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صدف آصف

زندگی کا موسم

"یہ کیا مصیبت ہے' بھئی۔۔۔ نئی دلہن کو کم از کم ایک مہینے تک تو کام کو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہیے۔" خوش بخت نے صبح صبح میاں جی کے لیے بل دار پراٹھے بیلتے ہوئے اپنے مہندی لگے ہاتھوں پر ایک نظر ڈالی تو چڑ کر سوچا۔

"خوشی۔۔۔ او میری۔۔۔ زندگی کی پہلی خوشی۔۔۔ یار۔۔۔ ناشتا لے بھی آؤ۔" امان کے اتنے پیار سے پکارنے پر اس کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔

خوش بخت نے باریک کتری پیاز اور ہری مرچوں کا سنہری آملیٹ پلیٹ میں نکالا' بھاپ اڑاتی چائے کے دو کپ ٹرے میں رکھے اور بے زار چہرے پر مسکراہٹ کا نقاب اوڑھ کر باہر نکل گئی' نیا گھر' نیا ماحول' وہ اپنی ماں کی ہدایات کے زیر اثر یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھتی اپنے چہرے پر ہمہ وقت نرم سا تاثر طاری کیے زیادہ بولنے کی جگہ سوچتی رہتی۔

خوش بخت کی شادی کو صرف پندرہ دن ہی گزرے تھے اور اس کی ساس نے گھر کی ساری ذمہ داری اس کے نازک کاندھوں پر لاد دی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی جاری ہونے والے نادر شاہی حکم پر وہ اندر ہی اندر تلملائی' کلبلائی پر چپ کی مہر نہ ٹوٹی۔

وہ سو کر اٹھی تو چائے کی طلب میں کچن کی طرف گئی تو دیکھا کہ خورشیدہ اشتیاق نے بڑے سے پتیلے میں کھیر چڑھائی ہوئی تھی' اس کے استفسار پر پتا چلا کہ اس کی کھیر میں ہاتھ ڈلوانے کی رسم ادا کی جا رہی ہے۔ انہوں نے اسے کھیر دیکھنے کا کہا اور خود اس کے گھر والوں کو فون کر کے رات کے کھانے کی دعوت دینے چل دیں۔

"اتنی جلدی۔۔۔ سب کام مجھے سنبھالنے ہوں گے۔" خوشی ہکا بکا کچن میں تنہا کھڑی رہ گئی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کام کہاں سے شروع کرے۔

"دیکھیں۔۔۔ سلمیٰ بہن! میں نہیں چاہتی کہ خوشی کو اس گھر میں اجنبیت کا احساس ہو' ہم چار تو لوگ ہیں یہاں۔۔۔ کام کا کوئی خاص بوجھ نہیں' صاف صفائی کے لیے شریفاں آجاتی ہے۔ بس اوپر کے کام اور کھانا ہی پکانا ہوتا ہے۔ اچھا ہے یہ اس گھر کے طور طریقے جلد ہی سیکھ لے۔ اب سب کچھ ہماری دلہن کو ہی تو سنبھالنا ہے۔ اچھا ہے اپنی من چاہی گھرداری شروع کرے۔" خوشی کی امی کے دبے دبے اعتراض پر خورشیدہ نے واضح الفاظ میں اپنا موقف سب کے سامنے رکھا۔

"آنٹی کہتی تو آپ ٹھیک ہیں۔۔۔ اگر ساری ساسیں آپ کی طرح سوچیں تو روز روز کی دانتا کل کل سے جان چھوٹ جائے اور گھروں میں سکون ہو جائے۔" خوش بخت کی بھابھی عمیمہ نے اپنی ساس کو ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بظاہر مسکرا کر کہا۔

"ہاں بہن! آپ کی بات سو فیصد درست ہے۔ تاہم کچھ لڑکیوں کو گھر کے معاملات سنبھالنے میں کافی عرصہ لگ جاتا ہے۔ اگر ان کے ہاتھ میں سارا خرچا دے دیا جائے تو دو دن میں ہی کھا پی کر بیٹھ جائیں۔ پھر باقی مہینہ گھر والے کیا دھول پھانکیں گے؟ ویسے بھی میں یہ دعوا نہیں کرتی کہ میری خوشی ایک دم پرفیکٹ ہے' تاہم میں نے اس کی تربیت ایسی سخت کی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے سے بڑوں کا احترام کرے گی۔ آپ کو ان شاء اللہ اس کی طرف سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" سلمیٰ بہو کے طنز پر تلملا اٹھیں۔ اسے سنانے کے ساتھ ساتھ بیٹی کا دفاع بھی کیا۔

"بھئی۔۔۔ میں اپنی بہو کے معاملات میں بلاوجہ ٹانگ اڑانے کی خواہش مند نہیں۔ دلہن سیاہ کریں یا سفید' اب یہ ان کا گھر ہے۔ اپنا سمجھیں تو نفع۔ ورنہ نقصان اٹھائیں گی۔" وہ مسکرا کر مہمانوں کو اسکوائش پیش کرتی ہوئی خوشی کو دیکھتے ہوئے متانت سے بولیں۔

"اس دور میں ایسی ساس' جو اپنی سلطنت بہو کو دینے میں لمحے بھر نہ سوچیں۔۔۔ کمال ہو گیا بھئی۔" عمیمہ نے ان کی بات کو زوردار طریقے سے ہاتھ ہلا کر سراہا تو ان سب نے تائید میں سر ہلا دیا۔ سوائے خوشی کے جو اناری اور سبز رنگ کے لباس میں دہک رہی تھی۔ سلمیٰ الگ' بہو کی باتوں پر بیٹھی کڑھتی رہیں۔

"نہیں۔۔۔ بھئی۔ اس کا کریڈٹ خوشی کو بھی جاتا ہے۔ ہماری دلہن بہت سمجھ دار اور معصوم ہے۔ ہمیں اس نے کبھی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا۔" خورشیدہ نے کھلے دل سے اپنی بہو کی تعریف کی۔ امان نے مسکرا کر پہلے فخر سے ماں کو دیکھا' پھر جا کر خوشی کے برابر میں کھڑا ہو گیا جو سب باتوں کو نظرانداز کیے مہمانوں کی مدارات میں مصروف ہو گئی۔ امان کی ناشتے کے لیے پکار پر وہ خیالات کی دنیا سے باہر آگئی۔ تیزی سے ڈائننگ ہال کی طرف بڑھی۔



"امان۔۔۔ مما کہاں گئیں؟" اپنے سسر اور شوہر کے سامنے جلدی جلدی ناشتا لگاتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

"خوشی بیٹا۔۔۔ وہ جو ہماری کام والی شریفاں مائی ہے نا' اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ اس بے چاری کے پاس تو پیسہ کوڑی ہے نہیں۔ روتی گاتی ان کے پاس آئی کہ کچھ کر دیں تو بیٹی کو سادگی سے بیاہا جا سکے۔ ان کا تو وہ حال "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" بس وہ نکل پڑیں۔ انہوں نے محلے بھر کی خواتین کے پاس جا جا کر اس کی مدد کے لیے مہم کا آغاز کیا ہوا ہے۔"

اشتیاق انور نے مسکرا کر بہو کو بتاتے ہوئے بیوی کی تعریف کی تو وہ حیران رہ گئی۔ اس کا سسرال جس علاقے تھا' وہ ایک ہائی سوسائٹی کہلاتی تھی' یہاں کے رہائشی نہ بلاوجہ کسی کی زندگی میں مداخلت کرتے نہ ہی کسی سے ایسی توقع رکھتے۔ البتہ خوشی اور غمی میں گھنٹہ بھر کو شرکت ضرور کرتے۔ ایسی جگہ گھر گھر جا کر کام والی مائی کے لیے امداد اکٹھی کرنا بڑی بات تھی۔

"میری ساس ہیں یا چلتا پھرتا' ویلفیئر ٹرسٹ۔۔۔ ہر وقت فلاحی کاموں میں مصروف۔" خوشی نے سوچا۔ وہ گم صم سی امان کی کرسی کے پیچھے کھڑی رہ گئی۔

"خوشی۔۔۔ پلیز ایک۔۔۔ ایک کپ چائے کا اور ہو جائے۔۔۔ ذرا جلدی۔ مجھے اور پاپا کو اب نکلنا ہے۔" امان کی آواز پر وہ کچن کی طرف مزید چائے لینے بھاگی۔ ویسے تو اس کی ساس ہمیشہ سسر جی کو ناشتا کرا کر اپنے



کاموں کے لیے باہر نکلتیں، لیکن آج شاید انہیں جلدی جانا تھا۔ اس لیے خوشی کو ان کا ناشتا بھی تیار کرنا پڑا۔

خورشیدہ اشتیاق کے دو ہی بچے تھے۔ بڑا بیٹا امان اور چھوٹی بیٹی ثوبیہ۔ جس کی شادی کو دو سال ہوگئے تھے۔ وہ بھائی کی شادی میں شرکت کرنے شوہر کے ساتھ پاکستان آئی ہوئی تھی۔ ایک مہینہ شادی کی گہما گہمی میں پلک جھپکتے گزر گیا۔ وہ اب کینیڈا واپس جا چکی تھی۔

امان ایک غیر ملکی بینک میں وی پی کے عہدے پر فائز تھا۔ اچھی تنخواہ کے ساتھ مراعات ملی ہوئی تھیں۔ اشتیاق انور نے سرکاری نوکری سے ریٹائرمنٹ کے بعد ایک ادبی ادارے کے اکاؤنٹس کا کام سنبھال لیا۔ وہ اس عمر میں بھی صحت مند اور چاق و چوبند تھے۔ اس پر اتنے سالوں کی مصروفیت کے بعد ایک دم سے در آنے والی فراغت، چند دنوں میں ہی گھر بیٹھ کر گھبرا اٹھے۔ دوست کے توسط سے اس نوکری کی آفر ہوئی۔ انہوں نے غنیمت جانا۔ امان باپ کو ان کے آفس چھوڑ کر اپنے بینک نکل جاتا۔

خوش بخت شادی کے بعد خوش تھی۔ اسے امان بہت چاہنے والا نرم مزاج اور حساس طبیعت کا انسان لگا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ شوہر سے ابھی بے تکلف نہ ہو پائی۔ جب کہ امان کی بے تکلفی۔ لگتا تھا وہ اس کی بہت پرانی ساتھی ہو۔ اشتیاق احمد بھی خوشی کو ثوبیہ سے کم نہ جانتے۔ جب بھی آفس سے واپس آتے اس کے لیے ایک مزیدار سی چاکلیٹ لاتے۔ بظاہر زندگی میں سکون ہی سکون تھا۔ گویا حالات اس خاندان کے موافق جا رہے تھے۔

سلمیٰ بانو بیٹی کی اونچی قسمت پر اسے سسرال والوں سے بنا کر رکھنے کی تلقین کرتیں۔ ان کو بہو کے معاملے میں کچھ اچھا تجربہ نہ ہوسکا۔ البتہ داماد بڑا شان دار تھا۔ بہو۔ عمیمہ انتہائی منہ پھٹ اور فضول خرچ لڑکی نکلی۔ سلمیٰ غصے میں کم نہ تھیں۔ یوں آئے دن کے دنگل و فساد شروع ہوگئے۔ ارتضیٰ ماں اور بیوی کے بیچ میں پھنس کر رہ گیا۔

"کس کی سنوں۔ کس کی نہ سنوں؟" کبھی کبھی وہ ہر وقت کی چاؤں چاؤں سے گھبرا کر حلق کے بل چیخ اٹھتا۔ اس کے بعد پچھتاتا۔ بیوی کی آنکھ میں آئے آنسو اس سے برداشت ہوتے۔ نہ ہی ماں کا دل دکھا کر وہ سکون سے سوپاتا۔ ارتضیٰ نے مجبور ہو کر زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنا شروع کردیا۔ رات گئے لوٹتا جب دونوں سو چکی ہوتیں۔ بیٹے کو خود سے دور جاتا دیکھ کر سلمیٰ بانو بیمار رہنے لگیں۔

خوشی کو سسرال میں بظاہر کوئی مسئلہ نہ تھا مگر میکے سے ملنے والی ایسی اطلاعات اسے ڈرا دیتیں۔ وہ صلح جو۔ نرم مزاج کی لڑکی اس گھر کا ماحول میکے جیسا دیکھنے کی خواہش مند نہ تھی۔ اسی لیے لب سیے بغیر اعتراض کیے۔ خاموشی سے گھر کے کاموں میں الجھی رہتی۔ ہاں، کبھی کبھی اپنی ساس کی عادتوں پر بھی الجھتی۔ یہ حقیقت تھی کہ اگر وہ سسرال میں کسی کو مکمل طور پر سمجھ نہ پائی تو وہ "خورشیدہ اشتیاق" کی شخصیت تھی۔ کبھی کبھی وہ اسے بہت اچھی لگتیں، کبھی ان کی محبت ڈرامہ دکھائی دیتی۔ وہ کنفیوز ہو جاتی۔ یوں دل ہی دل میں ان کی اچھائی یا برائی کی جانچ کرنے پر تل گئی۔

☼ ☼ ☼

"اوہ۔ میرے اللہ۔" جلنے کی مہک سے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے بالوں کو سمیٹتے ہوئے کچن کی طرف دوڑ لگا دی۔ ساس کو قیمے کی پتیلی میں چمچ چلاتے دیکھا۔

"آج تو خیر نہیں۔ مما۔ یقیناً" غصہ کریں گی۔ دل ہی دل میں خوف زدہ ہو گئی۔

"میں نے قیمے میں تھوڑا سا دودھ ڈالا ہے۔ اس سے جلنے کی مہک نکل جائے گی، اصل میں امان کو جلا ہوا سالن بالکل پسند نہیں۔ کچھ آلو جو جل گئے تھے انہیں اس میں سے نکال کر دوسرے آلو ابال کر ڈال دیے ہیں۔ پانچ منٹ دم پر رکھا ہے۔ اب تم دیکھ لینا مجھے ارشد کا اسکول میں ایڈمیشن کروانا ہے۔ اس لیے صا[illegible] کے پاس جا رہی ہوں۔ وہ آج کل ایک اسکول میں پرنسپل ہے۔"

خورشیدہ اس سے یوں مخاطب تھیں جیسے یہ کوئی معمول کی بات ہو۔ ساتھ ساتھ ان کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ صالحہ ان کی چھوٹی نند کا نام تھا۔ یقیناً" اب وہ اس غریب بچے کی تعلیم کی ذمہ داری بھی اٹھائیں گی۔ اس سے پہلے تو وہ اپنی غلطی پر نادم سوچے جا رہی تھی کہ آج تو ساس بہو میں خوب جھگڑا ہوگا، لیکن ان کے ماتھے پر تو ایک بل نہ آیا۔ وہ ہونٹ بھینچے ان کے منہ سے اس بچے کی داستان غم سنتی رہ گئی۔

کیا ساس بھی ایسی ہوتی ہیں؟ اس کی ماں بھی تو اس کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی یوں ہی پردہ داری کرتی تھیں، مما بھی تو ماں ہی ہیں۔ پہلے ماں کی اب اس کی۔ اس نے انہیں نم آنکھوں سے دیکھا۔

"وہ۔ اصل میں شام کے لیے آلو قیمہ چڑھا کر لیٹی۔ تو۔ جانے کیسے آنکھ لگ گئی۔" خوشی نے ان کے بغور دیکھنے پر صفائی پیش کی۔

"کوئی بات نہیں کبھی ہو جاتا ہے۔" انہوں نے اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ نرمی سے رکھ کر تسلی دی اور باہر نکل گئیں۔ خوشی پیچھے سے ان کی چوڑی پشت دیکھتی رہی۔ وہ اس کے سسر کے مقابلے میں انتہائی معمولی شکل کی تھیں، پھیلا جسم، قدرے گہری رنگت، البتہ ان کے نقوش انہیں جاذب نظر بناتے تھے۔ اس کے باوجود اشتیاق انور بیوی کے شیدائی تھے۔ گھر کا ہر کام ان کی مرضی سے ہوتا۔ باپ بیٹا ان کی ہی بات کو اولیت دیتے۔ خوشی تو یہ سب دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی جاتی۔

اس بات سے ناآشنا کہ وقت ہمارے دامن میں صرف پھول ہی نہیں کانٹے بھی بکھیر دیتا ہے۔ ان کے باہم ملن سے حاصل ہونے والی چبھن اور راحت کا نام ہی زندگی ہے۔

☼ ☼ ☼

"مما۔ وہ میں امی کے گھر جانا چاہ رہی تھی۔" خوشی نے تھوڑا گھبرا کر کہا۔ وہ چار روز قبل ہی تو میکے سے لوٹی تھی۔ شادی کے بعد پہلی بار امان نے بڑی مشکلوں سے اسے ایک ہفتہ رکنے کی اجازت دی۔ روز اس کے میکے فون کھڑکا کر اپنی بے تابیوں کا حال سنائے جاتا۔ وہ بھی مسکرا مسکرا کر شوہر کی بے قراریوں سے لطف اٹھاتی۔ اس کے اصرار پر بہت جلدی گھر نہ لوٹی۔ میکے کے حالات نے اسے یہاں رکنے پر مجبور کیا۔

بڑے بھائی کا اترا چہرہ اسے بہت ڈسٹرب کر رہا تھا۔ روٹھی بھابھی اور ماں کو الگ الگ بٹھا کر پیار سے سمجھایا۔ دونوں کے بیچ تناؤ کو کم کرنے کے لیے بڑا زور لگایا۔ اس کے خلوص کا کچھ تو اثر ہوا کہ عمیمہ نند کے سامنے ساس سے مسکرا کر بات چیت کرنے لگی، ورنہ اس سے قبل تو دونوں ایک دوسرے سے کلام کرنے کی بھی روادار نہ تھیں۔ وہ پرسکون ہو کر امان کے ساتھ سسرال لوٹ آئی۔

اب جانے ایسی کیا بات ہوگئی؟ اچانک امی کی شوگر اتنی بڑھ گئی کہ وہ چکرا کر گر پڑیں۔ ایک ڈرپ بھی لگانی پڑی۔ سلمیٰ کی طبیعت کی خرابی کا احوال چھوٹی بہن سے بات کرنے پر پتا چلا تو اس کا دل اڑ کر وہاں پہنچنے کو بے قرار ہوگیا۔

"اچھا۔ امان کے ساتھ شام کو چلی جانا۔" انہوں نے اپنی پرانی بنارسی قمیص کی ترپائی کھولتے ہوئے چشمے سے اسے دیکھا۔ وہ شریفاں مائی کی بیٹی کے لیے اپنے کچھ پرانے کپڑوں کی مرمت میں مصروف تھیں۔

"جی۔ وہ ابھی جانا چاہ رہی ہوں۔ امی کی طبیعت کچھ خراب ہے۔" خوشی نے ان کی طرف التجائیہ انداز میں دیکھا۔

"خیریت تو ہے دلہن؟" انہوں نے سوئی کو دھاگے کی نلکی میں پھنسایا اور فکر مندی سے پوچھا۔

"جی۔ جی۔ بس ایسے ہی ذرا شوگر کا مسئلہ ہے۔" اس نے بظاہر اطمینان سے کہا۔ وہ اپنے میکے کے راز ساس کے سامنے کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی اداسی کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔

"ہر گھر کے اپنے مسئلے مسائل ہوتے ہیں۔ اگر

ولہن مناسب نہیں سمجھ رہی۔ تو مجھے مزید سوال نہیں پوچھنے چاہئیں۔" خورشیدہ نے کریدنے سے گریز کیا ان کی اشتیاق انور کے ساتھ کامیاب شادی شدہ زندگی کے پس پردہ کئی ایسے ہی رمز چھپے ہوئے تھے' اپنی اچھی عادتوں کی بدولت ہی وہ معمولی شکل و صورت رکھنے کے باوجود شوہر کے دل پر آج تک چھائی ہوئی تھیں۔

"ہوں ــ ٹھیک ہے دلہن ــ ہم منع نہیں کررہے پر' شادی شدہ زندگی کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ اپنی مرضی چلانے کے بجائے شوہر کی مرضی پر چلو۔ دیکھنا وہ خود تمہارا عادی ہوجائے گا۔ آخر میں ہوگا وہ ہی جو تم چاہوگی۔ خیر۔ ایسا کرو' امان کو فون پر مطلع کرو' پھر بھلے ہی چلے جانا۔" انہوں نے نرمی سے سمجھایا تو وہ سرہلا کر کمرے کی طرف بڑھ گئی تاکہ شوہر سے بات کرسکے۔

"ارے یہ کیا...؟ امان کی اتنی ساری مسڈ کال..." خوشی نے ڈریسنگ سے اپنا سیل فون اٹھایا تو چونکی۔ اس نے فوراً" نمبر ملایا۔

"واہ... واہ... جانو... صحیح کہتے ہیں۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے' میں ابھی تمہارا نمبر ہی ملا رہا تھا۔" امان نے پہلی بیل پر ہی کال ریسیو کی اور چہکا۔

"خیریت... آپ نے اتنی دفعہ کال کی... میں مما کے پاس تھی؟" اس نے اپنی بات کہنے سے پہلے شوہر کی سننا چاہی۔ ساس کی باتوں کا اثر تھا۔

"ارے... یار آج میرے سارے دوستوں نے مل کر ہم دونوں کو ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔ بس تم آٹھ بجے تک تیار رہنا۔" امان بڑا پرجوش ہو رہا تھا۔

"وہ... سنیں۔" خوشی کی آواز حلق میں ہی گھٹ گئی۔

"ہاں... ہاں۔ آپ کی ہی تو سنتا ہوں۔ اچھی طرح تیار ہونا' میرے سارے دوستوں کی بیویاں شادی کے بعد آج پہلی بار تم سے ملیں گی... ایسا کرو' اپنا میرون والا سوٹ پہن لو' جو میں نے اس دن بوتیک سے دلایا تھا... تم مجھے اس لباس میں بہت اچھی لگتی ہو۔" اس کے سننے کی بجائے وہ اپنی سنانے میں لگا رہا۔ خوشی لب چباتے ہوئے اس کی سنتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"آج تو تم سچ مچ بہت پیاری لگ رہی تھیں۔" امان نے اس کے لمبے بالوں کو چھو کر کہا' جو اڑ اڑ کر اس کے ہوش اڑا رہے تھے۔ خوشی کو احساس ہوا کہ شوہر کو ڈرائیونگ میں دشواری ہو رہی ہے۔ اس نے جلدی سے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھ لیا۔

وہ لوگ دس بجے تک دعوت سے فارغ ہوگئے تو واپسی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خوشی ان سب لوگوں کے خلوص کی مداح ہوگئی۔ سمندر کنارے واقع ریسٹورنٹ میں دی جانے والی دعوت بہت شاندار رہی۔ سب نے نئے جوڑے کو بہت سراہا۔ آخر میں دونوں کو سرپرائز گفٹ کے طور پر بہت ساری چاکلیٹس کے پیکٹ دیے گئے۔ امان نے شاید کسی دوست سے ذکر کردیا تھا کہ خوش بخت تو بچوں کی طرح چاکلیٹ کی دیوانی ہے۔ بس تو ان سب نے یہ شرارت کی۔ دونوں میاں بیوی نے اس سرپرائز کو بھی خوب انجوائے کیا' ساری رونقوں کے باوجود خوشی کو جب بھی ماں کا خیال آتا تو وہ لمحہ بھر کے لیے چپ سی رہ جاتی' پر امان کا محبت بھرا انداز اسے بڑے سبھاؤ سے محفل میں واپس لے آتا۔

"کیا بات ہے... بڑی چپ چپ سی ہو۔" امان نے اس کی مسلسل خاموشی پر اسے ٹہوکا دیا اور تیزی سے موڑ کاٹا۔

"کوئی بات نہیں... بس تھک سی گئی ہوں۔" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر کہا۔

شوہر کا خوش گوار موڈ اور محبت بھرا انداز دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں اپنی ساس کا شکریہ ادا کیا۔ اگر وہ ان کے مشورے پر عمل نہ کرتی اور امان کو بتائے بغیر میکے چلی جاتی تو شاید حالات اس کے خلاف ہوجاتے۔ امان ناراض ہوجاتا۔ وہ الگ شرمندہ ہوتی... پر اس کی ساس کے خلوص نے اسے آج جیت لیا۔ وہ خیالوں

میں کھوئی تھی کہ امان نے جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ سامنے اس کی امی کا گھر تھا۔

"یہاں اترو... مطلب... آپ کو کیسے پتا چلا؟" خوشی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا بولے... اس کی آنکھوں میں خوشی کے موتی چمک اٹھے۔

"محترمہ... اب اندر بھی چلو... ساس صاحبہ نے کب سے چائے کو ہلکی آنچ پر رکھا ہوا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ بھی جل رہی ہوں گی۔" امان نے اس کا ہاتھ پیار سے تھام کر اسے گاڑی سے اترنے میں مدد دی۔

"امان... آپ کتنے تیز ہیں۔ جب ہی تو یہاں آنے سے قبل فون پر کسی سے ہنس ہنس کر بات کر رہے تھے' یقیناً" ساس کو فون کیا ہوگا۔" خوشی نے شریک حیات کو دیکھا اور ناز سے کہا۔

"کیوں سلمیٰ آنٹی میری ماں جیسی نہیں کیا... ان کی طبیعت خراب ہو اور میں انہیں دیکھنے نہ آؤں ایسا کیسے ممکن تھا... ویسے جانو! کیوں ایک شریف آدمی کو بدنام کرتی ہو۔ جانتی ہو نا ہر شریف آدمی اپنی بیوی سے ڈرتا ہے' میں تو ٹھہرا سیدھا سا معصوم انسان' جس پر اتنے بڑے بڑے الزام۔" امان نے شرارت سے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"جی... جی... صاحب تو جلیبی بلکہ امرتی کی طرح سیدھے ہیں۔"

خوشی نے اپنی نازک سی ناک کو ادا سے چڑھایا اور سرشاری ماں کے گھر کے دروازے کی بیل بجانے لگی۔ شوہر کے چھوٹے سے اس عمل نے اس کے اندر نئی توانائیاں سی بھر دیں۔ دل میں خوشیوں کے پھول کھل اٹھے۔ امان بھی مسکراتا ہوا اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ شادی شدہ زندگی کا یہ پہلا ایسا چمکتا جگنو تھا جسے اس نے اپنی مٹھی میں چھپا کر دل میں بسا لیا۔ یہ پیار بھرا لمحہ۔ امان کا اس کی ماں کے لیے یوں حساس ہونا' رات گئے میکے لے کر آنا... خوشی تو جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی۔ اسے لگا اب ان دونوں کے دکھ سکھ سانجھے ہوگئے ہیں۔

"زندگی... بن گئے ہو تم۔" خوشی کا دل امان کو یوں اپنے گھر والوں کے بیچ بیٹھا دیکھ کر گنگنایا۔ وہ سلمیٰ کو اپنی صحت کا خیال رکھنے کی سختی سے تاکید کر رہا تھا۔ سلمیٰ سعادت مندی سے سر جھکائے داماد کی پیار بھری ڈانٹ سنتے ہوئے مسکائیں۔ خوشی کی نگاہیں ان پر سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ اس کی زندگی میں یہ لمحے امر ہوگئے۔

☼ ☼ ☼

"یا اللہ... تیرا شکر ہے۔" تہجد کی نماز ادا کرکے خورشیدہ جائے نماز تہہ کر رہی تھیں کہ ان کی نگاہیں بے ساختہ امان کے کمرے کی طرف اٹھ گئیں۔ نائٹ بلب کی دودھیا روشنی چھن چھن کر کھڑکی سے باہر آرہی تھی۔ ان کے اندر عجیب سا نور اترتا چلا گیا۔ جو لوگ دوسروں کی زندگیوں کے لیے باعث راحت ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی بھی سکون سے معمور رہتی ہے۔

خورشیدہ نے زندگی میں ایک بات سیکھی تھی کہ "اگر شادی شدہ بیٹے کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنانا ہو... تو پہلے بہو کو خوش دلی سے اپنالو... بیٹا خود بخود آپ کا ہوجائے گا۔ ورنہ بہو اور ساس کے بیچ جاری چپقلش کبھی کبھی اتنی خطرناک ہوجاتی ہے کہ یا تو مائیں اپنے بیٹوں کو کھو دیتی ہیں یا بیویاں اپنے شوہروں کے دلوں سے اتر جاتی ہیں۔ یہ وہ رشتے ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے۔ جب جینا مرنا ایک ہے... تو کیوں نہ دکھ سے مرنے کی جگہ خوشی سے جی لیا جائے۔"

خورشیدہ اشتیاق کے خلوص نے آج نہ صرف ان کی بہو کا دل جیت لیا' بلکہ بیٹے کے دل میں ان کا مان مرتبہ اور بڑھ گیا۔

اپنے گھر کے اچھے ماحول کے لیے انہوں نے سب سے پہلے اپنی ذات سے جنگ کی' رشک و حسد کے جذبے سے دامن چھڑا لیا۔ یوں کچھ ہارے بغیر سب کچھ جیت گئیں۔ وہ اب ایک فاتح کی طرح سر اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

☼

عائشہ فیاض



بڑے سارے صحن میں سوکھے پتوں کا ڈھیر سا بنتا جا رہا تھا۔ سردیوں کا موسم آنکھیں بند کرکے گہری نیند میں جانے کو بس تیار ہی تھا۔ مارچ کا مہینہ آدھا تو گزر ہی گیا تھا۔ ٹنڈ منڈ سوکھے سڑے درختوں کی ٹہنیوں پر سبز کونپلوں کی آبادی بہت تیزی سے بڑھنے لگی تھی۔ جامن کے پیڑ پر نئے پھل کا بور آنے کی تیاری تھی۔ جب ہی تو سارے ہی پرانے پتے خشک ہو کر نیچے گرتے جاتے تھے۔

ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین سارا دن ہی وہ پتے نیچے صحن میں گرتے جاتے اور سعدیہ انہیں سمیٹتے سمیٹتے تھک جاتی۔ ہاں مگر ایک بار بھی اس نے تنگ آکر، جامن کے اس درخت کو کاٹ کر پھینک دینے کا نہیں سوچا تھا۔ تب بھی نہیں جب، پکی ہوئی رسیلی جامنیں، خود ہی تڑ تڑ کرتی نیچے گرتیں اور صحن کے پکے فرش پر ایسے نیلے اور گندے داغ پڑ جاتے کہ اسے روز ہی کئی گھنٹے رگڑ رگڑ کر فرش دھونا پڑتا اور داغ پھر بھی رہ جاتے۔ مگر وہ کبھی اللہ سے شکوہ نہ کرتی تھی۔

جامن کے خشک پتوں میں ادھر ادھر گری پڑی بہت سی کونپلیں بھی تو ہوتی تھیں۔ نوخیز بہت نازک سی، ننھی منی کونپلیں، ایک دو بہت چھوٹے سے، کائی سے سبز رنگت والے پتے، اس کی نظر جب بھی ان پہ پڑتی تو لمحے بھر کو وہ ٹھہر ضرور جاتی۔۔۔

شاید ایسی ہی کوئی ننھی سی کونپل اس کے وجود میں بھی تو پھوٹی تھی کبھی۔۔۔ کونپل سے پودا۔۔۔ ایک سایہ دار تناور درخت۔۔۔ ٹھنڈی گھنی چھاؤں، کسی بہت اپنے کے پاس ہونے کا سکون۔۔۔ مگر وہ کونپل تو تیز ہوا کے پہلے ہی جھونکے سے زمین پہ آن گری تھی۔

جامن کے سوکھے پتوں پر نمکین پانی کے چند قطرے پھسلتے ہوئے جاتے اور وہ بڑی مشکل سے خود کو آسمان کی طرف شکوہ بھری نگاہ ڈالنے سے روک پاتی تھی۔ بہت تیزی سے جھاڑو لگاتے ہوئے وہ تیز تیز پلکیں بھی جھپکتی تھی، اپنے ہی ہاں جائے سے اپنے آنسو چھپانے کے لیے۔

☼ ☼ ☼

"بہت بہت مبارک ہو تجھے سعدیہ!" آمنہ نے برفی کا سارا ٹکڑا اس کے منہ میں ڈال دیا اور پھر سے اسے گلے لگایا تھا۔

"خیر مبارک جی۔ خیر مبارک۔ لیکن میری خوشی تب پوری ہوتی جب تو بھی میرے ساتھ ہی اسے پاس کر لیتی۔" سعدیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"چل خیر تو نے کیا یا میں نے، ایک ہی بات ہے۔" آمنہ نے اس کی انگلیاں اپنے ہاتھ سے تھوڑی پیچھے کر اپنی طرف کھینچی تھیں۔

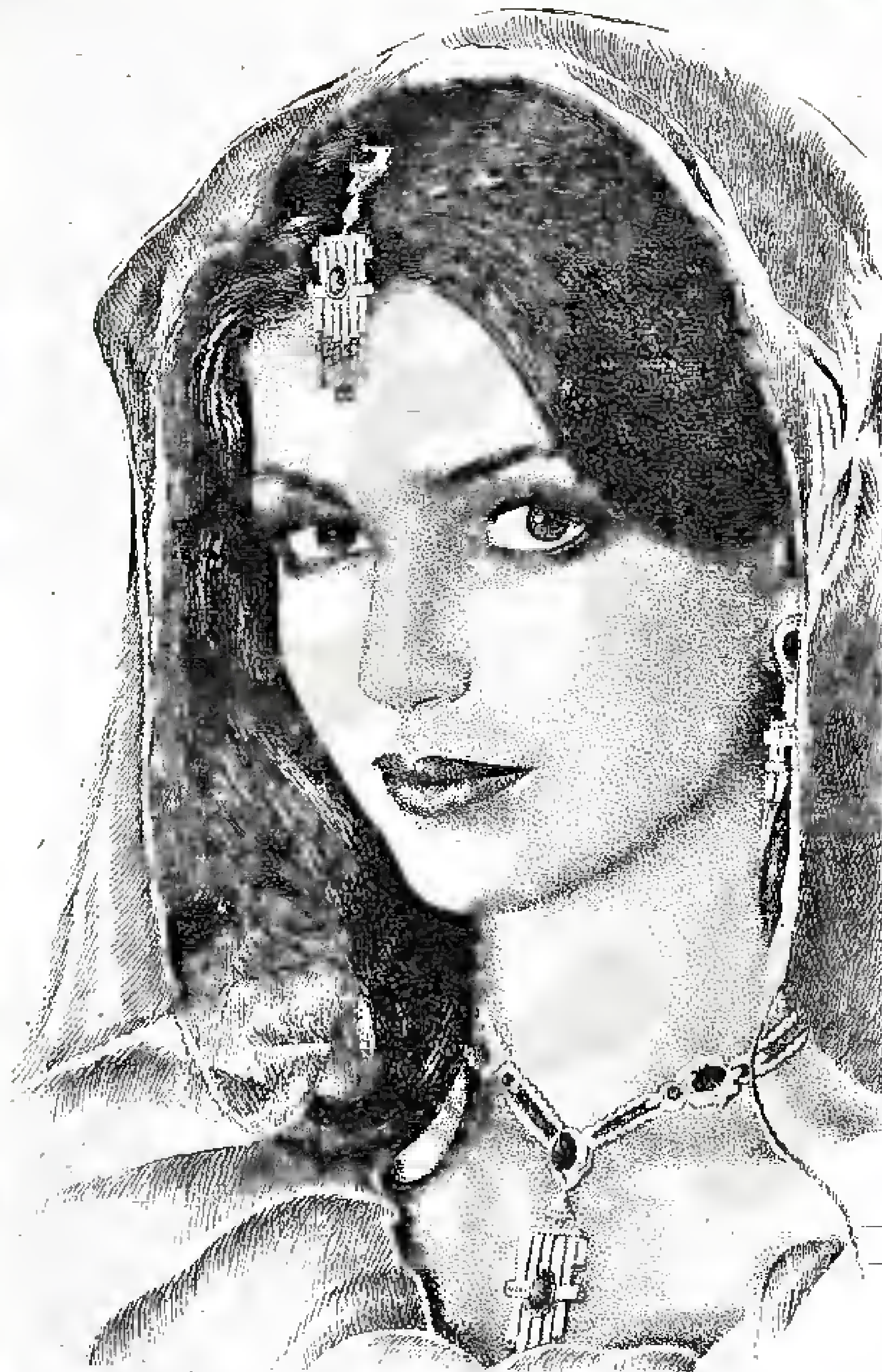
"کیا تھا جو تو تھوڑی ہمت کر لیتی۔ تایا جی کو میں نے خود منا لیا تھا۔" سعدیہ کو ابھی تک قلق تھا۔

"چل چھوڑ ناں اب، رہنے دے ناں ان کتابوں اور پڑھائیوں کی باتیں۔" آمنہ نے اس کے سرہانے کے اوپر پڑی کتاب کو ناک چڑھا کر دیکھا۔

"ہائے اللہ، میری کتاب کو ایسے نہ دیکھ سہیلی یہ تو میری جان ہے۔" سعدیہ نے اس کا اشارہ سمجھ کر فوراً وہ کتاب اٹھا کر اپنے سینے سے لگالی تھی۔

"اچھا جی ایسا کیا ہے ان میں؟" آمنہ نے اس کا مذاق سا اڑایا تھا۔

"پتا ہے اس میں جو کچھ ہے ناں اگر ہم اسے اٹھا کر اپنی زندگیوں میں ڈال دیں، تو بس پھر ہر بندہ ہی سونا ہو



جائے۔ ان میں روشنی ہے بھیا! علم کی روشنی وہ روشنی جو بندے کو کبھی گرنے نہیں دیتی خواہ کتنا بھی اندھیرا اس کی زندگی میں آجائے۔" سعدیہ جذب کے عالم میں تھی۔

"اچھا بابا! اب تو جلدی سے یہ ساری روشنی سمیٹ اور ہمارے آنگن میں اٹھا کے لے آ۔ بھائی منصور کو بڑی ضرورت ہے اس کی۔"

آمنہ نے سرسری سے لہجے میں بات کرکے اپنے تئیں اسے ٹٹولنے کی کوشش کی تھی' سعدیہ کے چہرے پر ہلکا سا سایہ لہرایا تو تھا مگر وہ صاف چھپا گئی۔

"سیدھی طرح کہہ دے ناں کہ تجھے خود میرے پیارے بھائی جاوید کے گھر میں اترنے کی جلدی ہے۔" سعدیہ نے تو الٹا اسی پر بات ڈال دی تھی۔

"بھائی منصور میرا سگا بھائی ہے۔ مگر غصے کا اتنا تیز ہے ناکہ..... ذرا دیکھ تو غور سے شاید تیری کتابوں میں پتھر دلوں کو موم کرنے کا بھی کوئی منتر لکھا رکھا ہو۔" آمنہ اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر رونے لگی تھی۔ "کاش میں تجھے بچا سکتی۔ اس وٹے سٹے کے عذاب سے نکال سکتی۔"

"یہ تو ہمارے والدین کا فیصلہ ہے پاگل لڑکی! اور والدین کا اپنی اولاد کے لیے کیا جانے والا ہر فیصلہ ہی بہترین ہوتا ہے۔ میں نے خود ان کتابوں میں پڑھا ہے۔" سعدیہ کی آنکھیں بھیگی مگر ہونٹ مسکرائے تھے۔ "اور یہ میرا تم سے وعدہ ہے سہیلی کہ وقت آنے پر یہی علم نہ صرف میرا سہارا بنے گا بلکہ میں تمہارا ہاتھ بھی پکڑلوں گی۔"

"اچھا تو پھر کھا ذرا میرے سر کی قسم۔" آمنہ کو اس کی بہادری پر حیرانی تھی۔

☼ ☼ ☼

حیرت زدہ تو خود سعدیہ بھی رہ گئی تھی۔ منصور کے رویے پر' اس کی شدت پسندی پر' اس کی جہالت پر' غصہ' لڑائی' ڈانٹ پھٹکار' مار پیٹ اور بالآخر تین برس بعد ہی بے اولادی کا طعنہ۔ سعدیہ نے بڑے ہی صبر سے یہ سب سہا تھا۔ اپنی ہی کتابوں اور لفظوں کو اپنے شوہر کے ہاتھوں پامال ہوتے دیکھا تھا اور سب کچھ اپنی جان پر سہا تھا اور پھر ایک دن منصور نے اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔

ہاں تو پھر بھی تھوڑا بہت جانتی تھی مگر جاوید کے لیے یہ صدمہ بڑا تو تھا ہی مگر غیر متوقع بھی۔ منصور اس کا تایا زاد سہی مگر دونوں میں بچپن سے ہی اک عجیب سی بے گانگی اور لاتعلقی تھی۔ کبھی کبھار کی ملاقات کا تاثر خوشگوار نہیں تو ناگوار بھی نہ تھا۔ ہاں مگر اپنی بہن اسے بڑی ہی پیاری تھی۔

"ماں کہتی ہے' ابے نے تیری منگنی میرے وٹے میں آمنہ کے بھائی منصور سے طے کردی تھی' خیر یہ تو بڑی پرانی بات ہے۔ اب تو بتا دے کیا کرنا ہے۔ اگر تو خوش نہیں تو ابے کے بعد میں کھڑا ہوں تیرے ساتھ۔ سنا ہے' وہ بڑا اکھڑ ہے۔ آج ہی دونوں رشتے توڑ دوں گا۔"

شادی سے چھ مہینے پہلے جاوید نے اسے بہت پیار سے پاس بٹھا کر کہا تھا۔

سعدیہ نے اس سنہری موقعے کو بھی ضائع کردیا کیونکہ اسی لمحے اس کی آنکھوں میں آمنہ کا سونے جیسی لشکیں مارتا چہرہ آگیا تھا جو بچپن سے اس کے بھائی کی دیوانی تھی۔

"تم ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ اور جا کر اپنے بھائی سے کہہ دینا' سعدیہ کا بھائی ابھی زندہ ہے۔ وہ لاوارث نہیں اور ہاں اب وہ اپنی بہن کی طلاق کا انتظار کرے۔ اللہ نے چاہا تو بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا اسے۔"

سعدیہ کی طلاق کا چوتھا دن تھا' جب جاوید نے یہ سب نوکیلے جملے' آمنہ کے دل میں گاڑ کر اسے بھی اپنے گھر سے باہر نکال دیا تھا۔

بات اگر صرف وٹے سٹے کی بھی ہوتی تو جاوید کا رد عمل فطری تھا۔ مگر بات تو اس کے اپنے دل کی تھی جہاں سعدیہ کی محبت کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ ابا کے بعد صرف آٹھ برس کی عمر میں ہی وہ خود بخود سعدیہ کا باپ بن گیا تھا۔ ہمیشہ اسے اپنے ساتھ' اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ کسی بہت قیمتی چیز کی طرح' بڑا ہی سنبھال کر۔ چوڑیاں' شیشے کے برتن' چاندی کی پازیبیں اور بہت سی کتابیں' ہر وہ چیز جو سعدیہ کو پسند تھی وہ اس کے لیے لاتا "لاٹ" لڑکے بالے تو اپنی منگیتروں کے لیے لاتے ہیں تحفے اور تو کیا بھلا ہے بھلا بہنوں کا بھی اتنا کرتا ہے کوئی۔" ماں شاید اسے ڈانٹتی یا پھر اپنے مان کا اظہار کرتی۔

"یہ تو مجھے بڑی ہی پیاری تھی' پھر اس کے اتنے بڑے دکھ سے بے خبر کیوں رہا میں۔" جاوید اسے چپ چپ دیکھتا تو اپنے آپ کو برا بھلا کہتا۔

"کتنا برا کیا تیرے ساتھ ہم سب نے میری پیاری بہن! کتنا برا!" اسے رہ رہ کر خود پر غصہ آتا' کتنے ہی دن تو وہ اسکول بھی نہ جاسکا تھا۔ اگر جاتا بھی تو بچوں کو الٹا سیدھا سبق دے کر فوراً" ہی لوٹ آتا۔

تب ہی ماں نے اسے یاد کروایا کہ وٹے سٹے کا ابھی ایک فرض اس کی طرف ادا کرنا باقی ہے۔ آمنہ کو طلاق دینا۔

"ہاں اماں! میں کل ہی یہ کام بھی پورا کرتا ہوں۔ اس کے بھائی کو بھی تو پتا چلے ناں ذرا..." ماں نے بیٹے کے کندھے پر شاباش کی تھپکی دی۔

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے!" سعدیہ نے شاید زندگی میں پہلی بار اس کے سامنے بلند آواز سے بولی تھی۔

"تیرا گھر اس کے بھائی نے اجاڑا تھا۔ اب اس کی بہن کا گھر تیرا بھائی اجاڑے گا۔ وٹے سٹے میں یہی ہوتا ہے۔" اماں نے بڑی فخر سے اسے حساب کتاب سمجھایا تھا۔

"اس کا بھائی تو جاہل تھا اماں! لیکن میرا بھائی علم والا ہے۔ دوسروں کو علم کی روشنی بانٹتا ہے۔ جو اس نے کیا اگر بھائی بھی وہی کرے گا تو پھر عالم اور جاہل کا فرق کیسے ہوگا۔ سیاہ اور سفید کی تمیز کون کرے گا۔ آپ ہی بتاؤ ناں بھائی؟؟"

اس نے خاموشی سے نظریں جھکائے بیٹھے اپنے بھائی کا کندھا ہلایا۔ وہ اب بھی خاموش تھا۔

"اور پھر اماں! تو نے بھائی کے بچوں کا نہیں سوچا' وہ رل جائیں گے۔" اس نے ماں کو یاد دلایا۔

"تیرا بھی تو بچہ تھا ناں۔ جسے منصور نے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی مار دیا۔ اس کا تو کسی نے نہیں سوچا۔" اماں نے اسے لاجواب کردیا تھا۔ وہ چپ سی ہوگئی۔

"باقی رب سوہنا خیر کرے' آج میں اپنے بیٹے کا پھر سے بیاہ کردوں' اللہ اور بچے دے دے گا' بچوں کا کیا ہے۔ اس مرن جوگے منصور کو تو سبق سکھانا ہے ناں۔" اماں نے پھر سے جاوید کو ہلا شیری دینا شروع کردی تھی۔

"اچھا ماں! میں اب چلتا ہوں۔ آج اسکول میں معائنے والی ٹیم نے آنا ہے' کہیں دیر نہ ہوجائے۔" وہ دھیرے سے انہیں بتا کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اس کی تھکن بھری چال اور جھکے ہوئے کندھوں نے سعدیہ کا دل تاسف سے بھر دیا تھا۔

"ننھے کو بڑا ہی تیز بخار ہے۔ میں تو کل سے پٹیاں کرکے تھک گئی ہوں۔ مہوش کا بھی حال برا ہی ہے۔ وہ دونوں ہی بابا' بابا کرتے رہتے ہیں سارا دن اور میرا دل مجھے تو لگتا ہے کسی دن بس رک ہی جاتا ہے۔ ہر وقت جاوید کی دھمکیاں میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ مجھے بچالے سعدیہ! تجھے تیرے علم کا واسطہ' اپنی کتابوں کا واسطہ! میرے بچوں کو بے آسرا ہونے سے بچالے۔ اللہ جانتا ہے' تیری بربادی میں ہمارا ریت کے ذرے جتنا بھی قصور نہیں ہے۔"

سارا دن وقفے وقفے سے اس کے موبائل پر آمنہ کے SMS آتے رہے تھے۔

رات گئے جب وہ گھر لوٹا تو اماں اندر کوٹھڑی میں عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں اور وہ باہر چارپائی پر بیٹھی اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں رکھے' جانے کیا کچھ سوچ رہی تھی۔

"ایسے کیوں بیٹھی ہے میری گڈی؟؟" وہ چارپائی پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ جب وہ اسے بہت پیار سے بلانا چاہتا تو پھر گڈی ہی کہتا تھا۔ یہ اس کی بچپن سے عادت تھی۔

"تیرے لیے پانی لاؤں بھائی!" وہ فوراً" ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لہجے کی ناراضی واضح تھی۔

"چھوڑ' رہنے دے پانی کو' ادھر بیٹھ میرے پاس اور بتا مجھے تو کیا چاہتی ہے۔ میری سوہنی گڈی!" جاوید نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ دوبارہ بٹھالیا اور اپنا دایاں بازو اس کے کندھے پہ بڑھا کر بہت نرمی سے اسے اپنے ساتھ بھی لگالیا تھا۔

"تم آمنہ اور بچوں کو گھر واپس لے آؤ بھائی! اور طلاق کے منحوس لفظ کو اپنے دل دماغ سے کہیں دور پھینک دو۔ میں بس یہی چاہتی ہوں۔" اپنے کندھے پر سے اس کا بازو ہٹاتے ہوئے اس نے دوٹوک بات کی۔

جاوید نے ایک لمبی سی سانس لے کر شاید اپنے اندر اٹھتے اضطراب کو روکنے کی سعی کی تھی۔

"پھر وہی جذباتی باتیں؟"

"یہ نہ میرا بھائی! ایسے نہ بول تو اور میں تو علم والے ہیں' کتابوں کے دوست اور لفظوں کے شیدائی۔ ہمیں جاہلوں جیسا اندھا نہیں بننا ہے۔ ذرا سوچ اس بارے میں۔"

سعدیہ نے اب خود اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگالیا تھا۔

"کتاب ۔۔۔ کتاب کی بات کرتی ہے ناں۔ اللہ کی کتاب سے بڑی تو کوئی کتاب نہیں ہے ناں دنیا میں۔ اس کتاب میں لکھا ہے 'بدلہ لو' پورا پورا بدلہ لو' آنکھ کے بدلے آنکھ' کان کے بدلے کان اور جان کے بدلے جان۔"

جاوید نے اسے قائل کرنے کو بڑی پکی دلیل دی تھی۔

"مگر دل کے بدلے دل بھی توڑ دو۔ یہ تو نہیں لکھا ناں وہاں بھائی!" سعدیہ کے ایک جملے نے جاوید کو ششدر کر دیا تھا۔

"ہاں دیکھو میری طرف' میرے ہاتھ' آنکھیں' کان' زبان کچھ بھی تو نہیں ضائع ہوا' سب کچھ تو ہے' منصور نے تو بس میرا دل ہی برباد کیا ہے ناں بھائی! تو اب اس کا تو بدلہ نہیں ہوتا ناں۔ بلکہ اللہ سوہنا تو کہتا ہے' جس نے معاف کر دیا' بدلہ لینے کی قدرت رکھنے کے باوجود معاف کر دیا تو پھر اس کا اجر میرے ذمے۔

میرا معاملہ بھی اب میرے رب کے ذمے اور بس وہی میرا ٹوٹا ہوا دل جوڑ دے گا۔ اپنی رحمت سے' اپنے فضل سے' مجھے کسی کا گھر اجاڑ کر کوئی بدلہ نہیں لینا۔"

بہت مضبوط لہجے میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے وہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

اگلے دن کی شام تھی' جب ان کے آنگن میں بچوں کا بہت سا شور اور جاسمن کے بہت سے خشک پتے تھے۔ جاوید خود جا کر آمنہ کو لے آیا تھا۔ اماں ابھی تو ناراض تھیں مگر سعدیہ کو یقین تھا کہ وہ رفتہ رفتہ مان ہی جائیں گی۔

آمنہ کی آنکھوں میں سعدیہ کے لیے شکر گزاری کے بہت سے آنسو تھے۔ جنہیں وہ اس کے پاس بیٹھی بہا رہی تھی۔

"جو سنتا ہے' حیران رہ جاتا ہے۔ سعدیہ کے پاس اتنا حوصلہ' اتنا جگرا آیا کہاں سے' اب تو ہی بتائیں تیرا کیسے شکریہ ادا کروں؟" وہ سعدیہ کے سامنے ہاتھ بار بار باندھ دیتی تھی۔

"ایسے مت کرو آمنہ! میں نے تمہارے لیے کوئی اتنا بڑا کام نہیں کیا جو تم بار بار میرا ہاتھ پکڑ کر شکریہ کہتی ہو اور جہاں تک بات ہے حوصلے کی تو یہ مجھے دیا میری کتابوں نے' میرے اللہ نے' مجھے علم کی روشنی دے رکھی ہے آمنہ' وہ روشنی جو انسان کو سیاہ اور سفید میں فرق کرنا سکھاتی ہے۔ بس وہی روشنی میں نے تمہاری زندگی میں بھر دی اور ۔۔۔ اور کچھ بھی نہیں۔"



تنزیلہ ریاض

عہدِ الست

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرہ ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کر پا رہا۔ مسجد میں پاکستان سے آئے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع پر نور محمد بہت گھبراتا ہے۔

عمر شہروز کا کزن ہے' جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہروز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچہ پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے

مکمل ناول



اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

۳
تیسری قسط

"تم کیوں اتنی پریشان ہو زارا؟ منگنی عمر کی ٹوٹی ہے تمہاری نہیں۔" شہوز نے اس کے الجھے بکھرے سراپے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے زرا کی ذرا طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ وہ جواباً کچھ نہیں بولی تھی مگر ایک شکوہ سا آنکھوں میں در آیا تھا۔ شہوز اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھنے لگا۔ اسے زارا پر بھی تھوڑا سا غصہ تھا کہ وہ اس دن عمر سے جھگڑے کے بعد اٹھ کر اس کے ساتھ کیوں نہیں آئی تھی۔

وہ دونوں اس وقت ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ دوپہر ڈھل کر سہ پہر بن چکی تھی۔ اس غیر ملکی ریسٹورنٹ میں اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔ اکا دکا مین انگریزی نظر آرہے تھے۔

یہ ریسٹورنٹ یونیورسٹی سے نزدیک تھا اسی لیے زارا کو لے کر شہوز یہاں آگیا تھا جو اس سے ملنے کے لیے بطور خاص یونیورسٹی آئی تھی۔ واقعہ تو اچھا ہو گیا تھا سو اس جانب سے شہوز کافی مطمئن ہو چکا تھا۔ عمر سے جھگڑنے کے بعد اب تک ان کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ زارا کو اندازہ تھا کہ شہوز کا موڈ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا ہو گا۔ وہ جلدی غصے میں نہیں آتا تھا لیکن جب اس کا مزاج کسی بات پر برہم ہو جاتا تھا تو نارمل ہونے کئی دن لگ جاتے تھے اسی لیے وہ اس کی خفگی دور کرنے کے غرض سے یہاں تک اپنی ہر مصروفیت ترک کر کے آئی تھی لیکن شہوز کا رویہ اسے مزید بے چین کر رہا تھا۔ دوسری طرف شہوز نے بظاہر خود کو کمپوز کر لیا تھا۔ وہ اب سارے قصے سے خود کو انتہائی لاتعلق ظاہر کر رہا تھا مگر اسے اندازہ تھا کہ زارا نہ صرف پریشان ہے بلکہ الجھی ہوئی بھی ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اتنی ہی حساس تھی۔ اب بھی شہوز کا طنزیہ جملہ سن کر اس کی آنکھیں جھلمل کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس لیے شہوز کی خفگی کا گراف بھی بڑھ رہا تھا۔

"یہ سب کیسے حل ہو گا شہوز۔ اب کیا کریں گے ہم؟" وہ اسی الجھے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

"تمہیں کوئی اور بات کرنی ہے یا ہم چلیں اب۔" شہوز کے اس طرح سے کہنے پر اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔

"ایسے مت کہو شہوز۔ وہ بہت پریشان ہے۔" شہوز کو خدشہ تھا کہ وہ رونے لگے گی لیکن اس کے عمر کی حمایت میں بولنے پر وہ بھڑک اٹھا۔

"پریشان کون نہیں ہے زارا؟ وہ پریشان ہے۔ میں نہیں ہوں۔ میں تو پشیمان بھی ہوں۔ شرمندگی ہو رہی ہے مجھے اس سارے ایشو سے مجھے لگتا ہے زارا! اس سارے پرابلم کا ذمہ دار میں ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس سارے معاملے میں ٹانگ اڑانی ہی نہیں چاہیے تھی۔ عمر جو بھی کرتا جیسے بھی کرتا۔ اس کی مرضی جس لڑکی سے کرتا یا نہ کرتا یہ سب اس کا سر درد ہوتا۔ میرا نہیں۔ مجھے تو کسی کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔ اب بتاؤ ڈیڈی مجھ سے پوچھیں گے تو میں کیا جواب دوں گا۔ کانچ کا گلاس نہیں ٹوٹا' رشتہ ٹوٹا ہے زارا بی بی! ڈیڈی ہی نہیں پوچھیں گے بلکہ چاچو بھی مجھ سے ہی سوال جواب کریں گے۔ سب بڑے تو یہی سمجھتے ہیں کہ عمر اپنی مرضی سے نہیں شہوز کی مرضی سے شادی کر رہا ہے۔ وہ امائمہ کو عمر کی نہیں میری پسند سمجھتے ہیں۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ زارا کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا جہاں عجیب سی سوچ نے تانا بانا بن رکھا تھا۔ اس نے شہوز کو اتنے جذباتی انداز میں پہلی دفعہ دیکھا تھا۔

"اس میں غلط کیا ہے شہوز؟" زارا اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ "تم مان کیوں نہیں لیتے کہ امائمہ تمہاری پسند ہے۔" وہ جیسے زچ ہو کر بولی تھی۔

"زارا۔ ایسا نہیں ہے۔" شہوز اس کی بات سن کر ششدر رہ گیا۔ وہ نجانے کیا سوچ رہی تھی۔

"ایسا ہی ہے شہوز۔ تمہیں امائمہ جیسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں' جو ذہین ہوں۔ کانفیڈنٹ ہوں۔ انہیں اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ ہو۔ وہ ویل بیہیوڈ ہوں اور امائمہ میں یہ سب کوالٹیز ہیں اس لیے تم اسے پسند کرتے ہو جیسے اسے لائف پارٹنر نہیں جنت مل گئی ہو۔ تم عمر کی فیلنگز کو' اس کے ایموشنز کو سمجھ نہیں پا رہے۔ وہ ہرٹ ہو رہا ہے۔ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے شہوز! جو فیڈر پی کر سو جائے یا کارن فلیکس کھا کر اسکول چلا جائے۔ تم کو تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا شہوز۔ اس سے پوچھنا چاہیے تھا کہ ایسی کیا بات ہوئی جو اس نے یہ سب کیا۔ وہ جذباتی ہے۔ لیکن بدتمیز نہیں ہے۔"

پتا نہیں اس کی بات مکمل ہوئی تھی کہ نہیں مگر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ شہوز خاموش کا خاموش رہ گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے زارا کی باتیں بہت بری لگی تھیں۔

"مجھے بھی اس پر غصہ آیا تھا لیکن میں نے غصہ پی لیا۔ میں جانتی ہوں۔ وہ کتنا جذباتی ہے' تمہیں بھی پتا ہی ہے اس کی ذہنی کیفیت کا۔ تم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا شہوز۔" وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولی تھی۔

"تم نے اگر اپنا غصہ پی لیا تھا تو پھر تم پوچھ لیتیں کہ ایسی کیا بات ہوئی جو شہزادے عمر کے مزاج پر گراں گزری اور۔" زارا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں پوچھ چکی ہوں" شہوز نے استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔ اس کا موڈ بری طرح بگڑ چکا تھا۔

"امائمہ نے مس بی ہیو کیا ہے اس کے ساتھ۔" زارا نے اپنی جانب سے کوئی گہرا راز اگلا تھا مگر شہوز پر مطلق اثر نہ ہوا۔

"مس بی ہیو۔ امائمہ نے؟ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ عمر نے تمہیں غلط معلومات بڑھا چڑھا کر بتائی ہے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ زارا! تم نہیں جانتیں وہ بہت سوفیسٹی کیٹڈ ہے ہماری کلاس کی سب سے ایلی گینٹ اور گریس فل لڑکی۔"

"میں نے کہا نا۔ تم کافی پسند کرتے ہو اسے۔" زارا کا چہرہ اور انداز بالکل نارمل تھا۔ اس میں کوئی طنز یا کاٹ نہیں تھی۔ لیکن شہوز بھڑک اٹھا۔

"زارا تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ صاف صاف کہو نا۔ کیا کھچڑی پک رہی ہے تمہارے ذہن میں؟" وہ بھڑک کر

بولا تھا۔ زارا نے جتاتی ہوئی نظروں سے اس کو دیکھا۔

"مجھے میری بات مکمل کرنے دو شہوز۔ تم لائمہ کو کافی پسند کرتے ہو لیکن ایک کلاس فیلو کی نظر سے۔ تم کہتے ہو وہ تمہاری کلاس کی سب سے ایلی گینٹ اور گریس فل لڑکی ہے۔ کیا پتا شہوز! میرے کلاس فیلوز میرے بارے میں یہی کہتے ہوں۔"

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ شہوز اس کی بات کا مفہوم سمجھ نہیں پایا تھا۔

"میرے کلاس فیلوز میرے بارے میں جو بھی کہتے ہیں تم اس سے کبھی متفق نہیں ہوگے کیونکہ تمہارا اور میرا رشتہ وہ نہیں ہے جو میرا اور میرے کلاس فیلوز کا ہے۔ اسی طرح جب تم لائمہ کی بات کرتے ہو تو عمر کا اس سے ایگری کرنا ضروری تو نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں وہ لائمہ کو پسند کرتا ہے۔ تمہارا اندازہ درست تھا کہ عمر کافی عرصہ سے لائمہ میں انٹرسٹڈ ہے۔ اس نے یہ بات تب ہمیں بتائی جب ہم اس کے بارے میں مشکوک ہوئے۔ اب وہ دونوں انگیجڈ ہیں۔ انہیں اپنے طریقے سے اپنے تعلقات بہتر بنانے دو۔ تمہاری کوئی بھی غیر ضروری نصیحت یا مشورہ عمر کو بلاوجہ تم سے متنفر کردے گا۔ تمہاری اور اس کی دوستی میں دراڑ پڑ جائے گی شہوز۔ لائمہ کی وجہ سے تم عمر جیسا دوست کھودو گے۔ تمہیں اچھا لگے گا؟"

وہ خاموش ہوگئی تھی۔ شہوز ایک ٹک اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ منہ سے کچھ نہیں بولا تھا لیکن دل میں اعتراف کرلیا تھا کہ زارا کچھ غلط نہیں کہہ رہی۔

"زارا! تم کیا چاہتی ہو؟ اب 'اب تو سب کچھ ختم ہوچکا۔ تمہاری باتیں فرض کرلو اگر سچ بھی ہیں تو اب ہم کچھ نہیں کرسکتے عمر اس کی انگلی سے رنگ اتار کر لے آیا ہے' یہ بات تو تم بھی مانو گی کہ عمر نے اپنی جذباتیت میں ہماری بہت انسلٹ کروائی ہے۔" اب کی بار شہوز نے تحمل سے اپنی بات مکمل کی تھی۔

"وہ جذباتی ہے' میں مانتی ہوں' لیکن اس نے انسلٹ نہیں کروائی ہماری۔ یوں سمجھو بات ابھی ان دونوں کے درمیان ہی ہے۔ جو بھی مس انڈر اسٹینڈنگ ہے یا لائمہ کو ہوئی۔ وہ دور کی جاسکتی ہے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہے تو یقیناً" لائمہ کو بھی ہوگا۔ تم اسے تنقیدی نگاہوں سے دیکھنا چھوڑ دو شہوز۔ تمہاری یہ باتیں اسے مزید ہرٹ کریں گی اور وہ پہلے سے زیادہ غصہ کرے گا۔ اس کی واپسی میں زیادہ دن نہیں رہ گئے' اس کو تمہاری فیور کی ضرورت ہے شہوز وہ پریشان ہے اور شرمندہ بھی۔" ناصحانہ انداز میں کہتی زارا اس لمحہ شہوز کو بڑی مختلف سی لگی۔

"اسے شرمندہ تو ہونا ہی چاہیے لیکن پریشان کیوں ہے وہ؟" شہوز نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ زارا چند لمحے کچھ نہ بولی' پھر اس نے گہری سانس بھری۔

"تو شیل یو وانڈ تھے۔۔۔ وہ بھی کافی پسند کرتا ہے لائمہ کو تمہاری طرح۔" شہوز کے چہرے پر استہزائیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ زارا اس کے پاس عمر کی حمایت کرنے آئی تھی اور کافی اچھے طریقے سے یہ کام کرچکی تھی۔ وہ یہ نہ بھی کرتی تب بھی شہوز کو غصہ ٹھنڈا ہوجانے کے بعد عمر کی فیور تو کرنا ہی تھی اور یہ بات وہ "ہوتی ہیں محبت میں بھی کچھ راز کی باتیں۔" کے مصداق زارا کو نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کی اور عمر کی دوستی ایسی باتوں سے ختم نہیں ہونی تھی' بلکہ ہر جھگڑے کے بعد وہ پہلے سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب آجاتے تھے۔

"اب کیا سوچ رہے ہو؟" اس کی استہزائیہ مسکراہٹ اور خاموشی سے اکتا کر زارا نے اسے ٹوکا تھا۔ شہوز نے لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ پریشان تھی اور شہوز اسی ایک بات کو طول دے کر اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"یار! تمہارے کلاس فیلوز واقعی تمہیں ایلی گینٹ اور گریس فل کہتے ہیں۔" اس نے سر کھجاتے ہوئے مصنوعی حیرت سے کہا تھا۔ زارا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔

"میرے لیے زیادہ اہم وہ ہے جو تم مجھے کہتے ہو۔" زارا نے مسکراتے ہوئے اعتماد بھرے لہجے میں کہا تھا' پھر شہوز کے چہرے پر استفہامیہ رنگ اور مسکراہٹ دیکھ کر بولی۔

"ٹیوب لائٹ۔"



اس روز گھر میں ایک عجیب پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ عین بارہ بجے معمول کے مطابق گھر کے باہر موٹر بائیک آکر رکی۔ گھر کے مکین ہی نہیں درودیوار بھی اس موٹر بائیک کی آواز کو بخوبی پہچانتے تھے۔ یہ اس کے ابو کی موٹر بائیک کی آواز تھی۔

ابو روزانہ اسی وقت گھر آتے تھے' لیکن آج کچھ ایسی بات ضرور تھی کہ اس موٹر بائیک کی آواز سن کر نا صرف وہ بلکہ اس کی امی اور چھوٹی بہن سہم سے گئے تھے۔

"ای۔۔۔ ای جی۔۔۔" اس کے منہ سے کراہ نما آواز نکلی۔ اس کی امی نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا' لیکن ہمیشہ کی طرح ان کی زبانی ہمدردی اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتی تھی۔ اس کی امی کا دل چاہا کہ بیٹے کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دیں' مگر اس لمحاتی تسلی کا فائدہ بھی کیا تھا۔ یہ بات وہ سمجھ سکتی تھیں' مگر ان کی سات سالہ بچی نہیں۔

"کچھ نہیں ہوگا بھائی۔۔۔ آپ ڈریں مت۔"

وہ اٹھ کر بھائی کے قریب آبیٹھی اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بہن ابو کی لاڈلی ہے' مگر اس لمحہ لاڈ پیار بھی بے فائدہ تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پہلے آٹومیٹک لاک کھلنے کی آواز آئی' پھر بائیک اندر کیے جانے کی آوازیں آنے لگیں۔ چند منٹ بعد لاک دوبارہ بند ہونے کی آواز آئی۔ ابو یقیناً" بائیک اندر کھڑی کرچکے تھے۔ مزید چند منٹ کا کھیل باقی تھا۔ عادت کے مطابق ابو کو باہر لگے واش بیسن پر ہاتھ دھونے تھے۔ پالتو طوطے کا دانہ پانی چیک کرنا تھا اور اندر آجانا تھا اور پھر۔۔۔

اسے یک دم ہی جھرجھری محسوس ہوئی۔ اب نل سے پانی گرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ چند منٹ بعد پانی گرنے کی آواز آنا بند ہوگئی اور پھر جالی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کا تنفس تیز ہوا اور ہتھیلیاں بھیگنے لگیں۔ اس کی بہن نے مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ ابو اندر داخل ہورہے تھے۔ ان کے چہرے کے تاثرات نے اسے اپنا ہاتھ بھائی کی ہاتھ سے ہٹا لینے پر مجبور کیا۔ وہ شاید سمجھ چکی تھی کہ تنکا بے شک ڈوبنے والے کو سہارا دے سکتا ہے' مگر ڈوبنے والا تنکے کو کوئی سہارا نہیں دے سکتا۔ اس نے بہن کی جانب نہیں دیکھا' مگر اس کا یہ اضطراری عمل اس پر بہت کچھ واضح کرگیا تھا۔ وہ ابو کے قدموں کی چاپ بہت قریب محسوس کررہا تھا۔ دل ہی دل میں اس نے الٹی گنتی شروع کردی۔ ہر ہندسے کے ساتھ اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہورہا تھا۔ دس سے شروع کرکے وہ زیرو پر پہنچ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ضبط کے باوجود پانی کے چند قطرے پھسلے۔ اس کی امی نے بے حد دکھ سے اس پانی کی جانب دیکھا۔ چاہنے کے باوجود وہ شوہر کی جانب نہیں دیکھ پائی تھیں۔

اسی لمحہ جب اس سمیت' اس کی امی اور بہن خود کو متوقع صورت حال کے لیے تیار کرچکے تھے اچانک کال بیل بج اٹھی۔ ابو خاموشی سے واپس مڑ گئے۔ اس کے ہونٹوں سے دبی دبی سانس خارج ہوئی۔ ابھی وہ پہلو بھی نہیں بدل پایا تھا کہ اس نے ابو کے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ دروازے سے ملنے والے کو فارغ کر آئے تھے۔ مزید چند لمحوں بعد وہ جو کچھ کرنے والے تھے۔ اس کے لیے بہت ضروری تھا کہ گھر میں کوئی باہر والا موجود نہ ہو۔

اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ اس نے سر کو بالکل جھکا لیا۔ اب وہ کسی کی جانب نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"میرے کمرے میں آؤ۔" اس کی سماعتوں نے ابو کے سرد لہجے میں دیے گئے حکم کو سنا' اب کی بار اس نے امی یا ابو کی جانب دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر ابو کے پیچھے ان کے کمرے

کی جانب چل دیا۔ امی نے اسے تسلی دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایک بے عمل خاتون تھیں۔ کسی بھی مشکل لمحے میں وہ کوئی عملی قدم اٹھانے کے بجائے تسبیح کے دانے گرانے کو ترجیح دیتی تھیں۔ اس نے جھکے سر کے ساتھ کمرے میں قدم رکھا۔

"دروازہ بند کردو۔" ابو نے پہلے سے زیادہ سرد لہجے میں حکم دیا۔ اس نے دروازہ بند کردیا۔

"کنڈی لگاؤ۔" اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ کنڈی ایک بار لگ جاتی تو اسے ابو کے علاوہ کوئی نہیں کھول سکتا تھا۔

"میں نے کہا کنڈی لگادو۔" اسے متامل دیکھ کر وہ تلخ لہجے میں بولے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ کنڈی لگادی اور پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ کمرے کے وسط میں پہنچ گیا۔ جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اس نے ابو کے ہاتھ میں اپنا اعمال نامہ دیکھ لیا تھا۔ ان کے ہاتھ میں اس کے سیریز ٹیسٹ کی مارکس شیٹ تھی۔

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے اس کے سامنے اس کی مارکس شیٹ لہرائی۔ اس سوال کا جواب وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ وہ پھر غرائے۔

"میں نے پوچھا ہے کچھ؟" ہر اگلا جملہ ان کے درجہ حرارت کو بڑھا رہا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" اب کی بار انہوں نے اس کا کان پکڑ لیا تھا۔

"ما۔ مارکس شیٹ۔ میری مارکس شیٹ۔" وہ منمنا کر بولا۔ ابو نے اتنی زور سے اس کے کان کو پکڑ رکھا تھا کہ تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"میں جانتا ہوں' یہ مارکس شیٹ ہے اور تم جانتے ہو' میں مارکس شیٹ کے متعلق نہیں پوچھ رہا؟ وہ بتاؤ جو میں پوچھ رہا ہوں۔"

انہوں نے اس کا کان موڑا۔ اس نے سہم کر التجائیہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔ سرخ ہوتے چہرے اور آنکھوں کے ساتھ ڈبڈبائے لہجے میں اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی' مگر الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ تین نمبروں کے فرق سے وہ فرسٹ پوزیشن لینے میں ناکام ہوگیا تھا۔ اسکول میں میٹرک کے سالانہ امتحان سے پہلے ایک سیریز ٹیسٹ ہوتے تھے' جن میں پورے میٹرک کے امتحان کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ ان ٹیسٹ کا پورا رزلٹ بنتا تھا۔ ان ہی ٹیسٹ میں وہ سیکنڈ پوزیشن لے سکا تھا۔ سلیمان حیدر اس بار فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

یہ اگرچہ پہلی بار ہوا تھا' مگر چونکہ یہ امتحان نہیں تھے' ٹیسٹ تھے۔ اس لیے اس کے ٹیچرز ابھی بھی اس کے متعلق بہت پراعتماد تھے۔ وہ یقین سے اس کے بارے میں پیش گوئی کرتے تھے کہ وہ بورڈ میں ضرور پوزیشن حاصل کرے گا۔ ابو اس کے متعلق ہمیشہ مشکوک رہتے تھے گزشتہ پروموشن ٹیسٹ میں اس کے اور سلمان کے نمبروں میں آٹھ نمبرز کا فرق تھا۔ سلیمان کے آٹھ نمبرز کم تھے اور اس نے سیکنڈ پوزیشن لی تھی ابو نے تب ہی اسے وارن کردیا تھا کہ اتنے کم نمبروں میں فرق کوئی فرق نہیں ہوتا' اسے اگلی بار پچاس نمبروں کے فرق سے لیڈ کرنا چاہیے۔ مگر وہ فرسٹ پوزیشن ہی نہیں حاصل کرپایا تھا۔

"میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے۔" اسے مسلسل خاموش دیکھ کر وہ دھاڑے۔ اس نے پلکیں جھپکا کر آنسو پینے کی کوشش کی تھی۔

"ابو جی۔۔۔ وہ جو ایک سوال تھا ایکسرسائز 5 کا۔۔۔ وہ جو میری بک میں غلط تھا۔ وہ مجھے نہیں آتا تھا۔ سر اظہر نے کہا تھا کہ وہ سوال پیپر میں نہیں آئے گا مگر وہ آگیا ابو جی میں نے۔۔۔" آنسو ضبط کرتے ہوئے وہ مسلسل بول رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اب بھی نہیں بولا تو ابو کا پارہ مزید چڑھ جائے گا۔

"الو کے پٹھے! صرف تیری کتاب میں غلط تھا۔۔۔ اس کی کتاب میں غلط کیوں نہیں تھا۔ جس نے فرسٹ پوزیشن لی ہے۔" اب کی بار اس کے گال پر ایک زوردار تھپڑ پڑا تھا۔

"اس نے بھی اندازے سے کیا تھا۔ لیکن۔۔۔" وہ رونے لگا تھا۔ جس کے باعث اس کی آواز حلق میں پھنس گئی تھی۔

"ہاں فیثا غورث نے خود آکر سکھلایا تھا اسے' جو اس کا جواب صحیح آگیا اور تیرا غلط۔" اسے ایک اور تھپڑ پڑا تھا۔

"آپ سر رضا سے پوچھ لیں' میں نے ان کو بھی بتایا تھا۔ میں سچ۔۔۔"

"پہلے تجھ سے تو پوچھ لوں' پھر سر رضا سے بھی پوچھ لوں گا۔" انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں نے کیا کہا تھا تجھ سے کہ تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔۔۔ سارا دن کام چوروں کے ساتھ کھیلے گا تو یہی حال ہوگا۔ میں واقعی تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔ اتنی مشکل سے عزت بنتی ہے معاشرے میں تو میرا نام ڈبو دے لوگ کہتے ہیں دوسروں کو کیا پڑھائے گا یہ جب اپنے بیٹے کو نہیں پڑھا سکتا۔ اب میں انہیں کیا بتاؤں کہ میرا بیٹا کام چور اور نکما ہے۔ کہتا ہے کتاب میں سوال غلط ہے تیری کتاب میں سوال غلط ہے صرف۔ تیری کتاب میں؟ صرف تیری کتاب میں؟"

وہ کہہ رہے تھے اور ساتھ ساتھ یہ دیکھے بنا کہ ان کا تھپڑ کہاں پڑتا ہے۔ اسے پیٹ رہے تھے۔ وہ رونے کے ساتھ ساتھ معافی مانگ رہا تھا اور اس کی امی بند دروازے کے پیچھے آنسو بہانے میں مصروف تھیں۔

"ایک ایک نمبر کی جنگ میں ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔" اگلے روز ابو نے ناشتے کی میز پر سخت لہجے میں اسے نصیحت کی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا۔ وہ مزید کہہ رہے تھے۔

"تین ہفتے رہ گئے ہیں ایبول ایگزامز میں۔۔۔ تم دودھ پیتے بچے نہیں ہو کہ ہر بات نئے سرے سے سمجھائی جائے۔ تمہیں خود پتا ہونا چاہیے کہ ہر لمحہ تمہارے لیے کتنا اہم ہے اب میں تمہیں وقت ضائع کرتے نہ دیکھوں اور نہ ہی تمہارے منہ سے یہ بات سنوں کہ فلاں چیز اس لیے غلط ہوگئی کہ وہ کتاب میں غلط تھی۔"

ان کا انداز اور لہجہ بے لچک تھا' مگر پھر بھی وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کی معذرت قبول کرلی گئی ہے۔ کل کی ساری رات رونے کے بعد وہ ان سے معافی مانگتے وقت دوبارہ نہیں رویا تھا۔ اس کا لہجہ نم تھا۔ مگر اس نے اپنی آنکھوں کے کناروں کو بھیگنے نہیں دیا تھا۔ ابو نے اسے واضح لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔

"میں اب کبھی رنگوں کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ میں ڈرائنگ بناؤں گا نہ کارڈز' رنگ اتنے اہم نہیں کہ میں ان کے لیے ابو کو ناراض کروں۔"

اس نے دل میں یہ تہیہ بھی کیا تھا۔ ابو نے منہ سے نہیں کہا تھا کہ وہ ڈرائنگ میں مصروف رہ کر اپنا وقت ضائع کررہا ہے۔ مگر وہ سمجھ گیا تھا کہ ابو اس کی خراب کارکردگی کی وجہ اس چیز کو سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اسے چند روز قبل بہن کے ساتھ مل کر اس کی سہیلی کے لیے برتھ ڈے وش کارڈ بناتے دیکھ لیا تھا۔

تین ہفتے بعد اس کے ایگزامز شروع ہوگئے تھے۔ اسے خود پر بھروسا تھا' نہ اپنی محنت پر' مگر وہ بے تحاشا پڑھنے پر یقین ضرور رکھتا تھا۔ اس نے دن رات ایک کرکے پیپرز دیے تھے۔ ابو کا اور ان کی ناراضی کا خوف امتحان کے خوف سے کہیں زیادہ تھا۔ لیکن کوئی بھی خوف اس کی کارکردگی کو متاثر نہیں کرپایا تھا۔ اس کے سب ہی پیپرز اچھے ہوگئے تھے۔

"ابھی ہم فرسٹ ایئر کی پڑھائی شروع نہیں کریں گے۔ فی الحال تم ان کتابوں کا' اپنی کورس آؤٹ لائن کا جائزہ لو۔۔۔ ان میں موجود تصویریں دیکھو۔ دل چاہے تو تصویریں بنا کر ان میں رنگ بھرو۔۔۔ ہم پریکٹیکلز کے بعد پڑھائی شروع کریں گے۔"

یہ ابو کا ایک اور حکم تھا جو انہوں نے بظاہر مسکرا کر دیا تھا۔ یعنی وہ اسے خود رنگوں سے کھیلنے کی اجازت دے رہے تھے۔ اس حکم نے اسے خوش کردیا تھا وہ کم از کم چند دن پڑھائی کے بوجھ سے خود کو بچا سکتا تھا۔ پریکٹیکلز کے لیے جرنل بکس تیار تھیں۔ اس نے پریکٹیکلز کی کئی بار پریکٹس کی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ دن اس نے بہت مطمئن ہو کر گزارے۔ یہی وجہ تھی کہ پریکٹیکلز کے بعد جب اس نے فرسٹ ایئر کی پڑھائی شروع کی تو وہ بہت تازہ دم تھا۔ ابو کا بے جا تسلط یہاں

بھی جاری تھا۔
میتھ اس کا فیورٹ سبجیکٹ ہونے کے باوجود ابو نے اسے پری انجینئرنگ منتخب کرنے کا حق نہیں دیا تھا۔ یہ بات جیسے اس کی پیدائش کے وقت سے طے شدہ تھی کہ اسے پری میڈیکل ہی لینا ہے اور وہ پری میڈیکل کی بکس ختم کرنے میں مگن ہو گیا۔
جب میٹرک کا رزلٹ اناؤنس ہوا تو وہ فرسٹ ایر کے کورس کا پچاس فیصد مکمل کر چکا تھا۔ میٹرک میں اس نے پورے سات سو اسی نمبر لے کر پورے لاہور بورڈ میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ اب کی بار اس نے ابو کو ڈانٹنے یا مارنے کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ اس کی اتنی بڑی کامیابی پر فیملی کے علاوہ اس کے ٹیچرز بھی بہت خوش تھے۔ اس کے اسکول کو یہ اعزاز پہلی مرتبہ حاصل ہوا تھا کہ وہاں پڑھنے والے کسی بچے نے بورڈ میں ٹاپ کیا تھا۔ اس کے حلقے میں جہاں اسے بے پناہ شاباشی ملی' وہاں یہ بھی سننے کو ملا کہ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ اکثر لوگوں کو یقین تھا کہ جس طرح وہ دن رات کتابوں کو چاٹنے میں مصروف رہتا تھا ایسی صورت میں اس کا پوزیشن نہ لینا حیران کن امر ٹھہرتا۔
وہ بہر حال خوش تھا کہ وہ ابو کو خوش کر پایا۔
جب کالج میں ایڈمیشن کا معاملہ شروع ہوا تب بھی ابو نے اس کے لیے شہر کے سب بڑے کالجوں کو چھوڑ کر ایک غیر معروف کالج کا انتخاب کیا۔ اسی پر موقوف نہیں' وہ بہت سے حیران کن کام کر رہے تھے۔ اس کے ابو کو نجانے کیوں سب کو حیران کرنے کا شوق ہو چلا تھا اور اس کے معاملے میں تو یہ شوق انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ سب حیران ہوئے تھے کہ وہ ابھی چودہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا اور اس نے میٹرک کر لیا تھا۔ دوسرے بچوں نے فرسٹ ایر کے کورسز خریدنے شروع کیے تھے اور اس نے پچاس فیصد سلیبس ختم کر لیا تھا اور اس کے اتنے شان دار رزلٹ کے باوجود اسے مشہور کالج میں داخلہ کیوں نہیں دلوایا گیا تھا۔
جس روز ابو نے اس کی کالج فیس جمع کروائی اسی روز سر شعیب جو اس کے اسکول کو آرڈینیٹر سے سیکنڈ پرنسپل بن چکے تھے۔ اس سے ملنے چلے آئے۔ انہیں جب یہ پتا چلا کہ اس نے جی سی اور ایف سی کالج کو چھوڑ کر ایک غیر معروف کالج کا انتخاب کیا ہے تو انہوں نے ابو سے کافی بحث کی۔
"مجھے آج تک آپ کی کوئی لاجک سمجھ نہیں آئی۔ آپ اپنے بچے میں اعتماد اور حوصلہ پیدا کرنے کے اس قدر خلاف کیوں ہیں۔ میرا بچہ اتنا ذہین ہوتو میں ناچتا پھروں۔ آپ نے اس کی اتنی بڑی کامیابی پر اسے ٹھیک طرح خوش ہونے کا موقع بھی نہیں دیا۔ آپ خود کسی اسکول فنکشن میں آئے نہ اسے آنے دیا۔ پرنسپل صاحب کی ذاتی درخواست پر بھی آپ بضد رہے کہ میرے بچے نے ٹاپ کیا ہے تو کوئی تیر نہیں کیا کہ اس کی دعوتیں کی جائیں۔ بچوں کے کچھ میگزینز نے اس کا انٹرویو کرنا چاہا تو آپ نے انکار کر دیا کہ یہ ایک اوچھا کام ہے۔ چند اچھی اکیڈمیز نے خود آپ سے رابطہ کیا اور اسکالرشپ کی بات کی تب بھی آپ نے ایک نہیں سنی اور آپ اب مجھے بتا رہے ہیں کہ جی سی اور ایف سی میں پڑھائی نہیں ہوتی' وقت ضائع ہوتا ہے۔ آپ اس طرح کیوں کرتے ہیں؟ بچے نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے کم از کم اسے اپنے کسی فعل سے تو احساس دلائیں کہ یہ کامیابی ہی ہے۔ آپ اس کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔"
وہ بے چارے واقعی پریشان ہو گئے تھے۔ اس لیے خود پر قابو نہ رکھ سکے۔ ساری گفتگو کے دوران ابو کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ چمکتی رہی۔ سر شعیب کی باتوں کے جواب میں انہوں نے کیا کہا۔ یہ اسے بالکل پتا نہیں چل سکا۔ کیونکہ ابو نے اسے وہاں سے اٹھ جانے کے لیے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ سر شعیب کی باتیں اسے حیران کر دینے کے لیے کافی تھیں۔ اسے اسکول کے کسی فنکشن میں انوائیٹ کیا جانا یا اس کے انٹرویو کے لیے کسی میگزین وغیرہ کے رابطے کے متعلق کچھ بھی نہیں پتا تھا۔ اس نے تو گولڈ میڈل وصول کیا تھا' تصویر بنوائی تھی اور اللہ خیر صلا۔ اس کے علاوہ اس کے لیے اس کارنامے

میں کوئی سنسنی نہیں تھی۔ رشتے داروں یا ٹیچرز وغیرہ کی شاباشی تو وہ بچپن سے ہی وصول کررہا تھا۔ اس میں اس کے لیے کوئی نیا پن نہیں تھا تو وہ کیوں یاد رکھتا کہ اس نے بورڈ میں کوئی پوزیشن لی تھی۔

"تمہیں ریگولر کالج جانے کی ضرورت نہیں، خوامخواہ وقت ضائع ہوگا۔ تم گھر پر رہ کر پڑھا کرو۔ شام کو اکیڈمی جاؤ تو وہاں دوسرے فیلوز سے پوچھ لیا کرو کہ کالج میں کچھ خاص تو نہیں ہورہا۔ ہفتے میں بس ایک بار کالج جانا کافی ہے، جب کوئی خاص ٹیسٹ یا پریکٹیکل ہو تو جایا کرنا۔"

اسے کالج جاتے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے جب ابو نے نیا حکم صادر کردیا۔ انہوں نے اس کے کالج کے ہیڈ کلرک سے بات کرلی تھی۔ ان کی واقفیت کی بنا پر حاضری رجسٹر میں اس کی حاضری خود بخود پوری ہوجاتی تھی۔ اس کے ابو کے کئی دوست اس کالج میں موجود تھے جو اس قسم کے ہر مسئلے کو حل کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے لیے ایک غیر معروف کالج کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس نے خاموشی سے ابو کے حکم کی تعمیل کرنا شروع کردی تھی کیونکہ اس کی زندگی میں کسی نیکن یا مگر کی گنجائش کبھی نہیں رہی تھی۔

وہ ہمیشہ کی طرح ان کا ایک غلط فیصلہ مان رہا تھا، مگر اس بار وہ دل ہی دل میں بہت بے چین تھا۔ اسے یہ سب برا لگ رہا تھا۔ وہ چودہ سال کا ہورہا تھا۔ اس کا قد ہی نہیں بڑھ رہا تھا، خیالات میں بھی تبدیلی آرہی تھی۔ کالج میں اس کا واسطہ ایک نئی دنیا سے پڑا تھا۔ اسکول کی نسبت کالج آکر وہ زیادہ مطمئن تھا۔ وہاں بہت سے لڑکے تھے۔ چھوٹے، بڑے، فیشن پرست، مذہبی، نکمے، پڑھاکو، شرمیلے، ان کے درمیان وہ خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتا تھا۔ سب ہی لڑکے نوجوانی کے زعم میں مبتلا اس نئی دنیا میں خوش تھے۔ کسی کے پاس وقت نہیں تھا کہ وہ اس کو خبطی یا پروفیسر کہہ کر چڑاتے اور پھر پہلے ہی دن سے اس کے شان دار رزلٹ، اس کی چھوٹی عمر اور فرسٹ ایئر کے سلیبس پہ

اس کے عبور نے اسے کسی قسم کا احساس کمتری نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ وہ کالج میں ایک نئے اسٹیٹس کو لے کر داخل ہوا ہے، لیکن شاید اس کے ابو خوش نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس کی مرضی جانے بغیر اس پر اپنی مرضی مسلط کردی تھی۔ وہ اس کی بڑھتی عمر کے تقاضوں کو یا تو سمجھ نہیں پارہے تھے یا وہ ان تقاضوں کو بری طرح اگنور کررہے تھے۔

وہ کوئی ان ڈور پلانٹ نہیں تھا کہ اسے بند کمرے میں بڑھنے پھولنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ وہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا جسے اپنے اردگرد دوسرے انسانوں کی ضرورت تھی۔ اسے اپنے اردگرد اپنے ہم عمر اچھے لگتے تھے۔ وہ ان کی باتیں، ان کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتا تھا۔

کالج میں چونکہ اسکول کی طرح ہر وقت کلاس میں بیٹھنے کی پابندی نہیں تھی۔ اس لیے ایک لیکچر ہال سے دوسرے لیکچر ہال میں جاتے ہوئے لیب میں پریکٹیکل کے درمیان یا فری پیریڈز میں کوریڈورز یا گراؤنڈ میں سے گزرتے ہوئے دوسرے کلاس فیلوز سے علیک سلیک ہوجاتی تھی جو دھیرے دھیرے دوستی کی سرحد میں داخل ہونے لگی تھی، لیکن ابو نے پھر اس کی خوشی کے آگے فل اسٹاپ لگا دیا تھا۔

"مجھے جو چیز بھی اچھی لگتی ہے، ابو مجھے وہی کرنے سے روک دیتے ہیں۔ کیوں؟" پہلی بار یہ سوال اپنی پوری شدت کے ساتھ اس کے ذہن میں گونجنے لگا تھا۔



رات کا پہلا پہر اپنے اختتام کی جانب بڑھ رہا تھا۔ چاند آسمان کے عین وسط میں کسی بادشاہ کی طرح تن کر کھڑا تھا۔ چاندنی بھی چار سو پھیلی تھی، مگر اسٹریٹ لائٹس کی زرد روشنی نے چاندنی کو بھی بسنتی چولا پہنا رکھا تھا۔ ہوا بہت تیز نہیں تھی، مگر خنک تھی، سو ان کے گرم خون کو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

وہ دونوں کب سے نہر کے کنارے بیٹھے تھے۔

دونوں نے جینز کے پائنچے چڑھا رکھے تھے اور دونوں ہی بہت دیر سے چپ تھے۔ یہ جگہ شہوز کی دریافت تھی۔ بہت پہلے جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا۔ تب سے کیمپس ایریا کے درمیان سینڈوچ بنی یہ نہر اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ کالج کے دوران بھی اکیڈمی آتے جاتے ہوئے وہ اکثر یہاں آیا کرتا تھا گو ریونیورسٹی میں تو وہ اس نہر کو اپنی سہیلی مانا کرتا تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ ٹریفک جیسی بھی مرضی کیوں نہ ہو، موسم کتنا بھی ناخوشگوار ہو، یہ نہر اپنے قدر دانوں کے لیے ہمیشہ مہربان رہتی ہے۔ عمر کو بھی اس نہر کی میٹھی آغوش کا چسکا شہوز کی وجہ سے لگا تھا۔ وہ دونوں جب لڑائی جھگڑوں سے اکتا جاتے تھے تو ایک بار دل ہلکا کرنے یہاں ضرور آتے تھے۔

یہ نہر ان کے کئی رازوں کی امین تھی۔ اس نہر میں ان کے کالج افیرز کے لولیٹرز دفن تھے۔ اس نہر میں وہ آنسو بھی تیرتے نظر آتے تھے جو وہ چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑوں اور ناراضیوں پر بہایا کرتے تھے۔ اس نہر کے سینے میں وہ شکوے بھی دبے تھے جو ان کو ایک دوسرے سے تھے، یہ نہر ان دونوں کو ساتھ ملا کر ایک ٹرائی اینگل تھی جو ان کی اس محبت کی تثلیث کو مکمل کرتی تھی۔ وہ ان کی ہمدرد تھی جو ان کو مشورے بھی دیتی تھی اور ان کے درمیان ثالث کا کردار بھی ادا کرتی تھی۔ اس دفعہ کے جھگڑے میں بھی اسی نہر نے ان کی صلح کروائی تھی۔ انہوں نے سارے گلے شکوے کرلیے تھے اور اب مطلع بالکل صاف تھا۔

"میں یہ شادی نہیں کرسکتا شہوز۔" بہت دیر خاموش رہنے کے بعد بالآخر عمر نے کہہ ڈالا تھا۔ شہوز نے گہری سانس بھری تھی۔ عمر کی جذباتیت سے وہ ہمیشہ خائف رہتا تھا۔

"یہ بات ڈیڈی کو تمہیں خود بتانی ہوگی۔" شہوز نے اس سے "وجہ" نہیں پوچھی تھی بس مشورہ دے ڈالا تھا۔ عمر ایک بار پھر خاموش ہوگیا اور پھر کافی دیر بعد بولا۔

"وہ بہت تنک چڑھی ہے شہوز! بدتمیز، ضدی اور ہٹ دھرم بھی۔ بس۔ مجھے ایسی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں جو بلاوجہ نخرے کریں، جنہیں ہر لمحہ یہ وہم رہتا ہو کہ وہ بہت خوب صورت ہیں اور لڑکے ان پر واری صدقے ہوتے رہتے ہیں اور وہ صرف اس لیے پیدا کی گئیں کہ وہ دوسروں کی انسلٹ کرسکیں۔"

"کم آن عمر! انائمہ بالکل بھی ایسی نہیں ہے۔" شہوز نے اپنی دوست کی حمایت کی۔

"میرے ساتھ وہ ایسی ہی ہے... مجھے لگتا ہے شہوز! وہ مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی۔"

"تم غلط سوچ رہے ہو عمر۔ تم دونوں کی انگیجمنٹ ہوئی ہے۔ ظاہر ہے رضامندی سے ہی ہوئی ہے۔ سر آفاق اپنی بیٹی کا رشتہ اس کی مرضی کے بغیر تو نہیں کرنے والے۔" شہوز کے سمجھانے کا ایک مخصوص سا انداز تھا۔ اس کی نگاہیں پانی کی سطح پر بنتے چاند کے عکس پر تھیں۔ وہ ٹانگیں سمیٹ کر بازوؤں کا گھیرا ان کے گرد ڈالے ہوئے تھا۔

"میں بہت کنفیوز ہوگیا ہوں شہوز! سچ کہوں تو مجھے اس لڑکی سے اکتاہٹ ہونے لگی ہے۔ بہت ایٹی ٹیوڈ ہے اس میں اور میری برداشت بہت کم ہے۔ کل کلاں کو بھی تو یہ رشتہ ختم ہونا ہی ہے۔ اسی لیے بہتر ہے اسے ابتدا میں ہی ختم کردیا جائے۔" عمر کا انداز واقعی بڑا الجھا الجھا سا تھا۔ شہوز کہنا چاہتا تھا کہ یہ رشتہ تو تم ختم کرہی چکے ہو، مگر اس نے کہا نہیں۔ عمر کے مزاج کی کچھ الجھنیں تھیں جن سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اسے اس کی ذات کے نفسیاتی پہلوؤں تک سے آگاہی تھی۔ وہ واقعی گہرے دوست تھے۔

"پرسوں کیا ہوا تھا عمر؟"

"شہوز! ہمارے درمیان بڑا عجیب سا تعلق ہے۔ وہ مجھے کبھی فون نہیں کرتی، میرے فون کالز اٹینڈ نہیں کرتی۔ میں اتنا بچہ تو نہیں ہوں کہ کچھ سمجھ نہ سکوں۔ تمہارا اور زارا کا تعلق ایسا تو نہیں ہے۔ پرسوں میں اس سے ملنے چلا گیا۔ میں نے سوچا، پھر میں واپس چلا جاؤں گا تو کہاں ملاقات ہوسکے گی۔ اسی لیے میں ان کے گھر چلا گیا۔ محترمہ نے گیٹ سے اندر ہی نہیں

آنے دیا مجھے۔۔۔ اتنی اِل مینرڈ ہے وہ کہ مجھے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے جان چھڑا رہی ہو' پھر مجھے بھی غصہ آگیا۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟" شہروز کا انداز عجلت بھرا تھا۔ عمر نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"بتا رہا ہوں مرے کیوں جا رہے ہو' بس مجھے غصہ آگیا۔ میں چاکلیٹ کیک لے گیا تھا۔ وہی میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور کہا مبارک ہو بی بی! آپ کی جان چھوٹ رہی ہے ہم سے۔۔۔ یہ کیک اسی لیے لایا ہوں۔۔۔ منہ میٹھا کیجئے اور ہماری رنگ واپس کر دیجئے۔" وہ ایک بار پھر رکا۔ اب کی بار شہروز نے اسے ٹوکا نہیں تھا۔

"وہ منہ اٹھا کر میری شکل دیکھنے لگی۔۔۔ میں نے کہا بی بی شرمایئے مت' آپ کی ہماری نہیں نبھ سکتی۔۔۔ واپس کریں ہماری رنگ اور تم اس کی ہٹ دھرمی دیکھو شہروز! فوراً" انگوٹھی اتار کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔۔۔ اونہہ نخرے باز۔۔۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا وہ بہت شوخی ہے۔"

"اس میں تیری غلطی بھی تو ہے عمر۔۔۔ تجھے ان کے گھر جانے کی ضرورت کیا تھی اور کیا پتا وہ تجھے گھر کے اندر بلانا چاہتی ہو' مگر اس وقت گھر پر کوئی نہ ہو۔۔۔ اسے مناسب نہ لگا ہو؟" شہروز چڑ کر بولا تھا۔

"مناسب نہ لگا ہو؟" عمر نے دہرایا۔

"کیا مناسب نہ لگا ہو۔ میں وہاں ایسا کیا کرنے چلا گیا تھا؟! اچھی مصیبت ہے بھئی' ہم تو ہمیشہ مشکوک ہی رہیں گے چور' ڈاکو ہیں نا ہم' تھانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اونہہ مناسب نہ لگا ہو۔" وہ بری طرح ہرٹ ہوا تھا۔

"یار! تو بات کو سمجھتا نہیں ہے اور غصہ کرنے لگتا ہے۔ یہ لاہور ہے' لندن نہیں کہ کسی کی کوئی ویلیوز نہ ہوں۔ یہاں لوگ اپنے حساب سے حدود مقرر کرتے ہی اور اگر تمہیں ان سب چیزوں پر اعتراض ہے تو تم وہیں کسی جولی' جینی سے شادی کر لیتے" یہاں اتنا کھٹ راگ پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔" شہروز کا لہجہ نارمل مگر الفاظ سخت تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس سارے مسئلے میں سب سے زیادہ خوار بھی وہ ہی ہو رہا تھا۔ اگر خدانخواستہ یہ انگیجمنٹ واقعی ٹوٹ گئی تھی تو وہ سب بڑوں کی نظر میں بہت خوار ہونے والا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے عمر کو دیکھا جو ایک دم ہی ہونٹ سی کر بیٹھ گیا تھا۔

"یار! میری بات سنو غور سے' تمہاری انگیجمنٹ کسی کورٹ شپ کا نتیجہ تو نہیں ہے نا میرا مطلب کوئی لمبی چوڑی کمٹمنٹ تو ہے نہیں۔ ایسے ریلیشن شپ ایسے ہی ہوتے ہیں میٹھے اور بل دار' جلیبی جیسے' ایسے ریلیشن شپ وقت کے ساتھ بہت مضبوط ہو جاتے ہیں۔ لیکن تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم نا صرف جذباتی ہو' بلکہ عجلت پسند بھی۔۔۔ یہی دو چیزیں سب سے بڑا بگاڑ ہیں۔ تم اپنے فیصلوں پر بہت جلد پچھتانے لگتے ہو۔" اب کی بار شہروز نے تحمل سے کام لیا تھا۔

"میں کیا ہوں' مجھ میں کون کون سی خامیاں ہیں' یہ سب کچھ تم لوگ ایک ہی دفعہ بتا دو۔ مجھے تو ایسا لگنے لگا ہے جیسے میں دنیا کا کوئی گندہ ترین انسان ہوں جو بہت بری جگہ سے تعلق رکھتا ہے۔ میری کوئی ویلیوز ہیں نہ مورل ایتھکس۔۔۔ کسی کے گھر چلا جاؤں تو غیر مناسب' کسی سے بات کرنا چاہوں تو غیر مناسب' کسی کی طرف ایک نظر دیکھ لوں تو بھی غیر مناسب۔۔۔ ارے بابا میں بھی مسلمان ہوں' ایک اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ماننے والا' تم لوگ جس سمت کو قبلہ مانتے ہو نا ہم بھی اسی سمت کو مانتے ہیں۔ اللہ دلوں میں بستا ہے' لاہور یا لندن میں نہیں کہ جگہ بدلتے ہی رب بھی بدل جائے۔ ہم اگر لاہور میں مسلمان ہیں تو لندن' پیرس' میلان جہاں بھی چلے جائیں مسلمان ہی رہیں گے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے وقت ٹرین بدلتی ہے خدا نہیں۔" وہ بھڑک کر بولا تھا' پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"ایسا کرو عمر احسان کو چوک میں کھڑا کر کے پھانسی دے دو۔" شہروز کو بالکل برا نہیں لگا کیونکہ عمر کے غصے کا ذائقہ اس کے لیے بڑا پرانا تھا' مگر وہ شرمندگی ضرور محسوس کر رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اسے عمر کو طعنہ نہیں دینا چاہیے تھا۔

"اوکے' آئی ایم سوری' مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔" مسکراہٹ چھپاتے ہوئے شہروز نے معذرت کی تھی۔ عمر کچھ نہیں بولا۔ شہروز نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

"اچھا یار کہہ تو رہا ہوں سوری' اتنا غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

اسے ہنسی بھی آرہی تھی اور شرمندگی بھی ہو رہی تھی۔ عمر پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

"میرا مذاق کا موڈ نہیں ہے شہروز! آئی ایم ہرٹ' اچھا نہیں لگتا مجھے جب لوگ ایسا سمجھتے ہیں' میں الحمد اللہ مسلمان ہوں میرے پیرنٹس مسلمان ہیں۔ مگر ہم لوگوں کو بار بار ثابت کرنا پڑتا ہے کہ ہم اور ہمارا عقیدہ وہی ہے جو باقی مسلمانوں کا۔۔۔ ہم وہ کام نہیں کریں گے جو ہمارے مذہب میں ناپسندیدہ ہیں۔ کسی جگہ رہنے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ انسان اس جگہ کی برائیاں بھی اپنا لیتا ہے' جہاں وہ رہ رہا ہوتا ہے۔ ہوتے ہوں گے لوگ ایسے' مگر میں اور میرے گھر والے ایسے نہیں ہیں شہروز۔" عمر واقعی بہت غصے میں تھا۔

"اچھا اچھا سن لیا ہے تقریر' بولا ہے نا سوری۔۔۔" شہروز نے اس کے کندھے پر ہاتھ بھی رکھ دیا تھا۔ عمر نے ہونٹ بھینچے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ منتخب کر رہا ہے۔

"پتا ہے شہروز! گڈ تو ہوتا ہے نا اور میں سچ سچ بتاؤں تجھے۔ وہ جو لائبہ بی بی ہیں نا' وہ بھی یہی سمجھتی ہیں۔ مجھے اس کے انداز سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھے قابل بھروسا نہیں سمجھتی۔ ورنہ ایسا بھی کیا ہوا کہ انسان منگیتر کو گیٹ سے ہی ٹرخا دے؟ دو منٹ بات کرنے کا روادار بھی نہ ہو۔"

"عمر یار! ہماری سوسائٹی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہاں سب سے زیادہ ناقابل بھروسا منگیتر ہی ہوتا ہے اور جب تک شادی نہیں ہو جاتی' بار بار اس سے اس کا کریکٹر سرٹیفکیٹ طلب کر لیا جاتا ہے۔" شہروز ہنس کر کہہ رہا تھا' عمر مسکرایا تک نہیں۔

"مجھے بچہ سمجھتے ہو نا تم؟ فیڈر پینے والا چھ ماہ کا بچہ' اگر یہی سچ ہے تو پھر زارا اور تمہارے درمیان جس طرح کا تعلق ہے وہ تو تمہیں ایب نارمل لگتا ہو گا۔"

اس کا انداز تمسخرانہ تھا۔ شہروز نے حیرت سے اسے دیکھا۔ گتھی جیسے خود بخود سلجھ گئی تھی۔ عمر یقیناً" اپنا اور لائبہ کا اس کے اور زارا کے ساتھ موازنہ کرتا رہتا تھا۔ ظاہر ہے اس نے ان دونوں کو لڑتے جھگڑتے' صلح صفائی کرتے' ایک دوسرے کے ساتھ روٹھتے' منتے دیکھا تھا۔ وہ اسی طرح کے تعلق کا خواہش مند تھا جو کوئی ایسی غیر فطری بات نہیں تھی' لیکن چونکہ وہ لائبہ کی طبیعت سے واقف نہیں تھا۔ اس لیے لائبہ کے گریز کو وہ اس کی ناپسندیدگی سمجھتا تھا۔

"عمر! تم خود کو ہمارے ساتھ کمپیئر مت کرو۔۔۔ ہم کزنز ہیں۔ میں اور زارا۔۔۔ ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ کھیل کود کر' لڑ جھگڑ کر ہم دونوں عمر کے اس حصے میں پہنچے ہیں۔ ہمارے درمیان وہ جھجک نہیں ہے جو تمہارے اور لائبہ کے درمیان ہے۔ جب یہ جھجک دور ہو جائے گی تو تم دونوں کے درمیان بہت اچھے فرینڈلی ٹرمز ڈیولپ ہو جائیں گے اور تب میں تمہاری طرح جیلس ہوا کروں گا۔" شہروز ملائمت بھرے لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یار! میں جیلس نہیں ہوتا' آئی سویئر نہیں ہوتا' مگر ہرٹ ہوتا ہوں' اب کی بار تو بہت ہوا ہوں' جب مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ مجھے اگنور کرتی ہے۔ بلکہ وہ مجھ سے مس بی ہیو کرتی ہے۔" وہ بازو پھیلا کر گھاس پر لیٹ گیا تھا۔

"شہروز۔۔۔ بائی گاڈ میں بہت کنفیوزڈ ہو گیا ہوں۔"

"پرابلم پتا ہے کیا ہے۔۔۔ ہم لوگوں کا فیملی سیٹ اپ بہت مختلف ہے۔ ایکچوئلی وہ ایک مختلف ماحول کی پروردہ' تم ایک مختلف ماحول کے۔ ان کے گھر کا ماحول

ہمارے گھر کے ماحول سے بالکل مختلف ہے۔ ہم آپس میں جس طرح بات کرتے ہیں، تم میں اور زارا، اس طرح وہ اپنے کزنز کے ساتھ بھی نہیں کرتی۔ ہم کلاس فیلوز سے بھی وہ ایک حد تک ہی فرینک ہوتی ہے۔ دیکھو یار! ہر فیملی کی اپنی ویلیوز ہوتی ہیں۔ میں جیسے زارا کے ساتھ فرینک ہوں۔ اس طرح تم امائمہ کے ساتھ فرینک نہیں ہوسکتے۔ جیسے میں اور زارا ہوٹلنگ کرلیتے ہیں۔ اکیلے ہر جگہ چلے جاتے ہیں، تم ایسے امائمہ کے ساتھ نہیں جاسکتے۔ سر آفاق اس چیز کو کبھی پسند نہیں کریں گے اور سچ تو یہ ہے کہ امائمہ خود بھی ایسا کبھی نہیں چاہے گی۔"

شہوز نے لمحہ بھر کا توقف کرکے اس کی جانب دیکھا کہ وہ اس کی بات پر کس طرح کا رد عمل ظاہر کرتا ہے، مگر وہ چپ چاپ، چت لیٹا آسمان کی آغوش میں محصور چاند کو دیکھ رہا تھا۔

"اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ بہت کنزرویٹو ہیں۔۔۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ امائمہ نے ہمارے ساتھ بہت سے سیمینارز، کانفرنسز اٹینڈ کی ہیں۔۔۔ وہ دوسری کلاس فیلوز کی طرح کام ادھورا چھوڑ کر اس لیے کبھی گھر نہیں گئی تھی کہ اندھیرا اچھل رہا ہے یا پک اینڈ ڈراپ کا مسئلہ ہے۔ اگر کنزرویٹو ہوتی تو لڑکوں کے ساتھ نہیں پڑھ رہی ہوتی۔ وہ اچھی لڑکی ہے، رشتوں کی قدر کرنے والی۔۔۔ اپنی ویلیوز کو پہچاننے والی اور ایک دن آئے گا جب تم مجھ سے یہ ساری باتیں کیا کرو گے کیونکہ تب تمہیں احساس ہوچکا ہوگا کہ تم نے اپنے لیے جس طرح لائف پارٹنر چاہا تھا امائمہ بالکل ویسی ہے۔"

شہوز اس کے دماغ میں لگی گرہیں کھول رہا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ عمر کو اس کے بہت سے فیصلوں پر مطمئن کرنے والا شہوز ہی تھا۔ وہ ایک دوسرے کے دل میں چھپی بات کو بنا کہے جان لینے کے دعویدار تھے۔ ان کے درمیان ہمیشہ مسائل کا حل اسی طرح ڈھونڈا جاتا تھا۔

"یہ بات بھی تم ذہن نشین کرلو وہ تمہیں ناپسند نہیں کرتی۔"

"اس نے تم سے خود کہا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے؟" عمر کے لہجے سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ طنز کررہا ہے یا سنجیدہ ہے، لیکن وہ شہوز کا جواب سننے کے لیے بے چین ہے۔ یہ شہوز کو اندازہ ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی۔

"یہ رنگ جو تم اس کی انگلی سے اتروا کر لائے ہو، اگر وہ تمہیں ناپسند کرتی تو یہ رنگ انگلی سے اتار کر نہیں، بلکہ الماری کے کسی نچلے خانے سے نکال کر دیتی۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہو اور ویسے بھی مجھ جیسے ہینڈسم لڑکے کو وہ ناپسند کر بھی کیسے سکتی ہے۔ اس کی تو لاٹری نکلی ہے۔"

اسی انداز میں لیٹے عمر نے کہا تھا۔ شہوز بلاوجہ ہی مسکرایا۔ عمر نارمل ہو رہا تھا۔ شہوز کو ہنستا دیکھ کر عمر دوبارہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ایک بات بتاؤ گے سچ سچ؟" شہوز نے جواب میں فقط ہنکارہ بھرا۔

"زارا نے کبھی نخرے کیے امائمہ کی طرح؟" عمر کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"اور نہیں تو کیا، سب لڑکیاں نخرے کیا ہی کرتی ہیں۔ یہ ان کا پیدائشی حق ہے۔" شہوز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ موسم کی دلفریبی تھی یا عمر کا ساتھ، بلکہ یہ زارا کی یاد تھی جس نے اس کے چہرے کو الوہی سی مسکراہٹ بخش دی تھی۔

"نہیں اس ڈفر کو نخرے کرنا کہاں آتا ہوگا۔۔۔ وہ تو اللہ میاں کی گائے ہے۔" عمر اسے چھیڑ رہا تھا۔ شہوز نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ایسے مت کہا کرو۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اس کے انداز میں مصنوعی ناراضی تھی۔

"بہت پسند کرتے ہو اسے تم؟" عمر نے اس کے کندھے کو ٹھوکا دیا تھا۔

"بہت سے بھی بہت زیادہ۔۔۔ تمہیں پتا تو ہے۔" شہوز کی کوئی بات عمر سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

"شہوز! مجھے بھی وہ بہت ہی اچھی لگتی ہے۔" عمر کے لہجے میں اعتراف تھا۔

"کون۔۔۔ زارا؟" شہوز صرف اس کو چڑانے کے لیے پوچھ رہا تھا۔

"لو شٹ اپ۔۔۔ اتنا بدذوق تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا۔" اس نے شہوز کو چڑایا تھا۔

شہوز نے اس کی جانب مصنوعی ناراضی کے انداز میں دیکھا تھا۔ پھر وہ دونوں ہی ہنس دیے۔ عمر نے ذرا سا اٹھتے ہوئے بیک پاکٹ سے اپنا والٹ نکالا تھا۔ پھر اس کی اندرونی زپ کھول کر اس نے پلاٹینم کی رنگ نکال لی۔ جس میں تین ننھے ننھے ڈائمنڈز لگے تھے۔ یہ وہی انگیجمنٹ رنگ تھی جو شہوز اور عمر نے امائمہ کے لیے خریدی تھی۔ بہت سی رنگز دیکھنے کے بعد یہی وہ رنگ تھی جو ان دونوں کو پسند آگئی تھی اور یہی وہ رنگ تھی جو عمر، امائمہ کی انگلی سے اتروا لایا تھا۔ والٹ سے رنگ نکال کر عمر چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا، پھر اس نے وہ رنگ شہوز کی جانب بڑھائی تھی۔

"یہ تم اس کو واپس کردو گے؟" امید بھرے لہجے میں پوچھا گیا تھا۔

"نہیں۔۔۔" شہوز نے قطعیت سے کہا۔

"یہ رنگ اب تم خود واپس کرو گے اس کو۔"

"وہ محترمہ مجھ سے فون پر بات نہیں کرتیں، گھر چلا جاؤں تو اندر بلانے کی روادار نہیں۔ اب یہ رنگ کیا ایس ایم ایس کروں اس کو۔" عمر نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"نہیں۔۔۔ میں بتاتا ہوں۔" شہوز بزرگوں کے سے انداز میں اس کے قریب ہوا۔

"کل صبح تم چاچو کو فون کرو گے اور کہو گے۔"

عمر بغور اس کی بات سن رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی اس قدر خوب صورت بھی لگ سکتا ہے۔"

شہوز نے دل کھول کر سراہا تھا۔ زارا کو لگا اس کی محنت وصول ہوگئی۔ اس نے عمر اور امائمہ کے نکاح کی تقریب کے لیے بہت دل سے تیاری کی تھی۔ لباس سے لے کر جیولری تک اور فٹ ویر سے میک اپ تک اس نے ہر چیز خود خریدی تھی، اور اس کے لیے اس نے نا صرف میگزینز کھنگالے تھے بلکہ ٹی وی شوز بھی دیکھے تھے کہ کیا چیز ان ہے اور کیا چیز آؤٹ ہے اور اس کے بعد ہی اس نے اپنی شاپنگ مکمل کی تھی۔

ویسے تو یہ بڑی عام سی بات تھی بہت سے لوگ شادی بیاہ کی تقریب کی تیاری ایسے کرتے ہی ہیں، لیکن زارا کی طبیعت اس معاملے میں بڑی مست ملنگ سی تھی۔ وہ کپڑوں اور جیولری کے جھنجٹ میں کبھی وقت برباد کرنے کی عادی نہیں رہی تھی، کیونکہ اس معاملے میں اس کا ذوق کافی تھکا ہوا واقع ہوا تھا۔ اس نے جب بھی کبھی کوئی چیز اپنی پسند سے خریدی تھی، اس کے ارد گرد رہنے والوں کو وہ کبھی پسند نہیں آئی تھی۔ اس لیے وہ زیادہ تردد کرنا چھوڑ ہی چکی تھی۔ مگر اس تقریب کے لیے اس کا دل چاہا تھا کہ وہ سب سے اچھی نظر آئے اور شمع محفل بننے کی اس خواہش نے اس کا وقت اور محنت دونوں خرچ کروائے تھے۔ حالانکہ اس تقریب کا گمان کہیں دور، دور تک نہیں تھا، بس اچانک ماموں نے انگلینڈ سے فون کیا تھا اور یہ مشورہ دیا تھا کہ بہتر ہے عمر نکاح کرکے واپس آئے، تاکہ بعد میں کاغذات بنوانے میں آسانی رہے گی۔ سارا خاندان ہی یہ بات سن کر متحرک ہوگیا تھا۔ زارا نے اپنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر بوتیکس کے چکر لگائے تھے اور نا صرف اپنے لیے بلکہ امائمہ کے لیے بھی کچھ شاپنگ کی تھی اور اب شہوز کے منہ سے ایک ہی جملہ سن کر واقعی اس کا دل خوش ہوگیا تھا اور اس کی محنت وصول ہوگئی تھی۔ اس نے اپنی گردن میں ایک نئی طرح کے خم کو اور لہجے میں مزید اکڑ کو محسوس کیا۔

"میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔" اس نے مسکراتے ہوئے اپنی تعریف کو وصول کیا تھا۔ شہوز سامنے اسٹیج کی جانب دیکھنے میں مگن تھا۔ جہاں عمر اور امائمہ سب کی نظروں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ اس کی بات سن کر

وہ اس کی جانب مڑا تھا، پھر وہ بشاشت سے مسکرایا۔

"میں امائمہ کی بات کر رہا تھا۔" اس کا جائزہ لیتے ہوئے اسے اندازہ بھی نہیں ہوا تھا کہ کہیں کوئی چیز چھن سے ٹوٹی تھی۔

"میں۔۔۔ میں بھی امائمہ کی بات کر رہی ہوں۔" بہت ہمت کر کے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ بہت عام سی بات تھی۔ اس قسم کی غلط فہمی انسانوں کو ہو ہی جاتی ہے۔ وہ واقعی نہیں سمجھی تھی کہ شہوز اس کی نہیں بلکہ امائمہ کی بات کر رہا ہے اور جو فخر و انبساط اس کو یک دم محسوس ہوا تھا اس کے حصار سے یک دم نکلنا آسان نہیں تھا۔

"واؤ۔ یہ تم ہو زارا۔ مائی گاڈ۔" عمر اچانک قریب آکر بولا تھا۔ "ارے کوئی مجھے پکڑ کر چٹکی بھرنا، میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔" وہ زارا کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر بولا تھا۔

"میں یہ کام تمہیں پکڑے بغیر زیادہ اچھے طریقے سے کر سکتا ہوں اور یہ حقیقت ہی ہے۔" شہوز کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"اگر یہ حقیقت ہے تو مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ پارٹنر کا انتخاب کرنے میں میں نے نا صرف عجلت بلکہ غلطی بھی کی۔ شہوز یار ابھی کچھ ہو سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے۔" وہ کہتے کہتے جان بوجھ کر چپ ہوا تھا۔

شہوز نے اس کی پشت میں دھموکا جڑا تھا۔

"بکواس نہ کرو۔ اور میں نے غلطی کی نہ عجلت، اور یہ بھی کہ اب کبھی بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہیں واپس جا کر بیٹھو جہاں سے اٹھ کر آئے ہو۔ زارا از مائی پرنسز۔"

وہ بہت جذب سے بولا تھا اس کی آنکھوں اور لہجے میں وہی سچائی جھلک رہی تھی جو اس کے انداز میں تھی مگر زارا کا دل جیسے کسی نے نچوڑ ڈالا تھا۔ وہ سابقہ کیفیت اور احساسات کے اثر سے نکل ہی نہیں پائی تھی۔ اس نے شاید کوئی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس نے سر ہلایا پھر وہ مسکرائی تھی۔

"اچھی لگ رہی ہوں کیا؟" وہ لہجے میں مصنوعی بشاشت بھر کر بولی تھی۔

"بے حد، بے حساب" شہوز کے لہجے میں سچائی تھی۔ اس نے کہنے کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی تھام لیا تھا۔ زارا کو انجانی سی طاقت محسوس ہوئی۔

"تم نے ضرور کوئی دم درود کیا ہے، راتوں رات ایسے معجزے نہیں ہو سکتے۔" یہ عمر تھا۔

"مہربانی، شکریہ"

اس نے بدقت اپنی مسکراہٹ کو گہرا کیا تھا۔ وہ جانتی تھی شہوز دل سے اس کی تعریف کر رہا ہے۔ اسے عام حلیے میں دیکھ کر بھی سراہنے کا عادی تھا مگر اسے پہلی بار زندگی میں حسد محسوس ہوا۔ وہ شہوز کے لیے کم از کم شہزادی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ ہر عورت کی زندگی میں کوئی ایک مرد ایسا ضرور ہوتا ہے جس کی زندگی میں وہ ملکہ سے کم کے درجہ پر کبھی راضی نہیں ہوتی۔ اس سے ہوا ہی نہیں جاتا۔ زارا کے لیے شہوز ایسا ہی مرد تھا۔ اس نے اس پر محبت بھری نظر تو ڈالی تھی مگر دوسری جبکہ اسے پہلی کی خواہش تھی۔

"میں تمہیں پہلے کیوں نظر نہیں آئی۔ میری محنت میں ایسی کون سی کمی رہ گئی تھی شہوز۔" اس نے دل میں سوچا تھا مگر شہوز سے کہا نہیں تھا۔ وہ اس کا مذاق اڑاتا، اس کے جذبات کو کبھی سمجھ نہ پاتا اور اس وقت وہ رونے کے موڈ بھی نہیں تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے گہری سانس بھری تھی۔ اس کا دل اتنا صاف تھا کہ اسے اس بات پر بھی شرمندگی ہوئی کہ وہ حسد کا شکار کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے اسٹیج پر بیٹھی امائمہ کو دیکھا تھا۔ وہ واقعی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس پر دلہناپے کا بہت روپ آیا تھا۔ اس نے امائمہ کے لیے اپنے دل میں رشک کے جذبات کو ابھرتے محسوس کیا۔ وہ روشنیاں اگلتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ آج اس کا دن تھا مگر ہر دن ہر علاقے کے لیے نہیں ہوتا۔ شہوز کا دل اس کا مفتوحہ علاقہ تھا اور وہاں پر پہلا قدم رکھنے کا حق بھی اسے تھا وہاں کسی اور کی گنجائش نہیں تھی۔ زارا کی گردن میں جو خم لحہ بھر پہلے آیا تھا وہ

لحہ بھر میں ہی ختم ہو گیا تھا وہ اب وہی زارا تھی جو تعریف سن کر بھی مطمئن ہوتی تھی نہ یقین کرتی تھی مگر یہ پہلی بار ہوا تھا کہ وہ شہوز کے رویے سے الجھ گئی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا حالانکہ یہ عام سی بات تھی۔ شہوز پہلے بھی نا صرف امائمہ کی بلکہ اپنی دوسری کلاس فیلوز کی گرلز کی تعریف کرتا تھا ان کے متعلق زارا سے بات کرتا رہتا تھا۔ زارا کو کبھی کسی سے جلن یا حسد محسوس نہیں ہوا تھا لیکن آج کچھ ایسا تھا کہ اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اسے ہر چیز سے بے وجہ اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔

"میں مان لیتا ہوں دنیا میں معجزے ہوتے ہیں اور چلو مان لیا تم آج معجزتاً" بہت خوبصورت لگ رہی ہو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بت بن کر ایک ہی جگہ کھڑی ہو جاؤ۔"

شہوز نے اس کی خاموشی سے اکتا کر اس کا کندھا ہلایا تھا۔ زارا نے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے تاثر اور بے رنگ تھیں نجانے شہوز کو کچھ محسوس ہوا یا نہیں۔ زارا نے مسکرانے کی کوشش کی تھی اور مشکل سے ہی سہی مگر وہ کامیاب ہو گئی تھی۔

"آؤ زارا اچھی سی فوٹو گراف بنواتے ہیں۔ کیا پتا تم دوبارہ کبھی اتنی خوبصورت لگو یا نہیں۔ معجزے کون سا روز روز ہوتے ہیں بھئی۔"

عمر کہہ رہا تھا۔ زارا کو اب کی بار مسکرانے کے لیے محنت نہیں کرنا پڑی تھی وہ شہوز کے لیے دل میں کبھی کوئی میل رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ عمر فوٹو گرافر کو اشارہ کر رہا تھا۔ زارا نے شہوز کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ وہ شہوز کے ساتھ تصویر بنوانا چاہتی تھی مگر شہوز اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اسٹیج کی جانب بڑھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے، میں آپ کو نہیں جانتا۔"

نور محمد نے آنکھیں اٹھائے بنا کہا تھا۔ اس کا دل ہولے ہولے لرز رہا تھا اور دھڑکن معمول سے ہٹ کر گنگنا رہی تھی۔ اس کے لہجے میں عجیب سی گھبراہٹ تھی اور وہ مسلسل اپنی انگلیاں چٹخانے میں مصروف تھا۔ یہ اس کے سامنے بیٹھے شخص کا رعب حسن نہیں تھا کہ وہ اس قدر الجھا ہوا تھا بلکہ یہ اس کی عادت تھی۔ اسے اجنبی لوگوں سے ملنے میں ان سے بات کرنے میں ہمیشہ رکاوٹ کا سامنا رہتا تھا۔ وہ انسانوں سے الرجک تھا اسے اپنی ذات میں گم رہنے میں سکون ملتا تھا۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ اسے کم سے کم لوگوں سے ملنا پڑے اور نئے لوگوں سے ملنے سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ یہ اس کی اپنی کمزوری تھی جسے وہ دوسروں سے چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ سب ہی کرتے ہیں۔ اس کے ارد گرد رہنے والے اس کی طبیعت سے بخوبی واقف تھے اور کوئی بھی اس کی اپنی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے کے لیے نہیں کہتا تھا اسے لیکن کبھی کبھی ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی تھی کہ اسے یہ کڑوی گولی نگلنی ہی پڑتی تھی۔ آج بھی اس کا کڑوی گولی نگلنے کا دن تھا۔ اکیسویں صدی کو خوش آمدید کہے دنیا کو پانچ سال گزر چکے تھے اور اب چھٹے سال کی ابتدا تھی۔ لوٹن کی جامعہ مسجد میں موذن کے فرائض سر انجام دیتے اسے تین سال ہو رہے تھے۔ مارچ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور موسم میں سردی کی شدت تھوڑی سی کم ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود نور محمد کو کپکپی سی محسوس ہو رہی تھی حالانکہ ہیٹرز بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے۔ یہ شخص جو اس کے سامنے بیٹھا تھا اس نے اسے اتنا مجبور کر دیا تھا کہ وہ آج اس سے ملنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ دراصل وہ خود بھی روز روز کی انکوائری سے تنگ آ گیا تھا۔ ہر دوسرے روز اسے پیغام ملنے لگا تھا کہ کوئی اس سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے مسلسل انکار کو کوئی اور مطلب پہنائے اسی لیے جب مسجد کے منتظمین کی جانب سے بھی اسے پیغام ملا کہ کوئی اس سے ملنا چاہتا ہے تو وہ انکار نہیں کر سکا تھا، اور اسی لیے اب وہ یہاں موجود تھا۔

"آپ واقعی مجھے نہیں جانتے، دراصل میں اس

علاقے میں کچھ عرصے پہلے ہی آیا ہوں اور میں اچھے دوستوں کی تلاش میں ہوں۔ میں یہاں نماز پڑھنے آتا ہوں تو اکثر آپ کو دیکھتا ہوں۔ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔" اس شخص نے مسکراتے ہوئے بہت عاجزی سے اپنا مطمع نظر بیان کیا تھا۔ نور محمد دل ہی دل میں حیران ہوا تھا اس شخص کو اگر یہ کام تھا تو وہ کسی سے بھی کہہ سکتا تھا۔

"میں آپ کو اس علاقے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس علاقے میں آپ کو بہت جلد اچھے دوست مل جائیں گے۔" نور محمد نے ابھی بھی انگلیاں چٹخانا بند نہیں کیا تھا۔

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے شاید میں دراصل آپ ہی سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔" وہ شخص اب مسکرایا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں عجیب سی التجا چھپی تھی۔ نور محمد کو اس کی آنکھوں کے رنگ اچھے نہیں لگے تھے۔ وہاں اسے نجانے کیوں سفاکی سی محسوس ہو رہی تھی اور اس کی خواہش نے نور محمد کو اکتاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ دوستی تو دور کی بات وہ تو کسی شخص سے دوسری بار ملنے کے خیال سے بھی چڑ جاتا تھا۔

"آپ مجھے نہیں جانتے میں بہت خشک طبیعت کا مالک ہوں۔ میری عادات اس قسم کی ہیں کہ لوگ زیادہ دیر میرے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے۔ میں آپ کے لیے زیادہ عرصہ اچھا دوست ثابت نہیں ہو سکوں گا۔ معاف کیجیے گا نماز کا وقت ہونے والا ہے۔"

نور محمد نے بات پوری کر کے اس شخص کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا۔

"آپ براہ مہربانی میری بات۔" نور محمد کو اس کی بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس کی پوری بات سنے بغیر عجلت وہاں سے نکل گیا تھا۔

وہ شخص کون تھا؟؟

نور محمد اس شخص کے بارے میں زیادہ نہیں سوچنا چاہتا تھا لیکن وہی شخص اس کے لیے اس معاملے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ یہ اس سے پہلی ملاقات کے اگلے دن کی بات تھی جب اس نے نماز عصر کے وقت اسے دیکھا۔ نماز ادا کرنے کے بعد وہ شخص اس کے قریب آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہاں اور لوگ بھی موجود تھے اور کسی مذہبی معاملے کے متعلق بحث جاری تھی۔ نور محمد ایسی گفتگو میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ خاموشی سے سننے میں مگن تھا جب اس نے اس شخص کی جانب غیر ارادی نگاہ ڈالی۔ اسے عجیب قسم کی ناگواری کا احساس ہوا تھا۔ وہ شخص اس کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر اس نے سر کے اشارے سے نور محمد کو سلام کیا تھا۔ نور محمد کو اس کا انداز کچھ عجیب لگا تھا۔ وہ سلام کا جواب بھی نہیں دے پایا تھا۔ اس نے دوبارہ اس کی جانب دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ مبادا وہ اسے پھر دوستی کی پیشکش کر ڈالے' لیکن اس دن کے بعد سے یہ جیسے ایک معمول بن گیا تھا۔ وہ شخص ہر نماز عصر میں موجود ہوتا اور اسی طرح نور محمد کی جانب دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ نماز مغرب میں بھی موجود ہوتا تھا اور اس وقت بھی اس کا انداز وہی ہوتا تھا جو نور محمد کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے باعث خلجان بنتا جا رہا تھا۔ وہ شخص بظاہر اسے یا کسی بھی اور شخص کو کچھ نہیں کہتا تھا۔ وہ نماز ادا کرتا اور اس کے بعد نور محمد کے کہیں آس پاس بیٹھ کر فقط نور محمد کو دیکھنے میں مگن رہتا۔ بہت بار نور محمد نے سوچا وہ اس کی شکایت کرے یا اسی سے بات کرے کہ وہ آخر چاہتا کیا ہے مگر پھر نجانے کیا چیز اسے روک لیتی تھی اسے لگتا تھا سب اس کو بے وقوف سمجھ کر اس کا مذاق نہ اڑائیں۔ وہ دوستی کی پیشکش ہی تو کر رہا تھا کوئی نقصان تو نہیں پہنچا رہا تھا۔ وہ شخص ویسے بھی سب کا پسندیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ نماز عصر کے بعد اکثر لوگ جو عام طور سے فارغ ہوتے تھے مسجد میں قیام کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کا چھوٹا سا ایک گروپ بن گیا تھا جن میں زیادہ تر بزرگ شامل تھے اور وہ لوگ سیاست اور مذہب کے متعلق بات کرنا پسند کرتے تھے۔ اکثر لوگ اپنے اپنے ممالک کے مسائل کا ذکر بھی کرتے نظر آتے۔ وہ شخص بھی عام طور سے انہی بزرگوں کے گروپ میں بیٹھ جاتا تھا اور اس کا دوسرا پسندیدہ کام بس یہی تھا کہ وہ نور محمد کو دیکھتا رہتا۔ کچھ عرصہ نور محمد اس امر کو اپنا وہم سمجھ کر ٹالتا رہا مگر پھر اسے یقین ہونے لگا تھا کہ وہ شخص اسی کو دیکھنے میں مگن رہتا ہے اس کے دیکھنے پر وہ سر کے اشارے سے سلام کرتا اور مسکرا دیتا۔

اس کے علاوہ ان کے درمیان کبھی کوئی بات براہ راست نہیں ہوتی تھی لیکن اس بات سے بھی دن گزرنے کے ساتھ ساتھ نور محمد کی جھنجلاہٹ اور اس سے بھی بڑھ کر پریشانی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ وہ نماز کے اوقات کے علاوہ مسجد میں قیام کرنا کم کر دے مگر وہ انتظامیہ میں شامل تھا اور کب سے مسجد کے انتظامات کی دیکھ ریکھ کر رہا تھا۔ وہاں یہ سب لوگ اس کی نا صرف ـــ عزت کرتے تھے بلکہ اس کو کافی پسند بھی کرتے تھے۔ ویسے بھی ایسے لوگ بہت کم تھے جو ہر روز ہر نماز میں شامل ہوتے تھے' ڈیوٹی آورز کے ساتھ ساتھ فاصلہ زیادہ ہونے کا مسئلہ بھی درپیش رہتا تھا بہت سے لوگوں کو' ایسی صورت حال میں جو لوگ مسجد آپاتے تھے ان کے دلوں میں نور محمد کی بہت قدر تھی' عمروں کے فرق کے باوجود اس کی بات توجہ کے ساتھ سنی جاتی تھی اور اس کی رائے کو اہمیت بھی دی جاتی تھی۔ اور پھر اس کام میں اسے سکون ملتا تھا سو نور محمد اس شخص کو برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ چنانچہ یہ سلسلہ کچھ عرصہ ایسے ہی چلتا رہا۔ نور محمد کو بھی اس شخص کی عادت ہوتی چلی گئی اور پھر ایک دن وہ شخص اچانک کہیں غائب ہو گیا۔

نماز عصر میں اسے نہ پا کر نور محمد نے سوچا شاید وہ کسی ضروری کام میں پھنس گیا ہوگا اور نماز مغرب میں آجائے گا لیکن وہ نماز مغرب کے وقت بھی نہیں آیا تھا۔ وہ رات نور محمد نے اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ہی گزاری اور صبح اٹھ کر وہ اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے آپ سے بھی ہچکچاتا رہا۔ اسے اکیلے رہنے کی عادت تھی۔ وہ اپنے روم میٹس کے علاوہ کسی سے بہت ہی کم بات کرتا تھا۔ اس کے لیے یہ بڑی بے چین کر دینے والی بات تھی کہ وہ کسی انسان کی غیر حاضری کو اتنا محسوس کر رہا تھا۔

اس سے بھی زیادہ پریشانی کی بات تب ہوئی جب وہ شخص اگلے روز بھی غیر حاضر رہا۔ نور محمد نے اسے نہ پا کر پہلی بار اس کی خیریت کے متعلق دعا کی۔ یہ اس کی زندگی میں شاید تیسری یا چوتھی بار ہو رہا تھا کہ وہ کسی کے لیے اتنا سوچ رہا تھا۔ یہ ایک نفسیاتی سا عمل تھا۔ اتنا عرصہ اس شخص کو اپنی طرف متوجہ پا کر اب اسے اس کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اس نے اسے چونکہ بتایا بھی تھا کہ وہ یہاں نیا ہے تب ہی نور محمد زیادہ پریشان تھا کہ وہ کہیں بیمار نہ ہو یا اسے کوئی اور پریشانی نہ لاحق ہو

نور محمد نے یہاں زندگی کو بہت ذلیل و خوار ہوتے دیکھا تھا۔ انسانی رشتے ہوا سے بھی سستے اور ہلکے ثابت ہوتے تھے۔ اقدار یہاں پیسے کے عوض پامال ہو جاتی تھیں۔ لوگ مختلف ملکوں سے آتے تھے اور اپنا نام و نشان چھوڑے بغیر مٹی کے مول بک جاتے تھے۔

یہ بڑا ظالم ملک تھا۔ یہاں لوگ کھانے کو ایک وقت روٹی تو دے سکتے تھے مگر تسلی کوئی نہیں دیتا تھا۔ لوگوں کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ کسی کے ساتھ بیٹھ کر اس کی خوشی یا غم کو بانٹ سکتے۔ یہاں میٹھا بول سب سے قیمتی اور نایاب تحفہ تھا اور یہ خوش نصیب لوگوں کو ملتا تھا۔ یہاں تنہائی سب سے قریبی عزیز ثابت ہوتی تھی۔ یہاں دکھ سے زیادہ دکھ بانٹنے والوں کی کمیابی رلاتی تھی۔ یہاں کبھی کبھی انسانوں کے ہجوم میں بھی قبر جیسا سناٹا محسوس ہوتا تھا اور اسی لیے شاید خدا یہاں زیادہ یاد آتا تھا کیونکہ یہاں اس کی یہ حکمت بخوبی سمجھ میں آجاتی تھی کہ اس نے "اکیلا" ہونا صرف اپنے لیے کیوں پسند کیا۔

✡ ✡ ✡

"آپ ٹھیک تو ہیں نا۔ میں آپ کے لیے پریشان تھا؟" نور محمد نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے سادہ سے انداز میں کہا تھا۔ اسے انسانوں کی دلجوئی کرنا نہیں آتا تھا مگر وہ اس شخص کی حالت دیکھ کر کہے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔ وہ تین دن بعد آیا تھا اور کافی کمزور لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی کائی زدہ لگتی تھیں۔ اس کی داڑھی بے ترتیب تھی اور اس کا چہرہ زردی مائل تھا۔ نور محمد کی بات سن کر وہ مسکرایا تھا۔

"آپ نے میری غیر حاضری کو محسوس کیا، میں اس کے لیے آپ کا مشکور ہوں۔" اس شخص کی آواز میں کمزوری کا عنصر غالب تھا، وہ بہت اونچا لمبا شخص تھا مگر نقاہت اس قدر اس کے وجود پہ حاوی تھی کہ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح لگ رہا تھا۔

"آپ اتنے دن نماز کے لیے نہیں آئے تو ہم سب ہی آپ کی غیر حاضری کو محسوس کر رہے تھے۔" نور محمد نے جیسے صفائی دی تھی۔

"میں کچھ بیمار تھا اس لیے میں آنہیں سکا تھا مگر میں گھر پر نماز ادا کرتا رہا ہوں۔" وہ جیسے اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ نماز کا پابند ہے۔

نور محمد نے سر ہلایا تھا یہ اس کی عادت تھی وہ سب کی بات سنتے ہوئے سر ہلاتا تھا گویا ان کی بات اس کے نزدیک بہت اہمیت کی حامل تھی مگر اس کے پاس باتوں کے جوابات کم ہی ہوتے تھے سو وہ چپ رہنے میں عافیت محسوس کرتا تھا۔

"میں آپ کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتا تھا آپ کی وجہ سے میری زندگی میں بہت مثبت تبدیلیاں آئی ہیں۔ میں پہلے سے بہتر محسوس کرنے لگا ہوں۔" وہ شخص نور محمد کے خاموش رہنے پر خود ہی کہنا شروع ہوا تھا نور محمد نے حیرانی سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے اس شخص کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ اسے پھر اس شخص کے اس رویہ سے جھنجلاہٹ ہوئی۔

"آپ ایسی بات مت کریں۔ آپ جانتے ہیں، میں نے آپ کے لیے کچھ نہیں کیا۔ میں تو آپ کو جانتا بھی نہیں ہوں" ان کے درمیان گفتگو سانپ سیڑھی کے کھیل کی طرح پھر ابتدائی نمبروں پر آگئی تھی۔

"میں یہاں بہت عرصہ سے آرہا ہوں۔ آپ کو نہیں پتا آپ نے میرے لیے کیا کیا ہے۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آپ کو نماز پڑھتا دیکھ کر میں نے اپنی بہت سے غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔ میں اسی لیے چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے دوستی کرلیں۔ میری رہنمائی فرمائیں۔"

وہ شخص اتنی عاجزی سے کلام کرتا تھا کہ اس کی بات مان لینے کو دل کرتا تھا مگر دوسری جانب بھی نور محمد تھا جو ایسے انداز دیکھ کر ہی ڈر جایا کرتا تھا۔ ابھی بھی وہ اس شخص کی بات سن کر حیران ہوا جا رہا تھا۔

"آ... آپ مجھے نہیں جانتے آپ کو میرے بارے میں کچھ نہیں پتہ۔ آپ میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہیں..." اس نے بے بس سے لہجے میں بات شروع کی تھی اور اسی انداز میں ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"نہیں... دراصل آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں آپ کو بہت عرصہ سے دیکھ رہا ہوں۔ میں اس مسجد میں آپ کی وجہ سے ہی آنا شروع ہوا تھا۔ اللہ پاک کا آپ پر بہت کرم ہے۔ اس نے آپ کو بہت خوب صورت آواز سے نوازا ہے۔ آپ اتنی خوب صورت قرات کرتے ہیں۔ میں پہلے پہل یہاں آپ کی تلاوت سننے کے لیے ہی آنا شروع ہوا تھا۔"

نور محمد حیرانی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ بہت اچھی قرات کرتا تھا یہ بات اکثر لوگوں کے منہ سے اسے سننے کو مل جاتی تھی مگر یہ شخص جس انداز میں اسے سراہ رہا تھا ایسے تو کبھی کسی نے اسے نہیں سراہا تھا۔ وہ اس بات سے بھی بے خبر تھا کہ اس نے اسے قرات کرتے وقت کب سنا تھا۔ وہ زیادہ تر نماز فجر کے بعد تلاوت کیا کرتا تھا اور اس نے اس شخص کو کبھی نماز فجر میں مسجد میں نہیں دیکھا تھا۔

"میں زیادہ کا مطالبہ تو نہیں کر رہا۔ آپ تو ویسے بھی معلم ہیں، میں جانتا ہوں آپ بچوں کو قرآن پاک بھی پڑھاتے ہیں۔ آپ مجھے بھی ان بچوں میں سے ایک

سمجھ لیں۔"

وہ اب کی بار مسکرایا بھی تھا۔ نور محمد کو اس کی مسکراہٹ اچھی نہیں لگی تھی۔ اسے لگا وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ سو وہ اس سے کیا سیکھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ یہ سچ تھا کہ وہ مسجد میں اور مسجد کے باہر بھی کچھ بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کے لیے جایا کرتا تھا لیکن وہ سب چھوٹے بچے تھے اس نے کبھی کسی اتنے بڑے شخص کو کچھ نہیں پڑھایا تھا اور وہ قرآن پڑھنے کی بات کر ہی کب رہا تھا۔ نور محمد نے کبھی اپنے آپ کو کسی معاملے میں اس قدر قابل نہیں سمجھا تھا کہ وہ کسی کے لیے قابل تقلید ہو سکتا۔ وہ احساس کمتری کے کمتر ترین درجے سے کبھی اوپر چڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔

"آپ پتا نہیں کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟" نور محمد کے لہجے میں اب ایک مخصوص قسم کی بے چارگی نمایاں ہونے لگی تھی۔ اسے بلاوجہ کی گفتگو ویسے ہی اکتا دیتی تھی۔

"آپ پر اللہ پاک کی بڑی رحمت ہے۔ اللہ نے آپ کو بہت خوب صورت آواز سے نوازا ہے۔ آپ اتنی اچھی قرات کرتے ہیں کہ راہ چلتے لوگ بھی رک کر سننے لگتے ہیں۔ میں جب جب آپ کو قرات کرتے سنتا ہوں میں ایک عجیب سے احساس میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ ایک جنتی آدمی ہیں۔" اس شخص کے لہجے میں بے پناہ عقیدت تھی۔ نور محمد کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ کون شخص تھا۔ وہ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ نا محسوس طریقے سے تھوڑا سا پیچھے ہوا تھا۔ اسے اس شخص سے خوف آیا تھا۔ وہ اسے جنت کی نوید دے رہا تھا۔ نور محمد نے اپنی خفگی کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے واقعی اس شخص سے خوف آرہا تھا، وہ اس شخص سے جلد از جلد جان چھڑا لینا چاہتا تھا۔ اس نے زندگی میں ستائش سمیٹنا نہیں سیکھا تھا تو وہ عقیدت کہاں سنبھال سکتا تھا۔ وہ شخص اسے کوئی بہت بڑا نوسرباز نظر آرہا تھا۔ اسے اگر صرف تعریفیں کرکے نور محمد کو شرمندہ کرنا یا خوفزدہ کرنا تھا تو نور محمد کے پاس قطعاً" فارغ وقت نہیں تھا اپنی جانب سے وہ اس کی تیمارداری کر چکا تھا۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتا اس شخص نے نور محمد کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھا تھا۔ اس شخص کے ہاتھوں میں لرزش تھی جو اس کی بیماری کا پتا دیتی تھی۔

"میری آپ سے گزارش ہے آپ میری راہ نمائی فرمائیں۔ مجھ سے دوستی کرلیں۔ آپ جیسے شخص سے دوستی مجھے فرش سے اٹھا کر عرش پر لے جائے گی۔ میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔" نور محمد کی پیشانی پر پسینہ نمایاں ہونے لگا تھا۔ کیا وہ واقعی کوئی نوسرباز تھا۔

"آپ مجھے معاف کیجیے میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتا۔ میں کسی کی کیا رہنمائی کروں گا مجھے تو خود رہنمائی کی ضرورت ہے۔" اس نے اس شخص کے ہاتھ جھٹکنے چاہے تھے۔

"ایسے مت کیجیے میں آپ کے پاس بہت امید لے کر آیا ہوں۔ مجھے ناامید مت کیجیے۔ آپ کو نہیں پتا آپ کا انکار کسی کو موت کے منہ میں دھکیل سکتا ہے۔" وہ منت پر اتر آیا تھا۔

"آپ عجیب آدمی ہیں۔ پتا نہیں آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں..." نور محمد نے بات پوری نہیں کی تھی کہ اس نے بات کاٹ دی۔

"میں زیادہ نہیں چاہتا بس میں اتنا چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے دوستی کرلیں۔ مجھے دین سکھا دیں۔"

"یا خدا... آپ پتا نہیں میرے ساتھ یہ کیوں کر رہے ہیں، میں کسی کو کیا سکھا سکتا ہوں۔ میں تو خود ابھی دین سیکھ رہا ہوں۔ میں تو خود ابھی طالب علم ہوں۔"

نور محمد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس جگہ سے بھاگ جائے۔

"آپ ایسے انکار مت کریں۔ مجھے اندھیروں میں مت دھکیلیں۔ میں واقعی بہت امید لے کر آیا ہوں۔ میں بہت عرصے سے اس مسجد میں آرہا ہوں۔ آپ کو نہیں پتا میں کب سے آپ کو دیکھتا ہوں۔ آپ پنج وقتہ

نمازی ہیں۔ آپ سے زیادہ دین دار کون ہوگا بھلا؟"
اس شخص کا لہجہ بھیگا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔
"آپ مسجد میں آتے ہیں مجھے پانچ وقت نماز پڑھتے دیکھتے ہیں تو یقیناً" آپ بھی پنج وقتہ نمازی ہوں گے' آپ بتایئے آپ سے زیادہ دین دار کون ہوگا بھلا۔" نور محمد نے جیسے تھک کر اسے سمجھانا چاہا تھا۔
اس شخص نے سر جھکا لیا تھا جیسے پشیمانی میں گھر گیا ہو۔
"میں نماز پڑھتے ہوئے بھی آپ کو دیکھتا رہتا ہوں۔ میں نے نماز پڑھنا سیکھا ہی آپ سے ہے۔ اس سے پہلے مجھے نماز پڑھنی آتی ہی کہاں تھی۔ سجدے کے نام پر صرف پیشانی زمین پر رگڑنے کا نام نماز نہیں ہوتا۔ نماز کیا ہوتی ہے یہ آپ نے سکھایا ہے مجھے "آپ خدارا مجھے اپنا دوست بنالیں میں آپ کا مشکور رہوں گا۔"
"بندہ خدا اگر آپ مجھے دیکھنے کے بجائے نماز پر دھیان دیتے رہتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ آپ کو مسجد یا نماز کی حرمت کا ہی نہیں پتا' آپ مجھے بھی اس طرح کر کے گناہ گار کرتے رہے ہیں۔ میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتا۔ میں شرمندہ ہوں۔" نور محمد واقعی تھک گیا تھا۔ یہ ساری صورت حال تھی ہی عجیب سی' وہ اس شخص کو سمجھا پا رہا تھا نہ خود کو بہتر تھا وہ یہاں سے چلا جاتا۔ یہی سوچ کر اس نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا تھا۔
"آپ..... آپ میری ایک آخری بات سن لیجیے۔" اس شخص نے جیسے کچھ سوچ کر کہا تھا اور پھر گہری سانس بھری تھی۔
"میں آپ کے پاس خود نہیں آیا' مجھے کسی نے بھیجا ہے۔ آپ کے کسی بہت عزیز نے....." وہ رک رک کر بول رہا تھا۔
نور محمد نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ دوبارہ اسی پوزیشن میں بیٹھ گیا تھا جس میں اٹھنے کا ارادہ کرنے سے پہلے بیٹھا تھا۔
"کس نے بھیجا ہے آپ کو؟" الفاظ اس کے منہ سے جیسے سرسراتے ہوئے نکلے تھے۔
"خضر الٰہی نے۔" اس شخص نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
نور محمد ساکت رہ گیا تھا۔



روپ نگر سے واپسی کے کچھ سالوں بعد گرینڈ پا کا انتقال ہو گیا۔ انہیں مثانے کا سرطان تھا اور ان کی اس بیماری سے ہم ہی لاعلم نہیں تھے۔ وہ خود بھی تھے۔ انفیکشن سمجھ کر وہ جس تکلیف کو نظر انداز کرتے رہے تھے وہ مثانے کا سرطان تشخیص ہوا اور بالآخر یہی مہلک بیماری گرینڈ پا کے آخری سفر کا سبب بن گئی۔ ان کی وفات میرے لیے بہت بڑا سانحہ تھی۔ میں ان کے پاس کب سے تھا۔ مجھے نہیں پتا لیکن وہ میرے پاس ہمیشہ سے تھے یہ مجھے بخوبی پتا تھا۔ لاشعور سے شعور کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے ہمیشہ اپنی انگلی کو ان کے ہاتھ میں قید پایا تھا۔ وہ میرا اثاثہ ہی نہیں میرا سرمایہ بھی تھے۔ وہ میری روشنی کا ماخذ' میری حرارت کا منبع تھے۔ وہ واقعی میرا سورج تھے۔ ان کے بعد زندگی ایک دم تاریک اور سرد ہونے لگی تھی۔ میں اور گرینی ایک دوسرے کا دم بھرنے کی کوشش کرتے مگر ہمیں ایک دوسرے کے وجود میں وہ حرارت نہیں ملتی تھی' جس کی ہمیں ضرورت تھی۔ میں نے اپنے ڈیڈی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ میری پیدائش سے ایک ماہ پہلے انتقال کر گئے تھے جبکہ ممی مجھے گرینی کے حوالے کر کے اپنی زندگی میں مگن ہو گئی تھیں۔ ان کے اور میرے درمیان ٹرمز نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں ان کے حوالے سے جو چند ایک باتیں جانتا تھا وہ مجھے گرینی کے توسط سے ہی پتا چلی تھیں۔ وہ کبھی کبھار کرسمس پر فون کر لیا کرتی تھیں جو ہیلو ہائے سے زیادہ طویل نہیں ہوئی تھی۔ وہ گرینڈ پا کے فیونرل (آخری رسومات) پر آئی تھیں اور دعا میں شامل ہو کر واپس چلی گئی تھیں۔ اس سے زیادہ ہمارے درمیان تعلقات نہیں تھے کہ ہم ایک دوسرے کو کوئی سہارا یا آسرا فراہم کر پاتے۔

میرے اردگرد اب گرینی ہی تھیں۔ میری اور ان کی زیادہ بنتی نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے سے جلدی اکتا جاتے تھے حالانکہ اب وہ مجھے پہلے کی نسبت بہت کم ڈانٹتی تھیں' کم غصہ دلاتی تھیں اور کم ٹوکتی تھیں لیکن وہ گرینڈ پا کی طرح میرے ساتھ باتیں نہیں کرتی تھیں' کھیلتی نہیں تھیں' فلم نہیں دیکھتی تھیں۔ ان کی نسبت گرینی بوڑھی تھیں اور بد ذوق بھی۔ ان کی باتیں' ان کے شوق' ان کی دلچسپیاں اور ان کے دوست مجھے بھاتے نہیں تھے اور ان کی طرف بھی میرے معاملے میں یہی صورت حال تھی سو ہم بہت جلد اپنے آپ میں مگن ہو گئے۔
انہی دنوں کی بات تھی۔ میں باسکٹ بال کھیل کر واپس آیا تھا جب میں نے گرینی کو بے وقت کچن میں مصروف دیکھا۔ وہ اچھے طریقے سے تیار تھیں۔ انہوں نے سنہرے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا ان کے چہرے پر میک اپ تھا اور ان سے گرینڈ پا کے فیورٹ پرفیوم کی مہک آرہی تھی۔ مجھے اتنے دنوں بعد انہیں اس طرح دیکھنا اچھا لگا۔
"کافی پر مہمان آرہے ہیں۔" میرے پوچھنے پر گرینی نے بتایا۔
میں چپ چاپ اپنے کمرے میں آگیا۔ گرینڈ پا کے بعد یہ پہلی مرتبہ تھا کہ ہمارے گھر کوئی مہمان کافی پر آرہے تھے۔ گرینی کی سہیلیوں سے میرا زیادہ تعارف نہیں تھا۔ وہ مجھے گرینی کی طرح بد ذوق اور عمر رسیدہ لگتی تھیں' سو اپنے بیڈ روم میں رہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے میں نے ٹی وی لگا لیا' میری پسندیدہ ٹی وی سیریز آرہی تھی میں ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی پسندیدہ بھنی ہوئی کھٹی میٹھی مونگ پھلیاں پھانکنے لگا۔ کچھ دیر بعد باہر ہال سے خوش گپیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ گرینی خوش دلی سے گفتگو میں مصروف تھیں۔ ان کے ہنسنے کی آوازیں گاہے بگاہے مجھ تک آرہی تھیں۔ ان کی آواز میں تازگی سی چھلکتی محسوس ہوتی تھی جو اچھی لگ رہی تھی۔ گرینڈ پا کے بعد جس طرح وہ الجھی الجھی لگتی تھیں اس کے اثرات کافی کم ہوتے لگ رہے تھے۔
"ملی! ہمارے ساتھ کافی شیئر کرو گے؟"
گرینی مجھے بلانے کے لیے آئی تھیں۔ پہلے میرا دل چاہا کہ انکار کردوں پھر یہ سوچ کر کہ میری موجودگی سے انہیں خوشی ملے گی میں ان کے ساتھ باہر آگیا۔ کافی ٹیبل کے گرد چار لوگ موجود تھے۔ ایک آنٹی ریکا جو گرینی کی پرانی سہیلی تھیں' ایک ہماری پڑوسی مسز ڈیمور بھی تھیں ایک گرینڈ پا کے کولیگ کی اہلیہ مسز رامسی تھیں۔ ان کے علاوہ مسٹر ایرک تھے۔ یہ گرینی کے کزن تھے اور پہلے بھی چند بار ہمارے گھر آچکے تھے۔
"تم پہلے سے زیادہ ہینڈسم ہوگئے ہو ینگ مین۔" انہوں نے پرجوش لہجے میں کہا تھا۔ وہ اچھے دلچسپ انسان تھے اور گرینڈ پا کی طرح چھوٹے بچوں سے کافی پیار کرتے تھے۔
"یہ بالکل اپنے باپ کے جیسا ہے۔" گرینی نے مجھے محبت سے دیکھا۔
"نہیں میگی..... یہ تمہارے جیسا ہے۔ کیوٹ..... چارمنگ۔" مسٹر ایرک نے گرینی کو دیکھتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی جس کے رنگ بڑے انوکھے سے تھے۔ میں چونک سا گیا اور کافی پیتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر ان کو دیکھتا رہا۔ کیا وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے۔ کیا گرینی اتنی جلدی گرینڈ پا کو بھول گئی تھیں۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگا مگر میں نے اس چیز کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کافی پی کر سب آنٹیز چلی گئی تھیں لیکن مسٹر ایرک کافی دیر بیٹھے رہے تھے۔ مجھے ان سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا لیکن گرینی کی طرف ان کا التفات مجھے کچھ چونکا رہا تھا۔
"ایرک اچھا انسان ہے..... تمہیں اس کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگا..... ہے نا؟" رات کو میرا یونیفارم وغیرہ نکالتے ہوئے گرینی نے مجھ سے پوچھا تھا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی لیکن مسکراہٹ کا سایہ ضرور تھا۔ میں بستر پر لیٹ چکا تھا۔ ان کی باتیں سن

www.paksociety.com

کر یکدم اٹھ بیٹھا۔

"گریبی! مسٹر ایرک اکیلے رہتے ہیں؟" میرے انداز میں تجسس تھا۔

"ہاں..... اس کی بیوی مر چکی ہے۔ ایک بیٹی ہے اپنے شوہر کے ساتھ "کارڈف" میں رہتی ہے تو ایرک بیچارہ میری طرح اکیلا ہے۔"

گریبی کا لہجہ سادہ تھا اور انداز مگن سا تھا۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ وہ خود کو میرے ہوتے ہوئے اکیلا کیوں سمجھنے لگی تھیں۔ میں تو ان کے ساتھ ہی تھا لیکن وہ شاید میرے ساتھ نہیں تھیں۔ میں دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ گریبی کو میری خاموشی کا احساس ہوا تھا یا شاید وہ ابھی بھی اپنے آپ میں گم تھیں۔

"جب لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو انہیں اکیلا رہنا ہی پڑتا ہے۔" میرا بلینکٹ درست کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

"جب لوگ اکیلے ہو جاتے ہیں تو انہیں بوڑھا ہونا ہی پڑتا ہے گریبی۔" میں نے بجھے ہوئے دل سے انہیں جتایا تھا پھر ان کے چہرے کی جانب دیکھے بنا لحاف کو چہرے کے اوپر کر لیا۔

مسٹر ایرک اکثر و بیشتر ہمارے گھر آنے لگے۔ وہ فطرتاً" اچھے انسان تھے۔ پیار کرنے والے اور باتونی..... انہیں بہت سی مزے دار باتیں اور لطائف یاد رہتے تھے۔ وہ ہمارے گھر میں ہوتے تو ان کے اور گریبی کے قہقہے در و دیوار میں گونجتے رہتے۔ گریبی ان کی موجودگی میں خوش رہتی تھیں۔ وہ اکٹھے کچن میں کچھ بیک کرتے رہتے یا پھر کھر پی اور کھادلے کر باغبانی کا شغل جاری رہتا پھر گریبی ان کے ساتھ واک پر بھی جانے لگی تھیں۔ کبھی کبھی وہ گروسری بھی اکٹھی کر لیتے۔ ہمارے ریفریجریٹر میں مسٹر ایرک کی پسند کی چیزیں کثرت سے موجود رہنے لگی تھیں۔ گریبی کی گفتگو میں مسٹر ایرک کا ذکر نمایاں رہتا اور یہ سب کچھ مجھے بے چین کر رہا تھا۔ مجھے ان سے چڑ ہونے لگی تھی۔

میں بے شک گرینڈپا کی نسبت گریبی سے تنا اٹیچڈ نہیں تھا لیکن گریبی پر کوئی حق جتائے یہ بھی مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے ابھی تک گریبی سے ان کے اس ریلیشن شپ کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن ان کے بدلے بدلے انداز مجھے سب سمجھا رہے تھے۔ نئی بات یہ تھی کہ وہ اب وقتاً" فوقتاً" میری ممی کا ذکر کرنے لگی تھیں۔ وہ مجھے اکسانے لگی تھیں کہ مجھے ممی سے فون پر بات کرنی چاہیے۔

"تم اپنی ممی سے ملو..... ان سے فون پر باتیں کرو..... انہیں پوسٹ کارڈ بھیجا کرو..... تم دونوں کے بہترین تعلقات تمہاری آئندہ زندگی میں معاون ثابت ہوں گے۔"

ایک دن جب مسٹر ایرک ہمارے گھر میں موجود تھے تو گریبی نے میری ممی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ مسٹر ایرک بھی ان کا ساتھ دینے لگے۔

میں پڈنگ کھا رہا تھا۔ ان کی باتیں سن کر میرا دل چاہا میں پڈنگ کا پیالہ فرش پہ دے ماروں۔ وہ مجھے ممی سے تعلقات بڑھانے کے لیے کہہ رہی تھیں، جن کو میں نے زندگی میں کبھی ممی کہہ کر بھی نہیں بلایا تھا بلکہ میں نے انہیں کبھی مخاطب بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ لندن کے کس ایریا میں رہتی ہیں۔ میری پیشانی پر تیوریاں نمایاں ہونے لگیں تھیں۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا چمچ پڈنگ کے پیالے میں زور سے پٹخا اور پیالہ میز پر رکھ دیا۔

"آپ لوگوں کو میری زندگی کے فیصلے کرنے کا اس میں مداخلت کرنے کا اور ناپسندیدہ چیزوں کے لیے مجھے مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں ہے..... مجھے آپ لوگوں کی کوئی بات نہیں سننی۔" میں غرایا تھا اور میرا رخ مسٹر ایرک کی طرف تھا۔ گریبی چند لمحے حیرانی سے مجھے دیکھتی رہیں پھر جیسے انہیں ہوش آیا۔

"اتنی بدتمیزی پر میں تمہیں سخت سزا دے سکتی ہوں..... میں تم سے توقع کرتی ہوں کہ تم ایرک سے ابھی معافی مانگ کر اپنے برے رویے کا ازالہ کرو گے۔"

گریبی نے مجھے تنبیہہ کی تھی۔ میری آنکھیں پانی سے لبالب بھرنے لگیں۔ میں ایک چھوٹا بچہ ہی تو تھا جس کے ارد گرد رہنے والوں کو اس کی پرواہ نہیں رہی تھی۔ مجھے گرینڈپا کی شدید یاد آئی۔ میں نے مسٹر ایرک کے چہرے کو آنسوؤں کی بنا پر دھندلاتے دیکھا۔

"آپ کبھی میرے گرینڈپا کی جگہ نہیں لے سکتے۔ کبھی نہیں۔ ہیٹ یو..... ہیٹ یو..... آئی ہیٹ یو....." میں چلایا تھا اور پھر بھاگ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ مجھے بہت رونا آرہا تھا اور میں رونا چاہتا تھا۔

"تمہارے انداز دن بدن جارحانہ ہوتے جا رہے ہیں۔ تمہیں ایرک سے ایسے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

گریبی نے مسٹر ایرک کے جانے کے بعد رات کو میرے کمرے میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ناراض لگ رہی تھیں۔ روتے رہنے کے باعث میری ناک بہہ رہی تھی اور میرے سر میں درد تھا۔ گریبی کی بات سن کر مجھے اور رونا آنے لگا جسے میں نے بمشکل ضبط کیا۔

"آپ اور مسٹر ایرک شادی کرنے والے ہیں؟" بالآخر میں نے پوچھ لیا۔ میری بے چینی تب ہی ختم ہو سکتی تھی۔ میں گریبی سے اس موضوع پر کھل کر بات کر لیتا۔ میری آواز رندھی ہوئی تھی۔ گریبی پہلے میرا سوال سن کر چونکیں پھر انہوں نے گہری سانس بھری۔

"یہ سوال ہے یا خدشہ؟" وہ اب نارمل ہو چکی تھیں۔

"ایک ہی بات ہے گریبی..... سوال ہو یا خدشہ۔"

"نہیں..... ایک ہی بات نہیں ہے..... خدشے کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ میرے پاس جواب ہے۔ میں اور ایرک شادی نہیں کرنے والے..... وہ میرا اچھا دوست ہے۔ وہ تنہائی کے دکھ کو سمجھتا ہے اور میرے دکھ کو بانٹنے آتا ہے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھیں اور ناراض لگتی تھیں۔

"تمہارے گرینڈپا کی جگہ کوئی اور کیسے لے سکتا ہے بلی..... وہ جگہ خالی نہیں ہے۔ جیک کی یادوں نے اس جگہ کو ابھی بھی خالی نہیں کیا..... تم نے یہ کیوں سوچ لیا؟" وہ اب اداس بھی لگنے لگی تھیں۔ مجھے شرمندگی سی ہوئی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آگیا۔

"آپ بار بار کیوں ممی کا ذکر کرتی ہیں..... مجھے اچھا نہیں لگتا گریبی..... مجھے ان کے ساتھ نہیں رہنا..... میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں ہمیشہ۔"

میں نے محبت سے چور لہجے میں کہا۔ انہوں نے میرا چہرہ دیکھا اور دیکھتی رہیں۔

"میں نے خود بھی ہمیشہ ایسا ہی چاہا ہے..... میں خود تمہاری ممی کو زیادہ پسند نہیں کرتی اور یہ بات تم سے ڈھکی چھپی نہیں ہے، پہلے دن سے وہ مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ ایک ویمپ کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ اس کی وجہ سے میرے بیٹے کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ میں ہمیشہ اس سے خائف رہی ہوں کہ وہ تمہیں ہم سے چھین لے گی۔ مجھے ہمیشہ یہ اچھا لگتا تھا کہ تم اس کے ساتھ نہیں ہمارے ساتھ رہ رہے ہو..... مگر۔" انہوں نے کہتے کہتے اپنی مخصوص ٹھنڈی آہ بھری۔

"وہ تمہاری ماں ہے..... جوان اور پرجوش..... وہ مجھ سے بہتر تمہارا خیال رکھ سکتی ہے۔ تمہارے ساتھ باسکٹ بال کھیل سکتی ہے، گٹار بجا سکتی ہے، ڈانس کر سکتی ہے اور یہ سب میں نہیں کر سکتی۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ کسی چھوٹے بچے کا اچھے طریقے سے خیال رکھ سکوں۔"

"میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا..... کبھی نہیں..... میں چھوٹا بچہ نہیں ہوں، بڑا ہو گیا ہوں۔ مجھے باسکٹ بال کھیلنے یا ڈانس کرنے کے لیے کسی پارٹنر کی ضرورت نہیں ہے گریبی..... مجھے آپ کی ضرورت ہے..... میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

میں نے تڑپ کر کہا تھا اور اپنی بانہیں ان کے گرد حمائل کی تھیں۔ وہ بیچارگی سے مسکرائیں۔

"تم نہیں میں چھوڑ کر جا سکتی ہوں..... یہ خدشہ ہے اور اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے..... جیک اس طرح اچانک ہمیں چھوڑ کر چلا گیا اگر اسی طرح میں بھی چلی گئی تو تمہارا خیال کون رکھے گا؟"

"گرینڈپا بیمار تھے گریبی اور..... آپ بیمار نہیں

ہیں۔" میں نے سابقہ انداز میں کہا۔

"میں بیمار نہیں ہوں۔۔۔ بوڑھی ہوں۔" انہوں نے پھر ٹھنڈی لمبی سانس بھری۔ "بوڑھے لوگوں سے لمبی دوستی نقصان کا باعث بنتی ہے اور میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔"

"آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں گرینی؟" میں روہانسا ہو رہا تھا۔

"بڑھاپا بھربھری مٹی کا پیڈسٹل ہوتا ہے۔ یہ آپ کو اونچا کر سکتا ہے لیکن اس اونچائی کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ تمہیں مضبوط پیڈسٹل کی ضرورت ہے جب تک تم خود اپنے قد کی بنا پر اونچے نہیں ہو جاتے تمہاری ممی یہ مضبوط پیڈسٹل بن سکتی ہے۔" وہ اب ناصحانہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"میں پہلے ہی بہت اونچا ہو چکا ہوں گرینی۔ میرا قد آپ جتنا ہو گیا ہے۔ مجھے مزید اونچا نہیں ہونا۔ مجھے کسی پیڈسٹل کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے خود کو مزید رونے سے بھی نہیں روکا تھا۔

"میں تمہیں اس سے بھی زیادہ اونچا دیکھنا چاہتی ہوں۔ جذباتی ہونے سے کامیابی نہیں ملتی۔۔۔ کامیاب ہونا ہو تو جذبات کو قابو میں رکھنا پڑتا ہے۔" وہ قطعیت سے کہہ رہی تھیں اور میں مسلسل رو رہا تھا۔

"یہ سب میرے لیے آسان نہیں ہے لیکن آسانیاں تلاش کرتے رہنے سے مشکلات بڑھتی ہیں اس لیے مشکلات کا حل تلاش کرتے ہیں آسانیاں نہیں۔"

گرینی نے اپنے مخصوص پروقار انداز میں کہا تھا۔



ہم ڈنر ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے۔ کھانا ابھی چنا نہیں گیا تھا۔ سب کے انداز دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ کسی کو بھوک نہیں ہے۔ سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ گرینی بالکل سامنے بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ میری کرسی تھی۔ میرے بالکل سامنے میری جوان، طرحدار خوب صورت ممی بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ والی کرسی پر آنٹی ریکا تھیں جبکہ مسٹر ارک میرے ساتھ والی کرسی پر براجمان تھے۔ گرینی مجھے ممی کے ساتھ رچمنڈ بھجوا رہی تھیں اس لیے بے چین تھیں، جبکہ ممی شاید اس لیے بے چین تھیں کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جا رہی تھیں۔

وہ ایک دن پہلے ہی آئی تھیں۔ گرینی نے انہیں خط لکھ کر بلوایا تھا۔ ان کے اور گرینی کے درمیان مجھے لے جانے والے ایشو پر کیا بات ہوئی تھی مجھے اس سے قطعاً بے خبر رکھا گیا تھا۔ گرینی نے مجھے صرف اطلاع دی تھی کہ ممی مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر خوش دلی سے آمادہ ہیں اور اب مجھے ممی کے ساتھ ہی جانا ہے اور اب یہ آخری ڈنر تھا جو میں گرینی کے ساتھ کرنے والا تھا۔

میرا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور دل کی حالت بہت بے چین تھی۔ میں گرینی کی بہت منت سماجت کر چکا تھا کہ مجھے ان کے ساتھ ہی رہنا تھا، ان کو چھوڑ کر نہیں جانا تھا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی تھیں۔ اسی ضد کی بنا پر انہوں نے ممی کو رضامند کر لیا تھا۔

"میرا پوتا بلی مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں نے تیرہ سال تک اس کو اپنے پروں میں چھپا کر رکھا ہے۔ اس پہ کوئی آنچ نہیں آنے دی اور بلی بہت اچھا بچہ ہے۔ اسے کتابوں سے محبت ہے۔ یہ فطرت کا دلدادہ ہے اور بے ترتیبی سے اسے سخت نفرت ہے۔ اس کی طبیعت کی شائستگی کی وجہ سے مجھے ہمیشہ اس کی تربیت کرنے میں آسانی ہوئی ہے۔ میں امید کرتی ہوں کرسٹی کہ تم اپنے بیٹے کے ساتھ بہت خوش رہو گی۔ ایک بچے کا ساتھ آپ کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دیتا ہے اور کرسٹی میں تمہیں تمہاری خوشیاں اپنی پوری رضامندی کے ساتھ لوٹاتی ہوں۔"

گرینی کی آواز بھرانے لگی تھی۔ انہوں نے بات مکمل کر کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے آنکھوں کے کنارے صاف کیے پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے میری جانب دیکھا۔ مجھے بہت رونا آ رہا تھا اور میں بہت ضبط کر رہا تھا۔

گرینی نے دایاں ہاتھ میری جانب بڑھایا۔ میں نے ان کے ہاتھ کو تھام کر پہلے ہونٹوں اور پھر آنکھوں سے لگایا تھا۔ آج جب میں انہیں چھوڑ کر جا رہا تھا تو مجھے احساس ہوا تھا کہ مجھے ان سے کتنی محبت ہے۔

"میں آپ کو بہت مس کروں گا گرینی!" میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں بھی۔۔۔ میرے بچے۔" وہ بھی آب دیدہ تھیں۔ آنٹی ریکا نے بھی اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"میں پوری کوشش کروں گی مسز کی آنٹی کہ بلی کا خیال ویسے ہی رکھ سکوں جیسے آپ نے اب تک رکھا ہے۔"

میری ممی نے گرینی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا لیکن ان کے انداز میں کچھ ایسی بات تھی جس نے مجھے چونکایا۔ مجھے بارہا ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دلی رضامندی سے مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا رہیں۔ مسز روز میری جو ہماری ہاؤس کیپر تھیں نے کھانا لگوانا شروع کر دیا تھا۔ ڈائننگ ہال میں چند لمحے بعد بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو پھیلنے لگی تھی۔

"بڑھی اکیلی رہ رہی ہے یا پھانس لیا ہے کوئی مرغا؟" یہ میری ممی کا گرینی کے متعلق ان سے علیحدہ ہو جانے کے بعد اگلا سوال تھا اور اب میں اتنا بچہ بھی نہیں تھا کہ ان کا مفہوم سمجھ نہیں پاتا۔ میں نے حیرانی سے ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ گرینی کے سامنے تو اتنی غیر مہذب نہیں لگتی تھیں۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا لیکن مجھے ان کے بدلے ہوئے لہجے سے نجانے کیوں خوف آیا۔

"مسٹر ارک کے ساتھ کوئی چکر چل رہا ہے کیا۔۔۔ ساتھ رہ رہے ہیں دونوں؟"

دوسرا سوال تھا اور اتنا چبھتا ہوا سوال تھا کہ میں ان کی جانب سے نظریں ہٹا کر ٹرین کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سورج غروب نہیں ہوا تھا لیکن غروب ہونے کی تیاری میں تھا۔ اس کی دمکتی کرنیں اب زرد و نارنجی لباس پر سرمئی کی دھاریوں والا لبادہ اوڑھ رہی تھیں۔ آسمان کا رنگ بھی میلا میلا سا ہو رہا تھا ایسے میں غروب ہوتا ہوا سورج مجھے کسی بوڑھے ہارے ہوئے بادشاہ کی طرح اکیلا اور تھکا ہوا دکھائی دیا۔

"گرینی بہت اکیلی ہیں۔" میں نے بہت پر زور دیتے ہوئے گہری سانس بھری۔

"اتنی اکیلی ہوتی تو تمہیں اپنے پاس ہی رکھ لیتی۔۔۔ اونہہ۔"

ان کا لہجہ سفاک تھا۔ ہنکارا بھر کر انہوں نے اپنا وینٹی باکس کھول کر اس میں سے کچھ نکالنا شروع کر دیا تھا۔ میں ان کی حرکت پر ساکت رہ گیا تھا۔ میں بلاوجہ اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا جو میری گود میں دھرے تھے۔

"آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتی تھیں؟"

میرا لہجہ شاید میری دلی کیفیت ظاہر کر رہا تھا مگر ممی نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ ان کی ہنسی بہت کھنک دار تھی۔

"تم بھی اپنے گرینڈ پیرنٹس کی طرح بہت جذباتی ہو۔" انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور پھر اپنی لپ اسٹک ٹھیک کرنے لگیں۔

"کسی انسان یا اس سے متعلق صورت حال کو جانچنا ہو تو جذبات کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے اس سے ہمیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔"

لپ اسٹک ہونٹوں پر پھیلا کر انہوں نے ہونٹوں کو باہم مس کیا تھا۔ وہ آئینے میں دائیں بائیں زاویے سے اپنے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کام سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے لپ اسٹک اور آئینے کو باکس میں واپس رکھ دیا۔

"یہ ٹرین دیکھ رہے ہو۔۔۔ یہ ہمیں لندن لے کر جائے گی۔" میری جانب رخ موڑ کر انہوں نے ٹانگ پہ ٹانگ رکھ لی تھی۔

"اتنی دلچسپ بات مجھے پہلے سے پتا ہے۔" میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

"میں جو بات اب تمہیں بتانے والی ہوں، وہ صرف دلچسپ نہیں ہے۔" ممی اب خفا نہیں لگ رہی تھیں۔

"مجھے ٹرین کا سفر اس لیے پسند ہے کہ اس میں کوئی "یوٹرن" نہیں ہوتا۔ انسان کو یوٹرن لینے کے لیے خود ٹرن لینا پڑتا ہے۔ میری زندگی گزارنے کی فلاسفی بالکل ٹرین جیسی ہے۔ میں یوٹرن نہیں لے سکتی۔ مجھ سے لیا ہی نہیں جاتا۔ ٹرین کی طرح۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھیں۔ میں سپاٹ چہرے کے ساتھ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کے بارے میں گرینی پہلے ہی کہہ چکی تھیں کہ وہ بے لچک سی خاتون ہیں۔

"مجھے امید ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو گے۔ تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے تو خود کو بدلنا ہو گا' خود کو میرے مطابق ڈھالنا ہو گا۔ یہ اتنا مشکل کام نہیں ہو گا تمہارے لیے کہ تم مجھے ایک اچھے بچے لگ رہے ہو اور یقین کرو میں بھی بری عورت نہیں ہوں۔ میرا اپنا ایک طرز زندگی ہے' ہر شخص کا ہوتا ہے تمہارا بھی ہو گا' میں نے تمہیں کبھی بھی ڈس اون نہیں کیا۔ ابھی بھی نہیں کروں گی۔ لیکن۔"

وہ لمحہ بھر کے لیے رکی تھیں۔

"میں یوٹرن نہیں لے سکتی۔"

"مجھے آپ کی بات سمجھ میں آ گئی ہے۔ آپ مجھے کند ذہن مت سمجھئے اور یہ بھی مت سمجھیں کہ میں کبھی آپ کو یوٹرن لینے کے لیے مجبور کروں۔"

میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا تھا۔ انہوں نے سر ہلا دیا جیسے میری سمجھ داری کو سراہ رہی ہوں۔

"بہت خوب۔ مجھے تمہارا انداز اچھا لگا۔ تم جلدی بات سمجھ لیتے ہو اپنے باپ کی طرح۔" وہ مسلسل بولتے ہوئے سر ہلا رہی تھیں۔ میں نے ان کا چہرہ آج پہلی بار اتنے قریب سے اور اتنے غور سے دیکھا تھا۔

"آپ کے شوہر اس بات پر اعتراض تو نہیں کریں گے کہ میں آپ کے ساتھ رہوں۔"

میں نے پوچھا تھا۔ میرے لہجے میں عجیب سی جھجک در آئی تھی۔ میرے لیے یہ پوچھنا بہت ضروری تھا کہ ان کے گھر والے میرے بارے میں کیا سوچتے تھے۔

"اوہ میرے خدا۔ تم واقعی اپنے باپ کی طرح ہو۔ وہی وضع داری۔"

انہوں نے اپنی تیکھی ناک سکوڑی۔ گرینی کی ان کے بارے میں ایک بات تو غلط ثابت ہو گئی تھی۔ وہ ممی کو ویمپ کہتی تھیں۔ اتنی خوب صورت ویمپ کے بارے میں کہیں نہیں پڑھا تھا میں نے یہ میری اور ممی کی پہلی باضابطہ طویل نشست تھی۔ آج سے پہلے مجھے ان کے ساتھ اتنی دیر بیٹھنے یا بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں ان کے بارے میں جانتا ہی کیا تھا اور اب جو ان کو جاننے کا موقع مل رہا تھا تو خدشات میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔

"میرا کوئی شوہر نہیں ہے بیگ مین! تم مجھے سنگل سمجھو۔" انہوں نے مجھے اطلاع دی تھی پھر جیسے انہیں کچھ یاد آیا۔

"زندگی میں ایک شادی کافی ہوتی ہے۔ غلطی کرنا حماقت نہیں ہوتی۔ غلطی کو دہراتے رہنا حماقت ہوتی ہے۔ اور میں احمق نہیں ہوں۔"

انہوں نے کہتے کہتے یکدم میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ ممتا کا پہلا لمس بے حس' بے تاثر اور بے کار تھا۔ "محبت" سے آپ کو کچھ اور ملے نہ ملے توانائی ضرور ملنی چاہیے۔ میری ممی کی محبت میں میرے لیے کوئی توانائی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ ایک سیکنڈ سے بھی پہلے اٹھا لیا۔ میں نے اطمینان بھری سانس لی۔

ٹرین آگے کی سمت جا رہی تھی۔ میں کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کالج کیوں نہیں آتے؟" راشد نے اس کے بنائے ہوئے نوٹس کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ راشد سے اس کی ملاقات اکیڈمی میں ہوئی تھی جہاں وہ ایف ایس سی کے تین مضامین کی ٹیوشن پڑھ رہا تھا۔ اونچے لمبے قد والا راشد طبیعتاً" بے حد ملنسار خوش مزاج تھا۔ اس کی خاموشی اور لاتعلقی کو نظرانداز کر کے وہ اس کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دے رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کے درمیان دوستی ہونا شروع ہو گئی تب ہی اسے پتا چلا کہ راشد اس کے کالج میں ہی پڑھتا ہے۔ کالج میں اس کی مسلسل غیر حاضری کو محسوس کر کے راشد نے اس سے پوچھا تھا۔

"بلاوجہ ٹائم ضائع کرنے کا فائدہ۔ کالج میں پڑھائی کب ہوتی ہے۔" اس نے ابو کی زبان بولی تھی۔ راشد نے نظریں اٹھا کر لمحہ بھر کے لیے اس کی جانب دیکھا۔

"ہمیشہ نہیں ہوتا ٹائم ضائع۔ ہم بھی تو جاتے ہیں کالج۔ میں' جبران' طلحہ۔ ہم پڑھنے ہی جاتے ہیں۔" راشد نے اپنے کالج کے دوستوں کے نام لیے تھے۔

"میں گھر پر پڑھ لیتا ہوں۔" اس کا لہجہ سادہ اور لاتعلق تھا۔ راشد نے کچھ کہنا چاہا مگر اکیڈمی ٹیچر کے آ جانے سے وہ کہہ نہیں پایا لیکن چند دن بعد اس نے ایک بار پھر یہ ٹاپک چھیڑ دیا اور بطور خاص تاکید کی۔

"کل کالج ضرور آنا۔"

"ہوں۔ کوئی خاص بات؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا تھا۔ فزکس کا لیکچر ہو رہا تھا۔

"کل کالج میں اینول اسپورٹس ڈے ہے۔" راشد کا لہجہ پرجوش تھا۔ وہ ہاکی کی ٹیم میں شامل تھا۔ راشد کی تاکید کے باوجود اینول اسپورٹس ڈے پر کالج نہیں گیا تھا بلکہ اس کے دو دن بعد جب زیادہ تر لڑکے غیر حاضر تھے وہ فقط حالات حاضرہ جاننے کے لیے کالج کا چکر لگا آیا تھا۔ کالج فنکشنز اور ایونٹس کنفیوژن اور تھکن کے علاوہ اسے کچھ نہیں دیتے تھے۔ ایسی باتوں میں اس کی دلچسپی صفر تھی۔ کالج میں اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ کلاس فیلوز سے اس کا رشتہ بے حد سرسری تھا۔ جو لڑکے اسے پہچانتے تھے وہ کبھی کبھار اسے کالج میں دیکھ کر ہیلو ہائے کے بعد اپنی راہ ہو لیتے تھے۔ کسی کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ ایک بورنگ پڑھاکو اور غیر دلچسپ باتیں کرنے والے لڑکے کے پاس کھڑے ہو کر گپ شپ کی جاتی۔ اسی لیے وہ اکیڈمی میں مطمئن رہتا تھا وہاں چند ایک لڑکے تھے جو علیک سلیک کے بعد بھی اس سے چند باتیں کر لیا کرتے تھے۔

"میں نے تمہارا بہت انتظار کیا بلکہ میں نے تمہارے لیے اپنے ساتھ جگہ بھی رکھی تھی اگلی رو میں تاکہ ہم سب کچھ باآسانی دیکھ سکیں۔ مگر تم۔" راشد نے چند دنوں بعد اس سے شکوہ کناں لہجے میں کہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے بسی اور مسکراہٹ ایک ساتھ چمکی۔ ایسے شکوے اس سے کبھی کسی نے نہیں کیے تھے۔

"میں۔ وہ۔ دراصل۔ میں نے آنا تھا۔ میرا مطلب میرا ارادہ تھا مگر میری طبیعت خراب ہو گئی۔ سوری۔" دوستی کا وہ رشتہ جو مضبوط ہونے جا رہا تھا۔ اس میں اتنا جھوٹ بولنا جائز لگا تھا اس کو۔

"اوہو۔ چلو کوئی بات نہیں۔ اب جس جس روز تم کالج آؤ مجھے ایک روز پہلے بتا دینا۔ میں تمہیں طلحہ اور جبران سے ملواؤں گا۔" راشد نے اس کا عذر قبول کر لیا۔ راشد کی طبیعت میں ملنساری کچھ زیادہ ہی تھی اور اسے باتیں کرنے کا فن بھی آتا تھا لیکن وہ باتیں کرنے کا شائق تھا نہ اسے زیادہ لوگوں سے ملنے کی طلب تھی۔ جس طرح دن' رات کا تعاقب کرتا ہے اور رات' دن کی پیروی میں پاگل رہتی ہے اسی طرح ان کے درمیان بھی کیمسٹری بتدریج ملنے لگی۔ راشد کی اس کے نوٹس میں اور اس کی راشد کی باتوں میں دلچسپی بڑھنے لگی۔ کالج جا کر اس نے طلحہ اور جبران سے بھی ملاقات کی وہ دونوں بھی کافی خوش مزاج تھے اس لیے اس روز اسے کالج میں بہت مزا آیا ویسے بھی اکیڈمی میں زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ملتا تھا لیکن کالج میں کلاسز بنک کر کے وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کرکٹ' ہاکی کی' فلموں اور گانوں کی باتیں' ٹیچرز اور کلاس فیلوز کی باتیں۔ ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کتنا کچھ تھا طلحہ' راشد اور جبران کے پاس جبکہ وہ سن رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔ ایک دوستی نے کچھ زخم دیے تھے۔ "ایک" اور دوستی ان کے خشک ہو جانے والے کھرنڈوں کو بہت نرمی سے کھرچ رہی

تھی۔

"سیکنڈ ایئر کا ٹور جا رہا ہے..... مری۔" طلحہ نے بے حد پرجوش لہجے میں اطلاع دی۔ یہ اطلاع صرف اس کے لیے تھی راشد باقاعدگی سے کالج جاتا تھا اس لیے اسے یہ بات پہلے سے پتا تھی۔ فرسٹ ایئر کے ایگزامز ہو چکے۔ فرسٹ ایئر کے سارے سیکشن کو عارضی طور پر پروموٹ کر دیا گیا تھا۔ پڑھائی کا لوڈ اور اسپیڈ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی اسی لیے طلحہ نے اس کی اکیڈمی جوائن کر لی تھی۔

"چلو گے نا..... اب یہ مت کہنا کہ ٹائم ضائع ہو گا۔" راشد کو اس کے متوقع انکار کا پتا تھا اس لیے اس نے پہلے ہی اس سے یقین دہانی چاہی۔

"سر کہہ رہے تھے سنڈے کو لے کر جائیں گے کیونکہ منڈے کو فرسٹ مئی کی چھٹی ہے دو دن کا ٹور ہے اس لیے ٹائم ضائع نہیں ہو گا۔" طلحہ نے بھی اس کی متوقع وجہوں کو بیان کرنے سے پہلے رد کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سر کے ہی آجانے کی دعا کرنے لگا تاکہ فی الحال بات ٹل جا سکے۔ اس کے پاس انکار کی کوئی مناسب دلیل نہیں رہی تھی تین گھنٹے کے دوران امتحانی کاغذ پر بے شمار الفاظ اتارنے والا وہ لڑکا بعض اوقات بولنے کے لیے تین مناسب الفاظ بھی نہیں ڈھونڈ پاتا تھا۔

"میرے ابو ایسی چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں سو وہ مجھے اجازت نہیں دیں گے۔" فزکس کے سر نہیں آئے تھے سو اسے ٹور سوال حل کرنا ہی پڑا تھا۔ اس نے سر جھکائے ہوئے سادہ سے لہجے میں اپنے دوستوں کو اصل وجہ بتا دی تھی۔

"سب ہی ابو ایسی چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں..... میرے ابو بھی کب اجازت دے رہے تھے۔" راشد کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

"ابو کی بات کرتے ہو میری امی اجازت نہیں دیتیں۔ انہیں عجیب و غریب خدشات ستاتے رہتے ہیں۔ اکیلے کیسے جاؤ گے میرے بغیر۔ تھکن ہو جائے گی..... کوئی حادثہ ہو گیا تو رات کو لیٹ ہو گئے تو واپسی میں مشکل ہو گئی وغیرہ وغیرہ" طلحہ چونکہ اکلوتا اور لاڈلا تھا سو امی کی فکریں اسے عجیب و غریب خدشات لگتے تھے۔

"تم لوگوں نے اپنے پیرنٹس کو کس طرح منایا پھر..... ؟" اسے ان دونوں کے منہ سے یہ سن کر حیرانی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایسی روک ٹوک صرف اس کے ابو کرتے ہیں۔

"بہت آسان حل ہے بھوکے رہو کھانا مت کھاؤ ضد کرو کمرے میں بند ہو جاؤ بات چیت بند کر دو منہ بسور کر کھاؤ "فوراً" مان جائیں گے۔"

طلحہ نے اسے آزمودہ طریقے بتائے تھے۔ اسے کوئی بھی طریقہ خاص قابل ذکر نہیں لگا۔ ابو کی ایک گھرکی اور ایک گھورتی ہوئی نظر ان تمام طریقوں پر پانی پھیر سکتی تھی۔ اس نے صرف گردن ہلانے پر اکتفا کیا جبکہ طلحہ اور راشد مسلسل ٹور کی باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتیں سن سن کر اس کے دل میں بھی کھد بد مچ رہی تھی۔ وہ ٹور کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ ایسی تفریح کا خیال اس کے لیے بے حد انوکھا تھا اور ایسی صورت حال میں جب اس کے کچھ اچھے دوست بن گئے تھے جو بے حد اصرار کے ساتھ اسے اپنے ہمراہ لے جانا چاہ رہے تھے اس کا دل اور بھی ہمکنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ابو سے اس سلسلے میں کوئی بات کرتا انہوں نے خود ہی یہ دروازہ بند کر دیا۔

"میرے کولیگ بتا رہے تھے اس سال سے میڈیکل میں ایڈمیشن کے لیے انٹری ٹیسٹ ہوا کرے گا جس کا کلیئر کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس ٹیسٹ کا پیٹرن ایگزامز کے پیٹرن سے بالکل مختلف ہو گا یعنی ڈبل محنت کی ضرورت ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات..... ضائع کرنے کے لیے تمہارے پاس ایک لمحہ بھی نہیں ہے۔"

انہوں نے اسے نصیحت کی ماہانہ ڈوز اپنے مخصوص کڑوے لہجے میں دی تھی۔ اب یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ابو سے ٹور پر جانے کی بات کر پاتا مگر پہلی بار وہ بے حد جھنجلاہٹ اور اکتاہٹ کا شکار ہوا تھا۔

"کیا مجھے کبھی اپنے لیے ایک لمحہ بھی نہیں مل سکے گا۔" ہاتھ سے لکھے گئے نوٹس کے صفحوں کو بلاوجہ الٹتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

"ابو نے اجازت نہیں دی۔" اگلے دن راشد کے استفسار پر اس نے بتا دیا تھا۔ طلحہ اور راشد نے بمشکل اس کے انکار کو ہضم کیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ جان بوجھ کر ان کے ساتھ جانا نہیں چاہتا بلکہ وہ دونوں یہ بھی سمجھتے تھے کہ بحیثیت دوست کے وہ انہیں زیادہ پسند نہیں کرتا اگرچہ وہ اس امر کا اظہار نہیں کرتے تھے لیکن ہر گزرتا دن ان کے اس خیال کی تصدیق کر دیتا تھا۔ راشد نے بہت خلوص سے اسے اپنے گھر انوائٹ کیا تھا۔

"میرے چھوٹے بھائی نے قرآن پاک حفظ کیا ہے۔ اس کی آمین ہے..... تم ضرور آنا۔" وہ چونکہ جانتا تھا ابو اجازت نہیں دیں گے اس لیے اس نے خود ہی معذرت کر لی مگر چند دن بعد طلحہ نے کمبائن اسٹڈی کے لیے راشد کو گھر دعوت دی تو اسے بھی بلانا چاہا۔

"تمہارا گھر بہت دور ہے..... واپسی پر شام ہو جائے گی..... بہت مشکل ہے یار..... میں نہیں آپاؤں گا۔" اسے بہانے بنانے آگئے تھے۔

"اس کی تم فکر نہیں کرو..... میرے ابو مجھے لینے آئیں گے تو ہم تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔" راشد نے اس کی مدد کے خیال سے "فوراً" حل پیش کیا۔

"میرے ابو اجازت نہیں دیں گے۔" اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہہ دیا تھا۔ یہی حقیقت تھی لیکن اس کے دوستوں کو ہمیشہ کی طرح بہانہ لگا تھا۔

"یار مجھے ایک بات بتاؤ..... تمہارے ابو جلاد ہیں کیا؟ وہ کسی بات کی بھی اجازت نہیں دیتے کالج جانے کی نہیں ٹور پر بھی نہیں..... فرینڈز کے گھر بھی نہیں..... کمبائن اسٹڈی کے لیے بھی نہیں..... اتنی پابندیاں تو آج کل لوگ لڑکیوں پر بھی نہیں لگاتے..... تم واقعی ان کی سگی اولاد ہو نا..... آئی مین سوتیلے بیٹے والا چکر تو نہیں۔" طلحہ نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

وہ بے بسی سے سر جھکا کر رہ گیا۔ جھوٹ کی وضاحت مزید ایک جھوٹ سے ہو سکتی ہے۔ وہ سچ کی وضاحت کیا دے۔

طلحہ اور راشد دونوں اس سے ناراض ہو گئے تھے۔ اس نے انہیں منانے کی کوشش نہیں کی لیکن نجانے کیوں اسے ساری رات سکون کی نیند نہ آسکی۔ دل تو بوجھل تھا ہی' ساتھ ہی ساتھ طلحہ کے الفاظ کانوں میں گونجتے رہے۔

"تم واقعی ان کی سگی اولاد ہو نا۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سُدھا اروڑہ

سوچتا آدمی

"کیا یہ ضروری ہے کہ تین بار گھنٹی بجنے سے پہلے دروازہ کھولا ہی نہ جائے؟ ایسا بھی کون سا پہاڑ توڑ رہی ہوتی ہو؟ آدمی تھکا ماندہ آفس سے آئے اور پانچ منٹ دروازے پر ہی کھڑا رہے۔ اسے گھر کہتے ہیں؟ یہاں کپڑوں کا ڈھیر' وہاں کھلونوں کا انبار۔ اس گھر میں کوئی چیز سلیقے سے رکھی نہیں جاسکتی؟"

"اف! اس بستر پر تو بیٹھنا مشکل ہے۔ چادر سے پیشاب کی بو آرہی ہے۔ یہاں وہاں پوتڑے رکھتی رہوگی تو بدبو تو آئے گی ہی۔۔۔ کبھی گدے کو دھوپ ہی لگوالیا کرو' لیکن تمہاری تو بارہ مہینے ناک ہی بند رہتی ہے' تمہیں کوئی بو۔ بدبو نہیں آتی۔"

"اچھا' تم سارا دن یہ ہی کرتی رہتی ہو کیا؟ جب دیکھو تو گھسی بیٹھی ہو بچوں میں۔ میری ماں نے سات سات بچے پالے تھے' پھر بھی گھر صاف ستھرا رہتا تھا۔ تم نے تو دو بچوں میں گھر کی وہ بری حالت کر رکھی ہے جیسے گھر میں کرکٹ کی پوری ٹیم پل رہی ہے۔"

"پھر وہی شربت! تمہیں تو اچھی طرح معلوم ہے۔ میرا گلا خراب ہے۔ پکڑا دیا ہاتھ میں ٹھنڈا شربت' کبھی تو عقل سے کام لیا کرو۔ جاؤ' چائے لے کر آؤ۔ اور سنو' آگے سے آتے ہی ٹھنڈا شربت مت لے آیا کرو سامنے۔۔۔ بیمار پڑنا افورڈ نہیں کرسکتا میں۔ آفس میں دم لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی رہتی مجھے۔۔۔ پر تمہیں کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ تمہیں تو اپنی طرح ساری دنیا سلوموشن میں چلتی دکھائی دیتی ہے۔"

"سارا دن گھر میں گھسی ہی کیوں بیٹھی رہتی ہو' کھلی ہوا میں تھوڑا باہر نکلا کرو۔ ڈھنگ کے کپڑے پہنو۔ بال سنوارنے کا بھی وقت نہیں ملتا تمہیں تو بال چھوٹے کروالو' صورت بھی کچھ سدھر جائے گی۔ پاس پڑوس کی اچھی سمجھ دار عورتوں میں اٹھا بیٹھا کرو۔"

"باؤجی کو کھانا دیا؟ کتنی بار کہا ہے' وہ دیر سے کھائیں تو انہیں کھانا ہضم نہیں ہوتا' انہیں وقت پر کھانا دے دیا کرو۔۔۔ دے دیا ہے؟ تو منہ سے بولو تو سہی۔ جب تک بولوگی نہیں' مجھے کیسے سمجھ میں آئے گا؟"

"اچھا سنو! وہ کتاب کہاں رکھی ہے تم نے؟ نیلی کے اوپر نیچے سارا ڈھونڈ لیا' شیلف بھی چھان ماری ہم سے کوئی چیز ٹھکانے پر رکھی نہیں جاتی؟ غلطی کی جو تم سے پڑھنے کو کہہ دیا۔ اب وہ کتاب اس زندگی میں تو ملنے سے رہی۔۔۔ تم عورتوں کے ساتھ یہی تو دقت ہے' شادی ہوئی نہیں' بال بچوں میں لگ کر کتابوں کی دنیا کو الوداع کہہ دیا اور لگے نون تیل لکڑی کے کھڑاگ میں' پڑھنا لکھنا گیا بھاڑ میں۔۔۔"

"یہ کوئی کھانا ہے! روز وہی دال روٹی' بینگن' بھنڈی اور آ۔۔۔لو۔ آلو کے بغیر بھی کوئی سبزی ہوتی ہے دنیا میں یا نہیں؟ مٹر میں آلو' گوبھی میں آلو' میتھی میں آلو' ہر چیز میں آ۔۔۔لو۔ تم سے ڈھنگ کا کھانا بھی نہیں بنایا جاتا۔ اب اور کچھ نہیں کرتی ہو تو کم از کم کھانا تو سلیقے سے بنایا کرو۔۔۔ جاؤ ایک مہینہ اپنی اماں کے پاس رہ آؤ۔ ان سے کچھ ریسیپیز نوٹ کرکے لے آنا۔ تمہاری اماں تو اتنا بڑھیا کھانا بناتی ہیں' تمہیں کچھ نہیں سکھایا؟ کبھی چائنیز بناؤ' کانٹی نینٹل بناؤ۔۔۔ کھانے میں ورائٹی تو ہو۔۔۔"

"وہ کتاب ضرور ڈھونڈ کر رکھنا' مجھے واپس دینی ہے۔۔۔ یہ مت کہنا کہ بھول گئی۔۔۔ تمہیں آج کل کچھ یاد نہیں رہتا۔"

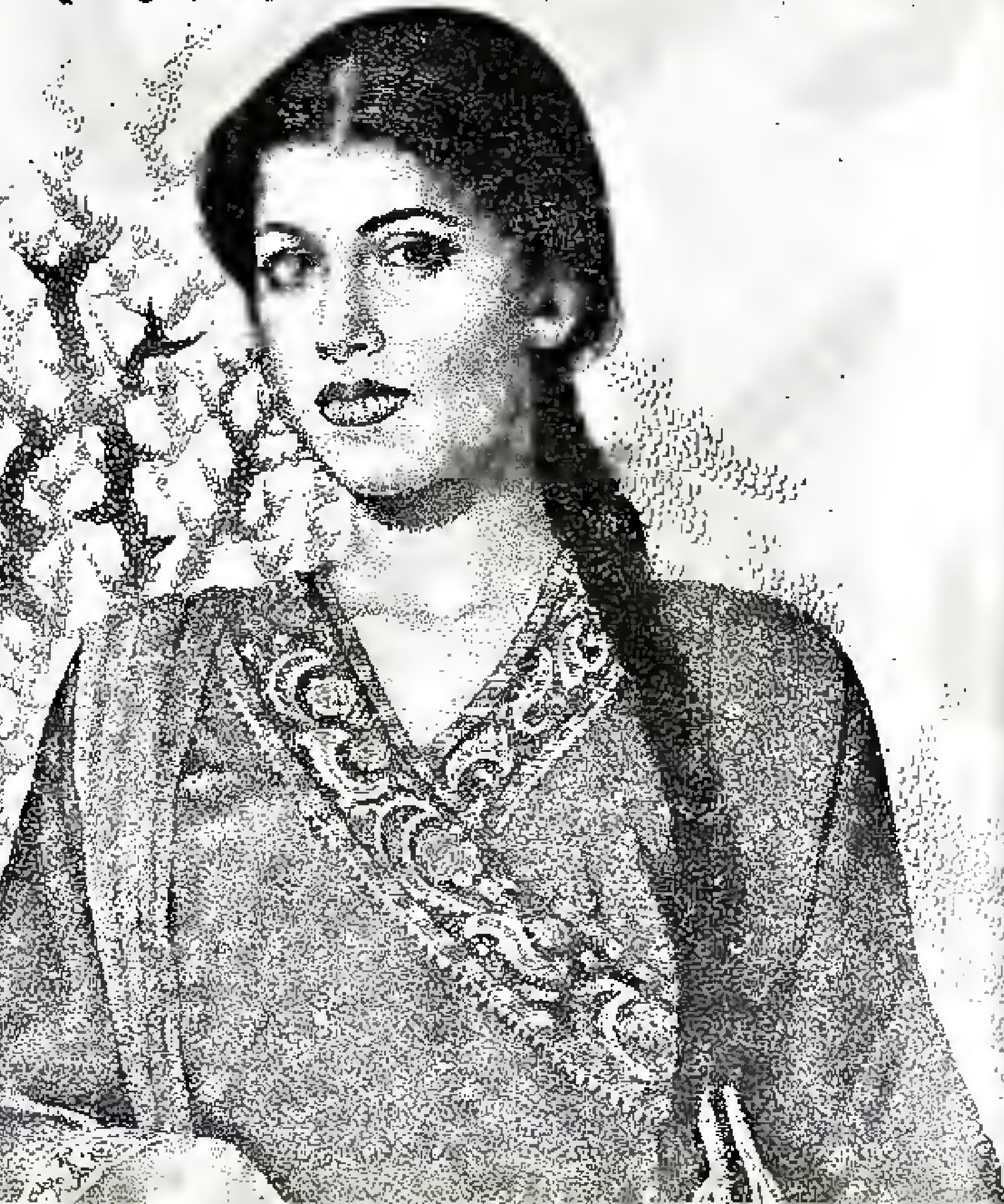
"اب تو دونوں سوگئے ہیں' اب تو یہاں آجاؤ۔ بس میرے ہی لیے تمہارے پاس وقت نہیں ہے اور سنو۔۔۔ باؤجی کو دوا دیتے ہوئے آنا' ورنہ ابھی آواز لگائیں گے۔"

"آؤ' بیٹھو میرے پاس! اچھا یہ بتاؤ' میں نے اتنے ڈھیر سارے پروپوزلز میں سے تمہیں ہی شادی کے لیے کیوں چنا؟ اس لیے کہ تم پڑھی لکھی تھیں' سنگیت و غزلوں میں دلچسپی تھی' اتنے خوب صورت لینڈ اسکیپ تمہارے گھر کی دیواروں پر لگے تھے۔۔۔ تم نے اپنا یہ حال کیسے بنالیا؟ چار کتابیں لا کر دیں' تمہیں تم نے ایک بھی کھول کر نہیں دیکھی۔۔۔ ایسی ہی بیویوں کے شوہر پھر دوسری کھلے دماغ والی عورتوں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں اور تمہاری جیسی بیویاں گھر میں بیٹھ کر آنسو بہاتی ہیں؟ پر اپنے کو سدھارنے کی کوشش بالکل نہیں کریں گی۔"

"تمہارے کپڑوں میں سے بھی بے بی فوڈ اور تیل مسالوں کی بو آرہی ہے۔۔۔ سونے سے پہلے ایک بار نہالیا کرو' تمہیں بھی صاف ستھرا لگے اور۔۔۔"

"یہ لو' میں بول رہا ہوں اور تم سو بھی گئیں۔ ابھی تو ساڑھے دس ہی بجے ہیں۔ یہ کوئی سونے کا وقت ہے؟ صرف گھر کے کام کاج میں ہی اتنا تھک جاتی ہو کہ کسی اور کام کے لائق ہی نہیں رہتیں۔۔۔"

"تمہاری عادتیں کبھی سدھریں گی نہیں۔ پندرہ



سال ہوگئے ہماری شادی کو' لیکن تم نے ایک چھوٹی سی بات نہیں سیکھی کہ آدمی تھکا ماندہ آفس سے آئے تو ایک بار کی گھنٹی میں دروازہ کھول دیا جائے۔ تم اس کونے والے کمرے میں بیٹھتی ہی کیوں ہو کہ یہاں تک آنے میں اتنا وقت لگے؟ میرے آفس سے لوٹنے کے وقت تم یہاں۔ اس صوفے پر کیوں نہیں بیٹھتیں؟"



"اب یہ گھر ہے؟ نہ میز پر ایش ٹرے' نہ باتھ روم میں تولیہ۔۔۔ بس' جہاں دیکھو کتابیں' کتابیں۔۔۔ میز پر' شیلف پر' بستر پر' کارپٹ پر' کچن میں' باتھ روم میں۔۔۔ کیا اب کتابیں ہی اوڑھیں' بچھائیں' کتابیں ہی پہنیں' کتابیں ہی کھائیں۔۔۔؟"

"یہ کوئی وقت ہے چائے پینے کا؟ کھانا لگاؤ۔ گرمی سے ویسے ہی برا حال ہے' آتے ہی چائے تھمادی۔ کبھی ٹھنڈا لیموں پانی ہی لے آیا کرو۔"

"اچھا! اتنے اخبار کیوں دکھائی دیتے ہیں یہاں؟ شہر میں جتنے اخبار نکلتے ہیں' سب تمہیں ہی پڑھنے ہوتے ہیں؟ خبریں تو ایک ہی ہوتی ہیں سب میں' پڑھنے کا بھوت سوار ہوگیا ہے تمہیں' کچھ ہوش ہی نہیں ہے کہ گھر کہاں جارہا ہے' بچے کہاں جارہے ہیں۔"

"یہ کیا کھانا ہے؟ بور ہوگئے ہیں روز روز سوپ پی کر اور یہ فلاں ڈھمکا نا پکڈ اور بوائلڈ ویجی ٹیبل کھا کھا کر۔ گھر میں روز ہوٹلوں جیسا کھانا نہیں کھایا جاتا۔ اتنا نیوٹریشن کانشس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کبھی سیدھی سادی دال روٹی بھی بنادیا کرو' لگے تو گھر میں کھانا کھارہے ہیں' آج کل کی عورتیں فارن کی نقل میں۔ دیسی مسالوں کا استعمال بھی بھولتی جارہی ہیں۔"

"یہ کیا ہے میرے جوتے مرمت نہیں کروائے تم نے؟ اور بجلی کا بل بھی نہیں بھرا؟ تم سے گھر میں ٹک کر بیٹھا جائے' تب نا! اسکول میں پڑھاتی ہو' وہ کیا کافی نہیں ہے؟ اوپر سے یہ خدمت خلق کا روگ بھی پال لیا اپنے سر پر؟ کیوں جاتی ہو اس پھٹیچر سوشل سروس کے دفتر میں؟ سب بیوروکریٹ عورتیں ہیں وہاں۔ ملتا کیا ہے تمہیں؟ نہ پیسہ' نہ دھیلا' الٹے اپنی جیب سے آنے جانے کا کرایہ بھی پھونکتی ہو۔"

"یہ ہے تمہارے لاڈلے کا رپورٹ کارڈ! جغرافیہ میں 23' تاریخ میں 25 اور میتھس میں 12! فیل نہیں ہوں گے تو اور کیا! ماں کو تو فرصت ہی نہیں ہے بیٹے کے لیے۔ اب مجھ سے امید مت کرو کہ میں تھکا ماندہ لوٹ کر دونوں کو ریاضی پڑھانے بیٹھوں گا۔ ایم اے گولڈ میڈلسٹ ہو' تم سے اپنے ہی بچوں کو پڑھایا نہیں جاتا؟ تمہیں نئی میتھس نہیں آتی تو ایک ٹیوٹر رکھ لو۔ اب تو تم بھی کماتی ہو' اپنا پیسہ خدمت خلق میں اڑانے سے تو بہتر یہی ہے کہ بچوں کو کسی لائق بناؤ۔ سارا دن ایم ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں۔"

"یہ تم نے بال اتنے چھوٹے کروالیے ہیں؟ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے چھوٹے بالوں میں بہت خوب صورت لگتی ہو؟ یو لک ہاریبل (خوف ناک) تمہاری عمر میں زیادہ نہیں تو دس سال اور جڑ جاتے ہیں۔ چہرے پر سوٹ کریں یا نہ کریں' فیشن ضرور کرو۔"

"سونا نہیں ہے کیا؟ بارہ بج رہے ہیں۔ بہت پڑھاکو بن رہی ہو آج کل۔ تمہیں نہیں سونا ہے تو دوسرے کمرے میں جاکر پڑھو۔ براہ مہربانی اس کمرے کی بتی بجھا دو اور مجھے سونے دو۔"

"اب ہاتھ سے کتابیں چھوڑ دو تو سہی! میں کہہ رہا ہوں' مجھے غصہ آگیا تو اس کمرے کی ایک ایک کتاب اس کھڑکی سے نیچے پھینک دوں گا۔ پھر دیکھتا ہوں' کیسے۔"

"ارے' کمال ہے' میں بولے جارہا ہوں' تم سن ہی نہیں رہی ہو۔ ایسا بھی کیا پڑھ رہی ہو' جسے پڑھے بغیر تمہارا جنم ادھورا رہ جائے گا' کتنی بھی کتابیں پڑھ لو' تمہاری عقل میں کوئی اضافہ ہونے والا نہیں ہے۔ رہو گی تو تم وہی۔۔۔"

(ہندی کہانی کا ترجمہ)



نایاب جیلانی

عدل اور جزا

روشنی کی ننھی سی لکیر ایک نکتے پر ٹھہر گئی تھی۔ جیسے وہاں سے نہ ہٹے گی نہ آگے بڑھے گی۔ روشنی کی ننھی سی یہ لکیر آنکھ کے اندھیرے دور کرنے کے لیے آئی تھی۔ آنکھ کی پتلیوں پہ تنے جالے ہٹانے اور منظر واضح کرکے بہت کچھ سامنے لانے اور سچائیاں دکھانے کے لیے آئی تھی۔ وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ دیکھے گیا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی؟ کیا منوانا چاہ رہی تھی۔ وہ جیسے کچھ سمجھ نہ پایا۔ حالانکہ وہ ایک کھلی کتاب اس کے سامنے رکھ چکی تھی تاہم اس نے کتاب کے فٹ نوٹ پہ سیاہی مل دی تھی تاکہ کتاب کا شرح یا حوالہ جو متن کے نیچے لکھا تھا' وہ اس کی نظر نہ پڑھ لے۔ اس کے انداز کچھ ایسے ہی تھے اور یہ کتاب بھلا کیسی تھی؟ کسی مصنف کے ہاتھ سے لکھی داستان نہیں بلکہ کسی کی زندگی کے ساتھ کھیلی گئی ہار اور جیت کی بازی' ایک فتح نامہ' جو شکست خوردہ تھا۔ اس کے دل میں گرہیں پڑنے لگیں۔ وہ بنا پلکیں جھپکے اس کے تاثرات دیکھتا گیا۔

"ولید نے فون پہ جو کہا' ٹھیک کہا۔ تم مان کیوں نہیں جاتے۔ اس میں حرج کیا ہے؟ جب میں رضامند ہوں۔" وہ فائل بک میں کچھ کاغذات ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ وہ بہت دنوں بعد بہت پرسکون تھی۔ وہ اپنی بیوی کی خواہش جان کر متحیر تھا۔ کیا کوئی ایسا بھی کہہ سکتا

مکمل ناول



ہے؟

"تم... پاگل ہو چکی ہو۔ اس حادثے نے تمہارا دماغ بھی متاثر کیا ہے۔ تم بہکی بہکی باتیں کیوں کرتی ہو یا پھر ایثار کرنے کا جنون سوار کرلیا ہے۔" وہ بدک کر چیخ پڑا تھا۔

"کون ایثار کررہا ہے؟ یہ تو محض کفارا ہے۔" ان کی بیوی کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔ اس کے الفاظ بہت شکستہ تھے جیسے وہ خود شکستہ تھی اداس ویران اور اجاڑ تھی وہ اپنی محبوب بیوی کی اداسی اور ویرانی پہ تڑپ گیا تھا۔

"تم مان جاؤ... تاکہ میرے دل پہ لدا بوجھ ہلکا ہو۔" اس کی بیوی اب گڑگڑانے لگی تھی۔ پھر اونچی آواز میں رونے لگی۔ آنسو بہت بڑا ہتھیار تھے۔ وہ جانتی تھی وہ اس کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"تمہارے دل پہ کیوں بوجھ ہے؟" وہ کچھ نہیں جانتا تھا کیوں کہ روشنی کی لکیر اس کی آنکھ میں ابھی نہیں اتری تھی۔ روشنی کی لکیر جب آنکھ کی چلیوں کے جالے ہٹا دیتی تب کیا ہوتا؟

وہ دونوں صرف یہی بات سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی بیوی ہر منظر واضح ہونے سے پہلے بند باندھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے قدم، سوچ اور ذہن کو زنجیر کردینا چاہتی تھی۔ وہ تھوڑی نہیں، بہت مفاد پرست تھی۔ اپنے "فائدے" کو دیکھ کر کوئی بھی فیصلہ کرلیتی، مگر اس دفعہ یہ فائدہ اور فیصلہ بھونچال لانے والا تھا۔

"یہ سوال مت پوچھو..." وہ سسک اٹھی۔ اسے خود کو مظلوم ثابت کرنا تھا اور اس کے آنسو ایک ہتھیار کا کام دیتے تھے۔

"اور تم مجھے مجبور مت کرو۔" وہ بگڑ گیا روشنی کی لکیر بھی بگڑ گئی۔

"تمہارے کسی کام کی نہیں ہوں۔ مجھے تمہارا احساس ہے۔" وہ اسے قائل کرنا چاہتی تھی۔

"میں نے تم سے گلہ نہیں کیا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تب تم کیا کرتیں؟" اس نے اصولی سوال کیا۔

"مجھے دلیلوں میں مت الجھاؤ۔ بس فیصلہ کرو۔" اس کی جان جیسے اٹکی ہوئی تھی۔ وہ اسے ہر صورت منا لینا چاہتی تھی۔ پر یہ ممکن تھا؟

"مجھے کوئی فیصلہ نہیں کرنا۔" اس کے ارادے اٹل تھے۔ روشنی کی لکیر اس سے کچھ دور ہوئی۔

"تم میری خواہش پوری نہیں کرسکتے؟" وہ تڑپ اٹھی۔

"نہیں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ نظر فائل بک پہ اٹک گئی۔ پاکستان سے آئی ڈاک تھی۔ لفافے پہ مہریں دبیں کی تھیں وہ لحہ بھر کے لیے ٹھٹک گیا۔

"اس میں کیا ہے؟" وہ کچھ حیران ہوا۔ روشنی کی لکیر اس کی پلک سے ٹکرائی۔ اس نے آنکھ موندلی تھی۔ جیسے روشنی سے بے زاری محسوس کی ہو۔ روشنی کو بھی غصہ آگیا۔ وہ اس سے دور ہٹ گئی۔

"مما نے بھیجے ہیں۔" جواب مختصر تھا۔ اس نے اصرار نہیں کیا۔ روشنی اور بھی دور ہٹی۔

"تو پھر تم نہیں مانو گے؟" وہ فائل بک کو بھیگی آنکھ سے دیکھتی رہی۔

"نہیں۔" اس نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔

"اس میں تمہارا بھلا ہے اور میرا بھی ہے۔" وہ ابھی ہارنا نہیں چاہتی تھی۔

"مجھے ایسے بھلے کی ضرورت نہیں۔" اس نے سابقہ کڑوے لہجے میں کہا۔

"چند سال بعد بھی یہی کہنا۔" اب وہ طنز کررہی تھی، اپنا غصہ نکال رہی تھی یا پھر اسے جذباتی وار سے ڈھانا چاہتی تھی۔

"آزما لینا..." وہ اس کی ویران آنکھوں میں جھانکتا جھکا تو کھلی ہوئی فائل بک پہ اس کی نگاہ پڑ گئی۔ ایک شکستہ سا پیلا پھٹک کاغذ اس کی نگاہ کے حصار میں آگیا۔ اس پہ کچھ لکھا تھا؟ کیا لکھا تھا؟ اس نے آنکھیں مسل کر پڑھا۔

ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ پھر کئی دفعہ... کاغذ زمین

پر گر گیا۔ اس نے اٹھایا پھر پڑھا۔

"یہ... یہ سب کیا ہے؟" وہ چیخ پڑا، چلا اٹھا، بھڑک گیا۔ روشنی کی لکیر اس کی آنکھ میں اتر آئی تھی۔ جیسے ہر منظر واضح ہوگیا۔ روشنی اس کے وجود پہ پھیلتی رہی۔ وہ چیختا رہا۔ چلاتا رہا۔ سوال پہ سوال کرتا رہا، مگر جواب کہاں تھا؟ کس کے پاس تھا؟ جواب شاید کہیں نہیں تھا۔

وہ تو خود پیلے، زرد، خستہ حال کاغذ کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔

اس نے اپنی نادانی میں یہ کیسا اژدھا سامنے لا رکھا تھا؟



وہیل چیئر کے پہیوں کو چین نہیں تھا۔ نظریں کلاک پہ جمی تھیں۔ ایک، دو، تین... جانے کتنے منٹ گزر گئے۔ پھر فون کی گھنٹی بجی اور اس کا انتظار ختم ہوگیا۔ اس نے بے تابی سے لپک کے فون اٹھایا دوسری طرف وہی تھیں۔ اسے سمجھاتی بجھاتی، تنا رہی تھیں...

"غلط فیصلہ کیا تو بہت پچھتاؤ گی میری جان! جب سے واپس آئی ہوں۔ دل کو کچھ ہولے لگے ہیں۔ جیسے کچھ غلط ہوتا جارہا ہے۔" وہ اپنا خوف بیان کررہی تھیں۔

"میں نے اپنا فیصلہ بدل لیا ہے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بہت مضبوط لہجے میں بولی تھی۔ اس کے الفاظ نے ہزاروں میل دور بیٹھی اس بوڑھی ہوتی عورت کو لحہ بھر میں شانت کردیا تھا۔

"تم نے بہت اچھا کیا... بہت بڑی نادانی کرنے جارہی تھیں۔ شکر ہے تمہیں عقل آگئی۔" اب وہ اس کی بے وقوفی کو دوہرا رہی تھیں اور وہ لب بھینچے سنتی رہی۔

"میرا فیصلہ غلط نہیں، انتخاب غلط تھا... میں نے فیصلہ نہیں، انتخاب بدل لیا ہے۔" اس کی آواز مدھم تھی۔ کچھ سوچتی ہوئی، کچھ عجیب، کچھ پر اسرار ہزاروں میل دور بیٹھی وہ عورت پھر سے بھونچکی رہ گئی۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"میرا انتخاب درست نہیں تھا۔ میں اپنے حلق پہ خود چھری مارنے لگی تھی۔ شکر ہے بروقت عقل آگئی۔ میں اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گی۔ آخر بند تو مجھے باندھنا ہی ہے۔ البتہ انتخاب بدل گیا ہے۔ جانتی ہیں نا۔ سامنے والی سلطانہ کو۔ وہی موٹی بھدی، پکی عمر کی رحم دل عورت جس کا دل مخلوق خدا کے درد سے بھرا ہوا ہے۔ شریف اور سیدھی ایسی کہ رات بھر ایک پاؤں پہ کھڑا کروں تو کھڑی رہے۔ میرا فیصلہ اسی کے حق میں ہوا ہے۔" اس کے پر اسرار لہجے میں کمال کا سکون تھا۔

دوسری طرف وہ لحوں میں شانت ہوگئیں۔ اس کے فیصلے نے ان کے اندر روح پھونک دی۔

"تو پھر گھر میں باندھی اس قیامت کو واپس بھجوا دو۔" انہوں نے ذرا سر جھٹک کر نخوت سے کہا۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ کان سے پکڑ کے باہر نکالوں گی۔" وہ بڑے اطمینان سے کسی کی ہستی ہلا رہی تھی۔



وہ اس کے سر پہ کھڑی چیخ رہی تھی۔ وہ اسے گالیاں دیتی، کوسنے دیتی، غصہ کرتی، طنز کرتی، اس پہ کیچڑ اچھالتی۔ وہ اسے ذلت کے تھپکارے مارتی، نفرت انڈیلتی، زہر اگلتی... پھر بھی... پھر بھی وہ عجیب لڑکی تھی جو اس کے سامنے سر نہ اٹھاتی۔ پلٹ کے جواب نہ دیتی۔ بس سر جھکا لیتی۔

"ڈورے ڈالنے آئی ہو یہاں؟ میرے گھر پہ قبضہ کرنے آئی ہو؟ تمہارا خواب کبھی پورا نہیں ہونے دوں گی۔ چار چوٹ کی مار دوں گی۔ چونڈے میں خاک ڈال دوں گی۔ تم مجھے جانتی نہیں۔"

"تم یہاں سے جاتی کیوں نہیں؟ میں نے نوکرانی

رکھ لی۔ اب تمہاری ضرورت نہیں۔ وہ تمہیں گھاس نہیں ڈالے گا۔ میں تمہارے کرتوت بتاؤں گی۔ تمہارے معاشقوں کی داستان دکھاؤں گی۔" وہ غلاظت اگل رہی تھی۔ وہ اپنا کام جاری رکھتی یہ ایک چپ کی بکل اوڑھے دن رات اپنا کام کیے جاتی۔

"تمہاری ڈائری دکھاؤں گی۔ جیسے ادھر سب نے دھتکارا۔ یہ بھی تمہیں منہ نہیں لگائے گا۔ بے کار آس لگا کر بیٹھی ہو۔" اس کا غیض اتر تا ہی نہیں تھا۔ دن رات اسے کچھ نہ کچھ لگائے جاتی۔

پہلے خود اسے بلایا۔ آٹھ مہینے تک نرمی اور محبت کا چولا پہنے رکھا۔ پھر جانے اچانک اسے کیا ہو گیا۔ سامنے والے فلیٹ میں آنے والی اس مسکین عورت کی آمد کے ساتھ ہی یہ بدل گئی تھی۔ اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ سلطانہ اس کے کام کی بندی جو نکلی تھی اور یہ ہمیشہ کی خود غرض۔۔۔ سلطانہ کو دیکھ کر اس کے ایثار، خلوص اور خدمت کو بھول گئی۔ پچھلے کئی مہینوں سے وہ یہ ذلت برداشت کر رہی تھی مگر اس کے لبوں پہ کبھی گلہ نہیں آتا تھا، مگر جب اس کے کردار پہ حملہ آور ہوئی تب وہ درد اور اذیت سے بلبلا اٹھی تھی۔

"میرے کردار پر گندگی مت اچھالو۔ میرے صبر کو مت آزماؤ۔ دیکھو اگر سب کچھ بھی بتا دوں تو تمہاری حیثیت میرے برابر ہو جائے گی۔" اس نے پہلی مرتبہ زبان کھولی تھی۔ شاید دس سالوں میں پہلی مرتبہ اور اس کی بات اسے آگ لگا گئی تھی۔ وہ اسے کیا "جتا" رہی تھی؟

"بڑا اتراتی ہو کاغذ کے اس ٹکڑے پر جو پرزہ پرزہ ہو گیا۔ کوئی ثبوت نہیں اور بنا ثبوت کے تم دو کوڑی کی ہو۔" وہ ہنسنے لگی تھی۔ وہ اسے یہاں سے نکال دینا چاہتی تھی۔ اسی میں اس کی بقا تھی اور وہ خود کو اپنے ہر عمل میں حق بجانب سمجھتی تھی۔

"اتنا تکبر کیوں ہے۔ اس کرسی پہ بیٹھ کر بھی۔۔۔ تمہیں اللہ یاد نہیں آتا۔" وہ کمزور لڑکی بے بسی سے رو پڑی تھی۔ تب اس کا بھیجہ الٹ گیا تھا۔ وہ اس کے بال کھینچتی فرش پہ گرا گئی۔ پھر اسے گھسیٹ کر باہر دروازے تک لے آئی۔

"مردود عورت! نکل میرے گھر سے۔ اب واپس مت آنا۔ میں تیری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔" وہ کسی جن زادی کی طرح دہاڑ رہی تھی۔ غصے اور غیض نے اسے طاقت سے بھر دیا تھا۔ وہ اسے دھکے مار رہی تھی۔ گالیاں دے رہی تھی۔

"تمہارے معاشقے کے پمفلٹ چھپوا کر گلی گلی بازار بازار لگوا دوں گی۔ عزت عزیز ہے تو واپس نہ آنا۔" وہ نخوت سے بولتی مڑ گئی تھی۔

پھر دروازہ بند ہو گیا۔ جیسے اس پر زندگی کا دروازہ بند ہو گیا۔ وہ اونچی آواز میں روتی رہی۔ وہ کہاں جائے گی؟ کدھر جائے گی؟ اس اجنبی دیس میں اس کا اپنا کون تھا؟ جانے وہ کب تک اپنے نصیب پہ روتی رہتی۔ پھر اچانک اس کے قریب کوئی اجنبی شخص آیا وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اسے دیکھ کر پہلے تعجب میں گھرا پھر اچانک پہچان گیا۔

"میں واجد ہوں۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کا اسسٹنٹ۔۔۔"

اس آدمی کے تعارف نے روتی ہوئی اس لڑکی کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی اور روتی رہی۔ پھر ان کے پوچھنے پر وہ برسوں کے لاوے کو اپنے اندر سے نوچ کھسوٹ کر نکالنے لگی۔ اس کی زندگی کے دردناک قصے کو سن کر وہ ادھیڑ عمر آدمی فکرمند ہو گیا تھا۔

"تمہارا فرض تھا۔ تم اسے سچائی بتاتیں۔ سچ ان تک پہنچانا چاہیے تھا۔ پھر حالات مختلف ہوتے۔ تم ٹھوکروں پہ نہ ہوتیں۔" اس کے آنسوؤں اور ذلت میں بھیگی کہانی سن کر بوڑھے آدمی کی آنکھوں میں دکھ اور تاسف بھر گیا تھا۔ وہ اسے نرمی سے ڈپٹتا رہا۔

"میرے پاس ایک ثبوت تھا جسے اس کی ماں نے پھاڑ دیا۔" وہ اپنی بے بسی کی وجہ بتا رہی تھی۔ وہ اب بھی اپنی قسمت پہ رو رہی تھی۔ تب واجد صاحب نے اس کے اندر قیامت کی روح پھونک دی۔

"تم غم زدہ نہ ہو۔ میرے پاس ڈاکٹر صاحب کا دیا ایک ثبوت ہے۔ میں وہ ثبوت اس تک پہنچاؤں گا۔ تمہاری زندگی کے اندھیرے چھٹ جائیں گے بیٹی! پھر کوئی بھی تمہیں دھکے دے کر گھر سے نہ نکالے گا۔"

انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا۔ پھر اسے دوبارہ گھر کے دروازے تک چھوڑ گئے۔ وہ ایک مرتبہ پھر ذلت بھری زندگی میں قدم رکھنے چلی گئی۔ یہ اس کا من چاہا نصیب تھا۔ وہ اس گھر سے زندگی بھر نکلنا جو نہیں چاہتی تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ بے قرار ہو کر پورے گھر میں وہیل چیئر گھماتی چکر لگا رہی تھی ان دنوں اس کے دل کو پنکھ لگے ہوئے تھے۔ چین کسی پل نہیں تھا۔

اس دن بھی وہ اندر کی بھڑاس نکالتی گھوم رہی تھی جب پوسٹ مین ایک رجسٹری دے گیا۔ شاید پاکستان سے آئی تھی۔ مما نے کوئی "سرپرائز" بھیجا تھا۔ اس کے اندر باہر ٹھنڈ پڑ گئی۔ تو گویا تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کا وقت آگیا تھا۔ وہ جیسے سرشار ہو گئی۔ وہ رجسٹری اس کے سامنے کھولنا چاہتی تھی وہ لاؤنج میں آگئی۔ اس کے سامنے وہی چنڈال بیٹھی تھی۔ روتی ہوئی خود کو مظلوم ثابت کرتی۔ اس کے اندر باہر آگ لگ گئی۔ وہیں رک کر ان کی باتیں سننے لگی۔

"میرا وجود قابل نفرت ہے۔ تمام عمر سب کی نظر میں حقارت ہی میرا مقدر رہی میرا خلوص' محبت' ایثار بھی میرے لیے بوند برابر کسی کی محبت نہ لا سکا۔ مجھ سا کون بدقسمت ہوگا۔" اندر سے سہمی سہمی آواز آرہی تھی۔ بھیگی آواز' بھیگا لہجہ۔ وہ اس کے شوہر کے سامنے بیٹھی سر جھکائے رو رہی تھی۔ اسے آگ ہی تو لگ گئی۔ اس نے رجسٹری کو ہاتھ میں دبوچ لیا۔

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟ میں ہوں نا... میں تم سے پیار کرتا ہوں۔" وہ محبت سے بول رہا تھا۔ وہیل چیئر پر بیٹھی عورت کے تن من سے شعلے نکلنے لگے تھے۔

"آپ سچ میں مجھ سے پیار کرتے ہیں؟" وہ بے یقین تھی' حیران تھی' اس انکشاف نے اسے دنگ کر دیا تھا۔ باہر بیٹھی عورت کا شوہر بھی اس اعتراف پر خود بھی حیران رہ گیا تھا۔

"ہاں۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔ اٹل تھا۔ وہ لڑکی عقیدت اور محبت کے جذبات سے سرشار ہو گئی۔ اس کی روح محض اسی "اعتراف" پر شانت ہو گئی تھی۔ اس کے لیے یہی کافی تھا۔

"اگر آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ تو مجھے واپس بھجوا دیں۔ میں آپ کی زندگی میں مشکلات بھرنا نہیں چاہتی۔"

وہ نم آواز میں کہہ رہی تھی۔ اپنا درد' دکھ' غم اور صدمات سے بھرے دل کی ہر حکایت چھپا کر درخواست کر رہی تھی۔ وہیل چیئر پہ بیٹھی عورت جیسے گنگ رہ گئی۔ اسے اس مکار' کتنی فراڈ' فسادن سے ایسی امید نہیں تھی۔

✡ ✡ ✡

"عدل! تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟" اسے سوال کرنے کی عادت تھی۔ چاہے یونیورسٹی کا کوریڈور ہوتا' چاہے سر زمان کی کلاس ہوتی' چاہے نفسیات کا لیکچر ہوتا۔ چاہے وہ سفر میں ہوتی' گھر میں ہوتی' کچن میں ہوتی جب اسے عدل سے یہ اہم ترین "سوال" پوچھنے کا خیال' آتا تب اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ اس کی سہیلیاں حیران نہیں ہوتیں۔ وہ اس کے پاگل پن سے واقف تھیں' مگر ایم اے نفسیات کے سر زمان ہرگز واقف نہیں تھے۔ وہ اس کی چوری اکثر پکڑ لیتے اس کا سیل فون جھپٹ لیتے' اس کے ٹیکسٹ پڑھ لیتے' اسے گھورتے' غصہ ہوتے' کبھی کلاس سے نکال دیتے' کبھی کلاس میں کھڑا کر دیتے' کبھی اپنے دفتر بلا کر چودہ طبق روشن کرتے پھر بھی ماسن کو اس ایک "سوال" کو ٹائپ کرنے' سینڈ کرنے سے روک نہیں پاتے تھے۔ اکثر ماسن کو شاپنگ کرتے' کپڑے خریدتے' جوتے لیتے' پاسپیکس چھانتے' کتابیں ڈھونڈتے' بڑے بڑے تھیلے اٹھائے فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے بھی اس سوال کی ہڑک بیدار ہو جاتی تھی۔ تب وہ تھیلے زمین پر رکھتے کچھ بغل میں دبائے' کچھ کو دانتوں میں دبائے میسج لکھنے میں مصروف ہو جاتی' اکثر چلتے چلتے ٹیکسٹ لکھتی تب اس کی کسی نہ کسی سے ٹکر ضرور ہو جاتی تھی۔

گواہ جو تھیں۔

اور اس وقت ماسن قلم کو منہ میں دبائے "تھیوریز آف اموشنز" پہ غور کرتی عدل کو دیکھتے ہوئے اچانک ہڑبڑا کر بولی تھی یوں کہ کتابوں میں سر دیے عدل کو بھی ہڑبڑانے پر مجبور کر چکی تھی۔ اس نے چونک کر ماسن کو دیکھا تھا پہلی سرسری سی' غصیلی نظر' پھر جانے کیوں گہری ہوتی چلی گئی۔ شاید ماسن کے چہرے پر پھیلے تاثرات ہی کچھ ہلچل مچا دینے والے تھے اور ہلچل تو اس کے اندر صدیوں کی مچی تھی۔ یہ تو عدل کبیر ہی تھا جس نے خود پر مضبوطی کا ملمع چڑھا رکھا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پگھلتا مگر ظاہر نہ کرتا۔

"تم تو میرے اس سوال پہ منطقہ البروج (راس منڈل) میں کھو جاتے ہو' آسمانی بارہ برج گننے لگتے ہو' اللہ کی مخلوق! میرا سوال ایسا "چکرا" دینے والا تو نہیں ہوتا؟" ماسن کی ناراض آواز اسے سوچوں کے تلاطم سے باہر نکال لائی۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا تھا۔ پھر ماسن کو دیکھنے لگا۔ بلک جھپکے بغیر' بنا نگاہ موڑے' بنا رخ بدلے' دیکھتا رہا۔ پڑھتا رہا' حفظ کرتا رہا۔ اس کی گندمی رنگت کا سنہرا پن' اس کی سنہری آنکھوں کا گلابی پن' اس کے تراشیدہ ریشمی سنہری بھربال۔ کندھوں سے کچھ اوپر لہراتے' جگمگاتے' کہانیاں سناتے... ایک کے بعد ایک سب چہرے پہ بکھرتے جاتے۔

وہ خوب صورت تھی' مگر کوئی ماہ پیکر' پری پیکر نہیں تھی۔ عدل کے سامنے تو کچھ بھی نہیں... جانے پھر کیوں دل اسی کی جانب کھنچا چلا جاتا تھا۔

شاید اس لیے کہ وہ عدل کے اکلوتے ماموں کی کئی دفعہ کچن میں کھانا پکاتے' کھانا جلاتے' دودھ ابالتے' ہاتھ جھلساتے' کپڑے جھلساتے وہ "اوئی اوئی" کرتی عدل سے ہم کلام ہوتی۔ کئی دفعہ واش روم میں برش کرتے' دانت صاف کرتے' چہرے پہ کریم ملتے وہ بھاگتے بھاگتے سیل تک آجاتی۔ تب اس کی لاڈلی پھوپھو اس کے پاگل پن' جنون' محبت اور بچپنے پر مسکرائے جاتی تھیں آخر ماسن کے عدل سے عشق کی چھوٹی اور بہت لاڈلی بیٹی تھی' وہ یامن سے دو سال چھوٹی تھی اور عدل کی ہم عمر۔ ان دونوں نے ایک ساتھ دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ انہیں ایک ہی پالنے میں ڈالا گیا تھا۔ وہ ایک مدت تک ایک ہی پالنے میں رہے۔ ماسن پیدائشی بدقسمت تھی۔ اس کی ممی اسے پیدا کر کے ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔ عدل کے ماموں' مامی میں بہت سے جھگڑوں' لڑائیوں اور فسادات کے بعد طلاق ہو گئی تھی۔ اس کی ممی دونوں بچیوں کو اکلوتی نند کے گھر پھینک کر یورپ چلی گئیں۔ پھر ان کے پاپا نے بھی جانے میں دیر نہ کی۔ ایک صبح بہن کے نام مختصر سا نامہ لکھا اور ملک بدر ہو گئے۔ پھر سالوں بیت گئے مگر ان کی کوئی خبر نہ آئی۔

یوں یامن اور ماسن عمر بھر کے لیے عدل کی مما غفیو کی ذمہ داری بن گئیں۔

اور وقت گواہ تھا کہ عدل کی مما کو اپنی بھتیجی ماسن سے اور بابا کو اپنی بھتیجی سے کیسا لازوال عشق رہا تھا۔

وہ جیسے پھر سے ہڑبڑا گیا کیونکہ ماسن کے تیور بہت بگڑ رہے تھے۔

"کبھی تو میرے سوال کا مدلل' جامع' رومانوی' افسانوی ٹائپ جواب دے دیا کرو۔" وہ غیض کے عالم میں اپنا نازک ہاتھ لہراتی اسے دھمکا رہی تھی۔ پھر جیسے اس کے کندھے پہ یکے بعد دیگرے کئی مکے پڑے۔ عدل کے ہونٹوں پر تکلیف کے بجائے مسکراہٹ آگئی۔

"یہ سی ایس ایس کا امتحان ہے میری جان! مجھے محبت پر کوئی رومانوی ناول نہیں لکھنا... تم نے نفسیات

میں ٹانگ اڑا کر بھی پہلی نہ سہی دوسری پوزیشن لے جاتی ہے۔ پر مجھے تو اپنی پوزیشن بچانے کے لیے جان مارنا پڑے گی۔" وہ مسکراتا ہوا حقیقت بیان کر رہا تھا۔ وہ حقیقت جس میں یامن کے لیے ستائش تھی۔ محبت بھی تفخر تھا۔ وہ اس کی ذہانت سے متاثر تھا اس کی تعریف کرتا تھا اور اسے اپنے سے آگے سمجھتا تھا۔

یامن اس کے خاندان کا سرمایہ تھی۔ بہت لائق فائق' ذہین فطین' حاضر جواب' شوخ' ہنگامہ پرور' زندہ دل۔ چلبلی۔ مما اسے گھر کی رونق اور بابا اپنے باغ کی بلبل کہتے تھے۔

وہ صرف پالنے میں ہی عدل کے ساتھ نہیں تھی۔ بلکہ عمر بھر سے اس کے ساتھ ہی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اسکول میں پہلا قدم رکھا تھا۔ پھر یہ ہاتھ کبھی چھوٹا ہی نہیں۔ اسکول' کالج اور پھر یونیورسٹی میں بھی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے۔ جیسے یک جان' دو قالب۔ ایک دوسرے کے ہمراز' دوست' ایک دوسرے کا سایہ۔ ان کی چاہت اور دوستی کے قصے یونیورسٹی کے چپے چپے پہ تحریر تھے۔ ان کے دوست' ساتھی' ہمراہی ان کے دل کی دھڑکنوں کے گواہ تھے۔

آئی۔ آر میں ماسٹرز کے بعد عدل اور یامن دونوں سی ایس ایس کی تیاری میں جت گئے تھے' مگر اسی دوران اپنی چند سہیلیوں کے اصرار پہ یامن نے دوبارہ یونیورسٹی جوائن کرلی۔ ان دنوں زیر عتاب نفسیات کا مضمون تھا۔

یامن کی شادی طے پا گئی تھی۔ بابا نے اس کے لیے ڈاکٹر عمیر کو چنا تھا۔ بہت قابل' ذہین اور نیک طینت جوان تھا۔ ان کی فیملی کا حصہ بنا تو جیسے خوشیاں دوبالا ہو گئی تھیں۔

یامن شادی کے بعد اپنے باپ کے گھر میں شفٹ ہو گئی۔ وہ ان کے پڑوس میں ہی تھا۔ کچھ سال پہلے بیچ کی دیوار گرا کر دونوں گھروں کو تقریباً" ایک ہی کرلیا تھا۔ لان ملا لیے گئے تھے' یوں بظاہر یہ ایک ہی ولا لگتا ہرا بھرا' خوب صورت محبتوں سے گندھا۔

عدل کبیر' ڈاکٹر ہلال کبیر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اسے دیکھتے تو اندر محبتوں کے سوتے پھوٹ پڑتے۔ وہ چلتا تو چراغ روشن ہو جاتے جگنو جھلملا اٹھتے' ستارے چمکنے لگتے۔

تھوڑا نخریلا' تھوڑا ضدی ضرور تھا پر یہ غرور اس پہ جچتا تھا' بڑا حلیم بھی تھا۔ نرم مزاج بھی تھا۔ باکردار' باوقار' بااعتماد۔ وہ اپنے باپ کے لیے "فخر" کا باعث تھا۔ بے شمار خوبیوں اور خوب صورتیوں کا مجسمہ۔

تب ہی تو بہت سال پہلے۔ کئی دھند لکوں کی اوٹ میں انہوں نے اپنے لخت جگر کو کسی کے لیے منتخب کرلیا تھا۔

ان کے بیٹے کی روشن آنکھوں سے "مدھ" بہتا تھا۔ وہی مدھ جس کی یامن الیاس اسیر تھی اور یہی مدھ کسی اور کو بھی گرفتار وفا کر چکا تھا۔

عدل کبیر اپنے دادا کی نسل کا واحد امین اور وارث تھا۔ اسی سے ان کی نسل چلنی تھی۔ عدل کبیر سے آگے اور مشعلیں روشن ہونا تھیں۔ دیے جلنے تھے اور ڈاکٹر ہلال کبیر اس وقت کے انتظار میں لمحہ لمحہ گزار رہے تھے۔ ان کا بیٹا بہت محکم قوت ارادی کا مالک تھا۔ فیصلوں میں اٹل' مضبوط اور مستحکم۔ انہیں امید تھی کہ عدل کبیر ان کی آنکھوں میں قرنوں سے بستا خواب تعبیر کی صورت میں ضرور سامنے لائے گا۔

اور وہ "خواب" بھلا کیا تھا؟

اس سے صرف غفیو واقف تھیں۔

مگر جو خواب ڈاکٹر ہلال کبیر کی زندگی تھا۔ ان کی فتح تھا' وہی خواب غفیو کبیر کی شکست تھا۔ ان کی موت تھا۔ اس خاموش جنگ سے ابھی کوئی بھی واقف نہیں تھا۔

"تم کس بھنور میں پھنس گئے؟" یامن نے غصے میں آکر اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔ تب وہ گہرا سانس لے کر مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ یامن کو مزید چڑا دیا کرتی تھی۔

"تمہارا سوال مشکل نہیں' مگر بہت وقت چاہتا ہے۔ اتنا وقت جو تم سے تم تک کی تشریح کے لیے کافی ہو۔" وہ بند مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے مسکرانے لگا تھا۔ پھر اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی تھی کیوں کہ یامن من پسند جواب پا کر "گل فام" بن جا رہی تھی۔ گلابی' سرخ' آگ سی۔ اس کے گال تپنے لگے تھے۔ سنہری آنکھیں چمکنے لگیں۔ ہونٹ مسکرانے لگے تھے۔ اول تو وہ یامن کے اس سوال کا جواب کم دیتا تھا اور اگر کبھی موڈ میں آجاتا تب اس کے لفظوں کی سحر انگیزی سے وہ کچھ بول نہ پاتی' نظر اٹھا نہ پاتی۔

"اب بولو نا' چپ کیوں ہو گئیں؟ کچھ اور بھی کہوں کیا؟" عدل اسے چھیڑ رہا تھا۔

"رہنے دو' اتنی مشکل سے تو "کچھ" اگلوایا ہے۔ میری ناتواں جان کے لیے بس اتنا ہی کافی ہوگا۔"

"کروڑ کی صرف ایک بات ہوتی ہے جانم! مجھے لفظ لفظ کھیلنا نہیں آتا۔"

"اور یہ ایک بات قرنوں بعد ترس ترس کر سننے کو ملتی ہے۔" شکوہ بالآخر اس کے لبوں پر مچل ہی گیا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے عدل کی محبت کا یقین نہیں تھا' یہ بھی نہیں تھا کہ وہ محبت کے اس سفر میں تنہا تھی۔ بس اس سے عدل کی بے رخی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ چاہے وہ بیگانہ پن اس کی "مصروفیت" کی صورت میں ہی کیوں نہ ہوتا۔

یامن میں بہت سی کمزوریاں تھیں۔ وہ لمحوں میں بدگمان ہو جاتی تھی۔ تھوڑی شکی بھی تھی' شاید عدل کی محبت نے اسے بے انتہا حساس بنا دیا تھا' مگر جو بھی تھا' یامن' عدل کے دل کا ایک حصہ تھی اور یہ حقیقت اپنی جگہ مستحکم تھی۔

یامن بہت بے صبری تھی۔ وہ ماسٹرز سے پہلے ہی منگنی چاہتی تھی' مگر عدل اس حق میں نہیں تھا۔ یامن کی "ضد" نے اسے غفیو سے بات کرنے پر مجبور کردیا تھا تب مما کے ہی سمجھانے پر یامن خاموش ہو گئی تھی۔

وہ اس وقت دودھ کے دو گلاس ٹرے میں رکھے دروازے کے پاس کھڑی تھیں۔ ماربل کی ٹرے میں دو بلوریں گلاس تھے۔ جن میں کٹے ہوئے بادام اور پستے مکس تھے۔ یہ دودھ یامن کو بہت پسند تھا جبکہ عدل کو اتنا پسند نہیں تھا۔ غفیو جب بھی یامن کے لیے دودھ بناتی تھیں تو عدل کے لیے بھی بنا لیتیں۔ وہ جانتی تھیں' یامن کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے اور جب وہ ناک بھوں چڑھا کر گلاس خالی کر دیتا تب انہیں یامن پہ فخر محسوس ہوتا تھا۔ وہ اسے کریلے گوشت کھلا دیتی۔ اسے چکن بریانی کھلا دیتی' اسے بیف برگر کھانے پہ مجبور کرتی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ عدل سبزی خور ہے۔ پھر بھی زبردستی اپنی بات منوا لیتی اور جب وہ یامن کی بات مان لیتا تب اس کی گردن غرور سے تن جاتی تھی۔ انہیں اپنے شوہر سے یامن اور عدل کے لیے ایک "جنگ" لڑنا تھی۔ انہیں یقین تھا کہ فتح ان ہی کے نصیب میں ہوگی۔ وہ اسی لیے مطمئن تھیں' انہیں اپنی فطری جبلی "ضد" پر بھی فخر تھا۔ وہ عزیز از جان شوہر سے کچھ بھی منوا لینے کا فن رکھتی تھیں۔

اس وقت بچوں کی "افسانوی" بحث پہ غور کرتی وہ دل ہی دل میں دونوں کی نظر اتارتی اندر داخل ہوئی تھیں تب وہ دونوں بیک وقت چونکے تھے' پھر دونوں ہی ہنسنے لگے۔

"پاگل ہو چکے تم دونوں۔" انہوں نے ماربل کی ٹرے سینٹرل ٹیبل پہ رکھ کر مصنوعی خفگی سے کہا تھا۔

"اور یہ تم ہر روز میرے بیٹے کا امتحان لینے کیوں بیٹھ جاتی ہو؟" انہوں نے یامن کے مشہور زمانہ سوال "تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ یامن لمحوں میں گلابی پڑ گئی۔

"اللہ مما جی! یہ زیادتی ہے۔ آپ نے پھر سن لیا۔" اس نے کشن اٹھا کر منہ پر رکھ لیا تھا۔

"میں نے تو سننا ہی تھا۔ آخر دن میں اٹھارہ ہزار مرتبہ جو دہراتی ہو تم۔" وہ عدل کی طرف متوجہ ہوئی

تھیں جو خواہ مخواہ کتاب پہ نظر جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم ایک ہی دفعہ میری بیٹی کو مطمئن کیوں نہیں کر دیتے۔"

"میری ایک زندگی اسے مطمئن کرنے کے لیے ناکافی ہے مما! اسے یقین آبھی جائے تب بھی یہ اپنی خصلت سے مجبور ہے۔" عدل نے کشن کے پیچھے "چھپی" کرتی ماممن پہ چوٹ کی تھی۔ اس نے فوراً کشن رخ روشن سے ہٹالیا تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر غفیرو نے عدل کو ڈانٹ کر چپ کرا دیا تھا۔ کیوں کہ معاملہ بگڑ بھی سکتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ماممن عموماً" واک آؤٹ کر جاتی تھی۔ پھر دو دو دن تک غصہ نہیں اترتا تھا۔ ہزار منتوں' ترلوں' خوشامدوں کے بعد بھی وہ نہ مانتی۔ اکثر عدل کے بابا اسے مناتے تھے۔ سچ تو یہ تھا' ماممن کو بگاڑنے میں کچھ کچھ ہاتھ ہلال کبیر کا بھی تھا۔ انہوں نے ماممن کے ناز نخرے اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

اچانک عدل نے کچھ یاد آنے پر گفتگو کا رخ ہی بدل دیا تھا۔ تذکرہ ایسا تھا کہ ماممن اور غفیرو دونوں کا منہ بن گیا۔

"بابا کی کال آئی تھی۔ اپنی ڈاک کا پوچھ رہے تھے۔ انہیں ایک دو ہفتے مزید لگیں گے۔ کوئی خط آئے تو سنبھال لیجیے گا۔" وہ ماں کو تاکید کر رہا تھا۔ غفیرو کچھ بے چین ہو گئی تھیں۔

وہ اپنے باپ کی ہر چیز اور ہر رشتے کے لیے بہت حساس تھا۔ وہ اپنے باپ کے منہ سے نکلے لفظوں کی بھی حفاظت کرتا تھا۔ آج صبح ان کی کال آئی تھی۔ وہ اپنی ڈاک کا پوچھ رہے تھے۔ آج کل کے تیز رفتار دور میں انہیں صرف ایک بندی کی طرف سے خطوط ملتے تھے۔ پھر وہ ان کا جواب بڑی محبت اور فرصت میں لکھتے تھے۔

ایک مرتبہ انہوں نے بڑے موڈ اور ترنگ میں عدل کو بتایا تھا۔

"دو لوگوں کے لیے میں کچھ بھی قربان کر سکتا ہوں۔" وہ جانے کس رو میں تھے سو کہہ گئے۔

"ایک میں اور ایک؟" اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیرنے لگی تھی۔ ایک دم بابا کے چہرے پہ روشنی سی پھیلنے لگی تھی۔ ایسی روشنی' ایسا نور جو عدل نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تھم سا گیا۔

"عدل اور جزا۔" انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ایک جذب کے عالم میں ان کے لبوں سے موتی بکھرے۔ عدل گویا دنگ سا رہ گیا۔ اس نے باپ کے چہرے پر ایسی روشنی' ایسا محبت کا نور کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسی ضوفشانی' ایسی چمک' ایسی دمک' ایسی تابناکی؟

"عدل اور جزا؟" عدل نے زیر لب دہرایا تھا۔ تب وہ ایک مرتبہ پھر میٹھی آواز میں بولے تھے۔

"ڈاکٹر ہلال کبیر کا عدل اور اس کی جزا۔" انہوں نے اپنی بات مکمل کر دی تھی۔ اس بات میں کتنے بھید تھے؟ کتنے اسرار تھے؟ وہ سمجھ ہی نہ پایا۔ جان ہی نہ پایا' مگر چہرے پہ بکھرتی چاندنی دیکھ کر خوشی ضرور ہو رہی تھی۔

"اس زمانے میں کون خط لکھتا ہے؟ اب تو انٹرنیٹ اور موبائل فون کا دور ہے' مگر بابا کو تو 1950ء کی دہائی کے خطوط آتے ہیں۔ حد ہے۔ آج کے دور میں بھی کوئی اتنا فارغ ہے؟" ماممن کی آواز میں واضح ناگواری تھی۔ دراصل بابا کے خطوط کا ذکر کسی کو بھی پسند نہیں تھا' نہ مما کو نہ ماممن کو اور نہ ماممن کو۔ کیوں کہ ان خطوط سے جس کی نسبت تھی' وہ اس گھرانے کی سب سے بڑی چڑ بنتی جا رہی تھی۔

بابا اسے جوئی کہا کرتے تھے۔ ایک پسماندہ گاؤں کی گنوار۔ مگر اس کے باپ کی بڑی محبوب ہستی تھی۔ مما کو اپنی اور بابا کو اپنی بھتیجی سے بڑا لازوال عشق تھا۔ اور وہ ڈاکٹر ہلال کبیر کی اکلوتی بھتیجی ہی تو تھی۔

"ارے۔ اس کا نام کیا تھا بھلا؟ آں۔ ہاں' یاد آیا۔ جوئی۔ کیسا ماسیوں جیسا نام ہے جوئی' موئی

کر موئی۔" ماممن نخوت سے سر جھٹک کر بولی تھی۔ صاف ظاہر تھا وہ اندر کا غصہ نکال رہی تھی۔ یہ نام غفیرو کبیر اور ماممن الیاس کی "چڑ" تھا اور یہ "چڑ" غصے اور جھنجلاہٹ میں تب بدلتی جب عدل اس موضوع پہ گفتگو کرتا تھا۔

"بری بات ماممن! یوں نہیں بولتے۔" یہ بہت نرم سی سرزنش تھی' مگر پھر بھی ماممن کو بہت بری لگی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی بھی تھی کہ عدل کبیر اپنے باپ کے لفظوں' ان کی چیزوں اور ان سے منسوب رشتوں کے لیے کتنا حساس ہے۔ پھر بھی۔

"اور یہ بھی خوب کہی۔ محترمہ! پاکستان کے کتنے ہی دیہات آج بھی موبائل فون اور انٹرنیٹ کے وجود بلکہ علت سے پاک ہیں۔ کیا پتا' وہاں بھی فون نہ ہو۔" اس نے بظاہر عام سے لہجے میں کہا تھا' مگر غفیرو بھی ذرا ٹھٹھک گئی تھیں۔

"اس نے فون تو کیا تھا' پچھلے دنوں۔ کیا پتا' انفرادیت جتانے کے لیے خط لکھتی ہو۔" ماممن جز بز ہو کر بولی تھی۔ تب غفیرو نے بمشکل ناگواری دبائی۔

"اسے کیا پتا ہو گا' انفرادیت کس چڑیا کا نام ہے اور تم لوگ کس بے کار بحث میں پڑ گئے ہو۔ اپنا وقت ضائع مت کرو۔ آرام سے پڑھو اور دودھ پی لینا۔ یاد سے عدل!" انہوں نے جاتے جاتے عدل کو تنبیہہ کی تھی تب ماممن نے جیسے انہیں تسلی دی۔

"آپ فکر مت کریں مما! عدل کا گلاس بھی خالی ہو گا۔" اس کا تیقن عدل کو "چونکا" گیا تھا۔ اس کالبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"جی مما! یہ میرا بھی گلاس خالی کر دے گی۔" عدل نے ماممن کو جیسے چڑایا تھا' مگر وہ چڑے بغیر اس کے ہاتھ میں گلاس تھما چکی تھی۔ عدل نے آرام سے گلاس پکڑا اور خالی کر دیا۔ ہمیشہ ایسے ہی تو ہوتا تھا۔ ماممن کی کسی بات سے انکار بھلا وہ کر سکتا تھا؟

غفیرو مسکراتے ہوئے پلٹ گئی تھیں۔ اب ان کا رخ اسٹڈی روم کی طرف تھا۔ یہ اسٹڈی روم ہلال کبیر کا تھا۔ ان کا قیمتی خزانہ بھی یہیں موجود تھا۔ مورکھ سے آئے گئے خطوط' ان کا اثاثہ۔ غفیرو کے اندر لہریں سی اٹھنے لگی تھیں۔ وہ عورت تو مر چکی تھی' مگر اپنے پیچھے اپنی جانشین کو چھوڑ گئی۔ رشتے میں غفیرو کے شوہر کی بھاوج لگتی تھی' مگر غفیرو کی پہلی چڑ وہی تھی اور دوسری چڑ اس کی بیٹی۔

وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اسٹڈی ٹیبل تک آئی تھیں۔ ان کی توقع کے عین مطابق وہاں ایک بند لفافہ رکھا تھا۔ مہر سے پتا چلا ایک ہفتہ پہلے کا تھا۔ انہوں نے گہرا تکلیف دہ سانس خارج کر کے لفافہ چاک کیا۔ یہ خط مورکھ کے ہائی اسکول میں زیر تعلیم دسویں جماعت کی طالبہ نے لکھا تھا۔ انہوں نے تحریر پہ نظریں جما دیں۔

☼ ☼ ☼

بہت خوب صورت شام تھی۔ دور پہاڑوں پہ سفید گھاس کھل رہی تھی' انتہائی سفید' ملائم' مگر ٹھنڈی۔ یہ گھاس نہیں تھی۔ سفید برف تھی' روئی جیسی' ملائم' نرم' مگر سرد۔ ہاتھ لگانے سے سن کرتی ہوئی' جما دیتی ہوئی' کپکپا دیتی ہوئی اور اس سے آگے طویل رقبے پر پھیلا آلو بخارے کا باغ۔ یہ موسم پھل کا نہیں تھا' تب ہی درختوں کی شاخیں خالی تھیں۔ پتے جھڑ چکے تھے۔ ہریالی ختم تھی۔ سوکھی ٹہنیاں' بے پتوں کی شاخیں۔ ٹنڈ منڈ' ویران' بے آسرا' بے حجاب۔ جیسے اس کی لڑکھڑاتی زندگی کی عملی تصویر۔

دور کہیں عشاق گایا جا رہا تھا۔ کوئی منچلا اپنے شبستان میں آتش دان میں لکڑیاں جلا کر تنہا بیٹھا راگ چھیڑ رہا تھا۔ دکھ بھرا راگ' درد سے لبریز' غم سے بھرپور' کوئی دنیا سے ہارا ہوا' عشق کا مارا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اس نے گردن موڑ کر کسی کو ڈھونڈنا چاہا تھا۔ دور پل کے پار بل کھاتی سی سڑک پہ اکا دکا ٹریفک رواں تھی۔ بتیاں سی جلتی بجھتی تھیں' مگر کوئی سواری اس طرف نہ آئی۔ چمکیلی کاروں میں وہ ایک سفید کار کہیں نہیں

تھی۔ اس کی آس ٹوٹ گئی جیسے پورے وجود میں تھکاوٹ اتر آئی۔

وہ اداس میں بھیگی چھال پہ چلتے چلتے لڑکھڑانے لگی تھی۔ اس کی راہ میں بے شمار کنکر تھے' بے انتہا پتھر تھے۔ آس پاس اندھیرا پھیلنے لگتا' روشنی کم ہوتی اور خوف اس پہ چھائے جاتا رہتا۔ اس خوف میں وہ کسے تلاش کرتی تھی؟

صبح بہاریں جیسے اس ایک شخص کو جسے دیکھ کر اس کی زندگی پہ نگار ہن ہنسنے لگتی۔

وہ روشن صبح جیسا شخص اجالے لے کر آتا تھا۔

وہ کیکر کی چھال پہ کھڑی ہو کر آنکھوں میں ٹوٹے خوابوں کے زخم لیے روشن صبح جیسے شخص کا انتظار کرتی تھی۔

گاڑیاں آتی' جاتیں' پرندے اڑتے' پھدکتے' آسمان کی وسعتوں میں گم ہوتے' پھر آشیانوں کی طرف بھاگ پڑتے۔ شام رات میں ڈھلتی' رات خوف کی طرف بڑھتی اور اس کا انتظار برف کی طرح جمنے لگتا۔

وہ انگلیوں پہ گنتی۔۔۔ ایک' دو چار' آٹھ' دس اور جانے کتنے ہی دن؟ آنے والے نے آنا تو تھا پھر آیا کیوں نہیں۔۔۔ وہ تڑپ تڑپ کر روتی' لوگ اس پر ترس کھاتے' ہمدردی جتاتے' افسوس کرتے۔

"ارے' وہ آیا نہیں۔۔۔ اب تو نانی بھی نہ رہی۔ ضد تھی' نانی چلی۔۔۔ اب تو کوئی رکاوٹ نہ بھی۔ وہ آتا اور لے جاتا۔" گھر کی چار دیواری میں پرسہ دینے والی عورتوں کی کھسر پھسر اسے خوف زدہ کرتی' پریشان کرتی' پہروں رلاتی۔ اوپر سے مامی کی پھنکار۔

"ارے۔۔۔ بھول بھال گیا ہوگا۔۔۔ کون یاد رکھتا ہے۔ بوسیدہ عہد ناموں کو۔ جب پھیرے لگاتا تھا تب بڑھیا نہ مانی۔ اور اب۔۔۔ یہ سِل ہمارے سینے پہ دھر گئی۔ اب نہ آیا وہ۔" مامی کا چہرہ غیض سے بھر جاتا' بڑا بھیانک ہو جاتا اور آنے والے ڈراؤنے وقت کا خوف اسے راتوں کو سونے نہ دیتا۔

آج بھی امید ٹوٹی' خواب ٹوٹے۔ بل کھاتی سڑک سے کوئی بھی کار اس طرف آتی دکھائی نہ دی تھی۔ وہ بھیگی چھال پہ چلتی رہی' آسمان سے برف گرتی رہی۔ بستی ابھی دور تھی' بیچ میں بہت موڑ تھے۔ وہ ندی کنارے چلنے لگی۔ برف گر رہی تھی۔ بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا جیسے سفید ملمع میں چھپا ہوا تھا۔ دور پہاڑوں سے اترتی دھند رستوں کو دھندلانے لگی' منزلوں کو چھپانے لگی۔

یہ کوئی پسماندہ گاؤں نہیں تھا۔ یہاں موبائل فون کی سہولت تھی' بجلی تھی' پڑھنے کے لیے اسکول تھا۔ ڈسپنسری بھی تھی بڑے کاروباری لوگوں کا گاؤں تھا۔ یہاں پھولوں کی کاشت ہوتی۔ موسم کا ہر پھل اگایا جاتا۔ صحت مند مویشی تھے' ڈیری فارم تھے۔ دودھ' دہی' لسی کا کاروبار چلتا۔ نامی گرامی کمپنیوں کی گاڑیاں دودھ خریدنے آتی تھیں۔

خود اس کے ماموں کا کھوئے اور موتی چور کے لڈو کا کاروبار تھا۔ وہ صرف موتی چور کے لڈو بناتے اور بڑے وسیع پیمانے پہ کھویا تیار کرتے تھے۔ بہت دور دور سے لوگ یہاں کھویا لینے آتے۔

موتی چور کے لڈو یہاں کی مشہور سوغات تھی۔ ماموں پہلے خود یہ کام کرتے تھے پھر ماموں کے جانے کے بعد نانی اور مامی کرنے لگیں۔ بعد میں ساری ذمہ داریاں اس کے نازک کندھوں پہ آپڑی تھیں۔

اس وقت بھی صبح اور رات کے بے شمار کاموں کا بوجھ ابھی سے اس کے کندھوں کو تھکانے لگا تھا۔ گھر جاتے ہوئے اس کے قدم من من کے ہونے لگے اتنے کام تھے کہ کاموں کی کوئی حد نہیں تھی۔

اس نے اپنے کمزور ہاتھوں کو دیکھا۔ لمبی پتلی انگلیوں والے ہاتھ۔ مشقت کی چکی میں دن رات پسنے والے ہاتھ۔ جنہیں کوئی بہت پیار سے چوما کرتا' پھر آنکھوں سے لگاتا' پھر محبت سے کہتا۔

"جوئی! تم میری آنکھوں کا نور ہو۔" ان کے لہجے میں شدت ہوتی' محبت ہوتی۔ وہ اتنے پیارے بول

بولتے اتنے میٹھے لفظ کہتے۔ جوئی نے ایسے لفظ نہ کبھی سنے نہ کبھی برتے۔ کیا بول اتنے شیریں جیسے بھی ہوتے ہیں؟ وہ حیران ہوتی' گم صم رہتی۔ ان کی باتیں اسے خوابوں کی نگری میں لے جاتی تھیں۔ جہاں پھول تھے' خوشبوئیں تھیں' جگنو تھے' تتلیاں تھیں۔ جہاں کوئی غم نہ تھا' مشقت نہ تھی۔ پھٹکار اور جھڑکیاں نہ تھیں۔ مار نہیں تھی' دھتکار نہیں تھی۔ وہ کتنی حسین نگری تھی؟

"جتنے میٹھے بول آپ بولتے ہیں۔ اتنے میٹھے لفظ اس کو بھی آتے ہیں؟" وہ معصومیت سے پوچھتی۔ بے قراری سے انہیں دیکھتی۔ جیسے ان کا ہر جواب اس کے لیے نئی زندگی کا پیغام لانے والا تھا۔ وہ اس کی حیران آنکھوں میں جھانکتے' دیکھتے' پڑھتے اور دھک سے رہ جاتے۔ وہاں رنگوں کی کچھ انوکھی کہانیاں رقم ہوتی نظر آتیں۔ اک نئی داستان' وہ ان کے دکھائے' بتلائے رستے پہ اندھا دھند بھاگنے لگی تھی۔۔۔ بے دھڑک' بے خوف۔۔۔ جیسے منزل پہ کھڑا شخص اس ہانپتی کانپتی کم سن لڑکی کو تھامنے کے لیے ازل سے کھڑا تھا۔ اس کا یقین انہیں ڈگمگا دیتا۔ بے چین کر دیتا' مضطرب کر دیتا' کیا جس راہ کی مسافر وہ اسے بنا رہے تھے' وہ راہ اسی کے لیے تھی؟

"ہاں۔۔۔ وہ مجھ سے زیادہ میٹھا اور اچھا بولے گا تم سے۔" وہ اس کی خوشی کو بڑھا دیتے۔ وہ لمحوں میں گلاب ہو جاتی' جیسے سارے چرمرے پتے جھڑ جاتے' نئی کونپلیں سی کھل اٹھتیں۔

"اور مجھ سے زیادہ محبت کرے گا تم سے۔" وہ اسے چھیڑتے' تنگ کرتے' مسکرانے پہ مجبور کرتے اور وہ سارے خوف بھلا کر ہنسنے لگتی۔

"کوئی آپ سے بڑھ کر بھی جوئی کو چاہ سکتا ہے؟" اس کا سوال بڑا پریقین ہوتا۔

"میری دعا ہے۔۔۔ تمہیں مجھ سے بڑھ کر محبت کرنے والا ملے۔" ان کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔۔۔ وہ ماضی کے کسی لمحے میں کھو جاتے اور وہ انہیں کسی "یاد" میں نمناک دیکھ کر لڑکھڑا جاتی۔ جیسے اب ان کی

"یاد" میں لڑکھڑا رہی تھی۔ اسے ان کی باتیں، محبتیں اور عہد یاد آتے۔ وہ اسے بھولنے والے نہیں تھے، ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔

وہ چلتے چلتے بستی میں اتر آئی۔ منزل اگرچہ ابھی بھی دور تھی، مگر یہاں اندھیرا نہیں تھا۔ یہ ساہو کاروں کا بازار تھا۔ رات کے وقت یہاں محفل سجا کرتی تھی۔ بستی کے سارے ساہو کار اکٹھے ہوتے تھے۔ یہاں پورے مہینے کے "مال" کا حساب کتاب ہوتا تھا۔ اس بازار کو "ساہو کارا" کہا جاتا تھا۔ آج مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ یقیناً "گل شام بھی یہاں موجود تھا اور گل شام خان کی موجودگی اس کا "ہراس" بڑھا دیتی تھی۔

آج گل شام عرف گوشی کی ترنگ کا عالم الگ ہی تھا۔ مہینے کی پہلی تاریخ "مال" کا حساب کتاب، خرچا، لاگت وصولی، منافع ایک کے بعد ایک ترتیب... جب منافع بڑھتا تو گوشی کی حرص اور بھی بڑھ جاتی۔ وہ "مال" اور منافع پہ صرف اپنا ہی حق سمجھتا تھا۔ حالانکہ اس "مال" کو بنانے، تیار کرنے میں جوئی تھی کی طرح پھلتی تھی۔ پھرکی کی طرح گھومتی تھی، رات رات بھر جاگتی، رات رات بھر کرچھے چلاتی، ہاتھ ہلاتی، اس کے کندھے ٹوٹنے لگتے تھے۔ ہاتھ دکھنے لگتے تھے، کمر اکڑ جاتی تھی۔ کھڑے کھڑے پیروں میں ورم آجاتا۔ مگر اس کے حصے میں پھوٹی کوڑی تو کیا ایک لفظ ستائش کا نہ آتا۔

جب نانی زندہ تھیں، تب حالات اتنے برے نہیں تھے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر لڑ جھگڑ کر فساد کھڑا کر کے جوئی کا حصہ نکلوا لیتیں۔ لاکھوں کے منافع میں جوئی کے لیے صرف چار پانچ سو نکلتے تھے۔ وہ بھی مامی دل پر پتھر رکھ کر نانی کے منہ پہ مارتی اور موقع دیکھ کر جوئی کے حلق سے نکلوا بھی لیتی۔

مامی بہت کمینی عورت تھی اور گوشی ماں کی طرح ہی بہت کمینہ تھا۔ اسے کولہو کے بیل کی طرح جوتے رکھتا۔ ڈھور ڈنگروں سے بڑھ کے کام لیتا۔ جوئی نے گڑیا کھیلنے کی عمر میں مشقت کرنا شروع کی تھی۔ اس کے کھیلنے کی عمر میں کونڈا پکڑا دیا گیا تھا اور کتابیں پڑھنے کی عمر میں اس نے "عشق" پڑھنا شروع کر دیا تھا اور وہ اپنا کام بڑی دلچسپی سے کر رہی تھی۔

بوسیدہ چپل کے تلوے نیچے نوکیلا کنکر آیا۔ وہ بے ساختہ کراہ کر پتھریلی زمین پہ پیر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی معاً کنکروں پہ بھاری بوٹوں کے چلنے کی آواز آئی۔ کوئی ٹھوکروں سے کنکر اڑا رہا تھا۔ جوئی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ماموں کا گھر اب چند قدم کے فاصلے پر تھا مگر جوئی سے اٹھنا محال تھا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں، سر جھکا لیا۔ معاً "بھاری لوز کٹیلی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ جوئی کا جھکا سر جھکا ہی رہا۔ وہ سامنے کھڑے بندے کی شکل دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

"اچھا... یہ تم ہو؟ آوارہ گردی کرنے نکلی ہوئی تھیں۔ گھر میں کاموں کا انبار ہے تم کو سیر سپاٹوں سے فرصت نہیں۔" وہ دانتوں میں پان دبائے غضب ناک ہوا تھا۔ یقیناً "جیبیں نوٹوں سے بھر کر اس کی تلاش میں نکلا تھا۔

ایک وہی تو تھا جسے لمحہ بھر بھی جوئی دکھائی نہ دیتی تو ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ ضرورتاً "ہی سہی، کم از کم گل شام کو اس کی یاد تو آتی تھی۔ ورنہ اس وقت اس کی دونوں بہنیں اور ماں گرم لحاف میں گھسی پستے، چلغوزے کھا رہی تھیں۔ ایسے وقت میں تو انہیں جوئی کبھی بھی یاد نہ آتی۔

"میں پل تک گئی تھی۔" ایڑی کے درد کو بھلائے اس نے خوف زدہ انداز میں مجرمانہ صفائی پیش کی تھی۔ تب گل شام کا سفید چہرہ تپ کر سرخ ہو گیا۔ شکاری کتے کی طرح نتھنے پھول گئے۔ اس کے ماتھے پر لاتعداد بل ابھر آئے تھے۔

"ہاں... بے آس لوٹی، نامراد ہوئی... وہ دیالو، کرپالو، مہربان، ہمدرد، غم خوار تمہارا غم جان نہیں آیا..." گوشی کو طنز کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ سر جھکائے سسکیاں بھرنے لگی۔

"اس دفعہ تو لمبی ڈنڈی مار گیا۔ لگتا ہے دادی کے مرنے کا پتا چل گیا۔ اب نہیں لوٹے گا۔" گوشی ہاتھ میں پکڑے رجسٹر کو دیکھتا مسکرایا تھا۔ یہ وہ رجسٹر تھا جس پر روز مرہ کے آمد و خرچ کا حساب درج تھا۔ آج حساب کتاب کا دن تھا۔

"ایسا نہیں ہے۔" وہ ہکلا کر رہ گئی۔ وہ کسی کے سامنے بھی بول نہیں سکتی تھی۔ اس میں اعتماد کا فقدان تھا۔ وہ ایک دبو اور کمزور لڑکی تھی۔ خوف زدہ ہو جاتی، گھبرا جاتی، ہکلا جاتی۔ تب ہی تو ہر کوئی اس پہ حکومت کرتا تھا۔ مامی، اس کی چار بیٹیاں، ایک بیٹا... وہ سب کے لیے کمزور ترین رعایا تھی۔

"لکھوا لو مجھ سے، کوئی نہیں لوٹے گا۔ ایویں "سیالے" میں لور لور پھرتی ہو۔ یہ جاڑے کا موسم ہے۔ تاپ چڑھا کر بستر پہ پڑی تو ٹانگیں توڑوں گا۔ میرا "کام" ٹھپ کرنے کا ارادہ ہے۔" گوشی نے غیض سے سر جھٹک کر بھوری بھیانک موٹی آنکھوں سے گھورا تھا۔ جوئی کی جیسے بدروح فنا ہو گئی تھی۔ اسے خوف آیا۔ گوشی اسے جھانپڑ نہ دے مارے۔ ویسے تو وہ عادی ہی تھی۔ مامی، گوشی اور اس کی بہنوں سے جھانپڑ کھانے کی۔ جس کا جب دل چاہتا، اس پہ ہاتھ اٹھا لیتا۔

"میں جاتی ہوں۔" اس نے اٹھنا چاہا، مگر کراہ کر بیٹھ گئی۔ ٹھنڈی زمین اور نوکیلے پتھر... اوپر سے گوشی جیسے جن کا خوف... وہ تھر تھر کانپتی رہی۔

"اٹھ بھی جا اب..." گوشی نے زبردستی اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا۔ گوشی کی گرفت سخت تھی۔ جوئی نے بازو چھڑانا چاہا۔ وہ اسے ساتھ لیے آگے بڑھنے لگا۔

"کھڈے ہیں یہاں۔ گر کے مرنا ہے کیا؟" گوشی نے پھر سے پھنکار کر کہا تھا۔ جانے اسے غصہ کس بات پہ تھا؟ جوئی الجھ گئی۔ آج تو پہلی تاریخ تھی۔ پیسہ ملتا تو وہ چھٹنے کے قریب ہو جاتا۔ جیبیں بھرتا اور شہر نکل جاتا۔ دو چار روز عیاشی کے بعد گھر آتا۔ موڈ خوش گوار ہوتا۔ تب جوئی پہ سختی میں کچھ کمی آجاتی تھی۔ وہ تو دعا کرتی تھی۔ گوشی کی جیب کبھی خالی نہ ہو اور وہ گھر لوٹے ہی نہ... مگر بعض دعائیں...

"مر گئی تو کرچھے کون ہلائے گا۔ کونڈے میں دال کون کوٹے گا۔ میرا کام تو گیا۔ کشی اور دی تو بیکار مال ہیں۔ ایک نمبر کی ہڈ حرام اور یہاں ان کی استاد۔"

اس نے قہقہہ لگایا تھا۔ پھر جانے کیا گنگنانے لگا۔ جوئی نے گھر کا پھاٹک دیکھ کر کلمہ شکر ادا کیا تھا۔ مگر چھت پہ رسوئی کا خیال، لوہے کا بہت ناک طویل و عریض کڑاہا۔ جس میں چار چار دن کرچھا چلانے کے بعد کھویا تیار ہوتا تھا۔ سو کلو دودھ کو ایک ساتھ خشک کرنا۔ پھر مگری میں بھیگی چنے کی دال کو سل پہ پیسنا... اس کے روم روم میں تھکاوٹ بھر گئی۔ گرم بستر کا خیال ہوا ہونے لگا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی، گوشی اسے ڈھونڈتا کیوں پھر رہا تھا۔ اسے پھر سے ایک بڑا آرڈر ملا تھا۔

محنت، مشقت، سختی اور تلخی بھری رات پھر سے منتظر تھی۔ نانی جب زندہ تھیں تب بھی وہ اسی طرح محنت کرتی تھی۔ صرف لڑائی اور فساد کے خوف سے۔ نانی کی اس کے لیے حمایت مامی کو آگ بگولا کر دیتی تھی۔ گھر میں دنگل بچ جاتا۔ گالی گلوچ، گندی اور فحش باتیں... مامی بڑی بدزبان اور جھگڑالو تھی۔ نانی بھی مامی کی ٹکر... ایک سیر تھی تو دوسری سوا سیر۔ وہ ان کے جھگڑے پر خوف زدہ ہو جاتی۔ رسوئی میں جا کر چھپ جاتی، کڑاہے میں کرچھا ہلا کر خوف کم کرتی۔

وہ فطرتاً "بزدل تھی۔ نانی عمر بھر اس کی بزدلی کو ختم نہ کر سکیں وہ اسے بے خوف اور بہادر دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ اسی قدر ڈرپوک اور بزدل تھی۔ شور، لڑائی، ہنگامہ اسے خوف زدہ کر دیتا تھا۔ وہ آنکھیں میچے اپنے اور نانی کے مخصوص ڈربے میں گھس جاتی تھی۔ اسٹور روم سا یہ ڈربا صرف دو لوگوں کے لیے کافی تھا۔ جب نانی کی ٹانگیں بیکار ہوئیں تب مامی نے نانی کو اٹھوا کر "ڈربے" میں ڈال دیا تھا۔ نانی کے کس بل نکل گئے تھے۔ اب ان کا زور نہیں چلتا تھا۔

"مگری میں دال پھول چکی... اسے نکال کر سل پہ پیس لو۔ بہت بڑا آرڈر ہے۔ غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ تمہاری مدد کو بخت گل بھی آجائے گی۔ کشی اور دی سے کوئی توقع نہیں۔"

وہ سرخ ہونٹوں کو پونچھتا، حکم چلاتا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا جبکہ جوئی کے حواس جیسے جاتے

رہے۔ تو آرڈر سوتی چور کا تھا۔ انتہائی وقت طلب مشکل ترین کام تھا۔ جسم کی چولیں تک ہل جاتیں۔ کندھے اتر جاتے' دال پیستے پیستے کمر تختہ ہو جاتی تھی' مگر ایک لفظ تھکاوٹ اور انکار کبھی اس کے لبوں پہ نہیں آتا تھا۔ یہ اس کی بزدلی تھی' کمزوری تھی یا فرماں برداری؟

وہ بھاری قدموں سے لکڑی کا زینہ چڑھنے لگی۔ کام کے لیے رسوئی اوپر تھی۔ یہاں پر کھویا اور لڈو بنتے تھے۔ نانی اور ماموں کے وقتوں سے یہ کاروبار چل رہا تھا۔ پہلے کاریگر ہوا کرتے تھے۔ ماموں کے انتقال کر جانے کے بعد نانی نے کاریگر' ہنرمند ہٹا دیے تھے۔ کاروبار میں تنخواہ داروں کی گنجائش نہیں تھی۔ ماموں کے بعد حالات کشیدہ ہو گئے تھے۔ تنگی کا دور تھا' وسائل کم پڑنے لگے۔ تب نانی نے ہمت جوان کی اور خود میدان میں اتر آئیں۔ کچھ جانور فروخت کر دیے اور کچھ دودھ' دہی' مکھن کے لیے بندھے رہنے دیے۔

جوئی کو سب یاد تھا' ذرا ذرا سا وقت۔ نانی کی مشقتیں۔ محنت' سختیاں۔ وہ فولاد جیسی عورت تھیں۔ باڑے میں جانوروں کا گوبر اٹھاتیں' چارہ کاٹتیں' ان کی سیوا کرتیں' دودھ دوہتیں۔ بڑے بڑے مٹکے اٹھا کر لکڑی کا زینہ چڑھتیں اور کڑاہے میں کھویا تیار کرتیں۔ لڈو بناتیں۔ رات بھر جاگتیں۔

مامی کو بچوں سے فرصت نہ تھی' پانچ بچے' سب نخریلے' ضدی' جھگڑالو۔ بالکل ماں کی طرح۔ ایک ہنگامہ مچائے رکھتے۔ ہر وقت لڑتے' جھگڑتے' ایک دوسرے کے بال نوچتے' لڑکیاں بڑی تھیں۔ گوشی چھوٹا تھا۔ پھر بھی بڑی بہنوں کی شامت لائے رکھتا۔

تب جوئی سہم جاتی' ڈر جاتی' خوف زدہ ہو کر نانی کے پہلو سے چپک جاتی۔ اسے مامی کے سب بچوں سے خوف آتا تھا۔ وہ سب عجیب مزاج کے تھے۔ ایک دوسرے پہ آیا غصہ جوئی پہ اتارتے' نانی جب بھی نظر سے اوجھل ہوتیں۔ جوئی کی شامت آجاتی۔ جوئی ان سب کی مار کھا کے پلی بڑھی تھی۔ نانی کے سامنے کسی کی مجال نہیں تھی۔ وہ روئی کانپتی سائے کی طرح نانی کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ ایسے ہی نانی کے پہلو سے چپکے رہنے کی وجہ سے اسے موتی چور کے لڈو بنانے کا فن آگیا تھا۔ نانی دو دو بوریاں چنے کی دال صاف کرتیں' گگری میں بھگوتیں۔ پھر دال پھول جانے پر سل پہ پیستیں۔ پھر ململ کے کپڑے میں اسے چھانتیں۔ پوری رات لڈو کی تیاری میں گزرتی تھی۔ بنانے کا مرحلہ تو بعد میں آتا تھا۔

کئی کئی دن دال صاف کرنے میں گزر جاتے۔ دھیرے دھیرے جوئی نے نانی کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ اسے نانی پہ ترس آتا۔ وہ تنہا پورے کنبے کی کفالت کے لیے محنت کرتی تھیں۔ باقی سب تو کھانے والے تھے۔

نانی کا بوجھ بٹانے کی غرض سے پہلے پہل اس نے دال میں سے کنکر چننا شروع کیے تھے۔ پھر وہ گگری میں دال بھگو دیتی۔ سل پہ پیسنے کا کام دشوار تھا۔ یہ کام نانی کو کرنا پڑتا۔ وہ بس نانی کے کندھے دباتی اور انہیں مہارت سے ہاتھ چلاتے دیکھا کرتی تھی۔ پھر اسے پسی ہوئی دال میں مقدار کا پورا پورا حساب رکھ کر گھی ملانا بھی آگیا۔

وہ مٹی کے بڑے بڑے کونڈے میں جمے خالص دہی کو اٹھا لاتی۔ دودھ کا ڈرم کھول دیتی۔ نانی' دودھ' دہی پسے آمیزے میں ڈالتیں اور جھاگ بننے تک مکس کیے جاتیں۔ یہاں تک کہ آمیزہ خمیر جیسا پھول جاتا۔ جوئی غور سے دیکھتی' پھر کڑاہا بھر کے گھی کڑکڑایا جاتا تھا۔ موٹے چھید والی لوہے کی بہت بڑی چھلنی کڑاہے پہ رکھی جاتی اور آمیزہ بھر بھر کے چھلنی میں ڈالا جاتا۔ پھر اسی تیزی سے آمیزہ ہلا ہلا کر بوندیاں گرائی جاتی تھیں۔ یہ کام بہت تیزی سے کیا جاتا۔

نانی اکیلی تھک جاتیں' ٹوٹ جاتیں' اکثر غصے میں آجاتیں۔ تب جوئی پھر ان کی مدد کو تیار ہو جاتی۔ وہ بوندیوں کو پہلے سے تیار کیے شیرے میں ڈالتی' پھر ٹھنڈا ہونے پر نکال کر ململ کی چادر پہ پھیلا آتی۔ اگلی صبح الائچی دانے کوٹے جاتے' بوندیوں پہ چھڑکے جاتے

اور لڈو تیار کر کے چاندی کے ورق لگائے جاتے۔ انتہائی مزیدار' خوش بودار' خستہ' دیسی گھی سے تیار شدہ موتی چور کے یہ لڈو علاقے بھر میں مشہور تھے۔ لوگ دور دراز سے آرڈر لے کر آتے۔ ماموں کے مرنے کے بعد آرڈر کم ہو گئے تھے' مگر دھیرے دھیرے سہی' ایک دفعہ پھر سلسلہ روزگار چل پڑا تھا۔

نانی سے اکثر کام خراب ہو جاتا تھا۔ کچھ بڑھاپا تھا' کچھ نظر کمزور تھی۔ وہ کڑکڑاتے گھی سے بہت تیزی کے ساتھ بوندیاں نہیں نکال سکتی تھیں۔ کئی دفعہ آرڈر خراب ہوا۔ گاہک ناراض' کام مندا پڑنے لگا۔ تب نانی حواس باختہ ہو جاتی تھیں۔ پھر پہلی مرتبہ بہت کم سنی میں نانی کو نہ پا کر تنہا اکیلے جوئی نے دو کلو لڈو تیار کر لیے۔

اس نے پہلا لڈو سات سال کی عمر میں بنایا تھا۔ انتہائی خستہ' لذیذ' خوش بودار۔ نانی نے دیکھا تو حیران رہ گئیں۔ کیا یہ جوئی نے ہی بنایا تھا؟ ان کو اگلے بہت سے دن بھی یقین نہ آیا۔ یہاں تک کہ وہ عملی طور پر نانی کا ہاتھ بٹانے میدان میں اتر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایسی لذت' ایسی مٹھاس تھی کہ دنوں میں گاہکوں کا تانتا لگ گیا۔

ان کے لڈو بڑے بڑے حلوائیوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ لذت اور مہارت کے کمال نے کاروبار کو بہت وسعت دی تھی۔ یہاں تک کہ کام بڑھ گیا۔ گوشی کو بھی کام میں لگنا پڑا تھا۔ پہلے پہل وہ منہ بناتا رہا۔ پھر پیسے کا چسکہ پڑ گیا۔ نانی بیمار ہوئیں تو گوشی کے ہاتھ میں کاروبار کی ڈور چلی گئی۔ اسے پیسے کی لت لگ گئی تھی۔ آرڈر پہ آرڈر لے آتا۔

مالی حالات بدلنے لگے۔ اسی لیے جلد ہی عسمی اور نمی نمٹ گئیں۔ مامی کے رنگ ڈھنگ بھی بدل گئے۔ گھر کی مرمت بھی کروائی' بس نانی کا علاج نہ ہو سکا۔ اس کے لیے نہ کسی کے پاس فرصت تھی نہ رقم۔ وہ پورا دن اسٹور نما ڈربے میں پڑی رہتیں۔ چیختیں' چلاتیں' گالیاں کوسنے دیتیں۔ بس جوئی بھاگ بھاگ کے نانی کو دیکھنے آتی۔ عجیب وسوسے اور خدشے اسے لاحق تھے۔ وہ شیرے میں لتھڑے ہاتھ لیے بھاگ بھاگ کے زینہ اترتی' نانی کے پاس جاتی' انہیں اوگھتا پا کر واپس پلٹنے لگتی تب نانی کراہتی آواز میں اسے سمجھاتیں۔

"کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو؟ ارے ان حرامیوں کو مفت کی نوکر مل گئی۔ اس ذلیل گوشی سے کہو کاریگر رکھے۔ تم کسی کے باپ کی ملازمہ نہیں۔ خبردار' رسوئی میں مت جانا۔ یہ لوگ تجھے نگل جائیں گے میری بچی! کس دن میں نے تجھے لڈو بنانا سکھا دیے۔ ہائے' یہ کیا ظلم ڈھایا۔" وہ خود کو کوسنے لگتی تھیں۔ گالیاں دیتیں اور بال نوچتیں۔ وہ کتنی مخبوط الحواس ہو گئی تھیں۔

"تجھے آگ' دھواں کالا غبار بنا دے گا۔ خاک دھول ہو جائے گی۔ بس کتابیں پکڑ کر اسکول جایا کر۔ میری بچی! خود کو ضائع نہ کر۔" وہ روتی رہتیں۔ سر پٹختیں' مگر جوئی کو رسوئی جانے سے روک نہیں پاتی تھیں کیونکہ مامی اور گوشی کی پھٹکار اسے خوف زدہ کر دیتی تھی۔ وہ جھگڑے اور لڑائی سے بچنے کے لیے کام میں جت جاتی۔ اس گھر کے لوگ اسے کام کرتا ہی دیکھنا چاہتے تھے۔

بس ہوا کچھ یوں کہ تھوڑے دن بعد گوشی ایک لڑکی بخت گل کو لے آیا۔ یہ لڑکی اس کی مدد کے لیے لائی گئی تھی۔ دراصل وہ لڑکی کام سیکھنے کے لیے آئی تھی۔ بہت باتونی' تھوڑی چالاک اور کافی پھرتیلی تھی۔

اس وقت بھی لکڑی کے ایک ایک قدمچے پہ پیر رکھتی وہ سب کی سن رہی تھی۔ وہ سب جو گرم لحاف میں دبکے پڑے تھے۔ دانتوں میں خستہ' نمکین چنے کو کرچ کرچ نگل رہے تھے۔ جوئی کے قدموں کی آواز نے جیسے سب کو چوکنا کر دیا تھا۔ دراصل یہ اس کے قدموں کی آواز نہیں تھی۔ بلکہ زینے کی بھاری زنجیر کی آواز تھی۔ یہ خاص زنجیر تھی جو الارم کا کام دیتی تھی۔ کوئی بھی زینہ اترتا' چڑھتا گھر کے کونے کونے میں آواز جاتی تھی۔ ماموں نے چور اچکوں سے ہشیار رہنے کے لیے لگوائی تھی' مگر جوئی کو اس کی آواز بڑی ناگوار گزرتی

تھی۔

وہ کام ادھورا چھوڑ کر نیند سے نڈھال کبھی بھی نیچے نہیں آسکتی تھی کیوں کہ قدمچے پہ پہلا پیر رکھتے ہی زنجیر بجتی' ٹھکتی چیں چیں کرتی شور مچادیتی تھی۔ تب مائی اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر گردن نکالے فورا" پھنکارنے لگتی۔ گول کمرہ زینے کے قریب تھا مائی نے فورا" چیں چیں' کھر کھر کی آواز سن کر کھڑکی کھول لی تھی۔

"آگئی واپس؟ نہیں آیا تمہارا ہوتا سوتا... آنے والا بھی نہیں۔ جانے کس گمان میں ہو۔ ارے اس کے تو سر کی بلا ٹلی۔ تار بھیجے مہینہ بھر سے اوپر ہوگیا۔ بڑھیا کا پرسہ دینے بھی نہیں آیا۔ کیوں آئے گا بھلا بڑھیا نے کب اسے گھاس ڈالی۔ اپنی اکڑ اور غرور میں ہی رہی۔"

مائی کو بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

"ایک نمبر کا فریبی' دھوکے باز تھا۔ بس تجھے باتوں سے ہی بہلاتا رہا۔" گوشی نے بھی زہر اگلنے میں دیر نہیں کی تھی۔

"یہ اس کی مکارانہ باتوں پہ ریجھ گئی۔ وہ رغبت رکھتا تو ضرور لوٹتا۔ میں تو کہتی ہوں پڑھادو اس کے دو بول۔" دی نے بھی ناریل کاٹتے مذاق اڑایا تھا۔ جوئی کی آنکھوں میں دھند چھانے لگی۔ نیچے سے مائی کی پھر سے آواز آئی۔

"مٹکے میں رلی لگادے۔ بجلی کا بھروسا نہیں۔ سویر تک مکھن جمانا بھی ہے۔" حکم نامہ تیار تھا اور سرتابی کی مجال بھلا کس کی تھی۔

اس نے قدم رسوئی کی طرف بڑھادیے۔ یہ ہال کمرے جتنا بڑا کچن تھا۔ پوری چھت پہ مشتمل۔ یہاں بڑے بڑے بھاری سیاہ کڑاہے رکھے تھے۔ بالس جتنے کڑچھے' تانبے' پیتل کی پراتیں۔ ایک قطار میں بھاری مٹکے رکھے تھے۔ جمے ہوئے دودھ سے بھرے۔ جن میں بھاری "رلی" کو باری باری لگانا تھا۔ ایک طرف دو تین بلونیاں' مدھانیاں' مٹکیاں رکھی تھیں۔ سب دودھ بلونے کے آلے تھے۔

رسوئی کے ایک طرف مال کی تیاری کا سامان رکھا تھا۔ مہینے بھر کا سامان۔ دیسی گھی کے بھاری کنستر جن میں ڈالڈا کی ملاوٹ گوشی کے مجبور کرنے اور ہٹ دھرمی دکھانے پر کی جاتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ چھوٹی موٹی بے ایمانی کاروبار کے لیے بہت ضروری تھی۔

دوسری طرف "شکر تری" کی بوریاں رکھی تھیں۔ سرخ کھانڈ سے بھری۔ یہ کھانڈ بوندیاں بنانے کے کام آتی۔ چنے کی دال کا چھت سے لگتا ڈرم بھی موجود تھا۔ پچھلے سال دال میں کیڑا لگ گیا تھا۔ ساری دال خراب ہوگئی۔ ناقص' خراب بو زدہ۔ پر گوشی نے کسی کی نہ سنی۔ اسی دال سے لڈو بنوالیے۔ یہ تو جوئی کے ہاتھ کا کمال تھا۔ مہارت اور لذت کا کمال تھا۔ جو لڈو خراب نہ بنے۔ خوشبو' ذائقہ' لذت برقرار رہی۔ پھر بھی جوئی کا دل لرزتا رہا۔

ناقص مال تیار کرکے لوگوں کو دھوکا دینا' حرام رزق کمانا... کیا یہ جائز تھا؟ وہ سوچتی' الجھتی' مگر زبان بند رکھتی' بولنے کی صورت میں گوشی کے جھانپڑ کون کھاتا؟

"ملانی نہ بنا کر' بڑی آئی گناہ ثواب بتانے والی۔" وہ بدزبانی پہ اتر آتا تھا۔ گالی گلوچ کرتا یا ہاتھ اٹھاتا۔ جوئی ڈر جاتی تھی۔ اب تو نانی کی ڈھال بھی نہیں تھی۔ وہ گوشی کے منہ ہی نہ لگتی۔ اس کے سائے سے بھاگتی' مگر وہ اس کا سایہ بنا ہی رہتا۔

کبھی کبھی قربان' نچھاور' واری' نثار' فدا بھی ہونے لگتا۔ تب جوئی کی جان پہ بن آتی۔ وہ بھاگ کر گول کمرے میں گھس جاتی۔ بے سبب مائی کے پیر دبانے لگتی۔ گوشی کی ذومعنی گفتگو سے بچنے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ گول کمرہ' مائی کا کمرہ اس کی جائے پناہ۔

جوئی سر جھٹک کر دال کو لوہے کے ٹب میں سے نکالنے لگی تھی۔ پھولی ہوئی دال کو ساری رات بھگویا تھا۔ جوئی کے ہاتھ سرد پڑنے لگے' ٹھٹھرنے لگے' کانپنے لگے۔ باہر دھند نما برف پڑ رہی تھی۔ قیامت خیز سردی تھی۔ اس نے سب سے پہلے آتش دان میں لکڑیاں سلگائی تھیں۔ کچھ دیر بعد آگ جل اٹھی۔

شعلے ابھرنے لگے' رنگ نکلنے لگے۔ ماحول کو گرم کرنے لگے۔

وہ سرد' کمزور ہاتھوں سے دال پیسنے لگی تھی۔ اس کے کانوں میں کچھ گزری باتیں اترنے لگیں۔

"تم تو میری جان ہو... میں خود کو بھول سکتا ہوں' مگر تمہیں نہیں۔" کسی نے بڑی محبت سے اسے یقین دلایا تھا۔ کسی نے بڑی محبت سے اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا تھا۔

اس نے گیلا ہاتھ پیشانی پہ رکھا' چھوا' کچھ محسوس کیا۔ وہاں اب بھی گرم بوسے کا احساس باقی تھا۔ جوئی کی آنکھیں بھیگنے لگیں' اس نے اپنا کام چھوڑ کر دوپٹے سے ہاتھ پونچھے۔ پھر اٹھ کر رسوئی کے آخری کونے میں رکھے چھوٹے سے صندوق تک آگئی۔ یہاں بہت سا کاٹھ کباڑ رکھا تھا۔ ٹوٹی ماربل کی اینٹیں' پرانے برتن' ناکارہ اوزار۔ اس نے ماربل کی اینٹ اٹھا کر نیچے سے زنگ آلود اکلوتی چابی نکالی تھی۔ اب وہ بڑی بے تابی سے صندوقچہ کھول رہی تھی۔ بوسیدہ کترنوں' پرانے سویٹر' چادر اور کتابوں کے ڈھیر کے دوسری طرف لفافے میں کچھ موجود تھا۔ اس نے وہ لفافہ نکال کر آنکھوں کے سامنے کیا۔

یہ لفافہ نانی نے مرنے سے پہلے دیا تھا۔ زرد بوسیدہ سا ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا' مگر جوئی کی جیسے پوری زندگی کی حکایت اس پہ تحریر تھی۔ وہ بے یقینی سے دیوانہ وار لفافے میں موجود کاغذ کو چھوتی رہی' چومتی رہی محسوس کرتی رہی۔ اسی لفافے میں ایک تصویر بھی تھی' چار سال پہلے یہ تصویر وہ خود جوئی کو دے کر گئے تھے۔ وہ تصویر میں موجود ان دو چمکتے روشن چہروں کو دیوانہ وار دیکھتی رہی۔ اس کے لبوں پہ ہلکی سی بڑبڑاہٹ تھی۔

"ڈاکٹر چاچو! آپ اور آپ کا بیٹا میری پوری زندگی کا کل اثاثہ اور کل سرمایہ ہیں۔"



"تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟" روشن اسکرین پہ الفاظ چمک رہے تھے۔ یہ الفاظ دن میں کئی مرتبہ چمکتے۔ اس نے گہرا سانس کھینچا اور گلاس ونڈو سے سلکی پردے ہٹادیے۔ باہر صبح کا نور بکھرا تھا۔

وہ اندر تک جیسے مہک گیا تھا۔ سیل فون کی ٹون پھر سے بج اٹھی تھی۔ وہ چونک کر سیل کی طرف متوجہ ہوا۔ اسکرین پھر روشن تھی۔ موی کی طرف سے نیا میسج تھا۔ وہی الفاظ پھر سے جگمگا رہے تھے۔

"عدل! تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟" یہ صبح سے پچاسواں میسج تھا۔ وہ اڑتالیس مرتبہ جواب دے چکا تھا' مگر ماہن کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی تسلی ہوتی ہی نہیں تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر جواب ٹائپ کررہا تھا۔

"بے حد' بے حساب' بے شمار' بے انتہا... جتنے "بے" بچے ہیں۔ ان کو خود لگالو۔ پوری گردان مکمل ہوجائے گی۔" وہ مسکراتا ہوا ٹیکسٹ سینڈ کرکے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے جواب آگیا تھا۔

"بے حس' بے خبر' بے درد' بے طریقہ' بے دل' بے ڈھب' بے روح' بے رحم' بے قدرے' بے مروت' بے نیاز' بے ہمت انسان... بس اتنے ہی "بے" میرے پاس محفوظ تھے۔ سب تم پر فٹ آتے ہیں۔ میری محبت کا مذاق اڑاتے ہو۔" ماہن نے جواب کلس کردیا تھا۔ وہ سوچتا رہا اور مسکراتا رہا۔ گویا اس نے ماہن کو زچ کردیا تھا۔ جیسا کہ صبح سے ماہن نے میسج کرکرکے اسے زچ کررکھا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر میسج ٹائپ کرنے لگا۔

"بے ادب' بے تاب' بے خود' بے سلیقہ' بے صبری' بے قابو' بے کل' بے وقوف' خاتون! اتنی نادان اور بے شعور کیوں ہو؟ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم میرے لیے انمول ہو۔ محبت اظہار چاہتی ہے' مگر اتنا بھی نہیں۔ دن کے تین پہر "محبت محبت" کرتا رہا تو فارن سروسز کا خواب "بے دردی" سے چکنا چور ہوجائے گا۔ سو تم مجھے محبت کے جھانسے میں الجھا کر پہلی پوزیشن کے لیے راہیں ہموار نہ کرو۔ تم جانتی

ہو، پہلے نمبر پہ تم ہی ہو۔۔۔"

وہ میسج سینڈ کرکے بے اختیار ہنسنے لگا۔ جانتا تھا کہ آخری بات لکھ کر اس کا غیض بڑھانے کا سامان کرویا ہے۔ اب وہ اس کے میسج کا انتظار کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جواب فٹ سے آیا۔

"بے ہودہ آدمی، دماغ الٹا دیا۔" بہت جلا بھنا جواب تھا۔ آگ بگولا ہو کر لکھا گیا تھا۔ وہ تصور میں مامن کا سرخ چہرہ، غصیلی آنکھیں دیکھنے لگا۔ پھر ان غصیلی آنکھوں میں اسے نمی ابھرتی نظر آئی تھی۔ آنسو، پانی، گرم سیال۔۔۔ عدل کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ وہ بے چین ہو کر سا باہر نکلنے لگا تھا۔ مگر یہ کیا؟ دروازے کے سامنے مامن کھڑی تھی۔ ہاتھ میں فون پکڑے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اسے ملال نے گھیر لیا۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگا۔ اس نے مامن کا دل دکھا دیا تھا۔

"موی! میں نے تو۔۔۔" وہ اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا تھا، مگر مامن نے اسے موقع ہی نہ دیا۔ وہ اسے بے ساختہ ٹوک گئی۔

"زندگی میں پہلی مرتبہ کچھ درست کہا۔ میں تمہارے لیے انمول ہوں۔ میرے لیے یہ الفاظ انمول ہیں۔ یہ تمہارے لیے۔۔۔ اتنے حسین اظہار کے بدلے میں۔" اس نے پلو ہٹا کر پھول عدل کی ہتھیلیوں پر رکھ دیے۔ تازہ سرخ مہکتے گلاب۔ وہ حیران رہ گیا تھا۔ مامن رو رہی تھی۔ اس کے گالوں پہ شبنم گر رہی تھی۔

"پھر یہ آنسو کیوں؟" وہ گھبرا کر پوچھ رہا تھا۔

"یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔۔۔ انمول ہونے کے آنسو ہیں۔" موی روتے روتے ہنس پڑی۔۔۔ وہ ایسی ہی تو تھی۔ ہنستے ہنستے رو پڑتی، روتے روتے ہنس پڑتی۔ وہ اس کے لیے پاگل تھی، دیوانی تھی۔ ایک ساتھ کھیلتے، کودتے، سائیکلنگ کرتے، کیرم کھیلتے، تتلیاں پکڑتے، جگنوؤں کے پیچھے بھاگتے جانے کب، کیسے، کس طرح وہ ایک دوسرے کے ساتھ عمر بھر کے لیے بندھ گئے تھے اور بظاہر ان دونوں کے ایک ہونے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ تب ہی تو دونوں مطمئن تھے۔ بیچ میں تھوڑا سا انتظار تھا۔ صرف چھ مہینوں پر مشتمل۔۔۔ مامن کے لیے یہ انتظار کٹھن آگیں تھا جبکہ عدل کے لیے بھی بے حد لطیف۔۔۔ وہ جیسے لمحے لمحے سے خوشی کشید کر رہے تھے۔

مامن مسکراتے ہوئے کوریڈور سے ہوتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی۔

آج جاگنگ کا پریڈ بھی مس ہو گیا۔ اب دن چڑھ گیا تھا، ایکسرسائز کا موڈ نہیں تھا۔ وہ تازہ ہوا کھاتا گردی کرتے سلیم تک آ گیا۔

"سلام صاحب!" سلیم نے اسے دیکھتے ساتھ مؤدبانہ سلام پیش کیا تھا۔

"بابا کی ڈاک تو نہیں آئی؟" وہ سرسری انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"آج تو نہیں آئی۔" سلیم نے سوچ کے جواب دیا تھا۔ عدل کچھ پل کے لیے چپ سا ہو گیا۔ پھر کچھ بے چینی سے بولا تھا۔

"اور اس سے پہلے؟" اس کی پیشانی پہ سلوٹیں تھیں۔ ابھی رات کو بابا پھر اپنی ڈاک کے بارے میں پوچھ رہے تھے، وہ خاصے پریشان لگ رہے تھے۔

"ڈیڑھ ماہ پہلے خط آیا تھا۔ اس کے بعد نہیں۔" سلیم نے کچھ دیر ذہن پر زور دے کر جواب دیا تھا۔ عدل کچھ چونک گیا۔ یعنی بابا کے چلے جانے کے بعد؟ تو پھر وہ خط کہاں تھا؟ اسے بے چینی لاحق ہونے لگی۔

"میں اسٹڈی روم میں رکھ آیا تھا۔ صاحب کی میز پر۔" عدل کے پوچھنے سے پہلے ہی سلیم نے وضاحت کر دی تھی۔ تب وہ مطمئن ہو کر سر ہلاتا اندر چلا آیا۔ اس کا رخ اسٹڈی روم کی طرف تھا۔ اس کا ارادہ تھا، وہ خط پڑھ کے اس کا متن بابا کو ای میل کر دے گا۔ وہ خط کتنے اہم تھے، کس قدر قیمتی تھے۔ کوئی اور جانتا یا نہ جانتا، تاہم عدل کبیر ضرور جانتا تھا۔

اسے بہت کم سنی میں ہی اپنے بہت کم رشتوں کا احساس ہو گیا تھا۔ نھیال کے نام پر صرف دو ماموں زاد تھیں۔ اس کے بچپن کی سنگی ساتھی دونوں ہی اس کی ماں کے زیر سایہ پل کے جوان ہوئی تھیں۔ جہاں تک

ددھیال کی بات تھی تو وہ اپنے باپ کے رشتے داروں کے نام کی حد تک واقف تھا۔ بابا اسے کبھی مورکھ لے کر نہیں گئے تھے، کیونکہ مورکھ میں بابا کا کوئی رشتہ بچا ہی نہیں تھا۔ صرف ان کی ایک چاچی کے سوا۔

اس کے دادا مہوال کبیر خان تب انتقال کر گئے تھے جب وہ آٹھ سال کا تھا۔ تب وہ پہلی اور آخری مرتبہ مورکھ گیا تھا اور تب کا کوئی دھندلا عکس بھی اس کے ذہن میں تازہ نہیں تھا۔ تاہم اسے ایک ہلکی سی تقریب کا خیال ضرور آتا تھا۔ جیسے وہ کوئی خواب کا سا منظر تھا۔ کچھ لوگ، کچھ باتیں، کچھ چہل پہل۔۔۔ اور پھر دادا کی اچانک موت۔۔۔

دادا کے بعد اس کے اکلوتے چچا بلال کبیر بھی انتقال کر گئے تھے۔ چچا کو ٹی بی کا مرض لاحق تھا۔ بابا بتاتے تھے، وہ چند سال بھی جی نہیں پائے۔

اور چچا کے بعد ان کی بیوی جبیں۔۔۔ اسے ددھیال میں جبیں کے علاوہ کسی اور کی صورت یاد نہیں تھی۔ بہت حسین عورت تھی۔ اتنی سفید۔۔۔ اتنی سفید جیسے روئی کے گالے، یا جیسے دودھ میں گھلا ہوا روح افزا۔۔۔ یا گلاب کی پتیوں میں مکھن کی ملاوٹ۔۔۔ وہ بہت حسین عورت تھی، قندھاری انار جیسی۔۔۔ کینسر جیسے مرض میں مبتلا تھی، مگر اتنی جوان اور صحت مند نظر آتی۔ وہ پورے ڈیڑھ سال ان کے گھر میں رہی تھی۔ گاؤں میں اس کا علاج نہیں ہو رہا تھا۔ جب اسے بابا اپنے ساتھ لائے تب وہ حیران رہ گیا۔ وہ اتنی حسین عورت اس کے بابا ساتھ کھڑی بہت اچھی لگ رہی تھی، مگر مما کو جانے کیوں اس عورت کی اپنے گھر موجودگی کھلتی تھی۔ حالانکہ وہ بیمار عورت تھی اور قطعاً "بے ضرر" تھی۔ سارا وقت کمرے میں بند رہتی۔ تنہا، اکیلی، خاموش۔۔۔

تاہم بابا اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اسے یاد تھا، بابا جبیں کو آؤٹنگ پہ لے جاتے، گھماتے، پھراتے، باتیں کرتے۔ اس کے چیک اپ، مہنگے ترین علاج، ٹیسٹ، اعلا خوراک کے باوجود جبیں کی خاموشی ختم نہیں ہوتی تھی۔ اس کی وجہ شاید مما کی بدزبانی بھی تھی۔ وہ اسے ہر وقت باتیں سناتیں، طعنے دیتیں، غصہ کرتیں اور وہ چاپ سنتی رہتی تھی۔ اور پھر ایک صبح وہ اسی خاموشی کے ساتھ گہری نیند سو گئی۔ تب بابا بہت غم زدہ تھے۔ بہت رو رہے تھے۔ انہوں نے عدل کو سینے سے لگا کر بڑے درد بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"میں اپنا حق ادا نہیں کر سکا۔ میں چاچی کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ میں جوئی کی ماں کو بچا نہیں سکا۔"

وہ بہت دکھی تھے، بہت افسردہ تھے۔ خود کو جانے کیوں ملامت کر رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے باپ کو عمر بھر ملال میں ہی دیکھا تھا۔

بابا کی چاچی بہت بدزبان، جھگڑالو اور غصیلی عورت تھیں۔ عمر بھر ان سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ پھر بھی بابا نے مورکھ جانا ترک نہیں کیا تھا۔

اسے اب پتا چلا تھا، کچھ سال پہلے کہ بابا اپنی اکلوتی بھتیجی کے لیے مورکھ جاتے تھے۔ اس نے کبھی بھی بابا کے معمول میں فرق نہیں دیکھا تھا۔ وہ مہینے میں دو مرتبہ لدے پھندے سے گاؤں جاتے۔ مما کی ہزار ناگواری کے باوجود ان کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ایک مرتبہ مما نے جل بھن کر کہا تھا۔

"اسے ادھر ہی لے آؤ، پھیرے تو ختم ہوں تمہارے۔" تب بابا کچھ افسردہ سے ہو گئے تھے۔

"کاش کہ چاچی مان جاتیں۔۔۔ میں جوئی کو یہاں بہتر زندگی مہیا کرتا۔ زندگی کی ہر سہولت، ہر آسائش جو اس کے پاس نہیں۔"

وہ بہت رنجیدہ ہو جاتے تھے اور وہ جوئی کے لیے اسی قدر رنجیدہ رہتے تھے۔ ان کے اندر جیسے غموں کا شگاف پڑ گیا تھا۔ دل میں کہیں بہت سی درزیں ——— اور دراڑیں پڑ گئی تھیں اور جب وہ مورکھ سے واپس لوٹتے تب اور بھی شکستہ نظر آتے۔ وہ اپنی چاچی کی عداوت، غصے اور نفرت کے سبب بہت غمگین رہتے تھے۔ جانے ان کی چاچی کا رویہ ایسا کیوں تھا؟

بابا کی ہزار عرضداشت، درخواست اور گزارش کے باوجود ان کی چاچی جوئی کو بابا کے ہمراہ بھیجنے پر تیار نہ ہوتیں۔ ان کی کوئی الگ ہی منطق تھی۔ کبھی بھی

عدل کا بہت دل چاہتا تھا، بابا کو بغیر بتائے مورکھ چلا جائے اور جوئی کو زبردستی اس کی ظالم نانی کے چنگل سے آزاد کر کے ادھر لے آئے۔ یوں کہ بابا جوئی کو دیکھ کر حیران رہ جائیں۔

کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا۔ وہ بابا کے ان گنے چنے رشتے داروں سے ملے، ان کے رشتوں کے درمیان موجود ہر گرہ کا نٹھ کو کھول دے، مگر کچھ چیزیں اس کے اختیار میں نہیں تھیں۔

وہ اس وقت مسلسل جوئی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کا خط، اس کی طرف سے آیا ہوا خط، جوئی کا لکھا ہوا خط اس کے باپ کی ذات کے لیے کتنا "اہم" تھا۔ عدل کبیر جانتا تھا۔ وہ پیشانی مسلتا اسٹڈی روم کے دروازے تک آیا تھا، جب دائیں طرف سے بولتی ہوئی مامن بھی آگئی۔



لفافہ کھولتے ہوئے ان کا فشارِ خون بڑھنے لگا تھا۔ انہیں لگا۔ ان کی زندگی میں ایک اور جبیں، جوئی کی صورت میں جونک سی چمٹنے کو بے تاب ہے۔

وہ لب بھینچے تحریر پڑھنے لگیں۔

"پیارے ڈاکٹر چاچو!

سلام اور دعاؤں کے بعد اک طویل حکایت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، کیسے سناؤں اور کیا کیا بتاؤں۔

جو باتیں عمر بھر آپ سے چھپا کر رکھی تھیں۔ آپ کو دکھ نہ ہو، آپ کرب سے نہ گزریں، آپ کو تکلیف نہ ہو۔ وہ باتیں میرا "حال" چیخ چیخ کر بتا رہا ہے۔ چاچو! وقت مجھے دوراہے پر لے آیا ہے۔ میرے آس پاس خطرے کے علاوہ کچھ نہیں۔ میں ڈر اوڑھ کر سوتی ہوں اور خوف کے عالم میں اٹھتی ہوں۔ میرا وجود بہت سے لوگوں کے لیے بھونڈا، نامبارک، بدشگون اور نحس ہے۔ میں اپنے اس کرچی کرچی وجود کو لے کر کہاں جاؤں؟ میرا آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ میں آپ کے علاوہ کسے پکاروں۔

ڈاکٹر چاچو! نانی کی سانسیں اٹک رہی ہیں۔ یہ خط نانی نے لکھوایا ہے۔ وہ جیسے آپ کے انتظار میں ہیں۔ نانی نے ضد توڑ ڈالی۔ انہوں نے آپ کو معاف کیا اور یہ خط لکھنے کو کہا۔ وہ آپ کو بلا رہی ہیں۔ میری زندگی یہاں بہت تنگی اور بدحالی کا شکار ہے۔ نانی چاہتی ہیں۔ آپ مجھے یعنی اپنی "امانت" کو ہمیشہ کے لیے لے جائیں۔ اور۔۔۔"

انہوں نے مزید خط پڑھے بغیر ہاتھ میں مروڑ دیا تھا۔ ان کے چہرے پہ نفرت اور سوچ کی گہری پرچھائیاں ابھر آئی تھیں۔

"امانت" وہ زہرخندی بڑبڑائیں۔ انہیں جانے کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔ جبیں کی بیماری کے دوران ہلال کبیر کا گھن چکر بنے رہنا۔ بے حال، پریشان، رنجیدہ نظر آنا۔ چھپ چھپ کر آنسو بہانا پھر جبیں کی موت پہ مہینوں خود سے بیگانہ رہنا۔ گھر، بچے اور اسپتال کو بھول جانا۔

غفیو کو کیا کچھ نہیں یاد آیا تھا اور اسی حساب سے ان کے اندر تنفر بڑھتا رہا تھا۔ کسی کی لاچاری، تنگی، بے حالی، بے بسی انہیں کیسے نظر آتی؟ ان کے اپنے ہی کتنا بچے بہت تھے۔ نفرت، غصے اور نظرانداز کیے جانے والے گھاؤ انہیں بھولے نہیں تھے۔

انہوں نے لب بھینچتے ہوئے دائیں بائیں نظر دوڑائی تھی۔ جلد ہی انہیں مطلوبہ چیز نظر آگئی۔ وہ ایک سنہرا لائٹر تھا۔

ڈاکٹر ہلال کبیر کبھی کبھار اسے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے لائٹر اٹھا کر خط کو ایش ٹرے میں رکھا اور پھر کاغذ کے ننھے سے ٹکڑے کو شعلہ دکھا دیا۔ وہ ہر کہانی اور ہر داستان کو مٹا چکی تھیں۔ نئی کہانیاں رقم ہونے سے پہلے ہی بجھ گئیں، راکھ بن گئیں۔ خاک ہو گئیں۔ وہ کیوں نہ مطمئن ہوتیں۔ معاً دروازہ کھلا اور کوئی تیزی سے اندر آگیا۔ وہ یہ کام رات ہی کرنا چاہتی تھیں، مگر ضروری کالز آنے پر کر نہیں سکی تھیں۔ صبح اٹھ کر پہلا کام یہی کیا تھا۔ اب عدل کو سامنے پا کر حواس باختہ ہو گئی تھیں۔ مگر اپنی ناگواری، غصہ یا تنفر جتلا کر عدل کو "چونکانا" نہیں چاہتی تھیں۔

"مجھے کیا خبر بیٹا! یہیں کہیں ہوگا۔ سلیم نے کہیں رکھ دیا ہوگا۔ تمہارے بابا خود آکر دیکھ لیں گے، پتا تو ہے، اپنی چیزوں میں گھسنے نہیں دیتے۔" عدل نے خط کے بارے میں پوچھنے پر بہت میٹھے اور نرم لہجے میں بولیں۔ تب وہ سر ہلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس کی ایش ٹرے پہ نظر پڑی تھی۔

"یہ کیا ہے؟ عجیب سی بو؟ کسی چیز کے جلنے کی؟" اس کی حسیات بہت تیز تھیں۔ وہ فوراً" چونک گیا تھا۔ پھر ناک سکیڑ کر سونگھنے لگا، جیسے "بو" کی کیفیت کا اندازہ کر رہا تھا۔ کس چیز کی بو تھی؟ سگریٹ کی؟ کسی اسپرے کی؟ یا پھر؟ اس نے ہلکی سی چٹکی بھر راکھ کو دیکھا۔ پھر ماں کو دیکھا۔ وہ لاپروائی سے سلیم کو کوستی ہوئی ایش ٹرے اٹھا کر ڈسٹ بن میں الٹ آئی تھیں۔

"جب سے تمہارے بابا گئے ہیں۔ اس سلیم کو کھلی چھوٹ مل گئی۔ اتنے دن سے صفائی ہی نہیں کی۔" وہ زیرِ لب بڑبڑاتی ایش ٹرے صاف کر کے عدل تک آئی تھیں۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئیں۔

"یہ موی کہاں رہ گئی؟ چلو ہم موی کو آواز دو۔ میں ناشتا بناتی ہوں۔ یامن اور عمیر کو بھی بلا لانا۔" وہ اپنے تئیں بہت نارمل نظر آرہی تھیں تاہم اندر کہیں گھبراہٹ ضرور تھی۔ کیونکہ عدل کا انداز کچھ بدلا ہوا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے خود ہی ماں کو مخاطب کر لیا۔

"مما! بابا اس کے لیے بہت متفکر تھے۔ یہاں ہوتے تو ایک چکر مورکھ کا لگا آتے۔ کیا میں مورکھ جا کر اس کا پتا کر آؤں؟"

عدل نے پُرسوچ، سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ جیسے ان سے اجازت چاہ رہا تھا اور غفیو کے قدموں تلے سے زمین ہل گئی تھی۔



دھند کے پار ملگجا سا اجالا بکھر رہا تھا۔ دور دھند میں لپٹے پہاڑوں کی اونچی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ چوبارے سے آلو بخارے کا باغ بھی دکھائی دیتا تھا۔ ٹنڈ منڈ سے برہنہ درخت، بے پھل کی ٹہنیاں۔ بے پتوں کی اداس شاخیں۔ باغ کے اس طرف ندی کا پل تھا اور پل کے اوپر ٹریفک رواں دواں تھا۔ سارا وقت گاڑیاں آتی جاتیں۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے ٹینکر آتے۔ کوئی مکھن لینے، کوئی دودھ لینے، کوئی گھی اور پنیر لینے اور کوئی تیار شدہ کھویا اٹھانے۔ یہاں کا موسم بھی بڑا ضدی، نخریلا اور ہٹیلا تھا۔ نو، دس ماہ گیلا بھیگا، دھند میں لپٹا سرد ہی رہتا۔ گرمی بس مہینہ، دو مہینہ کے لیے آتی، پھر پلک جھپکتے میں پھسل جاتی۔

قصبے کے لوگ اسے برف کا شہر کہتے۔ شاداب، سرسبز، خوب صورت، مگر اداسی میں لپٹا۔ ضروریاتِ زندگی کی ہر سہولت یہاں میسر تھی۔ بازار میں رنگ رنگ کی دکانیں، کپڑا، جوتی، میک اپ سب کچھ با آسانی مل جاتا۔ گاؤں والوں نے اپنی سہولت کے لیے شہر اٹھا کر گلی گلی میں سجا لیا تھا۔

بخت گل کی "خصلت" میں چلبلا پن اور ظرافت تھی۔ کچھ گھر سے بھی آزادی ملی ہوئی تھی۔ وہ صبح کام پہ آنے سے پہلے ایک چکر بازار کا ضرور لگاتی۔ ہر روز اس کے پلو سے کچھ نہ کچھ بندھا ملتا۔ کبھی انگوٹھی، کبھی چھلا، کبھی بالی، جھمکا، پائل، چین، نقلی سامان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ تب لمحہ بھر کے لیے جوئی اپنا کام ترک کر کے بخت گل کی خریداری دیکھنے لگتی۔ وہ حیران ہو کر اس کی چیزوں کو چھوتی، ہاتھ لگاتی، محسوس کرتی، دیکھتی، سوچتی اور چپ سی رہ جاتی، تب بخت گل۔ اس کے گال پہ زور سے چٹکی بھرتی، اس کا ہاتھ دباتی، بالوں کی چٹیا کھینچتی اور اس کے کان پہ جھک جاتی۔

"تم ایسی چیزیں چاہئیں تمہیں؟" وہ اس کی آنکھیں کھوجتی، چہرہ پڑھتی، رنگ اور حسرت تلاش کرتی۔ وہاں سادگی کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ بس اک ہلکا سا شوق کسی چیز کو پانے کی چاہ حاصل کرنے کی لگن، چھیننے کی نہیں، جھپٹنے کی نہیں۔

"نن۔۔۔ نہیں۔" جوئی ہکلا جاتی۔ گھبرا جاتی۔

"کیوں نہیں؟" وہ اصرار کرتی۔

"میری پہنچ نہیں۔" جوئی ٹال دیتی۔ مگر بخت گل اسے ٹالنے نہ دیتی۔

"یہ کس نے کہا۔" وہ معنی خیزی سے قہقہہ لگاتی۔ گدگداتی، ہنستی مسکراتی، اس کے کان میں گھس جاتی۔

"لاکھوں میں ایک صورت ہے تمہاری۔ کبھی آئینہ دیکھا ہے؟ ایک دن خان کی دکان پہ چلنا۔ بڑا دل پھینک ہے۔ صورت دیکھ کر ریجھ جائے گا۔ پھر تو سمجھو موجیں ہی موجیں، جو مرضی اٹھا لانا۔ چوڑی، بالی، جھمکا، گجرا... غازہ، مہندی، ابٹن، پاوڈر، سرخی... لالی... زبان تک نہ ہلائے گا۔ صرف مسکرا مسکرا کر دو چار باتیں ہی تو کرتا ہے۔ ہاتھ پکڑنے کی بھی جرات نہیں اس میں۔"

بخت گل اسے لالچ دیتی، ابھارتی۔

"اتنی سفید، سرخ، دودھ اور چاندی میں دھلی ہوئی نظر نہیں ٹھہرتی۔ بانکی سجیلی۔ میرا جی چاہتا ہے تمہیں دیکھتی رہوں... بھلا مرد ذات کا کیا حال ہوتا ہوگا؟"

بخت گل اسے خود آگاہی کے سبق پڑھاتی۔

"گوشی کے ہاتھ سے تم بچ کیسے گئیں؟ ہائے... کتنی بھولی معصوم ہو۔ خود کو میٹھے لڈووں میں ڈبو لیا۔ شیرے میں گم کر لیا... ارے... تمہارا یہ ہنر یہ مہارت کس کام کی؟ فائدے میں سارا جہان ہے اور تم خسارے میں۔ ڈھور ڈنگروں کی طرح کام کرتی ہو... بنا اجرت کے۔ خاک دھول کر دیں گے یہ لوگ تمہیں... دیکھو، مجھ سے سبق حاصل کرو... میں تو تم سے کام سیکھنے کی مدت تک یہاں ہوں۔ کام سیکھنے کی بھی اجرت لیتی ہوں۔ جب مہارت آگئی تو کسی بڑے شہر چلی جاؤں گی۔ اپنی دکان بناؤں گی۔ تمہارے ہاتھ کا ذائقہ چرانا ہے بس۔ پھر تم دیکھنا، میرے وارے نیارے... "بخت گل اپنے خواب بتاتی، اپنی خواہش جتاتی اس کی خواہشوں کی کھوج لگاتی اور اس کا جواب بخت گل کو حیران کر دیتا۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ ایسے "طریقوں" سے تو کچھ بھی نہیں... میں اسی حال میں ٹھیک ہوں۔"

جوئی کا جواب اسے بے چین کر دیتا۔ ایسی قناعت پسندی حیران کر دیتی۔

کیسی لڑکی تھی یہ؟ میلے چیکٹ کپڑوں میں بھی ہیرا تھی، چکنائی، شیرے کے دھبوں میں نہاتی۔ الجھے بکھرے بالوں والی۔ ٹوٹی چپلی میں بھی مطمئن۔ رات رات بھر سل پہ دال پیستی۔ سو کلو دودھ میں کڑچھے چلاتی۔ کھویا بناتی۔ پھر بھی "ف" نہ کرتی۔ سب کی گالی، مار، جھاڑ سہتی۔ مڑ کر جواب نہ دیتی۔ ایسا صبر جس کی مثال نہ ملتی۔

اپنی ماں جیسی تھی، صورت، شکل، مزاج، عادت، خو میں گم صم، چپ چاپ، سنجیدہ... تھوڑی جوگی تھوڑی روگی۔

"ارے... اے... اے جوئی!" بخت گل بے چین ہو کر اس کا کندھا ہلاتی۔ اسے متوجہ کرتی۔ پھر سوال کرتی۔

"وہ تیرا خوب صورت چاچا... خوشبوؤں میں بسا... سوٹڈ بوٹڈ اور باس کا لڑکا؟ وہ تجھے اس حال میں قبول کرے گا؟ وہ شہری، انگریز بابو، پڑھا لکھا، زمانہ ساز... تو معصوم، سادہ، بھولی، دیہاتن..." بخت گل کے اکثر سوال اسے ڈس لیا کرتے، عجیب ساڈنک مارتے، زخم زخم کر دیتے۔ آنکھوں میں آنسو گھسیٹ لاتے۔

"اسی کے لیے خود کو بچا بچا کے سینت سینت کے رکھتی ہو نا۔" بخت گل بڑی گھاگ لڑکی تھی۔ عمر میں اس سے چند سال بڑی۔ باتوں میں بہت بڑی اور چالاکیوں میں تو بہت ہی بڑی۔ وہ گم صم ہو جاتی، خلاؤں میں دیکھنے لگتی۔ جواب تلاش کرتی، سوچتی، الجھتی، پھر دھیمے دھیمے بولنے لگتی۔

"مجھے نہیں پتا، لفظوں کی بازی گری مجھے نہیں آتی، مجھے تو بس اتنی خبر ہے۔ امانت میں خیانت نہیں کرتے۔ نانی نے مجھے یہی سمجھایا۔ میری ماں بہت اچھی عورت تھی، مگر خائن بھی تھی۔ میرے باپ کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اس سے محبت نہ کر سکی۔ بس ایک چپ کی بکل میں سارے جذبوں کو سمیٹ کر بیٹھ

گئی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا... میں جس کی ہوں، اسی کی رہوں گی۔ عمر بھر کے لیے، چاہے کچھ بھی ہو جائے... میں نہ جذبے بدلوں گی نہ محبت۔"

بخت گل گویا دنگ رہ جاتی، کچھ لمحے بول ہی نہ پاتی۔

سیاہ پڑتی رسوئی کی چھت کو دیکھتی وہ جانے سوچ کی کن کن بھول بھلیوں میں گم تھی جب لکڑی کے زینے پہ کسی کے پیر دھرنے کی آواز آئی تھی۔ جیسے زینے سے لگی زنجیر بجنے لگی۔ کھیس میں لپٹی اس سویرے کون گرم لحاف سے نکل کر اوپر آ رہا تھا؟ گوشی خان یا پھر ماسی؟ اس نے گردن موڑ کر دیکھا تھا۔ سامنے بخت گل کھڑی تھی۔ بظاہر اس کی مدد کے لیے آئی تھی، مگر گوشی سے اجرت بھی لیتی اور کام بھی سیکھتی۔ اس وقت بھی کام کے لیے آئی تھی۔ گرم اونی شال اوڑھے نئی نکور چمکتی شال، جیسے ابھی خریدی گئی ہو، نرم فروالی۔ ہری گھاس جیسا سوٹ پہنے، ویلوٹ کا، نرم ملائم، اور سب سے خوب صورت پیروں کی چپی۔ اصلی لیدر کی، جانے کتنی مہنگی تھی؟ بخت گل اس کی آنکھوں میں اتری ستائش کھوج گئی۔ تب ہی تو بلاوجہ اترانے لگی تھی۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں!" خان نے تو بہت تعریف کی۔ یہ سب وہی لایا تھا باڑے سے۔ ایک دم امپورٹڈ..." وہ چہک رہی تھی۔ سجنے سنورنے کی شوقین تھی۔ اس وقت تک بھی کمال کی رہی تھی۔ تر و تازہ سی، مہکتی ہوئی۔ خوشبو میں بسی... پھر بھی... پھر بھی... جوئی کو عجیب سی گھن آنے لگی، عجیب سی کراہیت کھانے لگی۔ اسے وہ بدبو میں لپٹی نظر آئی۔ گندی اور غلیظ سی مسکراہٹوں اور جذبوں کی ساہوکارن... جوئی کا جی اوب گیا۔ اس نے رخ موڑ لیا۔

"میری بات مان لے جوئی! ڈھنگ کے کپڑے مل جائیں گے۔ یہ پانچ سالہ پرانا سوٹ اتار پھینکنا اور یہ ٹوٹی چمڑے کی چپی... اسے کوڑے میں الٹ آنا۔ زندگی کا مزہ یہی ہے۔ مفت میں بے شمار سہولتیں... مزے ہی مزے۔"

بخت گل اپنی فہم کے مطابق پُرجوش ہو رہی تھی۔ وہ سیدھی سادی لڑکی تھی اور سیدھی سادی راہوں کو پسند کرتی تھی۔ اس کی نانی بہت جھگڑالو عورت تھی، بہت بدزبان، غصیلی، تنک چڑھی... پھر بھی جوئی کی ایسی تربیت کر گئی کہ کسی بھی مقام پر اس کے قدم ڈگمگا نہیں سکتے تھے۔ نانی کو اس کی ماں کا بہت دکھ تھا۔ وہ اسے یاد کر کے بہت روتی۔ اس کی جوانی پہ تڑپتی... مگر نانی کو ماں سے شکوے بھی بہت تھے۔ کبھی کبھار نانی کے منہ سے کوئی انہونی بات پھسل جاتی۔

"جبیں نے دل کو روگ لگا لیا تھا۔ یہی روگ اس کی جان لے گیا۔ تو دل کو روگ نہ لگانا۔" وہ ہر لمحے اس کی استانی بنی رہتی... اسے زندگی کے اتار چڑھاؤ کی رمزیں سمجھاتی۔ جوئی اس کی باتیں بہت غور سے سنا کرتی تھی۔ پھر ان کو پلو سے باندھ لیتی۔

"نکاحی عورت کسی اور کو سوچے بھی تو گناہ... ارے پچھلے نشان مٹانے پڑتے ہیں۔ یاد رکھ، نکاح سے بڑھ کر کوئی بندھن نہیں۔ اس سے پہلے کے سب بندھن کچے، منگ ٹھکرائی جا سکتی ہے منکوحہ نہیں... بس ہم سے کچھ نادانیاں ہو گئیں... اس تقصیر کی "پکڑ" میں ہیں۔"

نانی منہ پہ اونی ٹیار رکھ کے رونے لگتیں۔ جانے ان کو کیا کچھ یاد آ جاتا تھا۔ تب ان کی ذہنی رو بھٹک جاتی اور وہ جوئی کے دیوتا کو کوسنے لگتیں۔

"مجھے نہیں اس پر اعتبار... مومن ایک سوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاتا۔ میں کیسے اعتبار کروں؟" بیچ منجدھار میں چھوڑ گیا تھا۔ ڈگریاں میڈل تمغے، ہاتھ کیا آئے، سب بھول گیا... کیسے یقین کر لوں کہ وہ پھر سے دھوکا نہ دے گا۔"

نانی اونچی آواز میں خود کلامی کرتیں، غصہ کرتیں اور ڈاکٹر چاچو کو گالیاں دیتیں۔ پچھلے چودہ سال سے وہ نانی کو اپنے مخلص ہونے کا یقین دلا رہے تھے مگر نانی کو یقین ہی نہ آتا۔ جب بھی نانی ان کے نہ آنے کا طعنہ دیتیں۔ جوئی ننھا سا خط لکھتی اور خط ملتے ہی ڈاکٹر چاچو سارے ضروری کام چھوڑ کر بھاگے چلے آتے۔ پچھلے

چودہ سال سے کوئی وقت کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرا تھا جب وہ جوئی کے کہنے پہ ادھر نہ آئے ہوں۔

وہ کبھی بھی اپنی ذمہ داریوں سے نہیں بھاگے تھے۔ جب بھی آتے اس کے لیے رنگ رنگ کے کپڑے لاتے، جوتے، کھلونے، رنگ برنگے کھانے، چاکلیٹس کے ڈبے، ٹافیوں کے پیکٹ، کتابیں، بیگ، کلرز، سائیکل، جھولا اور بے شمار پھلوں کے ٹوکروں سے لدے آتے۔ یہ اور بات تھی کہ ان کی واپسی کی مدت تک یہ سب سامان جوئی کے پاس رہتا۔ ان کی گاڑی پل کی حدود سے نکلتی اور مامی کسی جن کی طرح ہر شے کو جھپٹ لیتی۔

جوئی کو یاد تھا، پچھلے چودہ سال سے ڈاکٹر چاچو کا لایا ہوا ایک جوڑا بھی اسے پہننا نصیب نہیں ہوا تھا۔۔۔ ہاں اس کے نصیب تب جاگتے جب مامی کی چھوٹی دونوں بیٹیاں اس کی چیزیں پہن پہن کر بے کار کر دیتیں۔ تب وہ کپڑے اور جوتے اس کے حصے میں آتے۔ اسے یاد تھا۔ چاچو اس کی بدحالی پہ کتنا حیران ہوتے تھے۔ اسے نہانے اور کپڑے بدلنے کا کہتے، اسے صفائی کے بارے میں سمجھاتے۔ تب مامی دکھاوے کے طور پہ اسے کھینچ کھانچ کے غسل خانے میں لے جاتی۔ رگڑ رگڑ کے جھانواں استعمال کرتے ہوئے وہ مسلسل اسے دھمکاتی رہتی تھی۔

"چاچا کو کچھ بھی بتایا تو اسی دودھ والے کڑاہے میں پھینک دوں گی۔ اپنی زبان بند رکھنا۔" مامی اس کی آنکھوں میں صابن گھسا دیتی۔ اسے چٹکیاں بھرتی، بازو دبوچتی۔ ناخن چبھوتی اور زبان بندی کا حکم دیتی۔ جوئی فرمانبرداری سے درد کی ٹیسیں دباتی، سسکاریاں بھرتی اثبات میں سر ہلائے جاتی تھی۔ پھر بھی چاچو کی جہاندیدہ نظریں بہت کچھ کھوج لیتی تھیں۔ وہ اس کی سوجی آنکھوں اور کمزور وجود کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے تھے۔

وہ ہر دفعہ نانی سے طویل بحث کرتے، کبھی کبھار جھگڑ بھی پڑتے۔ ناراض بھی ہو جاتے۔ پھر بھی جوئی کو اپنے ساتھ لے جانے پر نانی کو منا نہیں سکتے تھے۔ نانی کی ضد اٹل تھی۔ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ چاچو سے سیدھے منہ کلام نہ کریں گی اور ڈاکٹر چاچو کے حوالے جوئی کو کبھی نہ کریں گی۔

جوئی نے ڈاکٹر چاچو کو نانی سے بحث کے دوران کئی مرتبہ روتے دیکھا تھا۔ وہ نانی کے پیر پکڑ کر معافی مانگتے۔ اپنے ناکردہ گناہ پہ تڑپتے، روتے پھر بھی نانی کا دل ذرا نہ پسیجتا تھا۔ وہ چاچو سے عمر بھر کے لیے متنفر تھیں اور جوئی کے حوالے سے ان پہ اعتبار نہیں کرتی تھیں۔

"میں اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کر سکتی۔" نانی کا ایک ہی جواب تھا۔ چاچو کی ہر دلیل بیکار جاتی۔ وہ ان کی توجہ اس کی بدحالی کی طرف دلاتے۔ جوئی کے پاس نہ اچھا ماحول تھا نہ خوراک تھی، نہ اس کی صحت تھی، نہ اس کے پاس تعلیم تھی۔ نہ اس کے پاس اچھا لباس تھا۔ وہ نہ بھی بتاتی تب بھی ڈاکٹر چاچو فہم رکھتے تھے۔ وہ جوئی کے کمزور، سہمے سہمے خوف زدہ سے وجود کو دیکھ کر گھر والوں کے رویوں کی گہرائی سمجھتے تھے۔ مگر وہ اپنی بھتیجی پہ جیسے کوئی حق نہیں رکھتے تھے۔

جوئی کی نانی ضدی، تندخو، سخت غصے والی خاتون تھیں۔ گزری باتوں کو کبھی نہ بھلانے والی۔ عمر بھر کے لیے جیسے انہوں نے ہلال کبیر کو معتوب ٹھہرا دیا تھا۔

وہ ہمیشہ نانی سے بحث میں ہار کر واپس لوٹتے تھے، تھکے ماندہ، ٹوٹے بکھرے، بے حال سے نڈھال سے۔ تب جوئی کا دل چاہتا۔ وہ بھاگ کر چاچو کی ٹانگوں سے لپٹ جائے۔ انہیں روک لے یا خود ہی زنجیر توڑ کر ان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے چلی جائے۔ اس دکھ بھری، پُراذیت زندگی سے چھٹکارا پالے۔

اسے کمزور سی ایک بہت پرانی سہ پہر یاد تھی، جب اچانک چاچو بنا اطلاع کے آگئے تھے۔ حالانکہ اکثر وہ پڑوس میں فون بھی کرلیا کرتے تھے۔ مگر تب وہ اچانک آگئے مہینے میں تیسری دفعہ اور کبھی کبھی وہ مہینے میں چار مرتبہ بھی چکر لگا لیتے تھے پھر بھی نانی طعنے دینے سے باز نہیں آتی تھیں۔ ان کا دل دکھانے سے خود کو روک نہیں پاتی تھیں۔ اس سہ پہر اسکول سے آکر جوئی کو مامی کے ساتھ بہت کام کرنا پڑا تھا۔ تب وہ بخار میں پھنک

رہی تھی۔ اسے بیٹھے بیٹھے بھی چکر آتے، آنکھیں نیند سے بوجھل بند ہونے لگتیں۔ وہ کبھی دائیں لڑھکتی کبھی بائیں۔ تب مامی کا زوردار تھپڑ اسے ہوش میں لے آتا تھا۔ وہ میدہ گوندھتی روئے چلی جاتی۔

مامی بڑی دو رنگی عورت تھی، مکار، منافق اور چالاک۔ چاچو کی کار کو پھاٹک پہ دیکھ کر اسے گھسیٹتی زینہ اتارنے لگی۔ تب زنجیر نے بج بج کے اعلان کرنا شروع کر دیا تھا۔ مامی چاہتی تھی اسے جلد از جلد غسل خانے میں دھکیل دے۔ اس کے میلے چیکٹ کپڑے بدل دے اور اس کا سرخ زکام زدہ منہ دھلوا دے۔ مگر مامی کی ساری کوششیں بے کار گئی تھیں۔ تب چاچو نے اسے قابل رحم حالت میں لیا۔ ان کا دل جیسے پھٹ گیا۔

ان کی آنکھیں جیسے پھٹ گئیں۔ وہ بھاگتے ہوئے جوئی تک آئے تھے تب ان کے ہاتھ سے بھاری شاپرز گرتے چلے گئے۔ پورا صحن سرخ لوکاٹ سے بھر گیا، بڑے بڑے تھیلوں کے منہ کھل گئے۔ جوس کے ڈبے دودھ کے ڈبے مٹھائی، کیک، امرتی جلیبی، نان خطائی کئی طرح کے مربے..... جیسے ہر طرف بوتلیں ہی بوتلیں بکھر گئیں۔ وہ اس کی کمزوری دور کرنے لیے اعلا سے اعلا خوراک لاتے۔ مگر وہ جانتے نہیں تھے۔ ان میں سے کچھ بھی اس کے نصیب کا نہیں ہوتا تھا۔

چاچو نے تب اس کے گندے سندے ہاتھوں کو چوما، اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا۔ اس کے گال سے آنسو پونچھے۔ تب وہ چاچو کو محبت پاش نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔ اس نے سوچا، یہ وقت یہیں تھم جائے۔ چاچو نے اسے دوا لا کر دی۔ اس کا منہ دھلوایا۔ اپنے ہاتھ سے انڈا کھلایا۔ دوا کھلائی اور پھر نانی سے طویل "جنگ" کی۔ پہلی مرتبہ چاچو نے اپنی آواز کو بلند کیا تھا۔ پوری رات جھگڑا ہوتا رہا۔

وہ لحاف میں دبکی سنتی رہی۔ بالآخر فجر کے قریب بحث تمام ہوئی۔ نانی جیت گئیں، چاچو ہار گئے۔ نانی کی وہ آخری شرط۔ جوئی کو آج بھی وہ الفاظ یاد تھے۔ وہ الفاظ بھلا کیا تھے؟

"اپنے وعدے کے مطابق دستور کے مطابق لے کر جاؤ۔۔۔ ایسے نہیں بھیجوں گی۔" نانی کی آخری شرط پہ چاچو ہار گئے تھے۔ تب ہی تھکے ماندے لہجے میں افسردگی سے بولے۔

"ٹھیک ہے۔ تب تک کے لیے انتظار کریں۔۔۔ میں بھی کرتا ہوں۔ ابھی یہ بہت کم سن ہے۔ کچھ سال پل صراط سے گزرنا ہی پڑے گا۔ پھر وہ وقت دور نہیں، جب میری بیٹی میرے باغ میں چہکتی نظر آئے گی۔ ایسی غم زدہ بھی اور نڈھال نہیں ہوگی۔"

وہ آنکھوں میں کرچیاں لیے پلٹ گئے تھے۔ تب ان کے الفاظ جوئی کے دل پر نقش ہو گئے۔ اسے ایک آس کے جگنو نے جیسے باندھ لیا۔ ایک خواب، ایک امنگ، ایک امید۔ وہ دن، ہفتے، مہینے اور سال گننے لگی۔ جانے وہ وقت کب آنے والا تھا جب نانی بخوشی اسے چاچو کے ہمراہ بھیج دیتیں۔

اس کی اقنوم (بنیاد) ڈاکٹر چاچو کے وجود سے تھی۔ بس یہی بات نانی سمجھ نہ پاتیں اور جب انہیں سب سمجھ میں آیا تب وقت ہاتھوں سے پھسل چکا تھا۔

جب مامی نے اس کی دسویں جماعت کی کتابیں اور بستہ جلا دیا۔ جب زندگی اس کے لیے کڑاہے کے نیچے جلتی آگ اور دھواں بن گئی۔

جب وقت نے اسے بے اماں کر دیا تھا۔ جب حالات کی زوردار آندھی اس کے سر پر رکھی عزت کی اوڑھنی کو اڑانے لگی۔ جب آتی جاتی ہوائیں تک مخالف، بیری، بدخواہ اور رقیب بن گئیں۔

انسان کے خیال اور ادراک کے درمیان ایک مسافت ہے جسے اس کی آہ پُرشوق کے سوا کوئی طے نہیں کر سکتا اور وہ دھیرے دھیرے خیال سے ادراک تک کا سفر طے کر رہی تھی۔ اندر سے چاہے وہ روز ٹوٹتی، روز بکھرتی۔ مگر بظاہر روز مرہ زندگی کے ہر کام کو گھسیٹ رہی تھی۔ اتنے سالوں میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر چاچو بغیر بتائے اتنی مدت کے لیے غائب ہوئے تھے۔ نجانے وہ کہاں تھے؟ ٹھیک بھی تھے یا نہیں؟ اس کا نازک دل خدشوں کا مارا، ہر وقت کانپتا رہتا۔

وہ غائب دماغی سے گھی کا کنستر کڑاہے میں الٹنے لگی تھی۔ تب بخت گل گہرا سانس کھینچ کر جوئی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس کی تمام تقریر بے کار گئی تھی۔

پوری رات جاگ کر جوئی بوندی کے لڈو تیار کرنے کی ابتدائی تمام تیاریاں مکمل کر چکی تھی۔ چھولے چنے کی دال کو پیس لیا تھا۔ ململ کے باریک کپڑے میں چھان بھی لیا تھا۔ پسی ہوئی دال میں دیسی گھی ڈال کر حل بھی کر لیا تھا۔ اب وہ دہی کا ڈرم' دودھ اور بیکنگ پاوڈر بھی الٹ رہی تھی۔ پھر پورے وجود کی طاقت صرف کر کے اسے پھینٹتی رہی۔ بہت بڑا تانبے کا ٹب تھا۔ جس میں آمیزہ خمیر کی طرح پھولا نظر آنے لگا تھا۔

بخت گل نے اتنی مہربانی کی کہ چاشنی تیار کر دی۔ سرخ کھانڈ کی چاشنی دیکھنے میں بھی بہت بھلی لگتی تھی اور اس تمام آمیزے میں گوشی کی ہزار کوششوں کے باوجود جوئی نے ذرا بھی ملاوٹ نہیں کی تھی کھانڈ کی جگہ گڑ ڈالا' نہ دیسی گھی کی جگہ ڈالڈا استعمال کیا اور نہ دال میں ناقص بیسن کی ملاوٹ کی تھی۔

جوئی موٹے چھید والی لوہے کی چھلنی گرم گھی والے کڑاہے پہ رکھ رہی تھی پھر بخت گل تیزی سے چھلنی میں آمیزہ گرا کر بوندیاں بنانے لگی۔ چھلنی سے بوندیاں گھی میں گرتی جا رہی تھیں۔ جوئی پھرتی سے بوندیاں نکال کر شیرے میں ڈالتی جا رہی تھی۔ اگلے تین گھنٹے میں سرخ سرخ بوندیاں تیار ہو کر شیرے میں غرق ہو گئیں۔

اب ٹھنڈا ہونے پر الائچی کے دانے ملا کر وہ لڈو بنا رہی تھی۔ بہت پھرتی اور مہارت سے۔ بڑے ماہر ہاتھ تھے۔ ایک ہی سائز کے گول گول لڈو بناتے' ذائقے دار' خوشبو دار' لذیذ' خستہ صفائی' ستھرائی کے خصوصی خیال کے ساتھ بخت گل کھلی آنکھوں کے ساتھ دیکھتی رہ گئی۔ وہ کسی ماہر حلوائی کی طرح ہتھیلی پہ بوندیوں کے آمیزے کو رکھتی' آٹے کے پیڑے کی طرح گھماتی' چاندی کا ورق چپکاتی اور لڈو تیار۔ بہت میٹھا' ملائم' دانے دار' ذائقے دار...... بخت گل کے منہ میں شیرا گھل گیا۔ مٹھاس بھر گئی۔

"کاش! میں تمہاری طرح لڈو بنانا سیکھ جاتی۔" بخت گل حسرت زدہ لہجے میں بولی تھی۔ جوئی نے آنکھ اٹھا کر بخت گل کے نکوں والے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"اپنی نیت خالص کر لو' مہارت حاصل کر لوگی۔" وہ لڈو بناتی جا رہی تھی۔ نیچے زمین پر پلاسٹک کی شیٹ بچھی تھی۔ جس پر لڈو ہی لڈو ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔

"پر تمہیں بھلا اس ہنر کی کیا ضرورت؟ اگر تو قسمت نے ساتھ دیا تب تم اپنے چاچا کے پاس چلی جاؤ گی۔ وہاں ایسی مشقت نہیں ہوگی۔ تمہارا چاچا تو بہت امیر ہے۔ مہارانی بن کر رہو گی۔ گاڑی میں سفر' کوٹھی میں قیام۔ اعلا ملبوسات تم تو سر تا پا بدل جاؤ گی۔ مگر مجھے نہیں لگتا' تمہاری ماں سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے نکلنے دے گی۔ لکھوا لو' تمہارا زبردستی نکاح پڑھوا دے گی گوشی خان' عرف بے ایمان سے۔"

لمحہ بھر کے لیے جوئی بھونچکی رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں صدمے کی شدت سے پھٹ پڑیں۔

بخت گل کو اپنے لفظوں کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کی زرد رنگت کو دیکھ کر فورا" بات بدلنے لگی' اس کی توجہ بٹانے لگی۔ گفتگو کو دوسری سمت لے جانے لگی۔

"گوشی خان مال کو منڈی لے جائے گا؟" یہاں مٹھائی کی منڈی بھی لگا کرتی تھی۔ تھوک فروشی کا بازار تھا' تجارت گاہ' بڑا بازار..... جب گوشی کو آرڈر نہیں ملتے تھے تب وہ مال کو منڈی میں لگا آتا تھا۔ مگر اب صورت حال مختلف تھی۔ اسے آرڈر پہ آرڈر ملتے۔ کام عمدہ ہوتا اور معیاری بھی۔ سو گوشی خان کے وارے نیارے تھے۔

"نہیں..... آرڈر پہ تیار کیا ہے' تم شاید بھول گئیں' بتایا تو تھا۔" وہ ٹب کے کناروں سے چپٹا آمیزہ اٹھا کر لڈو بنا رہی تھی۔ کام تمام ہو چکا تھا۔ اس نے چند بچے سے لگے آمیزے سے لڈو بنائے اور بخت گل کو تھما دیے۔

"اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے لے جانا۔"

وہ آہستگی سے کہتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔ پھر اس نے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ دھوئے قمیص کے دامن سے ہاتھ پونچھے۔ اپنی تھکی تھکی سرخ آنکھوں کو ہاتھوں سے دبایا۔ اس کا انگ انگ تھکن سے ٹوٹ رہا تھا۔ بخت گل کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔ وہ کتنی ــــ اجاڑ، ویران لگ رہی تھی۔ جیسے وقت نے اس پر شادابی چھوڑی ہی نہیں تھی۔

بخت گل نے لڈو سے بھرا شاپر دائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور ایک شکر گزار نگاہ جوئی کے چہرے پہ ڈالی تھی۔ اب وہ گھر جانے کے لیے تیار تھی۔ معاً "لکڑی کے زینے پر بھاری قدم پڑنے لگے تھے۔ زنجیر چھن چھن، ٹھک ٹھک بجنے لگی تھی۔ اوپر کون آرہا تھا؟ جوئی کی آنکھوں میں سراسیمگی اتر آئی۔ اس نے بخت گل سے کہنا چاہا۔ "شاپر اپنی شال کی بغل میں کرلو۔" مگر کہہ نہ سکی۔ کچھ اسے اشارہ کرنے کا بھی موقع نہیں مل سکا تھا اور گوشی خان اسی اثنا میں رسوئی تک آ گیا۔

پہلی نگاہ اس کی پلاسٹک کی شیٹ تک گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حرص چمک اٹھی۔ مال تیار تھا۔ اور عمدہ ترین لگ رہا تھا۔ سارے ماحول پہ بوندی کے لڈوؤں کی مہک چھائی تھی۔ وہ گہرے گہرے سانس کھینچنے لگا۔ پیسوں کا جوڑ توڑ کرنے لگا ــــ نفع و نقصان سوچنے لگا۔ بچا ہوا راشن دیکھنے لگا۔ دال کے ڈرم، شکر تری کی بوریاں، گھی کے کنستر ــــ دودھ، دہی، بیکنگ پاؤڈر کے ڈبے۔ سامان بہت کم رہ گیا تھا۔ بہت وافر استعمال کیا گیا تھا۔ گوشی خان کو گھاٹے کے اندیشے کاٹنے لگے۔ اس کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں، وہ اس وقت بپھرا ریچھ لگ رہا تھا غضب ناک، خوفناک، بھیانک ــــ

"کم بختی آگئی میری ــــ رات نیند نے وحشت کر دیا ــ تجھے دیکھنے نہ آسکا۔ یہ کیا غضب ڈھایا ہے۔ دیسی گھی کے کنستر خالی کر دیے۔ ارے، اس میں ڈالڈا تیرے باپ نے ملانا تھا یا نانی نے تجھے قبر سے اٹھ کر سمجھاتی گڑ کو ہاتھ میں نہ لگایا۔ شیرہ شکر تری کا بنا لیا۔ اتنی مہنگی کھانڈ ضائع کر دی۔ دودھ، دہی، پاؤڈر سب تباہ کر دیا۔ میں خسارے میں گیا۔ برباد کر دیا تجھے۔"

وہ دھاڑتا ہوا تھر تھر کانپتی جوئی تک گیا۔ اسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ کمزور، بے جان، بے سانس بت کی طرح لڑکھڑاتی کڑاہے کے قریب جا گری تھی۔ بخت گل بے حد خوف زدہ ہو گئی تھی۔ جوئی کی درگت کا یہ منظر پہلی مرتبہ اس کی نظر کے سامنے سے گزرا تھا۔ اسے جوئی کی حالت پہ ترس آیا۔

"جی چاہتا ہے، تجھے اسی کڑاہے میں الٹ کر بھون دوں۔ ذلیل، مکار، نکمی، میرا کباڑا کر کے رکھ دیا۔" گوشی خان نے دو تھپڑ اس کے گالوں پہ مارے۔ جوئی کے ہونٹ اور گال سے خون رسنے لگا تھا تب بخت گل سے رہا نہ گیا۔ وہ بپھر کر گوشی خان کے سامنے آگئی تھی۔

"ظالم! زور آور ــــ کیوں اس معصوم کی آہ لیتا ہے۔ بے رحم درندے! اس معصوم کی حالت دیکھ۔ رات بھر مشقت کرتی رہی ہے۔ اتنی بھینس جیسی بھینیں گھر میں باندھے ہوئے ہے۔ ان سے کام کروایا کر۔ وہ بستر توڑتی، رزق اجاڑتی نظر نہیں آتیں۔ اس بے زبان یتیم کو جانور سمجھ رکھا ہے؟ ایک تو تیری چاکری کرے۔ تیری مفت کی نوکرنی رہے اوپر سے تو اسے مارتا ہے۔ لعنت ہے تجھ پر، تیرے مرد ہونے پر ــــ" بخت گل تو آگ بن گئی تھی۔ گوشی خان جیسے لمحہ بھر کے لیے سناٹے میں رہ گیا تھا۔ ایسا طمانچہ ایک دو ٹکے کی لڑکی نے اس کے منہ پر مارا تھا۔ وہ جوئی کو چھوڑ کر بخت گل پہ چڑھ دوڑا تھا۔

"حرام زادی! تیری جرات کیسے ہوئی؟ زبان چلاتی ہے؟ بکواس کرتی ہے؟ تیرا حقہ پانی بند۔ کل سے یہاں مت آنا ــــ" گوشی خان بپھر کر بول رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو کرچھا اٹھا کر اس بدزبان کا سر پھاڑ دیتا۔

"میں خود بھی تھوکنے نہیں آؤں گی۔" بخت گل نے دوبدو جواب دیا تھا۔ تب ہی گوشی خان کی نظر اس کے ہاتھ میں پکڑے شاپر پہ پڑی تھی۔ وہ جیسے پھر سے ابل پڑا تھا۔

"اچھا ــــ تو یہاں یہ سخاوتیں چل رہی ہیں۔ دو کلو لڈو آرام سے پکڑا دیے۔ تیرے باپ کا لنگر جاری ہے کیا؟ بڑی آئی خدا ترس، میری غیر موجودگی میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اماں تو بستر سے اٹھتی نہیں اور یہاں مجھے کنگال کیا جا رہا ہے ــــ دے ادھر شاپر۔" گوشی خان جوئی پہ پھنکارتا بخت گل کی طرف بڑھا تھا۔ تب وہ اس کے قریب آنے سے پہلے ہی حقارت سے بولی تھی۔

"یہ لے ــــ میں لعنت بھیجتی ہوں تجھ پر، تیری چیزوں پر، اس مہینے کی اجرت تجھے خیرات سمجھ کر بخشی، اب نہیں آؤں گی اور دعا کروں گی کہ یہ بدنصیب بھی تم لوگوں کے چنگل سے آزاد ہو جائے ــــ"

بخت گل نے غضب ناک ہو کر کہا تھا۔ وہ بہت منہ پھٹ تھی۔ جوئی کو آج اندازہ ہوا تھا، وہ حق بات کہنے سے ڈرتی نہیں تھی۔ جوئی کو اس کی بہادری پہ رشک آیا تھا۔ وہ بلبلا کر جھکار فعان ہو گیا تھا۔ تب بخت گل نے آگے بڑھ کر سسکتی ہوئی جوئی کو اٹھایا۔ اس کے منہ سے بہتا خون صاف کیا۔ اسے پانی پلایا۔ انگیٹھی سلگا کر پاس بٹھایا۔ پھر وہ اس کے تھکے تھکے ہاتھوں کو دباتے ہوئے نرمی سے بولی تھی۔

"خود کو ضائع مت کر جوئی! اپنے چاچا کو تار لکھ انہیں حالات بتا اور یہاں سے چلی جا ورنہ یہ درندے تجھے کچا نگل جائیں گے۔" وہ بہت مخلصانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

کچھ دیر پہلے وہ اس لڑکی کی "فطرت" سے گھن کھا رہی تھی۔ اسے کراہیت آرہی تھی اور اس وقت وہ جیسے اپنی لمحہ بھر کی سوچ پہ پشیمان تھی۔ بخت گل جو بھی تھی اس کا جو بھی کردار تھا۔ مگر وہ اپنے سینے میں انسانیت سے بھرا دل ضرور رکھتی تھی۔

"بخت گل! تم جانتی ہو، میرے پاس موبائل فون کی سہولت نہیں۔ پر نمبر ضرور ہے۔ میرے ڈاکٹر چاچو کا نمبر۔ میں وہ نمبر تمہیں دیتی ہوں۔ تم میرے چاچو سے کہو، وہ مجھے لینے آجائیں۔" وہ دھیمی بھرائی آواز میں کہہ رہی تھی۔ وہ اٹھی اور پرانی ماربل کی اینٹوں اور کاٹھ کباڑ سے بھرے صندوقچے سے ایک میلی کچیلی چٹ نکال لائی۔

"جوئی! نانی کا فیصلہ تیرے حق میں اچھا نہ تھا۔ انہیں اپنی زندگی میں تجھے تیرے چاچا کے حوالے کر دینا چاہیے تھا۔ یہاں تیری زندگی کیڑوں مکوڑوں سے بھی بدتر ہے۔" بخت گل نے چٹ شال کے پلو میں باندھ لی تھی اور اسے آلو بخارے کے باغ میں ملنے کو کہا تھا۔ وہ اب دوبارہ اس گھر میں آنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

ڈاکٹر چاچو نے کسی بھی خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ جانے وہ کہاں تھے؟ ٹھیک بھی تھے یا نہیں؟ پہلے اکثر پڑوسیوں کے گھر فون کر لیتے تھے۔ مگر زیادہ اسے خط ہی لکھتے۔ کیونکہ جوئی خط میں تفصیل لکھ دیتی تھی۔ فون پہ بات نہیں کر سکتی تھی۔ حالانکہ انہوں نے اسے اپنا نمبر دے رکھا تھا۔ مگر جوئی کبھی بھی فون کرنے کی جرات نہیں کر سکی تھی۔ اس میں اعتماد کی کمی تھی، وہ ہمیشہ دوسروں کی انگلی پکڑ کر ہی چلتی رہی تھی۔ پہلے نانی پھر چاچو اور چاچو اس کے بہترین رہبر تھے۔

وہ رات بھر کی تھکن بھول گئی تھی۔ گوشی خان کے ہاتھوں ملنے والی ذلت بھول گئی تھی۔ مار بھول گئی تھی۔ یاد رہا تو بس اتنا ــــ اگر چاچو ہی نہ رہے تو وہ کہاں جائے گی؟

ان کی فیملی کو تو اس کا خیال نہیں آسکتا تھا۔ وہ لوگ اس کے وجود سے ناواقف تو نہیں تھے مگر اس سے کوئی انسیت بھی نہیں رکھتے تھے۔ جانے تقدیر میں کیا لکھا تھا؟ اور ہر آنے والا دن اس کے لیے کتنی ذلت لانے والا تھا؟

بخت گل کے نہ آنے سے کام بڑھ گیا تھا۔ وہ تھک کر ٹوٹ جاتی، نڈھال ہو جاتی۔ رونے لگتی ــــ مگر یہاں کسی کو اس کا احساس نہیں تھا۔ کشتی اور دی بڈ حرام تھیں، ماں ازل سے کاہل۔ پھر مفت کی نوکرانی کے ہوتے ہوئے انہیں ضرورت کیا تھی کام کرنے کی۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا، وہ کھویا بھی بناتی لڈو بھی۔ مگر باڑے کا بوجھ بھی اس پہ آلدا ــــ وہ جانوروں کو

چارہ بھی ڈالتی، پانی بھی پلاتی، ان کی غلاظت بھی صاف کرتی۔ پھر کوئی خان کو باڑے کے لیے بندہ مل گیا تب جوئی کی بدبو کی بھبھکوں سے جان چھوٹ گئی تھی۔ مگر اس کی جان چھوٹی کہاں تھی۔ ایک مرتبہ پھر عسمی بچہ پیدا کرنے کے لیے آگئی بمعہ اپنے اوباش شوہر کے۔ عسمی کا یہ پانچواں بچہ تھا۔۔۔ اور جوئی کے لیے یہ بھی امتحان بن کر آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم جاؤ گے مورکھ۔۔۔؟" غفیرو کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ سختی سے عدل کو منع کرنا چاہتی تھیں مگر جانے کیوں رک سی گئیں۔ اس سے وہ برہم بھی ہو سکتا تھا اور باپ سے ڈائریکٹ بات بھی کر سکتا تھا۔ تب ان کی پوزیشن شوہر اور بیٹے کی نظر میں خراب ہو سکتی تھی۔ وہ کچھ نہ کچھ ان کی ناگواری کو سمجھ گیا تھا تاہم وہ اپنی ماں کے اندر اٹھنے والے زہریلے پن سے ناواقف تھا۔ سو انہیں خود کو نارمل رکھ کر عدل کو روکنا تھا اور یہ کام کٹھن یا دشوار نہیں تھا۔ عدل فطرتاً "نہ ضدی تھا نہ ہٹیلا۔۔۔ بہت حد تک فرماں بردار تھا اور ماں سے قریب تر۔

"میں نے ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے۔ آپ کیا کہتی ہیں، میں خود جا کر پتا کر آؤں؟ بابا بہت متفکر ہیں۔ شاید ان کا قیام کچھ اور طویل ہو جائے۔" عدل نے سادگی سے پوچھا۔ انہوں نے نظر بھر کر اپنے بیٹے کو دیکھا۔ وہ عام دنوں میں بھی بہت مصروف رہتا تھا اور ان دنوں تو اس کے مقابلے کے امتحان ہونے والے تھے۔ اس کو کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ اس نے جاگنگ، ایکسرسائز، کلب، جم سب چھوڑ رکھا تھا۔ امتحانات سر پہ تھے اور وہ باپ کے رشتے داروں کے لیے متفکر تھا۔ کیا یہ معمولی بات تھی۔

"مگر میری جان! تمہارے بابا ایسا نہیں چاہیں گے۔" انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد اپنے تاثرات بدل لیے تھے۔ لہجے میں مٹھاس بھر لی تھی۔ "بابا تو خوش ہوں گے۔۔۔ کیا پتا، زیادہ ہی خوش ہو کر میری اور ماسن کی منگنی کر دیں۔" عدل نے سنجیدہ گفتگو میں بدلاؤ لانے کے لیے خوشگوار لہجے میں کہا تھا۔ ایک دم ہی غفیرو کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ ان کے لبوں پر ماسن کے ذکر سے مسکراہٹ آگئی تھی۔ وہ ان دونوں کی محبت کو جانتی بھی تھیں۔ پھر بھی بوہموں میں پڑ جاتی تھیں۔

"تم نے ٹھیک کہا میرے بیٹے! پر خود سوچو، بابا نے تمہیں کہا نہیں۔ اگر وہ چاہتے تو ضرور تمہیں بھیج دیتے۔ ویسے بھی انہوں نے تمہیں اپنے خاندان سے دور رکھا ہے۔ اس کی کوئی ٹھوس "وجہ" ضرور ہوگی۔ پھر مورکھ میں تمہارے چچا کی ساس بڑی بدزبان سی خبطی سی عورت ہے۔ تمہارے بابا کے ساتھ تو جیسے بیر ہے۔ انہیں طعنے کوسنے دیتی ہے۔ وہ لوگ اجڈ، جاہل گنوار ہیں۔ گھر آئے بندے کی عزت کرنا نہیں جانتے۔ اسی لیے تمہارے بابا نے تمہیں ایسے لوگوں سے دور رکھا ہے۔" انہوں نے نرم اور میٹھے انداز میں توجیہہ پیش کی تھی۔ مگر آج عدل کو جانے کیا ہوا تھا۔ وہ ان سے بحث میں پڑ گیا۔

"مجھے چچا کی ساس سے کیا لینا دینا؟ میں تو بابا کی پریشانی کے لیے۔۔۔" عدل نے جھنجلا کر وضاحت کرنا چاہی تھی مگر غفیرو نے اسے ایک دم ٹوک دیا تھا۔

"تمہاری چچی کی ساس۔۔۔ "اس لڑکی" کی نانی ہے۔" انہوں نے دانت پیس کر دل ہی دل میں جوئی کو دو چار گالیاں دی تھیں۔ عجیب جونک لڑکی تھی، جو یہاں نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے شوہر اور بیٹے کے حواسوں پہ سوار تھی۔ اگر ادھر آجاتی تو کیا ہوتا؟

"تو مجھے اس بات سے کیا غرض؟ صرف خیریت معلوم کر کے آؤں گا۔ آپ کو پتا تو ہے، بابا اس کے لیے کتنے حساس ہیں۔ انہوں نے مجھے اس لیے نہیں کہا ہو گا کہ میرے امتحانات ہیں۔ وہ مجھے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے۔" عدل نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا تو گویا وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اب اسے روکنا آسان نہیں تھا۔ جب بھی وہ کچھ کرنے کی ٹھان لیتا تو تب وہ کر کے ہی دم لیتا۔ وہ جیسے اندر تک لرز گئیں۔

تصور کے پردے پر کسی کی صورت ابھر آئی تھی۔ حسین، دل نشین، دل موہ لینے والی، عمر بھر مقید کر لینے والی۔۔۔ پھر وہ بھی تو اس کی بیٹی تھی۔ گم صم سی ساحرہ، بغیر لڑے، جھگڑے، فساد کیے ہر جنگ جیت جانے والی۔ اگر ان کا بیٹا اس کا اسیر ہو آیا؟ اگر اس عورت کی بیٹی کا جادو چل گیا؟ اگر عدل اس لڑکی کو ساتھ لے آیا؟ تب بھلا کیا ہو گا؟ وہ ہار جائیں گی، ایک مری ہوئی عورت کے سامنے، جو ان کے شوہر کو تو باندھے ہوئے تھی ہی، ان کے بیٹے کو بھی اسیر کر گئی تھی۔ پھر ماسن کا کیا ہو گا؟ ماسن اتنی مضبوط نہیں تھی۔ وہ خود کو مار سکتی تھی۔ تباہ کر سکتی تھی، جبکہ غفیرو میں اتنی طاقت نہیں تھی جو وہ ماسن کی بربادی دیکھ سکتیں۔

فی الوقت انہوں نے دریا دلی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے عدل کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ پہلے تو وہ کچھ متحیر ہوا تھا۔ پھر ایک دم مسکرا دیا تھا۔

"آپ بہت گریٹ ہیں مما! دیکھیے گا، اب میں بابا کو کیا سرپرائز دیتا ہوں۔" وہ ان کے قریب چلا آیا۔ پھر اس نے ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر ان کی پیشانی کو چوما تھا۔

"آپ دنیا کی سب سے اچھی مما ہیں۔" اس نے غفیرو کے ماتھے پہ ایک اور بوسہ دیا تھا۔ وہ جیسے گم صم رہ گئی تھیں۔

"زیادہ دن مت لگانا، میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔" ان کے ہونٹ با آواز ہلے تھے پھر وہ مڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی تھیں۔ بہت تیزی کے ساتھ ان کا ذہن اگلا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔ بھلا وہ کس طرح سے عدل کو روک سکتی تھیں؟ وہ اسے جادوگروں کی بستی میں کبھی نہ جانے دیتیں۔ مورکھ تو ساحروں کا گاؤں تھا۔ وہاں سے جو بھی ہو کر آتا، عمر بھر کے لیے بندھ جاتا۔ تو انہیں کچھ تو کرنا تھا۔ اور عدل کو روکنے کا بھی ان میں حوصلہ نہیں تھا۔ پھر یہ کام ماسن کے علاوہ کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ آخری سیڑھی پہ کھڑی تھیں جب نیچے سے عدل کی آواز آئی۔ وہ سلیم سے کچھ کہہ رہا تھا۔ غفیرو رک سی گئیں۔

"سلیم! تم گاڑی نکالو، مجھے بس اسٹاپ تک چھوڑ کر آنا ہے اور یاد رہے ماسن کو پتا نہ چلے۔" وہ تیزی سے سلیم کو ہدایات دیتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ تو گویا وہ ابھی جا رہا تھا؟ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک زرد، میلا کچیلا کاغذ پھڑپھڑانے لگا تھا۔ تو کیا اسے ہلال نے اس حقیقت کا بتا دیا تھا؟ جو کم از کم غفیرو کے لیے قیامت تھی۔ بہت بھیانک تھی۔

ایک زرد پیلا، خستہ حال، کاغذ اژدھے کی مانند انہیں پھنکار پھنکار کر للکار رہا تھا۔ غفیرو کو لگا جیسے فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ وہ بڑھی عورت جیسے عدل کی منتظر کھڑی ہو گی۔ قبر سے نکل کر صدیوں کے پیٹ میں پھنسا راز بتانے کے لیے اور کیا خبر اسی راز کی کھوج، سعی، جستجو، سراغ عدل کو مورکھ لیے جا رہی ہو؟

ان کے دل کو پنکھے لگ گئے تھے۔ انہوں نے چکراتے دماغ کے ساتھ ماسن کے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ وہ اس وقت عدل کی دی ہوئی اسائنمنٹ پہ کام کر رہی تھی۔ غفیرو کو حواس باختہ دیکھ کر گھبرا اٹھی تھی۔ ان کے تاثرات ہی کچھ ایسے تھے۔

"مما! خیریت تو ہے؟" ماسن ان سے بھی زیادہ گھبرا اٹھی۔ "عدل تو ٹھیک ہے؟" عدل کے حوالے سے ان دونوں پھوپھی، بھتیجی کو دھڑکے ہی لگے رہتے تھے۔

"وہ مورکھ جا رہا ہے۔ اسے روک لو۔" ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔

ماسن جیسے سُن ہو گئی۔ یہ مما کیا کہہ رہی تھیں عدل کیوں جا رہا تھا پھر اسے بتائے بغیر؟ مورکھ؟ اسی جوئی، کرسوئی، رسوئی کے مورکھ؟ اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ عدل کی دوری؟ عدل سے دوری؟ اسے کہاں گوارا ہو سکتی تھی۔ چاہے وہ ایک گھنٹے کے لیے ہوتی یا ایک دن کے لیے۔ وہ غفیرو سے تکرار، بحث، تردد، سوال وجواب کے بجائے الٹے قدموں نیچے کی طرف بھاگی۔ تب اسے خیال بھی نہیں آیا تھا کہ اس کے پیروں میں جوتے نہیں، اس کے گلے میں دوپٹہ نہیں۔

وہ نیچے آئی تو پورچ کو خالی پایا۔ وہاں عدل کی کار نہیں تھی۔ سلیم بھی نہیں تھا۔ وہ الٹے قدموں اندر کو

دوڑی۔۔۔ غفیو نے اوپر سے کار کی چابی پھینکی۔

"یہ لو عدل بس اسٹاپ پہ ہو گا۔ اسے روک لو۔" وہ نم آواز میں کہہ رہی تھیں۔ مامن نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اس وقت غصے اور دکھ سے بے حال تھی۔ آخر عدل اسے بتائے بغیر کیسے جا سکتا ہے۔ وہ اس کی گنوار کزن مامن سے زیادہ اہم تھی۔ عدل اتنی ضروری اسائنمنٹ اس کے سر تھوپ کے خود رشتے داریاں نبھانے چلا گیا۔

وہ غیض کے عالم میں گاڑی بھگا رہی تھی۔ گاڑی سڑک پہ بے ڈول ہونے لگی اور اچانک ایک دھماکہ ہوا۔ جیسے سب کچھ تہس نہس ہوا اور یہ ہونا ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

مامن کی جذباتیت ہمیشہ اس کے لیے نقصان کا باعث بنتی تھی۔ وہ بنا سوچے سمجھے فیصلے کرتی تھی۔ اس نے زندگی میں بہت سے جذباتی فیصلے کیے تھے۔ چند سال پہلے جب وہ عدل کی محبت میں مخمور اتراتی پھرتی تھی تب اس پہ ایک اور حادثہ اترا تھا۔ غفیو بھی اس کی سخت ترین انتہائی رد عمل پر تھرا اٹھی تھیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ کالج میں تھی۔ تب عدل' بابا کے ساتھ کراچی گیا ہوا تھا۔ ان ہی دنوں اس پہ ایک بھیانک انکشاف ہوا تھا۔ اس نے بابا کے سیف میں غیر متوقع ایک زرد پیلا کاغذ نما اژدھا دیکھ لیا تھا۔ اس کی ذات کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ اس کے اندر باہر آگ بھڑک اٹھی تھی۔

تب اس کی جذباتیت نے اسے نیند کی گولیاں پھانکنے پہ مجبور کر دیا تھا اور اس کا یہ عمل غفیو کی جان نکال گیا۔ ان پہ قیامت کا وقت بیت گیا تھا۔ تب غفیو کی ان تھک محنت' یقین دہانی' وعدوں اور قسموں نے مامن کو نئی زندگی بخشی تھی۔

وہ اسے سمجھاتی رہیں کہ جو وہ ہے اور کوئی نہیں۔ اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ اسے اپنی پھوپھی پہ بھروسا کرنا چاہیے۔ وہ اس کی محبت اور دل کو کبھی اجڑنے نہیں دیں گی۔" اور یہ غفیو کا یقین' وعدے اور الفاظ ہی تھے جو مامن' عدل کے آنے تک پھر سے تندرست ہو گئی۔ پھر وہ عدل سے ہر بات شیئر کرنے والی اس سے کچھ نہ چھپانے والی اتنی بڑی قیامت کی خبر کو چھپا گئی تھی۔

اب ایک مرتبہ پھر اسی جذباتیت کی کرامات سے ہسپتال جا پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

سلیم اسے بس اسٹاپ پہ چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ عدل نے دانستہ موبائل فون آف کر دیا۔ اسے رستوں کے بارے میں علم نہیں تھا۔ اسی لیے وہ گاڑی پہ جانے کے بجائے بس میں بیٹھ گیا تھا۔ سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ جب بس چل پڑی تب وہ مطمئن ہو کر مما کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان کا رد عمل غیر متوقع تھا۔ وہ اس کے بارے میں بہت حساس تھیں۔ اسے کبھی اکیلے کسی فیملی فرینڈ کے گھر تک جانے نہیں دیتی تھیں۔ ننھیال تو تھا نہیں ددھیال میں بابا اسے کبھی لے کر نہیں گئے تھے۔ اور اب وہ بابا کو بتائے بغیر ان کے گاؤں جا رہا تھا۔ وہ کچھ کچھ ایکسائیٹڈ بھی تھا۔

مما شروع سے ہی عدل اور مامن کے لیے جذباتی تھیں۔ انتہائی حساس' انہوں اس کے تصور میں مامن کی صورت لہرائی تو اسے ایک تازہ' نرم اور شگفتہ احساس چھو گیا۔

اگر مامن اسے "م نہتا" تک چاہتی تھی تو وہ مامن کو "دنیا" ہونے تک چاہتا تھا۔ بس اس کی محبت میں مامن جیسی جذباتیت' بچپنا نہیں تھا اور یہی بات وہ مامن کو سمجھا نہیں پاتا تھا۔ جب وہ بڑے مان سے سوال کرتی۔ "عدل! تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟" تب اسے مامن پہ ٹوٹ کے پیار آتا۔ وہ اسے کیسے بتا پاتا؟ بھلا محبت کی پیمائش کا کوئی پیمانہ تھا؟

اسے یاد تھا' بچپن میں بھی مامن کی خواہش کو اولیت دی جاتی تھی۔ مامن اس کے لیے لائی چیزوں کو پسند کرتی۔ اپنی گڑیا چھوڑ کر اس کا بیٹ اٹھا لیتی۔ اسے باربی ہاؤس سے نہ کھیلتی' اس کی سائیکل کے لیے مچلتی۔ تب وہ بہت محبت کے ساتھ اپنی چیز اٹھا کر مامن کو دے دیتا تھا۔ مامن کبھی بھی اسے اپنی رقیب نہیں لگی۔ بلکہ مما اور بابا کی محبت جو وہ مامن سے کرتے تھے' عدل کا سیروں خون بڑھاتی تھی۔ مامن کی تعریف اسے اپنی تعریف لگتی۔ وہ بہت لائق اور آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تھی۔ بابا اس کو بہت سراہتے تھے اس کی تعریف کرتے اس کی کامیابیوں پر انعامات دیتے۔ بابا نے ان دونوں بہنوں میں اور عدل کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا تھا۔

مما ان دونوں کو ایک کرنے کے لیے ہلال کبیر کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں۔

دراصل ہلال کبیر نے کبھی اتنا لمبا ٹور اور کبھی اتنا لمبا عرصہ گھر والوں سے دور گزارا ہی نہیں تھا۔ جب وہ باہر جا رہے تھے اس سے پہلے ان کی طبیعت خراب تھی۔ پھر بھی وہ مور کھ چلے گئے۔ جب واپس آئے تب زیادہ بیمار تھے۔ کچھ دن ہسپتال بھی رہے۔ پھر اچانک انہوں نے باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ غفیو اور عدل تو چاہتے تھے کہ وہ اپنا پروگرام کینسل کر دیں۔ مگر ہلال کبیر مانے نہیں اور اب پچھلے کئی دن سے ان کا گھر والوں سے رابطہ نہیں تھا۔ غفیو کو تشویش تھی جبکہ عدل بہت متفکر تھا۔ ان سے آخری دفعہ بات ہوئے بھی کافی دن گزر چکے تھے۔ مما نے تو اس نے ایسے ہی کہہ دیا تھا تاہم وہ خود متوحش تھا کہ بابا نے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ ان کے لیے نہ سہی وہ اپنی جوئی کو کسی بھی حال میں بھول نہیں سکتے تھے اور کم از کم جوئی کے لیے ضرور کال کرتے۔

وہ دل ہی دل میں پلاننگ کر رہا تھا۔ بابا کے آنے تک ان کی جوئی کو گھر لانے کی۔ ان سے آخری دفعہ بات ہوئی تب بھی وہ جوئی کا ذکر کر رہے تھے۔ اس کے خط نہ ملنے پر پریشان تھے۔ اور اس سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ ان کے وہ الفاظ۔

"عدل! جوئی میرا واحد اٹوٹ خون کا رشتہ ہے۔ جو دنیا میں میرے بھائی کے حوالے سے میرے لیے بچا ہے۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔"

انہیں اپنی بھتیجی سے لافانی محبت تھی' وہ بہت آزردہ تھے۔ ان کی آواز بھی بہت تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

عدل کو وہم ہونے لگا تھا کہ بابا یقیناً" ٹھیک نہیں..... وہ انہیں واپس آنے کے لیے زور دیتا رہا تھا۔ تب وہ اسی بے قرار شکستہ لہجے میں بولے تھے۔

"مجھے آنا تو ہے' جوئی کے لیے۔ اس کا میرے بغیر کوئی بھی نہیں۔" وہ پھر بھی جوئی کے متعلق بات کر رہے تھے۔ تب لمحہ بھر کے لیے اسے جوئی کا ذکر بہت برا لگا تھا۔ "بابا! آپ کو میری کوئی پرواہ نہیں۔ میں اتنا مس کر رہا ہوں آپ کو' کب سے "واپس آ جائیں" کی تکرار کر رہا ہوں۔ مگر آپ کی تان جوئی پہ ہی ٹوٹتی ہے۔"

اس کے مصنوعی شکوے کو سن کر وہ بہت وقت سے مسکرائے تھے۔ انہیں بیٹے کے شکوے پہ پیار آیا تھا۔ پھر انہوں نے بہت تحمل کے ساتھ اسے سمجھایا۔

"میرے بیٹے! وہ میری روح ہے میرا سکون ہے میری زندگی ہے۔ وہ صرف میری بھتیجی نہیں میرے وجود کا حصہ ہے۔ میرے ماں جائے کی واحد اولاد ہے۔ اسے دیکھ کر میری غلطیوں کا کفارہ ادا ہوتا ہے۔ اس سے محبت کر کے میں شانت ہو جاتا ہوں۔"

وہ جیسے اپنی گفتگو کو عدل کے دل پہ نقش کر رہے تھے۔ سمجھا رہے تھے۔ رشتوں کی ایک مالا تھما رہے تھے۔

"اور تم۔۔۔ میرا بازو ہو۔۔۔ میرے برابر۔۔۔ میرے بعد' میری ہر چیز کے وارث۔۔۔ میری محبتوں' چاہتوں' سرمائے' کنبے اور رشتوں کے امین..... تمہیں میرے کنبے کی حفاظت کرنا ہے میری جان! اور یاد رکھنا۔ جوئی میری زندگی کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔"

بابا کی آواز نم تھی۔ وہ اتنے آزردہ' رنجیدہ' غم زدہ کیوں تھے؟ عدل بہت بے چین ہو گیا تھا۔ بہت گھبرا گیا تھا۔

"مجھے نہیں پتا' وہ کس حال میں ہے؟ مگر میں جانتا ہوں' وہ بہتر حال میں نہیں۔ کاش کہ میں اس تک پہنچ

پاتا۔ اب تو میری امید بھی ٹوٹ رہی ہے۔" ان کی آواز جیسے ڈوب سی گئی تھی۔

پھر لائن ڈراپ ہو گئی۔ عدل نے بہت کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو سکا تھا۔ بابا کی ان باتوں کو سوچتے ہوئے ان کی فکر کو محسوس کرتے ہوئے اس نے مورکھ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

یک دم اس کے دل میں عجیب سی بے چینی امڈنے لگی تھی عجیب سا اضطراب طاری ہونے لگا تھا۔ آخر اچانک اسے ہو کیا رہا تھا؟ وہ گھر کی طرف لوٹنا چاہتا تھا مگر یہ چلتی بس اسے کس منزل تک لے آئی تھی؟

ایک دم اس کی سوچوں کو بریک لگ گئے۔

بس اسٹاپ پہ رک گئی تھی۔ یہاں سے مورکھ جانے کے لیے ٹرانسپورٹ دستیاب تھی۔ وہ کسی بھی رکشہ ٹیکسی کو پکڑ سکتا تھا۔ ٹیکسی نے اسے مغلی پل پہ اتار دیا۔ آگے اسے پیدل سفر کرنا تھا۔ وہ پل پہ اتر کر لحہ بھر کے لیے مبہوت رہ گیا۔ یہ کیسی جنت نظیر وادی تھی سرسبز و شاداب پہاڑوں سے آراستہ حسین مرغزاروں سے سجی' نیلے پانیوں میں بہتی ہوئی۔ سبزے' پھولوں اور خوشبوؤں سے معطر... ندی کے پار پہاڑوں کی حسین چوٹیاں اور کہر میں ڈوبا زرد پڑتا سورج اور جب سورج افشاندہ ہوتا تب جانے وادی پہ کیسی ابرق سنہری افشاں بکھرتی؟ اس پہ مورکھ کا جادو چڑھنے لگا۔ اسے لگا وہ مشرق کے سوئٹزرلینڈ میں آگیا ہے۔ اسے اب تک یہاں نہ آنے کا افسوس ہوا تھا۔ جانے بابا اسے یہاں کیوں نہیں لائے؟ یہ جگہ تو سیاحت کے لیے بھی آؤٹ کلاس تھی۔ وہ سوچنے لگا' نامن کو شادی کے بعد یہاں ضرور لے کر آئے گا اور نامن کی طرف بہتی سوچیں اسے ایک مرتبہ پھر اس فسوں سے باہر لے آئی تھیں۔ اس کے دل میں پھر سے اضطراب چٹکیاں بھرنے لگا۔

وہ ندی پہ اڑان بھرتے بگلوں کو دیکھنے لگا پھر گہرا سانس کھینچ کر اس پگڈنڈی کی طرف آیا جو آلو بخارے کے باغ میں سے گزرتی تھی۔ وہ ٹنڈ منڈ سے درختوں کے جنگل کو دیکھنے لگا۔ جب یہ سبز پتوں سے مزین اور آراستہ پیراستہ ہوتے ہوں گے کتنے خوب صورت لگتے ہوں گے۔

اس نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ اب وہ رستوں کا تعین کر رہا تھا۔ بس میں اسے کسی نے بتایا تھا کہ پل سے اتر کر یہی پگڈنڈی بستی میں اترتی ہے۔ وہ اس رستے پہ چلنے لگا۔ معاً" اسے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ کسی درخت کے جھنڈ پیچھے... دو نسوانی آوازیں تھیں۔ وہ لحہ بھر کے لیے رک سا گیا۔ اسے کسی سے گھر اور رستے کے بارے میں پوچھ لینا چاہیے۔ وہ اسی لیے ٹھہر گیا تھا۔ اسے کسی کی دکھ' صدمے اور اندیشے میں گھری آواز سنائی دی تھی۔

"بخت گل! اب کیا ہو گا؟" آواز میں آنسو ہی آنسو تھے۔ دکھ ہی دکھ تھا۔

"بس اس عورت نے کہا۔ چاچا صاحب وہاں نہیں رہتے۔ یہ غلط نمبر ہے۔ کہیں اور لگاؤں... اور یہ کہ اس عورت نے تمہارا نام سن کر فون کھٹاک سے بند کر دیا۔" دوسری آواز میں مایوسی تھی۔ جانے وہ دونوں کیا گفتگو کر رہی تھیں؟ بھلا عدل کو ان کی گفتگو سے کیا لینا دینا تھا۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھا۔

"بخت گل! اپنے موبائل سے پھر کال کرو نا۔ کیا پتا اس عورت کو میرا پتا ہی نہ ہو۔" پہلی آواز پھر سے ابھری تھی۔ کچھ امید اور آس سے بھری۔

"تمہارے سامنے ہی کتنی دفعہ کر چکی ہوں۔ گھنٹی بجتی ہے پر کوئی فون نہیں اٹھاتا۔" دوسری آواز میں اب بھی مایوسی تھی۔ تاہم عدل کچھ چونک گیا تھا۔ موبائل کے ذکر نے اسے چونکا دیا تھا۔ کیا یہاں فون کی سروس اور سہولت موجود تھی؟ اس نے اپنا سیل فون جینز کی جیب سے نکال لیا اسی اثنا میں دو لڑکیاں ایک ہی جھونک میں چلتی ہوئی سامنے آئیں۔ ایک اسے دیکھ کر دونوں ہی حیران رہ گئی تھیں۔ زیادہ گھبرائی کچھ پیچھے رہ گئی۔ ذرا پر اعتماد سی تیکھوں والی لڑکی آگے آئی۔ عدل نے اسے بغور دیکھا۔ اس کے چہرے بہت سے تل تھے۔ رنگت گوری اور آنکھیں سبز چھوٹی تھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ سو خوب صورت

نہیں لگتی تھیں۔ تاہم جو لڑکی کچھ فاصلے پر پتھر کا بت بنی حواس باختہ کھڑی تھی' جیسے کسی نے اسم پھونک کر اسے پتھر کردیا ہو' اس کی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔ یقیناً "وہ حسن و جمال کا پیکر تھی دودھ جیسی یا پھر دودھ میں گھلے گلاب جیسی..... اسے کچھ ٹھیک بیٹھتی تشبیہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اگر وہ اتنی کمزور لاغر اور دبلی نہ ہوتی تو بہت کمال لگتی۔ وہ اپنی نظر اس روئی روئی' سہمی سہمی لڑکی سے ہٹا کر ایک ہاتھ سے بند ہوا موبائل آن کرتا سامنے کھڑی لڑکی سے مخاطب ہوا تھا۔

"ڈاکٹر بلال کبیر کے گھر کا پتا ہے؟ آئی مین' ان کے کسی رشتے دار کا گھر!" اس نے بہت شائستگی کے ساتھ پوچھتے ہوئے موبائل کی روشن ہوتی اسکرین کو دیکھا۔

"ہاں..... پتا ہے۔" لڑکی حیران حیران سی اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے گردن موڑ کر دوسری لڑکی کو دیکھ کر کوئی اشارہ بھی کیا تھا۔ عدل وہ اشارہ نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ لگاتار میسج کی بجتی ٹیون اسے کسی اور طرف دھیان نہیں دینے دے رہی تھی۔

"تم کون ہو؟" وہ بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔

"بتایا نہیں..... تم کون ہو؟ کیا شہر سے آئے ہو؟" وہ دوبارہ بے صبری سے پوچھ رہی تھی۔ عدل اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ کچھ حواس باختہ بے چین' دیوانہ وار میسج دیکھ رہا تھا' موبائل کی طرف متوجہ تھا۔ وہ ایک ایک ٹیکسٹ دیکھ رہا تھا یامن' ڈاکٹر عمیر اور مما کی بے شمار مسڈ کالز اور میسج تھے۔ وہ ایک کے بعد ایک کھولتا چلا گیا۔

"میرے اللہ! یامن کا ایکسیڈنٹ۔" اس کے پیروں تلے موجود زمین ہل گئی تھی۔ اسے اپنی بے چینی بے قراری اور اضطراب کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ یامن جانے کس اذیت' درد اور تکلیف سے گزر رہی تھی۔ اس کا ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟ کیا اس نے غصے کے عالم میں ایکسیڈنٹ کیا؟ وہ اسے بتائے بغیر جو آگیا تھا۔ ان دونوں کے بیچ ایسا تعلق' رشتہ' واسطہ تو تھا ہی ..... جو وہ اتنی دور..... ہونے کے باوجود یامن کی تکلیف محسوس کرسکتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا' وہ یہاں کچھ دیر اور ٹھہرا رہا تو ختم ہوجائے گا۔ اسے واپس جانا تھا۔ یامن سے ملنا تھا' اسے دیکھنا تھا۔ اسے چھونا تھا۔ محسوس کرنا تھا۔ اس کے زندہ ہونے کا یقین کرنا تھا۔ وہ ڈاکٹر عمیر کا میسج دیکھ رہا تھا۔

"جہاں بھی ہو' جلدی آؤ۔ یامن کی حالت تشویش ناک ہے۔" وہ نم آنکھوں سے اسکرین دیکھتا رہا۔ ایک کے بعد ایک میسج کھولتا رہا۔ وہ جیسے پاگل ہوتا رہا۔

"فون کیوں بند ہے تمہارا..... کہاں ہو تم! یامن مرجائے گی تب آؤ گے۔" مما کا میسج تھا۔

"یامن کی حالت نازک ہے۔ عدل! جلدی آؤ۔" یامن کے کئی میسج تھے۔

اس کے چہرے پہ وحشت پھیل رہی تھی..... اس کے تاثرات بدل گئے تھے۔ اس کے انداز بدل گئے تھے۔ تب ہی سامنے کھڑی لڑکی حیران اور متحیر رہ گئی۔ وہ اس کی اچانک نمکین پانیوں سے بھرتی آنکھوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔

"تم نے بتایا نہیں؟" وہ پھر سوال لیے کھڑی تھی۔ عدل نے آخری متوحش سی نظر دور کھڑی لڑکی پر ڈالی۔ پھر اڑے اڑے حواسوں کے ساتھ الٹے قدموں بھاگنے لگا تھا۔ بے حواس سا وہ کوئی دیوانہ لگ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پل تک پہنچ گیا۔

"پاگل تھا کوئی۔" بخت گل نے ہاتھ جھاڑ کر تبصرہ کیا۔" چاچا صاحب کا پوچھ رہا تھا۔ جانے اسے اچانک کیا ہوا۔ میسج دیکھ کے بھاگ گیا۔" بخت گل حیران بھی تھی اور بیزار بھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر جوئی کو دیے ہوئے نمبر پہ کال کررہی تھی مگر اس کا دھیان جوئی کی طرف ہی تھا۔

"ایں..... تو کیا بت بن گئی؟ مانا کہ بابو بڑا خوب صورت تھا پر تجھے کیوں پتھر کر گیا۔" وہ بولتی ہوئی جوئی تک چلی آئی پھر اس نے جوئی کا کندھا ہلایا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ جیسے کوئی بے جان بت ہو۔ بخت گل کچھ پریشان ہوئی' تھوڑا گھبرا گئی۔

"وہ چلا گیا۔" بے جان بت میں جان پڑ گئی تھی۔

اس کی نگاہیں دور پل کے پار اتر گئیں۔ وہ وہاں کھڑا تھا۔ اتنا ہی بے چین' بے حواس اور بے قرار جیسے اس کی کوئی قیمتی چیز گم ہوگئی تھی۔

"وہ آیا اس نے فتح کیا اور ساحل پہ کھڑا رہا ..... منجدھار تک نہ آیا' مجھے دلدل سے نہ نکالا۔ وہ لوٹ بھی گیا۔ پھر آیا کیوں تھا..... " جوئی جیسے پاگل ہونے لگی۔ بخت گل کے کندھے سے لگ کر رونے لگی۔

"وہ کوئی مکار' دھوکے باز' چھلیا بھی نہیں تھا۔ پھر نظر کا دھوکا کیوں لگا۔" وہ آلو بخارے کے خزاں رسیدہ باغ سے پوچھنے لگی۔ آتی جاتی سرد ہواؤں سے پوچھنے لگی۔ پتھروں کی اس بستی سے پوچھنے لگی۔ بہتی سرد خاموش ندی سے پوچھنے لگی۔

"کون تھا وہ؟" بخت گل نے متوحش سا ہوکر اسے جھنجوڑا۔" بتا نا مجھے وہ کون تھا؟" وہ اس کی بے جان ہوتی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

"میرے ڈاکٹر چاچو..... میرے چاچا صاحب کا بیٹا ..... عدل کبیر خان۔" اس کے ہونٹ بے آواز پھڑپھڑائے تھے پھر وہ کچھ زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ اس کی تو جیسے عمر بھر کی پونجی لٹ گئی تھی۔

"کیا وہ چھوٹا خان تھا؟" بخت گل چکرا کر رہ گئی تھی۔ پھر اس نے گردن موڑ کر پل کی طرف دیکھا۔ پل کے جنگلے کہر میں کھو گئے تھے ہر طرف دھند ہی دھند تھی۔ بخت گل اندھا دھند پل کی طرف بھاگنے لگی۔ وہ بے حواس سی پل کے کناروں تک پہنچی..... اس نے اپنی آنکھیں مسل مسل کر دیکھا..... وہاں کوئی اجنبی نہیں کھڑا تھا۔ پل کا آخری مسافر آنے والی آخری ویگن میں سوار ہوکر جاچکا تھا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح ٹھوکریں کھاتی لوٹ آئی۔

"تیری بے حواسی نے اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیا ..... " بخت گل اس چھوٹی سی تنہا لڑکی کے ٹوٹے بکھرے وجود کو دیکھتی زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔ "تجھے قدرت نے ایک لمحہ عنایت کیا تھا۔ چاہتی تو اسے عمر بھر کے لیے باندھ لیتی۔ مگر تیری نادانی نے اسے دھند کے حوالے کردیا۔"



وہ ڈھول ڈھول ہوتا' ہسپتال پہنچا تھا۔ ریسپشن سے ہوکر او۔ٹی کی طرف آیا' وہاں اسے ماربل کے بینچ پہ یامن بیٹھی نظر آئی تھی۔ اس کی بدحال نڈھال ماں جائے نماز پہ بیٹھی گڑگڑا رہی تھی۔ ڈاکٹر عمیر کہیں نہیں تھے۔

"اب بھی نہ آتے ..... رشتے داریاں نبھاتے رہتے۔" اس کا لہجہ غم زدہ اور آواز پھٹی پھٹی تھی۔ "کسی روز میری بہن کی جان لے لوگے۔ کسر تو آج بھی نہیں چھوڑی۔" عدل چپ چاپ سنتا رہا' اس کی آنکھیں اب بھی نم تھیں۔

قریب قریب ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر عمیر باہر نکلے تھے۔ وہ مطمئن نظر آرہے تھے۔ پھر عدل کے بے جان ہوتے شانے پہ بازو پھیلا کر بولے تھے۔

"ہوش میں آنے کے بعد بھی اس نے تمہارا پوچھا۔ محبت نارمل حد تک رہے تو آسانیاں لاتی ہے ورنہ دکھ' تکلیف اور پریشانیاں ہی ملتی ہیں۔ یامن سے کہنا' محبت ہو یا نفرت' اعتدال ہی بہترین راستہ ہے' یہ جذباتیت اس کے لیے مناسب نہیں۔" وہ اسے اور بھی بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔ یامن کے مقابلے میں وہ عدل کے زیادہ قریب تھے۔ پھر وارڈ کی طرف جاتے جاتے قدرے شرارت سے بولے۔

"شادی کے معاملے میں زیادہ دیر مت کرو' ورنہ یامن کی "بے یقینی" اس کا دم ضرور نکال لے گی۔" ان کا ہلکا پھلکا لہجہ بتا رہا تھا کہ یامن اب خطرے سے باہر ہے۔ اس کا دل جیسے سجدہ ریز ہوگیا۔ اگر یامن کو کچھ ہو جاتا تو وہ خود کو معاف کرسکتا تھا؟ شاید کبھی نہیں۔

یامن کے بعد مما نے بھی طویل کلاس لی تھی کہیں اندر سے یامن کے ساتھ ہونے والے حادثے میں وہ اپنا قصور بھی سمجھتی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یامن کس قدر عدل کے لیے جذباتی ہے پھر بھی اس کو آزمانے چلی تھیں۔ اور اب تو وہ یامن کے صحت

مند ہوتے ہی ان دونوں کی شادی کا ارادہ رکھتی تھیں۔ چاہے کچھ بھی ہو جاتا' ہلال کبیر مانتے یا نہ مانتے۔

ادھر عدل خود احساس جرم کا شکار تھا۔ اسے اندازہ تو تھا جب وہ مورکھ سے واپس آئے گا تب مامن بہت ہنگامہ کرے گی اور اگر وہ جوئی کو بھی ساتھ لے آتا تب تو تباہی آجاتی۔ اسے اتنا "بے بس" دیکھ کر عدل کا دل بھر آیا تھا۔ وہ بہت کمزور اور بیمار لگ رہی تھی۔ عدل نے اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑ لیا۔

"اب کبھی ایسا مت کرنا۔" بہت دیر بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہو سکا تھا۔ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"میں تو بس تمہارے پیچھے جا رہی تھی۔ تم بتائے بغیر جو چلے گئے تھے۔" وہ بہت تھکے تھکے نڈھال لہجے میں بولی تھی۔ بہت معصوم سا انداز تھا۔ عدل کا جی بھر آیا۔

"تم بھی اب ایسا کبھی مت کرنا۔" مامن بھی جیسے ایک دعدہ لے رہی تھی' ایک عہد میں باندھ رہی تھی۔

"ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ نوبت ہی نہیں آئے گی۔ تم اس بستر سے اٹھو ہم امتحان سے پہلے ہی شادی کر رہے ہیں۔"

عدل اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔ مامن پہ شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔

"اور بابا؟" مامن کی آنکھوں میں ایک خدشہ سا لہرایا۔

"ان کو بھلا کیا اعتراض ہو گا؟ انہیں بھی تمہارے صحت مند ہونے کا انتظار ہے۔" اس نے جھک کر مامن کی پیشانی کو چوما تو جیسے اس کے جلتے سلگتے دل کو قرار آگیا۔

"یہ بازی' یہ محبت کی بازی وہ ہارتے ہارتے جیت چکی تھی' وہ مورکھ جا کر بھی لوٹ آیا تھا۔ اس کی محبت کی طاقت مورکھ کے فسوں سے زیادہ تھی۔ اس نے اپنی پھوپھی سے سن رکھا تھا' وہ ہلال کبیر خان کی بھتیجی کے حسن سے خوف زدہ تھی۔ عدل کبیر صرف اسی کا تھا' اب کسی یقین کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جوئی' کرموئی' رسوئی محض ایک تحریر میں چھپی رہ گئی تھی بے نام و نشان سی۔ گم شدہ وہ مورکھ کی دھول خاک اور مٹی بن چکی تھی۔

اس کی آنکھوں میں رتن (جواہرات) کی سی چمک تھی۔ وہ۔۔۔ وہ جیت کے نشے سے مخمور تھی۔ اسے بہت سال پہلے بابا کے سیف میں رکھا پیلا پھٹک کاغذ بھی بھول گیا جسے دیکھ کر وہ ہل گئی تھی۔



ہر گزرتا دن اس کے لیے اذیت کا ایک نیا باب کھول دیتا تھا۔ مگر جب رات آتی تو اشکوں کے دیے جیسے روشن ہو جاتے۔ رات کی کوئی ایک گھڑی بہت نیک' بختاور اور مبارک ثابت ہوتی تھی۔ جو اسے فرحت' شادمانی' خوشی اور سرور کا وہ لمحہ بخش دیتی جب اس نے اپنی زندگی میں ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا جس کی آنکھوں سے مدھ بہتا تھا۔ جس کی پیشانی پہ روشنی بکھری تھی' جس کا چہرہ اس کے خیالوں سے زیادہ دل موہ لینے والا تھا۔ وہ جو اس کی پوری زیست کا حاصل تھا۔

پہلے پہل وہ لمحہ رات کو کسی وقت اس کی پلکوں پہ دستک دیتا تھا' پھر یہ پوری رات پہ محیط ہو گیا۔ پھر اس سے بھی کچھ آگے بڑھا۔ وہ دن میں بھی سپنے دیکھنے لگی' خمار آلود سا ایک خواب جاگتی آنکھوں کو گلابی کر دیتا تھا۔

وہ کڑاہے میں کڑچھا چلاتے چلاتے کھو جاتی' کہیں گم ہو جاتی' کسی جادو نگری میں پہنچ جاتی۔ اس کے گلاب ہونٹوں پہ مسکان چپکی رہتی۔ اس کے حسین گالوں پہ شفق بکھری رہتی۔ وہ موتی چور کے لڈو بناتے کبھی نہ تھکتی' نہ اسے رات بھر ٹھنڈ لگتی۔ وہ دال چینتی' چھانتی۔۔۔ اس میں گھی ملاتی' دہی' دودھ سے نرم کرتی۔ بیکنگ پاؤڈر کے ڈبے کھولتی خود آٹا آٹا ہو جاتی۔ گھی کڑکڑاتی۔ چھلنی میں بوندیاں ڈال کر گھی میں گراتی' انہیں شیرے میں ڈبوتی' ٹھنڈا ہونے پہ چاندی کے ورق سجا کر لڈو بناتی۔ کبھی بے خیالی میں بوندیاں زیادہ لال پڑ جاتیں' کبھی سیاہ ہو جاتیں' تب گوشی کو غیض چڑھ جاتا تھا۔ وہ اسے چوٹی سے پکڑ کر گھما گھما کر تھپڑ مارتا۔ اس کے گال پھٹ جاتے' ان میں لہو کی بوندیں پھوٹ پڑتیں اور گوشی کے الفاظ اسے خون خون کر دیتے تھے۔

"حرام زادی! کس کے خیالوں میں رہتی ہے۔ سارا مال خراب کر دیا۔ اسے کون خریدے گا۔" لڈو کبھی زیادہ نرم پڑ جاتے تھے' کبھی لڈو سخت رہ جاتے' گھی کی مقدار میں کمی بیشی ہو جاتی تو لڈو پتھر کی طرح جمتے۔ کبھی کھویا جل جاتا' کبھی دودھ میں دہی ملا دیتی' کبھی دودھ میں بیسن گھول دیتی۔ سو سو کلو دودھ تباہ ہو جاتا' کھویا پھٹ جاتا۔ بے ذائقہ ہو جاتا' کبھی کڑاہے کے تلوے سے لگ کر سیاہ پڑ جاتا۔ تب ایک طوفان کھڑا ہو جاتا۔ گوشی خان گالیاں بکتا چیختا چنگھاڑتا۔ اسے مارتا۔

"تیرے ہاتھوں میں سوراخ ہو چکے ہیں۔ اب تو کسی قابل نہیں رہی۔ تیرا کچھ اور بندوبست کرتا ہوں۔" وہ اسے گھورتا' آگ اگلتا باہر نکل جاتا تھا۔ پھر جوئی کی جیسے رسوئی سے جان چھوٹ گئی تھی۔ کیونکہ گوشی مال تیار کروانے کے لیے کاریگر لے آیا تھا۔ اور مرد اور عورتیں' ٹھٹھے لگاتے' قہقہے لگاتے' مذاق کرتے' ہنستے مسکراتے کام میں جتے رہتے۔ مگر سکھ پھر بھی اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ عسمی جب بھی اپنے شوہر سمیت یہاں آتی' جوئی کا سکھ چین دھواں دھواں ہو جاتا تھا۔ عسمی کے لاڈلوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری جوئی کے سر آجاتی تھی۔ وہ ان کی دن رات کے لیے آیا بن جاتی۔ عیش و عشرت میں پلے بڑھے بچے تھے۔ انتہائی نازک مزاج' چڑچڑے' مغرور' گھمنڈی وہ سارا دن اسے تگنی کا ناچ نچائے رکھتے۔ وہ پھرکی کی طرح گھومتی' دن بھر ان کی سیوا کرتی۔ رات کو بھی وہ اسی کے پاس سوتے۔ پوری رات کبھی ایک کو لیٹرین جانا ہوتا' کبھی دوسرے کو' کبھی تیسرے کو اور چوتھے' پانچویں کی نیند بدل بدل کر رات بھی گزر جاتی۔ تیسرے نمبر والے کو بستر بھگونے کی عادت تھی۔ ہر گھنٹے بعد اس کا بستر بدلنا پڑتا۔ صبح تک گندے کپڑوں کا ڈھیر لگ چکا ہوتا تھا۔ جنہیں دھو دھو کر اس کی کمر اکڑ جاتی' مگر یہ کام کھویا بنانے کی مشقت اور گوشی خان کی مار سے بہتر ہی تھا۔

وہ اپنے ڈاکٹر چاچو کا انتظار کرتی' دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ اگر انہوں نے عدل کو بھیجا تھا تو یقیناً وہ خود بھی عنقریب آنے والے تھے۔ وہ اکثر سوچتی' عدل اچانک پلٹ کیوں گیا؟ شاید اسے کوئی ضروری کام یاد آگیا تھا؟ کوئی ضروری کال یا کوئی حادثہ اسے کھینچ کے واپس لے گیا تھا۔ اس کی خوشی' شادمانی اور دل میں چراغاں ہونے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ عدل اس کے گاؤں تک چلا آیا۔ آخر کوئی نہ کوئی کشش تو اسے کھینچ کے لائی تھی۔ کیا خبر اسے ڈاکٹر چاچو نے بھیجا ہو۔" وہ سوچتی الجھتی' کبھی ہنس پڑتی' کبھی رو پڑتی۔۔۔۔



وہ ایک مرتبہ پھر وقت کے پھیر میں تھی۔ وہ کرخت تند مزاج گونداز خان تھا۔ عسمی کا امیر کبیر شوہر' لاکھوں ایکڑ اراضی کا مالک۔ اس کے کئی بسوں کے اڈے تھے' کئی ٹرک ان اڈوں پہ کرایہ دے کر رکتے' کئی ویگن ڈرائیور اس کے تلوے چاٹتے۔ اپنے علاقے میں اس کی خاصی دھاک تھی' عام لوگ اس سے ڈرتے۔ اور رشتے دار اس کی دولت' امارت کی وجہ سے دب کر رہتے تھے۔

بلا کا اوباش فطرت تھا۔ اسے دیکھ کر کشتی اور دی بھی آگے پیچھے ہو جاتی تھیں۔ ویسے بھی وہ کشتی دی جیسی لڑکیوں کو گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ اس کی نگاہ ہیروں کی تلاش میں رہتی تھی۔ پھر یہ میلی' کچیلی گدڑی میں لعل جیسی لڑکی اس کی نگاہ سے کیسے اوجھل رہ جاتی؟ وہ اگر قیمتی پوشاک پہنتی تو کیسی لگتی؟ اس کے دھلے ہوئے سیدھے بال قیامت ڈھاتے' اس کی رنگت' آنکھیں شکل و صورت۔۔۔ سب کمال کا تھا۔ بس اسے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت تھی۔

وہ نگر نگر' شہر شہر گھوما ہوا تھا۔ ہر رنگ اور ہر فیشن

مند ہوتے ہی ان دونوں کی شادی کا ارادہ رکھتی تھیں۔ چاہے کچھ بھی ہو جاتا ہلال کبیر مانتے یا نہ مانتے۔

ادھر عدل خود احساس جرم کا شکار تھا۔ اسے اندازہ تو تھا جب وہ مورکھ سے واپس آئے گا تب مامن بہت ہنگامہ کرے گی اور اگر وہ جوئی کو بھی ساتھ لے آتا تب تو تباہی آجاتی۔ اسے اتنا "بے بس" دیکھ کر عدل کا دل بھر آیا تھا۔ وہ بہت کمزور اور بیمار لگ رہی تھی۔ عدل نے اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑ لیا۔

"اب کبھی ایسا مت کرنا۔" بہت دیر بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہو سکا تھا۔ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"میں تو بس تمہارے پیچھے جا رہی تھی۔ تم بتائے بغیر جو چلے گئے تھے۔" وہ بہت تھکے تھکے نڈھال لہجے میں بولی تھی۔ بہت معصوم سا انداز تھا۔ عدل کا جی بھر آیا۔

"تم بھی اب ایسا کبھی مت کرنا۔" مامن بھی جیسے ایک وعدہ لے رہی تھی' ایک عہد میں باندھ رہی تھی۔

"ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ نوبت ہی نہیں آئے گی۔ تم اس بستر سے اٹھو ہم امتحان سے پہلے ہی شادی کر رہے ہیں۔"

عدل اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔ مامن پہ شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔

"اور بابا؟" مامن کی آنکھوں میں ایک خدشہ سا لہرایا۔

"ان کو بھلا کیا اعتراض ہو گا؟ انہیں بھی تمہارے صحت مند ہونے کا انتظار ہے۔" اس نے جھک کر مامن کی پیشانی کو چوما تو جیسے اس کے جلتے بلتے دل کو قرار آگیا۔

"یہ بازی' یہ محبت کی بازی وہ ہارتے ہارتے جیت چکی تھی' وہ مورکھ جا کر بھی لوٹ آیا تھا۔ اس کی محبت کی طاقت مورکھ کے فسوں سے زیادہ تھی۔ اس نے اپنی پھوپھی سے سن رکھا تھا' وہ ہلال کبیر خان کی بھتیجی کے حسن سے خوف زدہ تھی۔ عدل کبیر صرف اسی کا تھا' اب کسی یقین کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جوگی کر موئی' رسوئی محض ایک تحریر میں چھپی رہ گئی تھی بے نام و نشان سی۔ گم شدہ وہ مورکھ کی دھول خاک اور مٹی بن چکی تھی۔

اس کی آنکھوں میں رتن (جواہرات) کی سی چمک تھی۔ وہ ___ وہ جیت کے نشے سے مخمور تھی۔ اسے بہت سال پہلے بابا کے سیف میں رکھا پیلا پھٹک کاغذ بھی بھول گیا جسے دیکھ کر وہ ہل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہر گزرتا دن اس کے لیے اذیت کا ایک نیا باب کھول دیتا تھا۔ مگر جب رات آتی تو امنگوں کے دیے جیسے روشن ہو جاتے۔ رات کی کوئی ایک گھڑی بہت نیک' بختاور اور مبارک ثابت ہوتی تھی۔ جو اسے فرحت' شادمانی' خوشی اور سرور کا وہ لمحہ بخش دیتی جب اس نے اپنی زندگی میں ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا جس کی آنکھوں سے مدھ بہتا تھا۔ جس کی پیشانی پہ روشنی بکھری تھی' جس کا چہرہ اس کے خیالوں سے زیادہ دل موہ لینے والا تھا۔ وہ جو اس کی پوری زیست کا حاصل تھا۔

پہلے پہل وہ لمحہ رات کو کسی وقت اس کی پلکوں پہ دستک دیتا تھا' پھر یہ پوری رات پہ محیط ہو گیا۔ پھر اس سے بھی کچھ آگے بڑھا۔ وہ دن میں بھی سپنے دیکھنے لگی۔ خمار آلود سا ایک خواب جاگتی آنکھوں کو گلابی کر دیتا تھا۔

وہ کڑاہے میں کڑچھا چلاتے چلاتے کھو جاتی' کہیں گم ہو جاتی' کسی جادو نگری میں پہنچ جاتی۔ اس کے گلاب ہونٹوں پہ مسکان چپکی رہتی۔ اس کے حسین گالوں پہ شفق بکھری رہتی۔ وہ موتی چور کے لڈو بناتے کبھی نہ تھکتی' نہ اسے رات بھر ٹھنڈ لگتی۔ وہ دال پیستی' چھانتی ___ اس میں گھی ملاتی' دہی' دودھ کے ڈرم الٹتی۔ بیکنگ پاؤڈر کے ڈبے کھولتی خود آٹا آٹا ہو جاتی۔ گھی کڑکڑاتی۔ چھلنی میں بوندیاں ڈال کر گھی میں گراتی' انہیں شیرے میں ڈبوتی' ٹھنڈا ہونے پہ چاندی کے ورق سجا کر لڈو بناتی۔ کبھی بے خیالی میں بوندیاں زیادہ لال پڑ جاتیں' کبھی سیاہ ہو جاتیں' تب گوشی کو غیض چڑھ جاتا تھا۔ وہ اسے چوٹی سے پکڑ کر گھما گھما کر تھپڑ مارتا۔ اس کے گال پھٹ جاتے' ان میں لہو کی بوندیں پھوٹ پڑتیں اور گوشی کے الفاظ اسے خون خون کر دیتے تھے۔

"حرام زادی! کس کے خیالوں میں رہتی ہے۔ سارا مال خراب کر دیا۔ اسے کون خریدے گا۔" لڈو کبھی زیادہ نرم پڑ جاتے تھے' کبھی لڈو سخت رہ جاتے' گھی کی مقدار میں کمی بیشی ہو جاتی تو لڈو پتھر کی طرح بنتے۔ کبھی کھویا جل جاتا' کبھی دودھ میں دہی ملا دیتی' کبھی دودھ میں بیسن گھول دیتی۔ سو سو کلو دودھ تباہ ہو جاتا' کھویا پھٹ جاتا۔ بے ذائقہ ہو جاتا' کبھی کڑاہے کے تلوے سے لگ کر سیاہ پڑ جاتا۔ تب ایک طوفان کھڑا ہو جاتا۔ گوشی خان گالیاں بکتا' چیختا چنگھاڑتا۔ اسے مارتا۔

"تیرے ہاتھوں میں سوراخ ہو چکے ہیں۔ اب تو کسی قابل نہیں رہی۔ تیرا کچھ اور بندوبست کرتا ہوں۔" وہ اسے گھورتا' آگ اگلتا باہر نکل جاتا تھا۔ پھر جوئی کی جیسے رسوئی سے جان چھوٹ گئی تھی۔ کیونکہ گوشی مال تیار کروانے کے لیے کاریگر لے آیا تھا۔ اوپر مرد اور عورتیں' ٹھٹھے لگاتے' قہقہے لگاتے' مذاق کرتے' ہنستے مسکراتے کام میں جتے رہتے۔ مگر سکھ پھر بھی اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ عسمی جب بھی اپنے شوہر سمیت یہاں آتی' جوئی کا سکھ چین دھواں دھواں ہو جاتا تھا۔ عسمی کے لاڈلوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری جوئی کے سر آجاتی تھی۔ وہ ان کی دن رات کے لیے آیا بن جاتی۔ عیش و عشرت میں پلے بڑھے بچے تھے۔ انتہائی نازک مزاج' چڑچڑے' مغرور' گھمنڈی' وہ سارا دن اسے تگنی کا ناچ نچائے رکھتے۔ وہ پھرکی کی طرح گھومتی' دن بھر ان کی سیوا کرتی۔ رات کو بھی وہ اسی کے پاس سوتے۔ پوری رات کبھی ایک کو لیٹرین جانا ہوتا' کبھی دوسرے کو' کبھی تیسرے کو اور چوتھے' پانچویں کی نیپی بدل بدل کر رات بھی گزر جاتی۔ تیسرے نمبر والے کو بستر بھگونے کی عادت تھی۔ ہر گھنٹے بعد اس کا بستر بدلنا پڑتا۔ صبح تک گندے کپڑوں کا ڈھیر لگ چکا ہوتا تھا۔ جنہیں دھو دھو کر اس کی کمر اکڑ جاتی' مگر یہ کام کھویا بنانے کی مشقت اور گوشی خان کی مار سے بہتر ہی تھا۔

وہ اپنے ڈاکٹر چاچو کا انتظار کرتی' دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ اگر انہوں نے عدل کو بھیجا تھا تو یقیناً وہ خود بھی عنقریب آنے والے تھے۔ وہ اکثر سوچتی' عدل اچانک پلٹ کیوں گیا؟ شاید اسے کوئی ضروری کام یاد آگیا تھا؟ کوئی ضروری کال یا کوئی حادثہ اسے کھینچ کے واپس لے گیا تھا۔ اس کی خوشی' شادمانی اور دل میں چراغاں ہونے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ عدل اس کے گاؤں تک چلا آیا۔ آخر کوئی نہ کوئی کشش تو اسے کھینچ کے لائی تھی۔ کیا خبر اسے ڈاکٹر چاچو نے بھیجا ہو۔" وہ سوچتی' الجھتی' کبھی ہنس پڑتی' کبھی رو پڑتی ___

☼ ☼ ☼

وہ ایک مرتبہ پھر وقت کے پھیر میں تھی۔ وہ کرخت تند مزاج گوہداز خان تھا۔ عسمی کا امیر کبیر شوہر' لاکھوں ایکڑ اراضی کا مالک۔ اس کے کئی بسوں کے اڈے تھے' کئی ٹرک ان اڈوں پہ کرایہ دے کر رکتے۔ کئی ویگن ڈرائیور اس کے تلوے چاٹتے۔ اپنے علاقے میں اس کی خاصی دھاک تھی' عام لوگ اس سے ڈرتے۔ اور رشتے دار اس کی دولت' امارت کی وجہ سے دب کر رہتے تھے۔

بلا کا اوباش فطرت تھا۔ اسے دیکھ کر کئی اور دی بھی آگے پیچھے ہو جاتی تھیں۔ ویسے بھی وہ کئی دی جیسی لڑکیوں کو گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ اس کی نگاہ ہیروں کی تلاش میں رہتی تھی۔ پھر یہ میلی' کچیلی' گدڑی میں لعل جیسی لڑکی اس کی نگاہ سے کیسے اوجھل رہ جاتی؟ وہ اگر قیمتی پوشاک پہنتی تو کیسی لگتی؟ اس کے دھلے ہوئے سیدھے بال قیامت ڈھاتے' اس کی رنگت' آنکھیں' شکل و صورت ___ سب کمال کا تھا۔ بس اسے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت تھی۔

وہ نگر نگر' شہر شہر گھوما ہوا تھا۔ ہر رنگ اور ہر فیشن

سے واقف تھا۔ اس کے زرخیز ذہن نے جوئی کے لیے لمحوں میں بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ اسے ڈری' سہمی' معصوم سی کنجشک (چڑیا) کو اپنے دام میں کرنا تھا اور یہ کام اس کے لیے ناممکن ہرگز نہیں تھا۔

گونداز خان نے اپنے اکلوتے سالے کو قابو میں کر لیا۔ اسے بڑا میٹھا دانہ پھینک کر پلا لیا۔ وہ دانہ چگتا ہوا اس کے جال میں آگیا۔ بات چونکہ اس کے بھلے کی تھی سو اس کے دل کو ٹھیک سے جا لگی۔ تھا وہ بھی بلا کا شاطر۔ سو حساب پورا کر کے معاملے کو آگے لے کر چلا تھا۔

پھر جو گوشی خان کے دبنگ فیصلے نے گھر میں بھونچال مچایا۔ ایک قیامت کا منظر نظر آیا۔ پہلی مرتبہ ماہی نے سینہ کوبی کی اور عسمی چھلہ بھلا کر بپھری ہوئی شیرنی کی دھاڑتی نظر آئی۔ گھر میں قیامت کا منظر تھا۔ بچے سہم گئے اور چپک چپک کر جوئی کے پہلو میں لگتے۔ اور جوئی ایسی متوحش کہ بچوں کی اوٹ میں خود کو چھپانے لگتی۔ تب یہ منظر دیکھ کر ماہی اور عسمی خوں خوار درندے کی مانند اس پہ جھپٹ پڑتیں۔

پچھلے کئی دن سے وہ عسمی اور ماہی کی مار کھا رہی تھی۔ کبھی ڈنڈوں سے' کبھی سوٹوں سے' کبھی جوتوں سے وہ اسے مار مار کے خود بھی بے حال ہو جاتیں۔ سینہ پیٹتیں' بین کرتیں۔ اسے گالیاں کوسنے دیتیں۔ بد دعائیں دیتیں۔۔۔ سر میں دھول اڑاتیں۔ کسی پل دونوں سکون نہیں پا رہی تھیں۔ گوشی اور گونداز خان کے سامنے ان کی زبان تک نہ ہلتی تھی۔ بس جوئی پہ چلتا تھا۔

"اے۔۔۔ تجھے میرے شوہر پہ ڈورے ڈالتے شرم نہ آئی۔ تیرے باپ کی عمر کا ہے حرام زادی۔ کیا اسی دن کے لیے تجھے اناج کھلا رہے تھے؟" مردوں کی غیر موجودگی میں عسمی ماتم کرتی' اسے لہولہان کر دیتی تھی۔ اسے سارا قصور جوئی کا نظر آتا۔ وہ نہ خوب صورت ہوتی' نہ اس کی شکل اچھی ہوتی اور نہ گونداز خان کی نگاہ میں ٹھہرتی۔

ماہی اور عسمی اس کی ماں اور نانی تک کو نہیں بخشتی تھیں۔ تاہم مردوں کے سامنے دونوں کی زبان تالو سے چپک جاتی۔ عسمی کو جیسے سانپ سونگھ جاتا تھا۔ شوہر کے دبدبے کی وجہ سے وہ زبان نہیں ہلا پاتی تھی۔



اسی کشمکش میں نکاح کا دن آگیا تھا۔ گوشی خان کے ان دنوں رنگ انوکھے تھے۔ وہ بڑا مسرور اور شاد نظر آتا تھا۔ بھاگ بھاگ کے نکاح کی تیاریاں کروا رہا تھا۔ انتظامات دیکھ رہا تھا۔ جوئی کے لیے پہلی مرتبہ قیمتی ملبوسات آرہے تھے اور وہ انہیں ایسی خوف زدہ نظروں سے دیکھتی جیسے وہ سانپ تھے جو اسے ڈس لینے والے تھے۔

نکاح سے ایک دن پہلے ماہی' عسمی کی تشویش ناک حالت کی وجہ سے گوشی خان کے لتے لینے لگی تھی۔

"تجھے حیا نہ آئی۔ اپنی منگ کا نکاح بہن کے شوہر سے کروا رہا ہے۔ تیری عقل کہاں گئی؟ بہن کی حالت بھی نظر نہیں آئی؟ وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئی ہے۔" ماہی زخمی شیرنی کی طرح دہاڑ رہی تھی جبکہ گوشی کا اطمینان قابل دید تھا۔ اس نے جیسے کان پر سے مکھی اڑائی تھی۔

"رہنے دو اماں! جھوٹ [illegible] وہ میری منگ نہیں۔" مسکرایا تھا۔ "رہی عسمی' تو اسے سمجھا دو۔ سالوں بعد اس کا شوہر کوئی فائدہ دے رہا ہے۔ ایک دفعہ فائدہ حاصل کر لوں' جس طرح نکاح کروا رہا ہوں۔ اسی طرح طلاق بھی دلوا دوں گا۔ ویسے بھی اس کا شوہر ڈال ڈال منڈلانے والا ہے۔۔۔ اسے کھو دل پرنہ لے۔" گوشی کی مسکراہٹوں کا کوئی انت نہیں تھا۔ ماں کے دل کو تسلی ہو گئی۔ لگ رہا تھا گوشی کوئی لمبا ہاتھ مارنے والا ہے۔ سو خود تو مطمئن ہو گئی تھی مگر عسمی کو اطمینان نہ دلا سکی۔ اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ وہ ٹکے کی چمرخ سی لڑکی' جسے ملازمہ جتنی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ وہ اس کی سوکن کا رتبہ پانے والی

تھی۔ اب وہ بے دم ہو چکی تھی۔ گونداز خان نے ایک ہی جھٹکے میں طلاق کی دھمکی دے کر اس کے سارے بل نکال دیے تھے۔ وہ اس کم ذات لڑکی کے لیے اتنا ہی باؤلا ہو رہا تھا جو پانچ بیٹے بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ ورنہ ان ہی بیٹوں کی ماں ہونے پر وہ اتراتی پھرتی تھی۔ نکاح کی سویر سے تو عسمی بالکل ہی خاموش ہو چکی تھی۔ ماہی کو اسے چپ دیکھ دیکھ کر ہول اٹھتے تھے۔

جوئی چوبارے پہ بیٹھی چپکے چپکے انہیں دیکھتی اور پھر سہمی نظروں کے ساتھ زرق برق ملبوسات پہ نگاہ ڈالتی۔ اس کا پورا وجود رعشہ زدہ مریض کی طرح کپکپا رہا تھا وہ کمزور لڑکی تھی۔ بے سہارا تھی۔۔۔ بے آسرا تھی تب ہی ایک سچ اگلنے کی جرات نہیں کر پائی تھی۔ کیونکہ نانی اور ڈاکٹر چاچو نے منع کر رکھا تھا۔ انہوں نے کہا تھا جب وہ اسے لینے آئیں گے تب سب کو بتا کر جائیں گے۔ وہ ان کے آنے سے پہلے کسی کو کچھ نہ بتائے۔ اور جوئی ایسی فرماں بردار تھی کہ ان کی نصیحت کو پلو سے باندھ گئی۔ اس کڑے وقت میں بھی کچھ بول نہ سکی۔

وہ ایسے ہی سر نیہوڑائے بیٹھی اپنے دکھوں اور زخموں کو دھو رہی تھی جب پڑوس والے چوبارے سے کسی کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر سر اٹھا کر بائیں طرف دیکھا۔ وہاں کرم خان کھڑا تھا۔ ہاتھ میں موبائل پکڑے۔ اسے اشارے سے بلا رہا تھا۔ وہ کچھ اور خوف زدہ ہو گئی۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو۔۔۔؟

وہ تھر تھر کانپتی کرم خان کو دیکھتی رہی۔ جو اس کا تذبذب اور خوف محسوس کر کے چھلانگ لگا کر چوبارے والی چھت پہ کود پڑا تھا۔ جوئی کا دل جیسے حلق میں آگیا۔

"لالئی! ڈرو نہیں۔۔۔ میں یہ موبائل لایا ہوں۔۔۔ چاچا صاحب کا فون آرہا ہے۔۔۔ ہر روز آتا ہے۔ پر اماں تمہاری ماہی کے خوف سے بتاتی نہیں۔ تمہاری ماہی نے منع کر رکھا ہے۔ چاچا صاحب کی کال تمہیں نہیں سنوائی۔ یہ لو۔۔۔ بات کر لو۔" کرم خان نے جیسے اسے کوئی مژدہ جاں فزا سنایا تھا۔ وہ موبائل کو بے یقینی سے دیکھنے لگی۔

جب نانی زندہ تھیں' تب اسی نمبر پہ ڈاکٹر چاچو کی کال آیا کرتی تھی۔ اس وقت پڑوسن کو ماہی کا خوف نہیں تھا۔ تب وہ موبائل بھیج دیتی تھی۔ مگر اب ایسا نہیں تھا۔ ماہی کی بدزبانی کے خوف سے کوئی بھی ادھر نہیں آتا تھا۔

جوئی اس ننھے سے مشینی پرزے کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتی رہی۔ ابھی اس سے چاچو صاحب کی آواز آنے والی تھی۔ وہ لمحہ لمحہ گننے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد اسکرین چمک اٹھی۔ کوئی باہر کا نمبر تھا۔ جوئی نے بے تابی سے موبائل کان سے لگا لیا۔

"ڈاکٹر چاچو! آپ کہاں چلے گئے۔" اس کے علاوہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔

اس کے الفاظ آنسوؤں نے نگل لیے تھے۔ وہ اپنے دکھ درد' تکلیف' مار' اذیتیں کچھ بھی نہ بتا سکی تھی۔ وہ انہیں یہ بھی نہیں بتا سکی تھی کہ نانی اسے اتنے گرگ کہن (پرانے' مکار' بھیڑیوں) کے جنگل میں تنہا چھوڑ گئیں۔ کیسے مکروہ لوگ اسے قیدی بنا رہے ہیں۔ اس کے پیروں میں زنجیریں ڈال رہے ہیں۔

چاچو کی آواز سن کر اس کے پورے وجود میں تھرتھری' کپکپی اور لرزہ طاری تھا۔ جبکہ دوسری طرف چاچو اس سے مخاطب تھے جیسے برسوں کے بیمار ہوں۔ جانے لائن میں خرابی تھی یا پھر وہ اتنی نحیف اور کمزور آواز میں بول رہے تھے' وہ اپنی بدحواسی میں کچھ سمجھ ہی نہ پائی تھی۔

"جوئی! میری بیٹی' میری جان! بہت تھوڑا وقت ہے میرے پاس۔ دھیان سے سن لو میری بات۔ میں ملک سے باہر ہوں۔ میں کسی کانفرنس میں شرکت کرنے نہیں آیا تھا۔ یہاں میں نے دل کی چیر پھاڑ کروائی ہے۔ کسی کو بتایا نہیں۔۔۔ غفیو پریشان ہوتی اور عدل اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ادھوری چھوڑ کر میرے پاس آجاتا۔۔۔ اس لیے سب کو لاعلم ہی رکھا۔ تمہیں بھی نہیں بتایا۔ میری پیاری بیٹی! میں بہت مضمحل ہوں۔ تھکان سے چور ہوں' بہت شل ہیں

میرے اعصاب' میں مایوس اور ناامید بھی ہوں۔ جانے تمہیں دیکھ پاؤں گا بھی یا نہیں۔ پتا نہیں یہ میری آخری کال ہو...... میری بیٹی! تم اچھے حالوں میں نہیں۔ میرا بس چلے تو اڑ کر تمہارے پاس آجاؤں اور تمہیں چاچی کی خواہش کے مطابق دھوم دھام سے اپنے گھر لے جاؤں۔ کاش کہ مجھے تھوڑی اور مہلت مل جاتی۔ ڈاکٹر مایوس نہ بھی ہوں' میں اپنی کیفیات سمجھتا ہوں۔ تم سے بات کرنے کے بعد عدل کو کال کرنے لگا ہوں۔ مجھے اس بچے نے چاچی کے بارے میں بتا دیا ہے۔ تم وہاں اب کن حالوں میں ہو' تم نہ بھی بتاؤ تو میں جانتا ہوں۔ میں عدل کو بھیج رہا ہوں...... وہ تمہیں وہاں سے لے آئے گا...... میری جان! یاد رکھنا' میرا بیٹا' رشتے اور محبتیں نبھانے والا ہے۔ وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا اور احتیاطاً" گھر کا پتا بھی لکھ لو۔ زیادہ بول نہیں پاؤں گا۔ میری سانس اٹک رہی ہے...... سن رہی ہو نا جوئی! میں ٹھیک نہیں ہوں۔"

ان کی آواز میں ٹوٹے کانچ کی جھنکار تھی۔ وہ اپنی آواز سے بڑھ کر بیمار تھے۔ ان سے تو بولا بھی نہیں جا رہا تھا اور یہی کیفیات جوئی کی تھیں۔ نہ وہ اپنی بے مایاں بتا سکی نہ ان کے لیے اپنی محبت کا اظہار کر سکی۔ اسے دراصل "اظہار" کا سلیقہ ہی نہیں تھا۔

"جوئی! عدل آجائے گا۔" وہ اس کے اندر روح پھونک رہے تھے۔ اسے زندگی بخش رہے تھے اور خود نجانے کن خاموشیوں کی اتھاہ میں گرتے جا رہے تھے۔ تب جوئی کو ہونٹ سیے دیکھ کر گرم خان نے موبائل اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ پھر اسے ڈپٹ کر بے ساختہ چیخا۔

"لالئی! چاچا صاحب کو بتاؤ' یہاں درندے تمہارا کیا حشر کر رہے ہیں۔ وہ تمہیں مارتے ہیں' اذیت دیتے ہیں اور آج تمہارا نکاح ہے۔ بتاؤ چاچا صاحب کو۔"

گرم خان کی گرم' پھنکارتی آواز لہروں کے دوش پہ بستر مرگ پر پڑے اس بہت پیارے شخص کے کانوں میں بھی پڑی تھی۔ ان کا دوسرے ہاتھ میں پکڑا موبائل' عدل کا نمبر ملاتی انگلیاں جیسے لمحوں میں بے جان ہو گئی تھیں۔ دونوں موبائل ان کے ہاتھوں سے گر پڑے تھے۔

"نکاح؟ نہیں...... نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ زیر لب بڑبڑائے تھے' پھر جیسے دھڑام کی آواز کے ساتھ لڑھک گئے۔ موبائل سے آواز آنا بند ہو گئی تھی اور ادھر جوئی کے پتھر وجود میں بھی جان پڑ گئی۔ وہ روتے روتے زمین پر ڈھے گئی۔ اس کے نیلے ہونٹ کپکپا رہے تھے' اس کا کمزور وجود جھٹکے کھا رہا تھا۔

"ڈاکٹر چاچو! مجھ سے دور چلے گئے ڈاکٹر چاچو! مجھے تنہا چھوڑ گئے ڈاکٹر چاچو جوئی تباہ ہو گئی فنا ہو گئی۔"

اب کون تھا جو ڈاکٹر چاچو کے سیف میں محفوظ راز کو کھول کر عدل تک پہنچاتا؟ وہ راز جس کے بارے میں صرف غفیو جانتی تھیں یا پھر ماں۔ جس نے بہت سال پہلے اس زرد کاغذ کو دیکھ کر نیند کی گولیاں پھانک لی تھیں' پھر غفیو کے یقین اور اس کاغذ کی معمولی سی اہمیت بھی نہ دیکھ کر وہ پھر سے جینے لگی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی سیف میں رکھا کاغذ کبھی بھی عدل تک پہنچ نہیں پائے گا۔ اس کا یقین غلط بھی نہیں تھا۔



اس کے ہاتھ سے آخری آس کا دیا بھی گر گیا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ ڈاکٹر چاچو کی آواز اب دوبارہ سنائی نہ دے گی۔ وہ پیارا انسان' وہ چاہتیں لٹانے والا شخص کبھی اس کی آنکھیں دیکھ نہ پائیں گی۔

دل جو ڈاکٹر چاچو کے انتظار میں لہولہو ہو رہا تھا اب خوف سے دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے اپنی بدبختی کا یقین ہو چکا تھا۔

اس کے آس پاس ناانصاف' ظالم' خبیث اور ستمگر لوگ تھے۔ اور جوئی تو خودرو جیسے پیڑ کی طرح تھی جس کے پتے تو تھے لیکن جڑ نہایت کمزور تھی اور جن پودوں کی جڑیں کمزور ہوں' وہ کب طوفانوں اور آندھیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اس کے لیے تو "دعائے خیر" کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

معا" کوئی دبے قدموں اوپر آیا تھا۔ جوئی کا ننھا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ایک دم سہم کر اٹھ گئی۔ اوپر آنے والی عسمی تھی' خونخوار تیور لیے سوجی آنکھیں بکھرے بال اور تھل تھل کرتا سراپا لیے۔ اس کے ہاتھ میں جوئی کی سب سے قیمتی متاع یعنی وہ صندوقچہ تھا۔ جس میں ایک سالوں پرانا راز پوشیدہ تھا۔ جوئی کا دل جیسے حلق میں آگیا۔ عسمی نے وہ صندوقچہ اس کی طرف اچھال دیا تھا۔ پھر ایک سیاہ چادر بھی اس کی طرف پھینکی اور اس کا بازو دبوچ کر رسوئی تک لے آئی۔

"یہاں...... سے بھاگ جا' یہ تیرے لیے سولی چڑھنے سے بہتر ہے۔ اگر گونداز خان سے بچ بھی گئی تو گوشی سے نہیں بچے گی۔ میرا گھر تو ٹوٹے گا ہی...... پر تو بھی برباد ہو جائے گی۔ یہ پکڑ کرایہ اور اپنے چچا کے پاس پنڈی چلی جا۔" وہ خونخوار عسمی' مہربان فرشتہ بنی اسے راہ دکھا رہی تھی۔ اپنا گھر بچانے کے لیے ہی سہی

"میں نے پچھلی طرف لکڑی کی سیڑھی لگائی ہے۔ تو چھت سے اتر کر پچھلی طرف سے بھاگ جا۔" عسمی اسے رسوئی کی پچھلی کھڑکی تک کھینچ لائی تھی۔ تب جوئی کے کمزور پڑتے وجود میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ اس نے جلدی سے صندوقچہ کھول کر اندر سے وہ خستہ حال لفافہ نکالا۔ لفافے کے اندر پیلا پڑتا' کاغذ موجود تھا اور ایک تصویر بھی محفوظ رکھی تھی۔ جوئی کی جان میں جان آئی۔ اس نے صندوقچے سے ہاتھ برابر کپڑے کی تھیلی نکالی۔ اسے بازو کے ساتھ باندھا اور آستین نیچے کر لی۔ چونکہ عسمی اکیلی اسے بھگانے کے منصوبے میں شامل نہیں تھی۔ بلکہ جنی' کشی اور ماہی بھی شریک تھیں۔ عام حالات ہوتے تو ماہی مفت کی نوکرانی کو کبھی عمر بھر ہاتھ نہ جانے دیتی۔ مگر اب معاملہ کچھ اور تھا۔ لاڈلی بیٹی کو تباہی سے بچانے کے لیے واحد حل یہی تھا کہ جوئی کو یہاں سے بھگا دیا جاتا۔ اور جوئی تھی کہ اس عظیم مہربانی اور رحم پر ان کے تمام پچھلے گناہ بھی معاف کرنے کو تیار تھی۔ جوئی کھڑکی سے کودنے لگی تب عسمی نے لمحہ بھر کے لیے اسے روک لیا۔

"تیرے پاس وقت بہت کم ہے...... احتیاط سے منہ چھپا کر نکلنا۔ اور ہاں ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا۔ ہم سب اپنے اپنے گناہ کی پکڑ میں آچکے ہیں۔ اماں نے اور ہم نے تیرے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ جا اللہ کی امان میں......"

عسمی کی بھرائی آواز جوئی کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے گردن موڑ کر آخری مرتبہ عسمی کی طرف دیکھا تھا۔ اور گویا اس کا کلیجہ حلق میں آگیا۔ عسمی کے پہاڑ جیسے وجود کے پیچھے گوشی خان کھڑا تھا۔ جوئی کا خوف و ہراس کا مارا دل کٹ کٹ کر گرنے لگا۔ اور کچھ یہی حال عسمی کا بھی تھا۔ وہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گئی۔ گوشی خان کے تیور ہی کچھ ایسے تھے۔

"پیچھے ملا کے آنے کا وقت ہو چکا ہے اور تو اسے گھر سے بھگا رہی ہے۔ جاتے جاتے اپنے گناہ بھی بخشوا رہی ہے۔ تیرا تو کچھ مزا چکھاتا ہوں پہلے اس بھگوڑی سے نپٹ لوں۔"

گوشی خان عسمی کو گھسیٹ کر رسوئی سے باہر لے گیا تھا۔ پھر بڑا دروازہ بند کر کے تھرتھر کانپتی جوئی تک آیا۔ رسوئی میں دروازہ بند ہونے کی وجہ سے ملگجا اندھیرا پھیل گیا تھا ایک ہیبت ناک منظر' دل دہلا دینے والا نظارہ...... سامنے کھڑا مرد اس کا ماموں زاد بھائی نہیں کوئی درندہ لگ رہا تھا۔ کوئی خوفناک بھیڑیا دکھ رہا تھا۔

"حرام زادی! کس کے پاس بھاگ کر جا رہی تھی؟ تیرا چاچا مر گیا' شہر سے اطلاع آئی ہے۔ اب تیرا جانا بیکار ہے۔ وہاں تجھے کس نے منہ لگانا ہے۔ ادھر تجھے عزت سے بیاہ رہا تھا پر تجھے عزت راس نہیں آئی۔"

"شہر سے اطلاع آئی ہے تیرا چاچا مر گیا ہے" جوئی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ منہ کے بل گری اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی تھی۔

جب اسے ہوش آیا۔ تب اس کے گرد ایک ہجوم تھا۔ سینہ پیٹتی ماہی' کشی' زبی اور گم صم کی عسمی جو اتنی بے بس تھی کہ نہ بھائی کو روک سکتی تھی۔ نہ شوہر

کو۔۔۔ پانچ لڑکوں کو پیدا کر کے بھی وہ کوڑی کی تھی۔ وہ بے آواز رونے لگی تھی‘ تب ماں ماتھا پیٹتی چیخی۔

”رونے کے سوا تیرا اور کام ہی کیا ہے؟ مان جا تو بڑی بدنصیب ہے۔ بھاگ بھی نہیں سکی۔“

مای بہت بجھی بجھی تھی۔ جیسے سارے بل نکل گئے تھے۔ بیٹی کی راجدھانی پہ قبضہ ہونے والا تھا۔ وہ بھی اس کے اپنے بیٹے کی سازشوں اور منصوبوں کی دولت۔ مای کا بس چلتا جوئی کو اسم پڑھ کر غائب کر دیتی۔ مگر بس ہی تو چلتا نہیں تھا۔ نہ بیٹے کے سامنے جرات تھی نہ داماد کے سامنے۔ دونوں ہی لالچی اوباش تھے۔ پاس ہی زرق برق لباس پڑا تھا۔ زیورات کے ڈبے‘ لشکارے مارتا سامان۔۔۔۔ چمکیلا‘ ملائم‘ نفیس لباس۔۔۔ نیا نکور‘ عمر بھر جس جوئی کو نیا کپڑا نصیب نہیں ہوا تھا اس کے لیے ملبوسات کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ وہ سب زخمی نظروں سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھیں۔

”موئے نے طلاق کی دھمکی دی ہے۔ اب عسمی بولی تو بچوں کی بھی پروا نہیں کرے گا۔ وھن‘ دولت کا مان ہے اسے۔“ مای اونچی آواز میں رونے لگی تھی۔ یہ بھی وقت جوئی پہ آنا تھا جب مای اپنے دکھڑے جوئی کو سنائی۔ قدرت کا انصاف شاید اسی کو کہتے ہیں۔۔۔۔ کل تک جو سب کے پیر کی جوتی تھی۔ آج ان سب کے جھرمٹ میں بیٹھی تھی۔ اسے وقت وقت کی بات کہتے ہیں۔

جوئی کسی بے جان مورتی میں ڈھلی بیٹھی تھی جب دو عورتیں اسے پکڑ کر لباس بدلوانے‘ منہ دھلوانے لے گئی تھیں۔ تب کمرے میں پھر سے صف ماتم بچھ گئی۔ مای پچھاڑ کھا کے بے ہوش ہو گئی۔ آخر اس کی گناہ گار آنکھوں نے یہ سب بھی دیکھنا تھا۔ کشی اور دی رونے لگی تھیں۔ بچے الگ سہم رہے تھے جبکہ عسمی گم صم اور خاموش تھی‘ چپ چاپ ٹکر ٹکر دیکھتی رہی تھی۔ یہ تقدیر کا مذاق نہیں‘ انصاف تھا۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ جس لڑکی کی ہستی کو انہوں نے رول دیا۔ جس کا بچپن چھین لیا اور جس کا لڑکپن چولہے میں جھونک دیا۔ ذلت‘ مار‘ دھتکار جیسے تحفے میں دی جاتی تھی۔ آج وہی لڑکی عسمی کی راجدھانی میں حصہ دار بننے جا رہی تھی۔ اللہ کس کس طرح سے بندے کے غرور کو توڑتا ہے۔ عسمی پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔

پھر جب چاندی میں ڈھلی اس چینی کی مورت کو سجا بنا کر لایا گیا تو سب کی آنکھیں ابل پڑیں۔ وہ گندی بدبودار میلی کچیلی جوئی تو لگ نہیں رہی تھی۔ کوئی حور شمائل تھی یا نازک سی پری۔۔۔ ان کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ دل میں حسد‘ کینہ‘ بغض اور حقارت امڈ آئی۔ کاش کہ اس لڑکی پہ گرم تیل یا تیزاب پھینکا جا سکتا۔ کچھ دیر بعد ملا صاحب آگئے۔ گونداز خان اکڑ اکڑ کر برابر چل رہا تھا۔ آج تو اس کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ کیا ٹھاٹ باٹ تھے اس کے۔۔۔ بیوی کے میکے میں بیٹھ کر اسی پہ سوکن لا رہا تھا اور جوئی کو دیکھ کر تو اس کے تیور ہی بدل گئے۔ اس کی ہوس زدہ نظریں جوئی کے آر پار اترنے لگیں۔ وہ ملا کو ٹہوکا دے کر بے تابی سے بولا۔

”جلدی سے نکاح پڑھا دو۔“ جوئی کی اتری صورت اور چہرہ وجود کو دیکھ کر وہ خدشوں کا شکار تھا۔ اس لیے رسمی کارروائی سے جلد از جلد جان چھڑوانا چاہتا تھا۔ ایک عورت ”اندر سے“ کی طشتری اٹھا لائی تھی۔ خاص قسم کی مٹھائی تھی جو رواج کے مطابق نکاح کے وقت بانٹی جاتی۔ چاول کے آٹے سے بنتی تھی۔ پھر گھی میں تلی جاتی۔ ہر طرف تازہ مٹھائی کی مہک تھی۔ کچھ دوشیزہ نئیں ”اک تارا“ پہاڑی گیت گا رہی تھیں۔ گونداز خان نے انہیں ڈپٹ کر‘ جھاڑ کر‘ غصہ کر کے خاموش کروا دیا تھا وہ منہ ہی منہ بڑبڑاتی باہر نکل گئی تھیں۔ پھر ملا صاحب نے کارروائی شروع کی۔

تب ہی ایک عورت حواس باختہ اندر آئی۔

”خان! عسمی نے زہر پھانک لیا۔“ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ گونداز خان کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ وہ بل کھاتا باہر کی طرف لپکا تھا۔ ارادہ تو یہ تھا کہ عسمی کا گلا ہی دبا دے۔ کیسی منحوس عورت تھی۔ نکاح کی گھڑی میں بدشگونی اور نحوست پھیلا گئی۔ مگر عسمی کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اور جسم بے آب مچھلی کی طرح جھٹکے کھا رہا تھا۔

گونداز خان کو اسے اٹھا کر ہسپتال لے جانا پڑا۔ آخر وہ اس کے پانچ لڑکوں کی ماں تھی۔ وہ لڑکے جو اس کے وارث تھے۔ گونداز خان کو زمان و مکاں بھول گئے۔ اور ادھر نکاح کی کارروائی ادھوری رہ گئی۔ عسمی کی خودکشی جیسے بھونچال لے آئی تھی۔ مای‘ دی‘ کشی روتی پیٹتی ساتھ ہو گئیں۔ بچے تڑپتے‘ روتے بلکتے بت بنی جوئی سے لپٹ گئے تھے اور جوئی جیسے پھانسی کے تختے سے اتر آئی تھی۔ اس نے بلکتے بچوں کو دلاسا دیا۔ انہیں پیار کیا۔ ایک ایک لڈو پکڑایا اور خود کپڑے بدلنے چل دی۔ عروسی لباس کو نوچ کھسوٹ کر خالی گٹھرے میں ٹھونس آئی۔ زیورات اتار کر پھینک دیے تھے۔ اس کا روم روم عسمی کے لیے دعا گو تھا۔

رات بارہ بجے کے قریب ان کی واپسی ہوئی۔ عسمی کی حالت بہتر تھی۔ تاہم ابھی ہسپتال میں تھی۔ مای اور گوشی خان وہیں تھے۔ کشی اور دی آگئی تھیں۔ وہ بچوں کو کھینچ گھسیٹ کر اسے نفرت سے دیکھتی اپنے کمرے میں لے گئی تھیں۔۔۔ جوئی مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بن گئی تھی۔ رات کے اس پہر وہ تالی کی رضائی میں گھسی عسمی کے لیے آنسو بہا رہی تھی۔

معاً لکڑی کا کواڑ چرچرانے کی آواز آئی تھی۔ بڑا قدیم کواڑ تھا۔ جس کے کنڈے بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔ چٹخنیاں بھی نہیں تھیں۔ کواڑ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ ایک زرد اکلوتا بلب تھا۔ جو پچھلے سال جالا اتارتے ٹوٹ گیا تھا۔ پھر کسی کو بلب لگانے کی توفیق نہیں ہوئی تھی اور اس وقت گھپ اندھیرے میں کوئی دبے قدموں چلتا ہوا چارپائی تک لے آیا۔ اس نے لحاف کھینچ کر اندر دبکی تھر تھر کانپتی جوئی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دبا لیا۔ اب وہ اسے گھسیٹ کر اٹھا رہا تھا۔ اس کی گرفت سخت تھی اور کھردرے ہاتھوں سے اس کے مرد ہونے کا اندازہ ہوتا تھا۔ جوئی کا دل حلق میں آگیا‘ اس کی چیخیں گھٹ گئیں۔

کیا گوشی خان؟ وہ لوٹ آیا تھا؟ اس کی آنکھوں میں صبح کا منظر چبھنے لگا۔ رسوئی میں موجود گوشی خان‘ پلید اور نجس نگاہ سے دیکھتا ہوا۔ تو کیا ابھی وہ پھر اپنے ناپاک عزائم کو پورا کرنے کے لیے آیا تھا؟

وہ خود کو چھڑانے کی کوشش میں ہلکان ہونے لگی۔ مگر وہ ذلیل اسے پچھواڑے کے ایک کاٹھ کباڑ سے بھرے کمرے میں لے آیا تھا۔ اس قدر شدید اندھیرا تھا کہ آنکھیں پھاڑنے سے بھی کچھ نظر نہ آتا۔

معاً اس کے منہ کو آہنی شکنجے نے آزاد کر دیا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اس دیو ہیکل وجود سے دور ہٹی تھی۔ اسی پل کمرے میں زرد بلب کی روشنی پھیل گئی تھی۔ پھر جوئی نے سامنے کھڑے وجود کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ وہ گوشی خان نہیں گونداز خان تھا۔ جوئی جیسے تھر تھر کانپنے لگی اور وہ اسے کانپتے دیکھ کر خباثت سے مسکرایا تھا۔

”آ۔۔۔ ہا‘ سہمی چڑیا! بہت مہنگی پڑی ہو مجھے! شہر میں دس کنال زمین دے کر گوشی خان سے تمہیں خریدا ہے۔ بڑا مکار سودے باز تھا۔ پکے کاغذ پہ لکھوا گیا اور بہن نے زہر پھانک کر نکاح کو التوا میں ڈال لیا۔ چلو یوں ہی سہی۔ نکاح آج نہیں تو کل ہو جائے گا۔ مگر گونداز خان ”ملکیت“ آج ہی اپنے نام کروائے گا۔ اب نہ ہوشیاری دکھانا نہ شور مچانا۔۔۔ ورنہ انجام برا نہیں‘ بہت بدترین ہو گا۔ پھر میں تم سے نکاح نہیں کروں گا۔ تمہارا بیوپار کروں گا۔ تمہیں ہر روز بیچوں گا۔ تمہاری بولی لگواؤں گا۔ خود سوچ لو ایک جیب میں بے شمار سکھ ہیں۔“

مونچھیں مروڑتا ایک ایک قدم چلتا اس کے قریب آ رہا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے بچانے کے لیے اب کسی نے نہیں آنا تھا۔ اللہ نے اسے ایک موقع دیا تھا۔ وہ موقع جوئی گنوا چکی تھی۔

اس کے ہاتھ جوئی کی گردن کو چھونے لگے تھے‘ نرم نازک جلد کی ملائمت کو محسوس کرنے لگے تھے‘ عنابی رنگ میں دہکتی موم گڑیا آنکھیں میچے خوف سے

پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس کا خوف گوندا زخان کے لطف کو بڑھا رہا تھا۔ وہ اس کے نرم گالوں کو چھونے لگا۔ جوئی خوف زدہ سی کچھ اور پیچھے کی طرف کھسکی تھی پھر چھال سے بھرے کھڑے پہ جاگری۔ وہ جانور اس پہ جھکنے لگا تھا جب ایک دم بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹا۔

اس کے دیوہیکل وجود کے پیچھے انسانی ہیولا کھڑا تھا۔ سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا۔ جس کے ہاتھ میں وزنی پلاس تھا۔ وہی پلاس کے بعد دیگرے گوندا زخان کے سر پہ برسنے لگا۔ ٹھک ٹھک..... اس کے سر سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے تھے۔ اس کا منہ 'ماتھا' ناک خون سے بھر گیا۔ سر کی سخت ضرب نے اسے منہ کے بل گرا دیا۔ وہ اٹھ کر حملہ آور کو دبوچنے کے قابل نہیں رہا تھا بلکہ کسی رینگنے والے کیڑے کی طرح زمین پہ ڈھے گیا تھا۔ وہ منہ کھولے کراہ رہا تھا اور اس کے سر سے بہنے والا لہو اس کے منہ پر گر رہا تھا۔

سیاہ لبادے والے ہیولے نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ پھر وقت ضائع کیے بغیر وہ دونوں کاٹھ کباڑ سے بھرے کمرے کی حدود سے نکل گئے۔ اس کے ساتھ موجود انسانی ہیولا مرد تھا یا عورت؟ جوئی جان نہ سکی۔ وہ بھاگتی بھاگتی آلو بخارے کے باغ میں آگئی۔ اس کے پیچھے آنے والے آسیب بہت ہی پیچھے رہ گئے تھے۔

جبکہ برابر بھاگتا ہیولا بھی رک گیا تھا۔ گھپ اندھیرے اور مہیب سناٹے میں جوئی نے ایک بہت اپنائیت بھری آواز سنی تھی یہ آواز کس کی تھی؟ وہ لمحوں میں پہچان گئی۔

"بخت گل تم۔" جوئی کے ہونٹ پھڑپھڑا گئے تھے یہ بخت گل تھی جوئی کی آنکھیں بہنے لگیں۔ وہ بخت گل سے لپٹ گئی۔ وہ اس کے ہاتھ چومنے لگی۔

"رونا نہیں..... رونے کے دن گئے، تم اب واپس نہیں جاؤ گی۔ پل کے پاس خان کھڑا ہے۔ وہ کان والا۔ وہ تمہیں پنڈی پہنچا کر آئے گا۔ اس پہ بھروسا کر لینا۔ تیری طرف میلی نظر سے نہیں دیکھے گا۔" بخت گل نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

جوئی عمر بھر اس کا احسان نہیں اتار سکتی تھی۔ اس نے جوئی کی عزت بچائی تھی۔ اسے سہارا دیا تھا اس کی مدد کی تھی۔ مختصر الفاظ میں بخت گل نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ کیسے جوئی کو لینے نائی کے کمرے میں پہنچی۔ اس کے نکاح کی خبر سن کر وہ منصوبہ بنانے آئی تھی مگر جوئی کو کمرے میں نہ پا کر چونکی ہوگئی۔ پھر جلد ہی اسے پچھواڑے سے آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ وہ اندازے سے پیچھے کی طرف آئی تھی۔ پھر اس شیطان کو دیکھ کر اس پر جھپٹ پڑی تھی۔ جوئی کو بچانا تھا' اللہ نے اسے وسیلہ بنا کر بھیج دیا۔ اور اللہ بہترین وسیلے بنانے والا ہے۔

"اب جا بھی خان انتظار کر رہا ہوگا۔" بخت گل نے اسے پگڈنڈی کی طرف دھکیلا تھا۔ تب جوئی نے بھرائی آنکھوں سے اندھیرے میں بخت گل کو دیکھنا چاہا۔ وہ اس کی محسنہ تھی۔ پوری دنیا میں ڈاکٹر چاچو کے بعد صرف ایک واحد ہستی' جو اس کا بھلا چاہتی تھی۔ جو عادتاً "اچھی نہ سہی مگر فطرتاً "بری نہیں تھی۔ جو اسے زندگی کا ایک نیا سبق پڑھا رہی تھی۔

"ہمیشہ بات کے مثبت پہلو کی طرف غور کرو۔ منفی پہلو خود بخود پس منظر میں چلے جائیں گے۔" اس نے اندھیرے میں ہاتھ ہلایا تھا' جو جوئی کو نظر نہ آسکا۔ وہ اس کی بازگشت سنتی جا رہی تھی۔

"زندگی میں ناکامیاں اس لیے آتی ہیں..... تاکہ وہ اپنے بعد آنے والی کامیابیوں کے لیے راہ ہموار کر سکیں۔" آلو بخارے کے باغ میں کھڑی لڑکی بلند آواز میں کہہ رہی تھی۔ جوئی کے قدم لحہ بھر کے لیے رک گئے۔

"مجھے ڈر ہے۔ گوندا زخان کو پتا نہ چل جائے۔ زخمی درندہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔" جوئی اپنا خوف کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ اسے بخت گل کی فکر تھی۔

"اس کے باپ کو بھی نہیں پتا چلے گا۔" وہ اپنے لبادے کی وجہ سے مطمئن تھی۔

"اب چلی جاؤ اور کبھی بھی پیچھے لوٹ کر مت آنا تمہارے حصے کے موسم گل تمہیں پکار رہے ہیں۔"

بخت گل کی آواز نمی میں ڈوب گئی تھی۔

وہ پگڈنڈی پہ بھاگتی جا رہی تھی۔ پیچھے مڑے بغیر' دیکھے بغیر داہنے بازو پہ بندھی تھیلی میں موجود اس تصویر والے کے بھروسے پہ جسے زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے آلو بخارے کے باغ میں دیکھا تھا۔ وہ شخص جس کی آنکھوں سے مدھ بہتا تھا۔ وہ جو اس کی زندگی کا پہلا اور آخری خواب تھا۔ وہ جو اس کے لیے پوری حیات تھا' اس کے دل کی بڑی انمول کتاب تھا۔ سیاہ آسمان پہ چمکتا مہتاب تھا۔ عذاب لمحوں کا سراب تھا' اندھیرے رستوں میں روشنی کا مینار تھا' چمکیلا' روشن' تاباں اور درخشاں۔

آج بھاگتے بھاگتے جوئی کو کوئی ٹھوکر نہ لگی' نہ وہ گری' نہ وہ سنبھلی نہ وہ اٹھی۔ بس بھاگتی رہی بغیر رکے بغیر مڑے۔ دھند کے پار جیسے عدل کبیر خان کھڑا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے داہنے بازو پہ ہاتھ رکھا۔ تھیلی میں اک تصویر اور خستہ سا پیلا پڑتا کاغذ محفوظ تھا۔ اس کے اور عدل کے نام سے سجا جیسے عدل کے نام سے بڑھ کر کچھ نہ تھا۔ زمانے کی ہر خوشی اس خستہ حال کاغذ کے سامنے ہیچ تھی۔ جس پر عدل کا اور اس کا نام لکھا تھا۔

تمہارے نام کے حرفوں سے بہتر' حرف ابجد میں نہیں ہیں۔

نجانے کب سے یہ موسم
ستاروں کی طرح دھرتی کے سینے پر فروزاں ہیں
مگر ان کی نگاہوں نے
تمہارے وصل کے لمحوں سے بہتر وقت
دیکھا ہے نہ سوچا ہے
ہوا نے منظروں پر آج تک جو کچھ بھی لکھا ہے
تمہارے نام لکھا ہے
خلا میں ٹوٹتے تارے
تمہارے بام سے گزریں تو رکنے کو مچلتے ہیں
فلک کو چومتے جذبے
تمہاری آنکھ سے اتریں تو پاتالوں میں گرتے ہیں
تمہارے "خواب" سے روشن منارے
وقت کے دریا کے بے حد میں نہیں ہیں
تمہارے نام کے حرفوں سے بہتر حرف ابجد میں
نہیں ہیں!

دھند میں کھویا پل اب اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ مورکھ کی حسین پہاڑیاں دور رہ گئی تھیں۔ دھند میں کھویا آلو بخارے کا باغ اسے اداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بہتی رواں ندی اس کے لیے دعائے خیر کر رہی تھی۔ کھلا آسمان اسے نرمی سے دیکھ رہا تھا۔ بہت سے کریہہ' دردناک' خوفناک منظر پیچھے رہ گئے تھے' ایک ذلت بھری زندگی کا طوق اس کے گلے سے پھسل کر گر پڑا تھا۔ مشقت بھرے دن رسوئی میں جاگ جاگ کر گزاری راتیں' وہ کھوئے کا کڑاہا..... سب پیچھے رہ گیا۔ اس کی زندگی کے ایک بھیانک دور کا اختتام ہو گیا تھا۔

مگر اس کی زندگی کا دوسرا بھیانک دور شروع ہو گیا تھا

البیلے سنہرے خوابوں کے جگنوؤں کو سنبھالتی اس لڑکی کو خبر کہاں تھی؟



اینٹ کا اینٹ سے ربط ختم ہو جائے تو دیواریں اپنے ہی بوجھ سے گرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ زندگی کا مسرتوں سے ربط ختم ہو جائے تو زندگی ایک بوجھ کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ مگر بعض غم بہت وزنی ہوتے ہیں' ان کا بار پہاڑ تک اٹھا نہیں پاتے۔ وہ ایسے ہی رنج و غم کا شکار تھا۔ ایسے ہی ایک ملال کی گرفت میں تھا۔ کاش وہ اتنا لاپروا نہ ہوتا' کاش اپنی کامیابیوں کے پیچھے اندھا دھند بھاگتے ہوئے وہ اتنا غافل نہ ہو جاتا۔

زندگی کی سب سے بڑی خوشی پا کر بھی وہ ادھورا تھا۔ فارن سروسز کا خواب پورا ہو جانے کے باوجود بھی وہ خوش نہیں تھا۔ امن کے ملنے کا یقین رکھنے کے باوجود بھی مطمئن نہیں تھا۔

یہ ادھورا پن ایک شخص کے اچانک چلے جانے کی بدولت تھا۔ اسے اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی

یقین نہ آتا۔ وہ دیوانوں کی طرح پورے گھر میں بولایا بولایا پھرتا تھا۔ کبھی گھنٹوں اسٹڈی روم میں گھسا روتا رہتا، کبھی لان میں تنہا جانے کن سوچوں میں گم رہتا تھا۔ وہ اس غم سے سنبھل نہیں پا رہا تھا۔

غفیرہ کے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ عدل ان کی واحد اولاد اور آخری سہارا تھا۔ وہ اسے گھٹ گھٹ کر جیتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ مامن کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود وہ نارمل نہیں ہو پا رہا تھا۔

ابھی اسے جوائننگ لیٹر نہیں ملا تھا ورنہ اسی مصروفیت میں کچھ بہل جاتا۔ وہ عدل کی وجہ سے بہت اپ سیٹ تھیں۔ یہی حال مامن کا بھی تھا۔ وہ اب پوری طرح سے صحت یاب تھی۔ مامن اتنے شدید حادثے کے بعد بھی پہلی پوزیشن برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور زندگی میں پہلی مرتبہ عدل نے اس کی خوشی کو سیلیبریٹ نہیں کیا تھا، وہ تو اپنی کامیابی پہ بھی کوئی رسپانس نہیں دے پایا تھا۔

دن ایسے ہی اداس ویران اور بوجھل گزر رہے تھے۔ گھر پر خاموشی اور سناٹے کا ہی راج رہتا، مامن نے یونیورسٹی کو خیرباد دیا تھا وہ زیادہ سے زیادہ عدل کو وقت دیتی تھی۔ اسے زبردستی گھسیٹ کر لاؤنج میں لے آتی، کبھی آؤٹنگ کا پروگرام بنا لیتی، کبھی لانگ ڈرائیو پہ نکل جاتی، اس کے پاس بیٹھ کر اسے ٹیکسٹ کرتی، اپنی طرف متوجہ کرتی اسے بولنے پہ اکساتی، پھر تنگ آ کر اکثر رونے لگتی۔ وہ عمر بھر توجہ سمیٹتی آئی تھی اب عدل کی بے توجہی اسے پہروں رلاتی، وہ شکوے کرتی، ناراض ہوتی، غصہ کرتی، روٹھتی اور پھر مان جاتی۔

اکثر تو مامن کے ہر وقت سر پہ سوار رہنے کی وجہ سے وہ اکتا جاتا تھا۔ خفا ہونے لگتا، تنہائی چاہتا، تب مامن بہت بددل ہو جاتی تھی، خفا ہونے لگتی، عدل سے نہ بولنے کی قسم کھاتی، اور پھر اپنی قسم کو خود ہی توڑ دیتی۔ عدل کے تنفر اور وحشت کو دیکھ کر اسے ترس آنے لگتا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر عدل کے آس پاس گھومنے لگتی، وہ چاند کے گرد گھومنے والی چکور تھی۔

ایسی ہی ایک غضب کی اداس شام عدل اسٹڈی روم سے نکل کر غفیرہ کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ سوجی آنکھیں، بکھرے بال، اداس چہرہ، سلوٹ زدہ کپڑے۔ غفیرہ کے دل کو دھکا سا لگا۔ کیا یہ ان کا ٹک سک سے تیار رہنے والا بیٹا تھا۔

"میری جان! تم تو ماں کو بھی بھول گئے۔" بے ساختہ ان کے لبوں سے شکوہ پھسل پڑا تھا۔ تب عدل نے بڑی زخمی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو "بھلا ایسا ہو سکتا ہے۔"

"بیٹے! خود کو سنبھالو اب۔ تمہیں تو مجھے سنبھالنا تھا جبکہ تم خود ہی حواس چھوڑ بیٹھے ہو۔" انہوں نے دکھ سے کہا تھا۔ تب عدل ان کی گود میں اپنا سر رکھ کر سسک پڑا تھا۔

"مما! وہ کیسے چلے گئے؟ وہ بیمار کہاں تھے! انہوں نے بتایا ہی نہیں۔ میں خود ان کے ساتھ جاتا۔ میں آخری وقت ان کے قریب رہتا، میں کتنا بدنصیب ہوں۔" بہت دنوں بعد وہ دل کی بھڑاس اور غبار کو نکالنے کے قابل ہوا تھا۔ جیسے اپنے اندر موجود ملال کے غبار کو باہر نکالنا چاہتا تھا۔ یہ ملال جو کسی نوکیلے کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ اذیت دے رہا تھا۔

"وہ تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ تم ان کے ساتھ جاتے تو امتحان نہ دے پاتے۔ شاید اسی لیے میری جان! اب ان کی روح کو تکلیف مت دو، وہ تمہیں ذرا بھی دکھی یا غم زدہ نہیں دیکھ سکتے تھے، یاد کرو۔" غفیرہ نے پھر جذباتی انداز میں اسے سمجھایا تھا۔ ایسے ہی بابا کی یادوں کا ذکر کرتے اچانک اسے خیال گزرا تو وہ بے قرار سا اٹھ بیٹھا تھا۔

"مما! مورکھ اطلاع دی تھی کیا؟" اس کا سوال بہت غیر متوقع تھا۔ یوں کہ غفیرہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہی ہو گئی تھیں۔ آخر اسے مورکھ کا خیال کیسے آ گیا تھا ان کے اندر پھر سے دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔

"ہاں۔" بہت دیر کی خاموشی کے بعد بالآخر انہوں نے سنبھل کر جھوٹ کا سہارا لیا۔ اگرچہ ہلال کبیر کی ڈائری میں مورکھ والوں کا فون نمبر موجود تھا مگر انہوں

نے اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ مورکھ والوں کو بلا کر انہوں نے اپنے گلے میں مصیبت نہیں ڈالنا تھی۔ اگر وہ ساتھ اس طوق کو بھی اٹھا لاتا تب؟ اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھیں۔

"پھر وہ لوگ آئے کیوں نہیں؟ بابا کی چاچی! ان کی فیملی؟ اور بابا کی بھتیجی... کوئی بھی نہیں آیا۔" ایک اور متفکرانہ سوال آیا تھا۔ وہ اتنا بے چین اور بے قرار کیوں تھا؟ غفیرہ کے اندر گرہیں پڑنے لگیں۔

"ان لوگوں کے ہلال کے ساتھ تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔ میرا خیال ہے وہ اسی لیے نہیں آئے۔" انہوں نے جان بوجھ کر مختصر بات کر کے گفتگو کو سمیٹنا چاہا تھا مگر وہ بال کی کھال اتارنے لگا تھا۔ بالوں میں انگلیاں پھنسائے عجیب بے چینی بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"وجہ کیا تھی؟ تعلقات کیوں خراب تھے؟ مما! بابا نے اس بارے میں ہمیں کیوں نہیں کچھ بتایا اور آپ کو پتا ہے، میں مورکھ گیا بھی تھا مگر واپس آ گیا... جب موی کا ایکسیڈنٹ ہوا... بعد میں مصروفیت 'ایگزامز' انٹرویو، پھر بابا کی اچانک ڈیتھ... کیا مجھے وہاں جانا چاہیے؟" عدل بے ربط سا بول رہا تھا۔ ان کے اندر آندھیوں کے جیسے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

"تمہیں وہاں کیوں جانا چاہیے؟ اگر تمہارے بابا چاہتے تو خود تم سے کہتے یا پھر تمہارے لیے ایسا کوئی میسج چھوڑ جاتے۔ تمہیں تاکید کرتے۔ مگر انہوں نے تم سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے خاندان سے تمہیں دور رکھنا چاہتے تھے۔" غفیرہ نے اندر اٹھتے غبار کو بمشکل دبا کر نرمی سے کہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر تنفر کا مظاہرہ کر کے عدل کو چونکانا نہیں چاہتی تھیں۔

"کیا خبر وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہوں، مگر انہیں مہلت نہ ملی ہو۔" عدل ایک مرتبہ پھر کسی لمحے میں کھو گیا تھا۔ غفیرہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے اندر ہی اندر سہم رہی تھیں۔ عدل اگر ایک دفعہ مورکھ چلا جاتا تو پھر... ان کے اندر قیامت کا شور اٹھنے لگا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں میری جان! تم خود کو ذہنی دباؤ سے نکالو۔ کچھ دن بعد اپنی عملی زندگی میں قدم رکھو گے۔ پھر اللہ نے چاہا تو تم دونوں کی شادی۔" وہ کچھ مزید بولتے بولتے اچانک رک گئی تھیں۔ یہ وقت شادی کی بات کے لیے بڑا غیر مناسب تھا۔ اسے یہ بات بری بھی لگ سکتی تھی۔ مگر شاید اس کا دھیان ان کی گفتگو کے اتار چڑھاؤ کی طرف نہیں تھا۔ وہ پیشانی کو ٹھوکا دیتے نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ پھر جیسے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"بابا کے اسسٹنٹ واجد صاحب... ان کے ساتھ ہی امریکہ گئے تھے نا؟ اور پھر پچھلے دنوں کچھ سامان لے کر آئے تھے؟ بابا کا سامان' ہے نا؟ اس میں کیا تھا مما؟ مجھے یاد پڑتا ہے... واجد صاحب نے کہا تھا یہ عدل کی امانت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے عدل کے لیے خاص طور پہ دیا ہے۔ واجد صاحب وہ سامان میرے حوالے کرنے پہ بضد تھے۔ اور تب میں اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ مما! وہ بریف کیس کہاں ہے؟ اس میں میرے لیے خاص کیا تھا؟ بابا نے آخر میرے لیے کیا دیا؟ جو وہ خود نہیں دے پائے۔"

وہ اپنے آپ میں گم جیسے خود کلامی کرتے ہوئے چونک پڑا تھا۔ پھر سرخ ڈوروں سے بھری آنکھوں کے ساتھ ان کے بگڑتے چہرے کو دیکھنے لگا۔ ایک نہایت تند اور بے رحم سی لہر نے ان کے دل میں اٹھی تھی۔ وہ تنفر کے اس طوفان کو بمشکل دباتی اپنے حواسوں میں واپس آئی تھیں۔ انہیں عدل کو جواب دے کر مطمئن بھی تو کرنا تھا۔

"آں... ہاں یاد آیا... میں تمہیں بتا نہیں سکی۔ تمہاری حالت بھی تو کچھ ایسی تھی۔ بیٹا! وہ پراپرٹی کے ڈاکومنٹس تھے۔ اس گھر کے کاغذات جو انہوں نے تمہارے نام کر دیا تھا اور ہسپتال میں شیئرز کے حوالے سے انفارمیشن تھی۔ اس کے علاوہ بینک بیلنس کے متعلق تفصیلات تھیں۔ چونکہ یہ سب تمہاری امانت ہے سو واجد صاحب تم ہی کو دینا چاہتے تھے۔" ان کے مدلل، نرم اور تفصیلی جواب نے عدل کو کچھ مطمئن کر

دیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر بہت شکستہ تھا' اسی لیے کچھ غور ہی نہ کرپایا۔ ورنہ اتنا تو سوچ سکتا تھا کہ ہلال کبیر کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے ان کی پراپرٹی کا وارث وہ ہی ہے۔ اس کے لیے انہیں خاص ہدایات کی ضرورت نہیں تھی۔

پھر اس بریف کیس میں کیا تھا؟ جو غفیو نے عدل سے چھپا کر رکھا ہوا تھا اور پھر واجد صاحب سے اس کی ملاقات بھی نہیں کروائی۔ وہ واجد صاحب سے ملاقات کا خیال ظاہر کرتا اٹھ گیا تھا مگر غفیو نے ایک مرتبہ پھر اسے روک لیا۔

"واجد صاحب اپنی فیملی کے ساتھ واپس چلے گئے ہیں۔ جانے سے پہلے ملنے آئے تھے۔" انہوں نے بہت آرام سے اس کی امید بھی توڑ دی تھی' وہ جو واجد صاحب سے ملاقات کا سوچ کر مطمئن ہو رہا تھا کہ کم از کم وہ ان سے اتنا تو پوچھ سکے گا' بابا آخری وقت تنہا تو نہیں تھے؟ انہوں نے کچھ کہا تو نہیں' عدل کے لیے کوئی خاص پیغام' ہدایت؟ وہ جیسے بجھ کر رہ گیا تھا۔ بابا سے علاقہ' تعلق' واسطہ رکھنے والا واحد شخص بھی بیرون ملک چلا گیا تھا۔ اس کے دل پر بوجھ سا آگرا۔

"اور ان کا کوئی کانٹیکٹ نمبر؟" جیسے پھر سے امید کی کونپل پھوٹی تھی۔

"ان کا کوئی نیا نمبر میرے پاس نہیں ۔۔۔ اب تم آرام کرو عدل! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں' دیکھو۔ تمہاری وجہ سے مامن بھی بجھ کر رہ گئی ہے۔ تم اسے وقت نہیں دیتے' بات نہیں کرتے' دیکھتے تک نہیں۔"

انہوں نے بہت خوب صورتی کے ساتھ مامن کی طرف توجہ دلائی تھی۔ جبکہ اس کے ذہن پر بہت سی پرچھائیوں کی چھاپ تھی۔ وہ باپ کے "حوالوں" کا سوچ رہا تھا۔

اسے سلونی کہر میں گم ایک شام کا منظر یاد آیا۔ اسے مورکھ کا پل یاد آیا۔ اسے بہتی ندی کا سکوت یاد آیا۔ اسے سفید پہاڑوں کا سوگ یاد آیا۔ اسے آلو بخارے کا باغ یاد آیا۔ اور ساتھ اسے مخمل سے ایک چہرے کا کرب یاد آیا۔ جیسے سرخ رنگ کے ملائم پھول کی ہر پتی کرب سے پھڑپھڑا رہی تھی۔ جیسے کوئی زندگی دھیرے دھیرے مرجھا رہی تھی۔



اس کی آنکھوں کے سامنے سفید انڈے جیسا ولا تھا۔ سفید پھولوں اور سبز بیلوں سے گوندھا ہوا اس کے چاچا صاحب کا آشیانہ ۔۔۔ جو ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اور جس گھر کو خالہ کا غلیظ' ناپاک نجس شوہر ساڑھے تین' چار ماہ میں بھی ڈھونڈ نہیں سکا تھا۔ وہ اس بوڑھے ڈرائیور نے ایک گھنٹے میں ڈھونڈ لیا تھا۔

یہ وہی آشیانہ تھا جس کا پتا اس کے دل پر نقش تھا۔ وہ ڈاکٹر چاچو کو اسی پتے پہ خط لکھا کرتی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی سلور بھاری گیٹ تک آئی۔ وہ بے یقین کھڑی تھی۔ اس نے انگلی کی پوروں سے سنگ مرمر کی تختی پہ کھدے نام کو چھوا ۔۔۔ "ڈاکٹر ہلال کبیر خان" تھے اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ ڈاکٹر ہلال کبیر کے گھر سامنے کھڑی تھی۔ کاش کہ ڈاکٹر چاچو خود بھاری دروازوں کے دونوں پٹ اس کے لیے وا کرتے۔ کاش کے ڈاکٹر چاچو اپنے محل کے کسی کونے سے نکل کر اسے حیران کر دیتے۔

معاً" چوکیدار کا کیبن کھلا' بڑی مونچھوں والا خان بلبلاتا ہوا اپنے بل سے باہر نکلا۔ ایک تڑپ تڑپ کر روتی لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ کچھ حیران ہوا' زیادہ مشکوک ہوا۔

"اے لڑکی! کون ہو تم؟ ادھر کیوں کھڑا ہے تم؟" کرخت لہجہ' کرخت چہرہ۔ وہ اسے مشکوک نظروں سے گھور رہا تھا۔

"مجھے تمہارے صاحب سے ملنا ہے۔" جوئی کو ہمت کرنا پڑی۔ اس نے سسکتے ہوئے بمشکل کہا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

"اوئی ۔۔۔ اللہ کی بندی! تم کو معلوم نہیں ۔۔۔ صاحب تو چل بسا۔ چار مہینے پہلے تابوت میں بند ہو کر آیا۔ اپنے پیروں پہ چل کر علاج کروانے گیا تھا۔ بس حکم الہٰی۔" چوکیدار کا منہ اتر گیا۔ وہ ایک دم دکھی نظر آنے لگا جوئی کو چکر آگیا تو اس کے سارے وہم سچ ثابت ہو گئے' ڈاکٹر چاچو تاقیامت ۔۔۔ دنیا سے پردہ پوش ہو گئے۔ اس سے بغیر ملے چلے گئے۔ اسے بنا دیکھے چلے گئے۔

وہ ٹھنڈی زمین پر دو زانو بیٹھی اور تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ چوکیدار گھبرا گیا۔ جانے کیسی چوٹ لگی تھی بے چاری کے دل پر' وہ اندر کی طرف بھاگنے لگا' پھر پلٹ کر اس کی طرف آیا۔

"اللہ کی بندی! اوئی ماں! چپ تو کر' مت رو ۔۔۔ میں اندر صاحب کو بتاتا ہوں۔ تیرا کوئی نام بھی ہے؟" چوکیدار ہکلا گیا تب جوئی نے زخمی نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ چوکیدار کے پیچھے کوئی ہیولا کھڑا تھا' کوئی سایہ کھڑا تھا یا کوئی سائبان کھڑا تھا۔ وہ یک ٹک دیکھتی رہی' جیسے کوئی واہمہ' ہو ۔۔۔ کیا وہ اتنی اقبال مند' خوش نصیب تھی جو اس چہرے کو اتنے قریب سے دیکھ پاتی۔

وہ دیوانہ وار اسے دیکھتی رہی' کسی قیمتی منظر کی طرح' جو پلک جھپکنے کی دیر میں اوجھل ہو سکتا تھا۔ جوئی نے وہ بھاگوان لمحہ ضائع نہ کیا۔ اس نے کسی خواب کے سفر میں ڈولتے ہوئے کہا۔

"خان! عدل سے کہو جزا آئی ہے۔" جوئی کے لب کچھ پھڑپھڑائے تھے' اس نے سامنے کھڑے ہیولے میں واضح طور پہ حرکت محسوس کی تھی۔ وہ جیسے مضطرب ہوا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اس نے مخمل سے چہرے والی لڑکی کو دیکھا' جس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا۔ وہ آنسو جو اسے دیکھ کر جم گئے تھے' وہ آنسو جو اس کے قریب آنے پر پھر سے پگھل گئے تھے۔

عدل کو بہت کچھ یاد آیا ۔۔۔ ندی کا وہ پل' دھند میں کھویا آسمان' سفید پہاڑوں کی بلندی' آلو بخارے کا باغ ۔۔۔ اور مخمل سا منجمد ہوا وہ چہرہ ۔۔۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا' یہ جزا ہی تھی جزا کبیر خان' اس کے بابا کی جان ۔۔۔ اور عدل کبیر خان اس پہ صدقے اور قربان ۔۔۔ بابا کا عدل پہ کیا جانے والا آخری احسان ۔۔۔ یا قدرت کا انعام؟

اس کے رنج زدہ دل پہ بوندیں گرنے لگی تھیں۔ وہ ان کے چلے جانے کے بعد اس ملال کو ختم کرنے کا ایک واحد ذریعہ پا چکا تھا۔ اس کے اندر قندیلیں جل اٹھی تھیں۔ روشنیاں بکھر گئی تھیں۔

اس کے باپ کو سامنے کھڑی پہاڑی لڑکی سے عشق تھا۔ اس کے باپ کی جان اور ان کا جہان اسی لڑکی میں آباد تھا۔ وہ اپنے بابا کے چھوڑے گئے جہان کی حفاظت کر سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مخمل سی لڑکی کے کمزور وجود کو زمین سے اٹھا کر اپنے سامنے کھڑا کیا۔

"میں عدل ہوں ۔۔۔ اور تم جزا ہو ۔۔۔ جانتی ہو' عدل کے بدلے میں جزا ملتی ہے ۔۔۔ یعنی انصاف کے بعد اس کا اجر ۔۔۔ مشکل بات ہے' سمجھ میں نہیں آئی نا؟ آج کے بعد میں تمہارا عدل ہوا۔ مجھے تمہاری تلاش تھی اور تم مجھے تلاش کرتی یہاں تک پہنچ گئیں۔ تم مجھ میں میرے بابا کو ڈھونڈنا اور میں تم سے اپنے بابا کے لفظوں کی مہک کو کھوجوں گا۔ ایک بات تو سچ ہے نا۔ بابا نے مجھ سے بھی بڑھ کے تم سے عشق کیا۔"

وہ اس کے کانوں میں امرت انڈیل رہا تھا۔ وہ اتنا پیارا اور میٹھا بولتا تھا۔ ڈاکٹر چاچو نے سچ کہا تھا۔ عدل میں ان سے زیادہ مٹھاس بھری تھی اور اس کی آنکھوں سے شہد بہتا تھا۔

"تمہاری آنکھوں میں یہ آنسو ۔۔۔ میرے بابا کے لیے ہیں نا؟ آئی سویٹ جزا! میں بھی اسی طرح تڑپ تڑپ کے کھل کر رونا چاہتا ہوں ۔۔۔ اب تم آگئی ہو نا؟ ہم دونوں اکٹھے رولیں گے۔ میرے ساتھ بابا کے لیے اس قدر رونے والا کوئی نہیں تھا۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ماربل کی روش پہ چلنے لگا۔ اور

ماربل کی روش جیسے گل کوک سے بھر گئی۔ ڈیلیا کی پتیاں اس کے پیروں تلے بچھ گئیں۔ گل یاسمین برف کی مانند اس پہ گر رہے تھے' گل زیبا اسے سنگھار بخش رہے تھے۔ گل برگ اس کے قدم چھو رہے تھے۔ گل پیادہ مہک رہے تھے' گل چاندنی چمک رہے تھے' گل دوپہر دھند میں کھل رہے تھے' گل شبو مچل رہے تھے' گل صد برگ صدائیں لگا رہے تھے' گل عباسی مسکرا رہے تھے۔ گل شانہ جھوم رہے تھے۔ گل نیلوفر دلدل سے ابھر رہے تھے' گل احمر بکھر رہے تھے کیونکہ گل پیرہن اس کے ساتھ ساتھ تھا اس کے ہمراہ تھا' اس کے برابر چل رہا تھا۔ پہاڑوں سے آئی دردر کی ٹھوکریں کھاتی اس پہاڑی لڑکی کی زندگی کا ایک نیا باب کھل رہا تھا۔

وہ گلاب رنگ' گلابوں میں ڈھلی لڑکی نم آنکھوں سے مسکرا رہی تھی۔ وہ زندگی میں در آنے والے اس عجیب موڑ پر بوکھلا رہی تھی' وہ اپنے اتنے انوکھے استقبال پر گھبرا رہی تھی ___ اور وہ اپنی زندگی میں پھر سے چلے آنے والے طوفانوں کے خوف سے کپکپا رہی تھی اور وہ سنہرے خواب جیسے عدل کبیر خان کا ہاتھ تھام کر اندر جاتی اس کی سرد برف جیسی ماں کی آنکھوں میں اتری "برف" دیکھ کر پہلے ہی موڑ پر ڈگمگا گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ اس کی زندگی کا بڑا عجیب دور تھا۔ وہ سوچتی اور حیران ہوتی' کبھی خود پر رشک آتا اور کبھی رحم آتا ___ یہ دور اس کی زندگی کا پہلا اور آخری سنہری دور تھا۔ نہایت مختصر مگر مکمل۔

اسے عدل کبیر کی توجہ' نرمی' پیار اور خلوص نے دودھ میں گندھا گلاب بنا دیا تھا۔ وہ سب کی ٹھوکروں میں پڑی لڑکی آسمان کا سب سے روشن ستارہ بن گئی تھی۔

وہ جیسے دنوں میں اس کا اتالیق بن گیا۔ وہ اسے زندگی گزارنے کے قرینے سکھانے لگا' وہ اسے بولنے کے طریقے سکھانے لگا۔ وہ اسے ہاتھ پکڑ کر چلنا سکھانے لگا وہ اسے اپنے بابا کے اسٹڈی روم میں لے آتا۔ وہ جوئی کو ان کی کتابیں دکھاتا' ان کی تصویریں' ان کے میڈلز' سرٹیفکیٹ دکھاتا' پھر جوئی سے ان کی باتیں سنتا' ہر چھوٹی سے چھوٹی' بڑی سے بڑی' اسے رشک آتا جب وہ جوئی کے منہ سے بابا کی باتیں سنتا' وہ کس طرح جوئی سے پیار کرتے تھے۔ اس کے خطرے پر دوڑے چلے آتے۔ اسے بخار ہوتا تو کس قدر لاڈ کرتے' اس کا منہ دھلواتے' اپنے ہاتھ سے انڈا کھلاتے' دوا دیتے۔

عدل کی آنکھوں میں حیرانگی' تحیر اور تعجب در آتا تھا۔ وہ اسے عقیدت سے دیکھنے لگتا' ایسی نظر جس میں محبت تھی' بڑی مقدس اور متبرک قسم کی محبت گویا وہ اپنے باپ جیسی شفقت سے جوئی کو سرفراز کرتا تھا اور جوئی کے لیے تو محض اس کی آنکھ میں اتری نرمی عمر بھر کے زاد راہ اور زیست بھر کی خوشی کے لیے کافی تھی۔

وہ جوئی کے لیے موم کی طرح پگھل گیا تھا۔ کسی چھوٹے بچے کی طرح اس کا خیال رکھتا تھا۔ اور وہ دنیا کا پہلا شخص تھا جو اسے جوئی نہیں جزا کہہ کر پکارتا اور اس بات پہ یامن جیسی ہستی تک کو جھڑک دیتا تھا۔

دنوں میں بدلتی اس صورت حال نے غفیو اور یامن کے دل کو پنکھے لگا دیے تھے۔ ان کے ہوش اڑنے لگے' یامن تو کیا یامن تک چونک اٹھی تھی۔

ان دنوں اسے جزا کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا اور اس کے پیچھے پاگل دیوانی ہوتی یامن یہ سب کچھ بھلا برداشت کر سکتی تھی؟ جب بھی موقع ملتا وہ عدل سے الجھ پڑتی' پھوپھی سے بلاوجہ جھگڑنے لگتی اور کبھی کبھی جوئی کے نازک دل کو کچوکے لگانے سے بھی باز نہ آتی۔ غصے کی تیز تو وہ پہلے بھی تھی مگر اب مزاج عموماً گرم ہی رہتا تھا۔

جوئی کو ڈاکٹر چاچو کے محل میں رہتے ہوئے مہینہ بھر ہو گیا تھا۔ وہ اس جادو نگری میں آکر ابھی تک حیران تھی۔ دھوئیں سے کالی ہوتی چھت' وہ شیرے کے ٹب' دال کے ڈرم' کھوئے سے بھرے کڑاہے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ یہ ڈاکٹر چاچو کے عالیشان گھر کا کچن تھا۔ چمکتا دمکتا ___ شفاف' صاف خوب صورت' رنگ رنگ کی چیزوں سے بھرا فریج۔ سنگ مرمر کی چمکتی صلیب۔

اسے ڈاکٹر چاچو کے گھر کی وہ دھند میں کھوئی سویر آج بھی یاد تھی۔ رات بھر ماسٹر بیڈ روم میں اسے نیند نہ آئی۔ وہ نانی کے ٹوٹے نواڑی پلنگ پہ سونے کی عادی تھی' اس کے اوپر غلیظ سی بدرنگ رضائی ہوتی۔ جس کا غلاف جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا اور چوہے اکثر ادھڑے غلاف میں گھس کر روئی پھانکتے اٹھکھیلیاں کرتے تھے۔ وہ بدبودار رضائی سردی روکنے کے لیے بھی ناکافی تھی' اسے تب بھی نیند نہیں آتی تھی۔ اسے اتنے آرام دہ پرسکون ماحول میں بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ فرل لگی دودھیا بیڈ شیٹ اور نرم فردالا گداز سا کمبل جس میں سے آتی بھینی بھینی خوشبو اس نے آج تک محسوس نہیں کی تھی۔ کمرے میں خوب صورت صوفہ اور سنگھار میز بھی تھی۔ جس کے اوپر رنگ رنگ کے قیمتی لوشنز' باڈی اسپرے' پرفیومز اور رنگ رنگ کی کریمیں رکھی تھیں جن کا استعمال کرنا جوئی کے لیے محال تھا۔ اور سفید ٹائلوں سے سجا اٹیچ باتھ روم دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں ___ وہاں اتنے مہنگے صابن' فیس واش' ٹالکم پاؤڈر' باڈی واش اور شیمپو کی جمبو سائز بوتلیں رکھی تھیں ___ وہ ایک ایک چیز چھو کر دیکھ رہی تھی۔

وہ رات بھر جاگتی رہی اور اپنی زندگی میں آنے والے اس چونکا دینے' حیران کر دینے اور متعجب کر دینے والے موڑ کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

اس کی سوجی آنکھیں دیکھ کر عدل ٹھٹک گیا۔ بھلا اتنی معمولی سی تبدیلی بھی کسی کو چونکا سکتی ہے ___ مورکھ میں اس کے زخموں کو دیکھ کر' جان کر بھی انجان بن جایا کرتے تھے اور یہاں عدل اتنے متفکر لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"تم سوئیں نہیں جزا! تم ٹھیک تو ہو!" وہ اتنا فکر مند لگ رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے کچن میں آگیا تھا۔

وہ اسے بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا مگر جوئی کو اسٹول پہ بیٹھنے سے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ تب ناشتہ میز پہ رکھتی غفیو اور پلیٹ میں رکھا چمچہ بجاتی یامن نے بہت کٹیلی اور نفرت انگیز نظروں سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ عدل پہ انہیں غصہ تھا جبکہ جوئی کے لیے ان دونوں کی نظروں میں حقارت بھری تھی ___ وہ پہلے ہی وار میں ان کی نگاہوں کے تمسخر سے لڑکھڑا گئی تھی تب ہی اسٹول سے گرتے گرتے بچی۔ شاید وہ گر ہی پڑتی' زمین بوس ہو جاتی اگر عدل اسے سہارا نہ دیتا اور جب عدل نے اسے سہارا دے کر دوبارہ اسٹول پر بٹھایا تب بظاہر نرم اور ہلکے پھلکے لہجے میں غفیو نے گہرا کاٹ دار طنز کیا تھا۔

"میری جان! اسے ٹیبل مینرز کہاں آتے ہیں؟ اس کے لیے دری بچھوا دیتے یا کارپٹ پہ بیٹھ کے ناشتہ کر لیتی۔ ادھر پیڑھی وغیرہ تو ہے نہیں۔"

انہوں نے یامن کا من پسند ناشتہ شہد اور دودھ میں بھیگے توس اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا۔ یامن کے اندر جیسے ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔

اس کا کم سن معصوم حسن' جیسے شگفتہ سا پہاڑی گلاب نم نم بھیگا بھیگا سا۔ کل جب وہ آئی تھی تب انتہائی غلیظ گندی اور اجڑی پجڑی لگ رہی تھی ٹوٹی چپل اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے۔ جو دھول مٹی سے اپنی اصلی رنگت کھو چکے تھے۔ پھر ان کے لمحوں میں باؤلے ہوتے بیٹے نے سب کچھ منٹوں میں بدل دیا ___ وہ یامن کا نیا نکور سوٹ اور سوفٹی اٹھا لایا۔ اسے زبردستی سکینہ کے ساتھ واش روم میں فریش ہونے بھیجا ___ اور پھر کچھ ہی گھنٹوں میں وہ گندی سندی غلیظ لڑکی دھلا ہوا گلاب بن کر سامنے آگئی۔ سکینہ نے اسے باڈی واش اور شیمپو وغیرہ دیا تھا۔ تب ہی تو اس کے لمبے گھنے بال دھل دھلا کر چمک اٹھے تھے۔

عدل اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔

وہ اسے یہاں سے نکال نہیں سکتی تھیں ہاں یہ ضرور ہو سکتا تھا۔ اسے میٹھے میٹھے طعنے مارتیں' اس پہ شیرے میں ڈبو کر طنز کرتیں۔ اسے احساس کمتری سے کبھی نکلنے نہ دیتیں۔ اس کے اندر کبھی اعتماد نہ آنے دیتیں اور اسے یہ بات باور کروا دیتیں کہ عدل کی ہمدردی'

ترس' اور رحم کو کچھ اور ہر گز مت سمجھے۔ اور یہ کام وہ پوری دل جمعی کے ساتھ کر رہی تھیں۔

"ہمارے ساتھ رہے گی تو سیکھ جائے گی۔" عدل کے الفاظ نے انہیں مزید کچھ بولنے سے روک دیا تھا۔ وہ لب بھینچ کر ضبط کرنے لگیں۔

"کیا یہ عمر بھر یہیں رہے گی؟" مامن انگریزی میں چیخی تھی۔ تب عدل نے بڑے خوشگوار لہجے میں کندھے اچکا کر کہا۔

"کیا حرج ہے یہ اس کے باپ جیسے چچا کا گھر ہے۔۔۔ ویسے میں اس کی شادی کر دوں گا۔ آخر یہ میری ذمہ داری ہے۔" اس نے بھی جواباً" انگلش میں وضاحت کی تھی۔

مامن کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے 'اس کے اندر ابلتا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ جبکہ جوئی بے چاری چپ چاپ سر جھکائے ہاتھوں کو گھور رہی تھی' اسے ان کی گفتگو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ پھر عدل ایک دم اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ ناشتے کی ایک ایک چیز اٹھا کر اس کے سامنے رکھنے لگا تھا۔ اس کی پلیٹ بھرتا جا رہا تھا۔ خود اس کے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھا۔ وہ گھونٹ گھونٹ پیتا جوئی کی طرف متوجہ تھا۔

"یہ فرائی انڈا لو۔۔۔ پراٹھا کھاؤ۔۔۔ فرنچ ٹوسٹ اٹھا لو اور یہ دودھ کا گلاس بھی ختم کرنا ہے۔ شاباش! پلیٹ خالی کرو۔"

عدل ایک ایک چیز اٹھا اٹھا کر اس کے سامنے رکھ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ نرمی اور مٹھاس تھی' جوئی کا دل تو اس کی توجہ سے ہی بھر گیا تھا۔ پھر بھی جب عدل اتنی محبت سے اصرار کر رہا تھا تو وہ بھلا کیسے انکار کر لیتی؟ وہ اس کی طرف سے بے دلی سے پارجام' مارملیڈ' بٹر' چکن سپریڈ اور جانے کیا کیا الم غلم رکھنے لگا تھا۔

"اتنی کمزور ہو' کھاتی پیتی کچھ نہیں۔۔۔ میں پھونک ماروں گا اور تم اڑ جاؤ گی۔ دیکھنا' دنوں میں تمہیں کیسا پہلوان بنا دیتا ہوں۔"

عدل نے اس کے لیے ابلا انڈا چھیلا تھا' پھر اس کے پیس بھی کیے فورک پلیٹ میں رکھا اور اسے ایک پیس خود کھا کر طریقہ سمجھانے لگا۔ عدل کا انداز کچھ ایسا تھا کہ جوئی کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی' اس نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے سر جھکا لیا تھا جبکہ عدل اسے بغور دیکھنے لگا' وہ خود بھی مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ' بے تکلفی' نرمی' توجہ کو دیکھ کر مامن کی دماغ کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔ جبکہ غفیو کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔

"عدل میری جان! اس کے معدے پہ ظلم مت ڈھاؤ! اسے ایسی خوراک کی عادت نہیں۔ بیمار پڑ جائے گی۔" غفیو کے لیے یہ منظر دیکھنا دو بھر ہو رہا تھا۔ عدل اسے دودھ کا گلاس زبردستی پکڑا رہا تھا۔ اس کے منع کرنے کے باوجود وہ مالٹو کا چمچہ بھر کے مکس کر چکا تھا۔ بظاہر انہوں نے میٹھے لہجے میں کہا تھا مگر مامن جانتی تھی' کس طرح اندر سے سلگ رہی ہیں اور یہی حال مامن کا بھی تھا۔

"کھائے گی تو عادت بنے گی۔" وہ ان کی کسی بھی بات پہ دھیان نہیں دے رہا تھا۔

"دیکھو تن' راحت' سکون' آرام اور آسائشات کا عادی ہو جائے تو غضب ڈھانے لگتا ہے۔ بُرا مت ماننا۔ اس کے بھلے کے واسطے کہہ رہی ہوں۔" غفیو نے کڑوی کافی حلق میں انڈیل کر پھر سے نرم ملائم لہجے میں زہر اگلا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اس دو ٹکے کی لڑکی کو اٹھا کر باہر پھینک آئیں۔ پھر جب عدل' جوئی کو ناشتہ اپنی نگرانی میں کرا کر شاور لینے واش روم میں چلا گیا تب جوئی کو کچن سے باہر نکلتے دیکھ کر مامن پلیٹ میں رکھے انڈے کے ٹکڑوں سے کھیلتی بہت نرم' لہجے میں غفیو سے مخاطب ہوئی تھی۔

"مما! عدل بہت سوفٹ نیچر کا ہے۔ وہ تو اپنے پالتو کتے کے ساتھ بھی بہت نرم برتاؤ رکھتا ہے۔ اسے توجہ اور وقت دیتا ہے یہ اور بات ہے کہ کوئی اس کی رغبت' توجہ' میلان' رجحان اور ہمدردی کو غلط معنوں میں لے۔"

وہ جو ساری زندگی کٹیلی' ترش' زہریلی باتیں سنتی آئی تھی۔ چپ چاپ سر جھکائے سنتی رہ گئی۔

"ویلڈن ویری گڈ۔۔۔" غفیو نے جوئی کے نکلتے ہی مامن کو خوش دلی کے ساتھ سراہا۔۔۔ "یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ اس لڑکی کو اچھی طرح سے باور کروا دو۔ عدل کی ہمدردی کو کسی اور رنگ میں مت دیکھے۔ ورنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔" وہ سکینہ کو آواز دیتی اٹھ گئی تھیں۔

آئندہ آنے والے دنوں میں عدل نے ثابت کر دیا تھا کہ جوئی اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ وہ جوئی کو ایک دن اپنے ساتھ شاپنگ پر لے گیا۔ اسے رنگ رنگ کے ملبوسات لے دیے۔ اسے گھماتا پھراتا رہا۔ پھر برگر کھلایا' اپنے تئیں وہ اس کے اندر سے بابا کے اچانک چلے جانے کا غم اکھاڑ رہا تھا۔ وہ اس کی شخصیت پہ چھایا جمود توڑنا چاہتا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا' جوئی کی سنجیدگی' کم گوئی' خاموشی اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ وہ کبھی مامن جیسی شوخ' چنچل' منہ پھٹ' ہنگامہ پرور نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ عمر بھر خاموش اور سنجیدہ رہی تھی' اسے کبھی کسی نے بولنے نہیں دیا تھا۔ وہ صرف کام کرنے کی مشین تھی جو نہ بولتی تھی نہ کسی بات کا جواب دیتی بس اپنا کام کیے جاتی۔

ڈاکٹر چاچو کے گھر آ کر اسے ایک بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ عدل کے علاوہ اس گھر میں کوئی اس کا خیر خواہ نہیں۔

وقت کچھ اور آگے کی طرف کھسکا تو جوئی کی سوچ نے خود بخود کروٹ لی تھی۔

مامن کا عدل پہ حق جتانا۔۔۔ اس کے ساتھ بے تکلفی' دوستی' جھگڑے' لڑائیاں۔۔۔ نوک جھونک اور اس تمام قصے میں امڈتی ابھرتی' واضح ہوتی محبت وہ لاکھ دل کو سمجھاتی پھر بھی اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ مامن اور عدل کے درمیان کچھ خاص ضرور ہے۔ کیونکہ عدل کی غیر موجودگی میں مامن جتانے سے باز نہیں آتی تھی۔

"عدل مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔" وہ اسے اترا اترا کر بتاتی' پھر اس محبت کے بے شمار ثبوت دکھاتی۔

ایک روز وہ جوئی کو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں اس نے عدل اور اپنی بڑی بڑی تصویریں دکھائی تھیں۔ ہر تصویر میں وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ ایک خاص محبت کے رشتے کو واضح کرتے۔

"اور کچھ مزید "خاص" بھی ہے' ابھی دکھاتی ہوں۔ پہلے یہ دیکھو۔" مامن نے اسے الماری کا پٹ کھول کر دکھایا۔ وہ الماری جیسے امپورٹڈ سامان کی پوری دوکان تھی۔ وہاں رنگ رنگ کے پرفیومز' جیولری' کپڑے' ساڑھیاں' جیسٹر' کلاک' فراکس' ہیٹ' جیکٹس ترتیب سے رکھے تھے۔ وہاں ایک سلور باکس بھی تھا۔ مامن نے کھول کر دکھایا۔ اس باکس میں ہیرے کی دمکتی انگوٹھیاں' ہیئر پن' بریسلیٹ' لونگیں' ایئر سٹڈ بڑے قیمتی موتیوں کی مالا اور نیکلس چمک دمک رہے تھے۔ پھر وہ اسے اپنے کمرے کے ایک کونے میں رکھے موسیقی کے آلات دکھانے لگی۔

"یہ سب عدل لایا ہے وقتاً" فوقتاً"۔۔۔ مجھے ایک زمانے میں شوق چڑھا تھا۔ پھر اتر بھی گیا۔ تاہم میں نے یہ سامان عدل کے ہزار دفعہ کہنے کے باوجود اسٹور میں نہیں پھنکوایا۔ مجھے عدل کی دلائی ایک ایک چیز سے بہت پیار ہے۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ مجھے عدل سے عشق ہے۔"

وہ اس کی پتھرائی آنکھوں میں ایک ایک کانٹا چبھوتی بڑے سکون کے عالم میں کہہ رہی تھی' اس کی آنکھوں میں بڑا بے رحم پن تھا۔ جیسے وہ اسے جتلا رہی تھی اپنی بے لگام ہوتی دھڑکنوں کو کنٹرول کرو اور عدل کے خواب کو نوچ ڈالو۔ وہ تمہیں اپنے پالتو جانوروں جیسی اہمیت دیتا ہے۔"

وہ آنکھوں سے نشتر چلاتی ماؤتھ آرگن بجانے لگی پھر پیانو کو چھیڑا۔۔۔ وہاں ایک ڈگڈگی بھی تھی۔ مامن نے باقاعدہ بجا کر دکھائی۔

"اسے ڈگڈگی کہتے ہیں۔ میں اس پہ انسانوں کو بھی

نچاسکتی ہوں۔ پیچ کررہنا۔" وہ ایک دم ہنسنے لگی تھی۔

"عدل نے سارے موسیقی کے آلات اکٹھے کر دیے۔ حالانکہ میں نے تو صرف ماؤتھ آرگن کی فرمائش کی تھی اور یہ تمام تحائف بھی عدل نے دیے، ہر ایک خوب صورت موقع پر اس کے لیے میں بہت خاص ہوں۔" ماہن الماری میں رکھی ایک ایک چیز کو اٹھا کر اس کی آنکھوں کے سامنے کررہی تھی۔ جوئی کی آنکھیں جلنے لگیں، ان میں ریت چبھنے لگی، بکھرنے لگی۔ وہ ریزہ ریزہ ہونے لگی۔ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگی۔

"وہ رشتوں کو بہت اہمیت دیتا ہے اور بابا سے منسلک رشتوں اور ان کے تعلق داروں سے تو بہت انسیت رکھتا ہے۔ یہ اس کی بہت اچھی عادت ہے مجھے عدل کی عادتوں پہ فخر ہے۔ وہ غریب رشتہ داروں کی مدد کرتا ہے بلکہ ان پر پیسہ لٹاتا ہے... اور میں اسے نیکی کے کاموں سے روکتی بھی نہیں۔" ماہن بریسلٹ کو اپنی گوری کلائی میں گھماتی مسکرائی تھی۔ اس کے الفاظ سخت نہیں تھے، لہجہ بھی نرم تھا ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔ پھر جوئی کو چبھ کیا رہا تھا۔ وہ اپنی پھوپھی جیسی تھی، نرم اور شیریں لہجے میں کاٹ دینے والی باتیں کرتی، مسکرا مسکرا کر زہر انڈیلتی، پیار جتا کر آگ سلگاتی۔ عدل جب گھر میں ہوتا، جوئی کے ساتھ ہوتا، اس کو وقت دیتا، اس سے باتیں کرتا، تب وہ غیض سے بھر جاتی تھی۔ پھر جوئی کا جیسے جینا حرام ہو جاتا، اس پہ طنز کرتی، غصہ کرتی، کچوکے لگاتی، اس کی غربت، اجڈ دیہاتی انداز پہ چوٹ کرتی۔

اور جب عدل نظر سے اوجھل ہوتا، جوئی کے قریب نہ ہوتا تب پھر سے بدل جاتی، نرم باتیں، نرم گفتگو اور اکثر پشیمان نظر آتی، معافی بھی مانگ لیتی۔

تب جوئی جیسی جاہل گنوار لڑکی نے ماہن کی سوچ پڑھ لی تھی۔ اس کی ناقص عقل۔ اس کے اندر چھپے جذبوں کو کھوج آئی۔ جوئی نے جان لیا کہ ماہن کو عدل اور جوئی کا اکٹھے بیٹھنا۔ ہنسنا بولنا گوارا نہیں ہوتا۔

اگلے بہت سارے دنوں میں جوئی اور بھی بہت کچھ جان گئی۔ مگر اس سے بھی پہلے عدل نے کچھ اور انوکھا کر دیا۔ وہ جوئی کے لیے دسویں جماعت کی کتابیں اٹھا لایا۔ جوئی کی زندگی کا دوسرا بڑا خواب، وہ عدل سے ملنے کے بعد دوسری مرتبہ بے تحاشا خوش ہوئی تھی۔ حالانکہ تب غفیو چاچی نے بہت ناگواری جتلائی تھی۔ اپنی عزت، وقار اور زبان کو سنبھال سنبھال کر بہت گہری چوٹ اور بڑے گہرے طنز کیے تھے۔

"بیٹے! یہ کہاں پڑھنے کے قابل ہے۔ بے چاری کو آتا جاتا تو کچھ نہیں۔ کیسے میٹرک کے امتحان کو پاس کرپائے گی۔ اپنی انرجی کیوں ویسٹ کررہے ہو۔" وہ حتی المقدور کوشش کرتی رہی تھیں کہ کسی طریقے سے عدل اپنے ارادے سے باز آجائے مگر وہ بھی تو ہلال کبیر کا بیٹا تھا۔ ایک دفعہ فیصلہ کرلیا تو بس کرلیا۔

"میں خود اسے ٹیوشن دوں گا اور ٹیوٹر کا بھی بندوبست کروں گا۔ یہ بہت انٹیلی جینٹ ہے مما! آپ کبھی اس سے بات کرکے دیکھیں تو سہی۔" وہ جانے کہاں کہاں سے جوئی کے اندر موجود خوبیوں کو ڈھونڈ لاتا تھا۔

"ہونہہ...!" انہوں نے حقارت سے دوسری طرف منہ موڑ لیا تھا اور یہی حال ماہن کا تھا۔ وہ اکیلے میں عدل سے الجھ پڑی۔

"کیا ضرورت تھی اسے اسکول بھیجنے کی، پرائیویٹ امیدوار کے طور پر دے لیتی۔ ویسے بھی اس نے فیل ہی تو ہونا ہے۔" ماہن نے جس غصے بھرے لہجے میں بات کا آغاز کیا تھا۔ عدل کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"میں اسے پڑھاؤں گا تو کبھی فیل نہیں ہوگی۔ اسے ڈس ہارٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔" عدل نے پہلی مرتبہ ماہن سے سخت ترش لہجے میں بات کی تھی جس کی اسے ایک مرتبہ پھر بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔



اس کا بے ضرر وجود غفیو چاچی اور ماہن کی نگاہ کا کانٹا بن چکا تھا مگر وہ کہاں جاتی؟ یہ واحد جائے پناہ تھی

اور پھر ماہن کی بگڑتی حالت نے اس کی زندگی کو کچھ اور تلخ بنا دیا تھا۔

عدل کے ساتھ جوئی کے معاملے اور جوئی کی ذات کے متعلق آخری تکرار کے بعد وہ شدید بیمار پڑ گئی تھی اور اس کی بیماری نے عدل کو سدھ بدھ بھلا دی تھی۔ وہ اپنے کھردرے، سرد رویے پر پشیمان ہوگیا تھا۔ کیونکہ ماہن میعادی بخار کی زد میں آگئی تھی۔ اسے ہسپتال لے جانا پڑا۔ وہ دو ہفتے ایڈمٹ رہنے کے بعد گھر آئی تھی۔ بہت کمزور، بددل اور خاموش لگ رہی تھی۔ جیسے ہنسنا بھول گئی ہو۔ عدل خود کو اس کی حالت کا ذمہ دار ٹھہراتا، اپنی لاپروائی، بے توجہی کو کوستا۔ جب سے جوئی اس کی زندگی میں آئی تھی۔ وہ ماہن کو قطعاً" بھول گیا تھا۔

جب ماہن گھر آئی۔ تب عدل نے اس سے اپنے گزشتہ رویوں پر معذرت کی تھی۔ وہ حقیقتاً" نادم اور پشیمان تھا اور وہ اسے نادم دیکھ کر رونے لگی۔

"تم جانتے ہو، میں تمہاری بے اعتنائی برداشت نہیں کرسکتی۔ پھر بھی مجھے ہرٹ کرتے ہو۔ مجھے وقت نہیں دیتے۔ کاش تمہاری ٹریننگ جلد شروع ہو۔ تاکہ تم سارا وقت میرے ساتھ رہ سکو۔" وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ عدل کے دل میں اتر رہی تھی۔

"اب تم جزا کے بارے میں کچھ مت کہنا۔ آخر تم اور مما سمجھتی کیوں نہیں۔ وہ لڑکی بابا کو بہت عزیز تھی۔ اس کا بابا کے علاوہ کوئی نہیں اور وہ بابا کو کھو دینے کے غم سے گزر رہی ہے... میں اسے توجہ نہ دوں تو وہ مزید ٹوٹ جائے گی۔ وہ میری ذمہ داری ہے۔ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ کوئی غیر نہیں۔" عدل بہت نرم لہجے میں اس کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے اسے یقین دلا رہا تھا کہ وہ محض اس کی کزن ہے۔ ماہن غلط گمان میں نہ پڑے اور دل میں موجود گانٹھ گرہ کو کھول دے۔

"ہونہہ... تمہاری جزا میرے لیے سزا بن رہی ہے۔ میں رات دن ایک اذیت کا شکار ہوں۔" ماہن کے آنسو پھسلتے رہے، عدل کے دل پہ گرتے رہے۔

"اسے سہارے کی ضرورت ہے۔ تم سمجھتی کیوں نہیں، مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے، بابا اسے میرے حوالے کرکے گئے ہیں۔" وہ اپنے جذبات لفظوں میں بتا نہیں سکتا تھا۔ حقیقتاً" وہ جوئی کو اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا۔

"تم اسے اپنا عادی بنا رہے ہو۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟ اسے بتاتے کیوں نہیں۔" ماہن تیز لہجے میں بولی تھی جیسے آج کوئی فیصلہ کرکے رہے گی۔

"کیا؟" عدل حیران ہوا۔

"میرے اور اپنے بارے میں۔" اس کا انداز لٹھ مار قسم کا تھا۔ عدل لب بھینچ کر رہ گیا۔

"حد ہے ماہن بچپنے کی۔ اب کیا میں اشتہار لگادوں اخبار میں خبر لگواؤں؟ تب یقین کروگی؟" وہ بری طرح زچ ہوگیا تھا۔ معاً" باہر کھٹکے کی آواز آئی تھی۔ عدل نے گردن موڑ کر دیکھا۔ دروازے کے پاس کوئی سایہ کھڑا تھا۔

"تم... تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو عدل!" ماہن مچل کر بولی۔ آج بہت دنوں بعد وہ اپنا پسندیدہ سوال لبوں پہ سجائے بیٹھی تھی۔ عدل نے نرمی سے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

"بے حد، بے شمار، بے حساب، بے پناہ اور جتنے بے رہ گئے ہیں۔ ان کو خود ساتھ لگالو۔ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ اب آئے دن بیمار رہ کر میرا امتحان مت لیا کرو۔" عدل نے اس کے گالوں پہ پھسلتے آنسو پونچھ کر کہا تھا۔ ماہن لمحوں میں شانت ہوگئی تھی، اس کے سنہرے چہرے پہ سکون بکھر گیا تھا اور اسے مطمئن دیکھ کر عدل بھی پرسکون ہوگیا تھا۔

"اب تم آرام کرو۔ میں ذرا جم کا چکر لگا آؤں۔" وہ ماہن کی ناک کھینچتا باہر کی طرف آیا۔ تب اس نے دروازے کے پاس نظریں جھکائے کھڑی جوئی کو دیکھا تھا۔ وہ ہاتھ میں سوپ کا پیالہ لیے کھڑی تھی۔

"غفیو چاچی نے دیا ہے۔ ماہن کے لیے۔" اس نے ہکلا کر وضاحت کی تھی۔ عدل نے غور نہیں کیا تھا، وہ جلدی میں تھا۔ ورنہ اس کی جھکی پلکوں پہ اٹکی شبنم کو

دیکھ لیتا۔ اس کے چہرے پہ پھیلے کرب کو کھوج لیتا۔ وہ کس اذیت اور درد سے گزر رہی تھی۔ اس کی تو زندگی روٹھ گئی تھی۔ اسے یوں لگا' وہ کھڑے کھڑے ڈھے جائے گی۔ بکھر جائے گی۔ اسے عدل کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ اس کے یقین دلاتے لفظ' جو صرف مامن کے لیے تھے۔ اس کا محبت کی آنچ دیتا لہجہ۔

تو مامن ٹھیک کہتی تھی۔ عدل اس سے محبت کرتا تھا تو پھر جوئی کے لیے کیسے جذبات رکھتا تھا؟ ایک غریب کزن' یتیم کزن کے لیے محض ہمدردی' "انسیت" جو اس کی فطرت کا حصہ تھا' ہمدردی کرنا' خیال رکھنا۔ توجہ دینا' عزت دینا۔

اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے کپکپانے لگی۔ معاً" کھلے بیڈ روم سے مامن کی غرور میں ڈوبی آواز آئی۔

"جوئی! کیا پتھر میں ڈھل گئی ہو' اندر آجاؤ۔" اس کے لہجے میں واضح مستی تھی' جیسے عدل کے منہ سے نکلا اظہار خاص طور پر جوئی کو سنوا کر اب اس کی حالت زار سے لطف اٹھا رہی تھی۔ تو گویا اس نے جوئی کی موجودگی محسوس کر کے جانتے بوجھتے ایسی صورت حال پیدا کی تھی۔ جوئی نے سنبھل کر پیالہ اس کی طرف بڑھا دیا تھا جسے لے کر مامن نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔ اب وہ اسے اشارے سے بیٹھنے کا کہہ رہی تھی۔

"عدل مجھے بہت چاہتا ہے۔ تم نے سن لیا نا۔۔۔ مجھ سے محبت میں اور باقی لوگوں سے "انسیت" میں بہت فرق ہے۔"

وہ جیسے جوئی کو باور کروا رہی تھی وہ عدل کے لیے بہت اہم تھی۔ یہ تو جوئی اپنی آنکھوں سے دیکھتی تھی' مامن اور عدل کی بے تکلفی' ان کا ایک دوسرے کو سمجھنا' اٹیچ منٹ' محبت' اظہار' سب واضح تھا۔ جوئی تو چاہ کر بھی عدل سے اتنی برجستہ گفتگو نہیں کر سکتی تھی' بے تکلفی نہیں دکھا سکتی تھی' وہ مامن کی طرح اس کے کندھے جھنجوڑنے' بال کھینچنے' اسے مکے گھونسے مارنے کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس کی پلیٹ میں سے کچھ بھی بغیر پوچھے یا پوچھ کر بھی نہیں اٹھا سکتی تھی۔ وہ عدل کی چائے' کافی' جوس' حتیٰ کہ پانی تک کا گلاس پکڑ کر پینے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ مامن کی طرح عدل کے لیے کانٹینینٹل کھانے نہیں بنا سکتی تھی۔ وہ نان' خطائی' بیسن کے لڈو' چھٹے کے حلوے' نمکین مٹھریاں' جلیبی' کھویا' موتی چور کے لڈو اور امرتی بنانے والی جھینگا پلاؤ' چکن بریانی' پمفلٹ' پڈنگ' کیک' کوکونٹ رائس' چائنیز سوپ' اسٹرابیری سوپ' چیز سینڈوچ' کریزا' لزانیہ ٹائپ ڈشز کیسے بنا پاتی' اسے تو کافی بنانا بھی نہیں آتا تھا۔ اور تب اسے کتنی شرمندگی اٹھانا پڑی تھی جب ایک رات اسے انگلش کا ٹیسٹ یاد کرواتے عدل نے نرمی سے کہا تھا۔

"جزا! میرے لیے کافی تو بنا لاؤ۔۔۔ سکینہ تو اپنے کوارٹر چلی گئی اور مامن نیٹ پہ بزی ہے۔" وہ کسی کتاب میں غرق اچانک بولا تھا۔

جوئی فوراً" سرہلا کر کتاب رکھے اٹھ کر کچن میں چلی آئی تھی۔ اسے پتا تھا' چائے کافی کا سامان کہاں رکھا ہے۔ مگر اسے کافی بنانے کا نہیں پتا تھا۔ وہ آدھا گھنٹہ وہیں کھڑی رہی۔ سوچتی رہی' غور کرتی رہی۔

"جانے چاچی اور مامن کیسے بناتی ہیں؟ پہلے قہوہ' پھر دودھ' پھر کافی پاؤڈر؟ اللہ جی! کیسے بناؤں؟" وہ انگلیاں مسلتی چولہے پہ پانی چڑھانے لگی تھی۔ پھر اس نے اپنی عقل کے مطابق ہی پانی میں انڈیل کر قہوہ بنایا' دودھ ڈالا' کافی پاؤڈر مکس کیا اور اپنے تئیں بڑا سا مگ کافی کا تیار کر کے ٹرے میں رکھے وہیں کھڑی سوچتی رہی۔

"جانے عدل کو پسند آئے گی یا نہیں۔" پہلی مرتبہ عدل نے کوئی فرمائش کی تھی۔ اگر اسے پسند ہی نہ آئی تو پھر اس سے آگے وہ سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

اسے کھڑے کھڑے چکر آرہے تھے جب عدل خود ہی گھبرایا گھبرایا کچن میں آگیا۔

"جزا! تم ٹھیک تو ہو؟ اتنی دیر لگا دی؟ میں گھبرا گیا تھا۔" جب وہ پون گھنٹے تک بھی واپس نہ آئی تب وہ گھبرا گیا۔ جانے وہ برنر جلا پائی یا نہیں؟ خود کو جلا نہ لیا ہو۔ گیس کا والو نہ کھول لیا ہو؟ کئی طرح کے وسوسے لیے وہ کچن میں بھاگا بھاگا آیا تھا پھر جزا کو ٹھیک ٹھاک دیکھ کر

اس کی جان میں جان آئی تھی۔ تاہم وہ جس قدر راسیمہ سی کھڑی تھی عدل پھر سے متفکر ہو گیا۔

"کیا ہوا؟ ایسے کیوں کھڑی ہو؟ ارے کافی بنالی گڈ! مجھے وہ شدید طلب تھی۔" اس نے مسکرا کر مگ پکڑ لیا۔ مگر پہلے ہی گھونٹ نے بے مزہ کر دیا تھا۔ اسے ابکائی آتے آتے رہ گئی۔

"ایں ۔۔۔ یہ کیا بنایا ہے؟" وہ بری طرح حیران ہو کر مگ میں جھانکنے لگا تھا۔ مگ میں کالا سیاہ عجیب رنگت کا کوئی محلول تھا۔

"پسند نہیں آئی کیا؟" جوئی نے انگلیاں مروڑتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آس سی لہرا رہی تھی۔ جیسے وہ ابھی بہت تعریف کرے گا۔ جیسے مامن کی بنائی ڈشز کی کرتا تھا۔ عدل کچھ بولتے بولتے رک سا گیا۔ وہ بڑی امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"بہت اچھی بنائی ہے۔ بہت الگ منفرد اور مزے وار سا ٹیسٹ آرہا ہے۔ افریقی برانڈڈ کافی ہے۔ بہت اعلا بہت لاجواب۔ مجھے بھی ریسپی بتانا، میں بھی کبھی اکیلا ہوا تو ٹرائی کروں گا۔ بہت عمدہ خوشبو اور بہترین ذائقہ ہے۔ میں ایک مگ اور بھی پینا چاہوں گا۔ جزا! تم لاجواب کافی بناتی ہو۔" اس نے کھڑے کھڑے تعریفوں کے عظیم پل کھڑے کر دیے تھے اور دیکھتے دیکھتے جوئی کا چہرہ چاندی کی طرح چمکنے لگا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے اس کی اتنی عمدہ تعریف کی تھی۔ حالانکہ یہ تو معمولی سی کافی تھی۔ وہ تو چالیس چالیس کلو کھویا اور بوندی کے لڈو تیار کرتی تھی۔ انتہائی لذیذ، خستہ، عمدہ ترین، مگر کسی نے کبھی جھوٹے منہ تعریف نہیں کی تھی۔ اور یہاں عدل نے ایک مگ میں موجود قہوے دودھ اور پاؤڈر کے محلول کی اتنی تعریف کر ڈالی تھی۔ اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکنے لگی تھیں۔

"کیا میں ایک اور مگ بنا دوں؟"

اس نے سرخوشی کے عالم میں کہا تھا۔ یہ عدل کا بخشا ہوا اعتماد تھا جو وہ اس کے سامنے کچھ کچھ بولنے لگی تھی۔ اسے دوبارہ کوکنگ رینج کی طرف بڑھتے دیکھ کر عدل بوکھلا گیا تھا۔ کافی کی چسکیاں حلق سے بمشکل اتارتے ہوئے وہ جلدی سے بولا تھا۔

"آں ۔۔۔ ہاں نہیں جزا! آج کے لیے اتنا ہی ۔۔۔ پھر کبھی ایسی ڈوز لینے کے لیے تمہیں زحمت دوں گا۔ ابھی تم اپنا ٹیسٹ یاد کرو، ویسے بہت سارا شکریہ تم نے کافی بنائی سویٹ کزن!" اس نے خود پر مزید ظلم ڈھاتے ہوئے آدھا مگ کھڑے کھڑے پی لیا تھا۔ تاہم وہ جوئی کی خوشی کو ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے غیر ارادی طور پر پوچھنے لگا۔

"تم کوکنگ میں تمہیں اور کیا بنانا آتا ہے؟" وہ جو گندے برتن سنک میں رکھے دھونے لگی تھی، اس کے سوال پر گردن موڑتے ہوئے بڑے جوش سے بولی۔

"مجھے بوندی کے لڈو بہت اچھے بنانے آتے ہیں ۔۔۔ میں چالیس چالیس کلو آرڈر پہ بناتی تھی۔" اس کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ جیسے وہ اپنی اس صلاحیت پر بہت نازاں تھی۔ عدل چالیس کلو کا سن کر حیران رہ گیا۔

"تم بیکری کا کام کرتی تھیں۔" اس نے متعجب ہو کر پوچھا تھا۔ اسے جیسے دھچکا لگا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"نن ۔۔۔ نہیں تو، میرے ماموں کا اپنا کاروبار تھا۔ لڈو اور کھویا بناتے تھے۔ میں نے نانی سے سیکھا۔" جوئی نے ہکلا کر وضاحت کی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ عدل کو برا لگا ہے۔ وہ گھبرا گئی تھی۔

"تمہارے ماموں تو فوت ہو چکے اور نانی بھی۔ پھر کاروبار کون چلاتا تھا؟" وہ خاصا برہم لگ رہا تھا۔

"ماموں کا بیٹا۔" اس نے مری مری آواز میں بتایا تھا۔ جانے عدل کو کیا برا لگا تھا۔

"کیا کاریگر رکھے ہوئے تھے؟ یا پھر تم ہی۔" وہ کچھ سوچ کر بولا تھا، پھر اس نے مگ سنک میں لڑھکا دیا۔ وہ بدمزا سی زہر بھری کافی تقریباً" پی چکا تھا۔ جوئی جیسے نہال ہی ہو گئی۔ مگ جو خالی تھا۔

"میں کام کرتی تھی۔ کاریگر تو بہت بعد میں آئے۔" اس نے مگ دھو کر ریک میں سجا دیا تھا پھر دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھنے لگی تھی۔

عدل کچھ سوچتا ہوا اس کے قریب آگیا۔ پھر اس نے جوئی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر باریکی سے جائزہ لیا۔ اب وہ اس کے بازو دیکھ رہا تھا۔ آستین ہٹا کر۔ اسے کہیں کہیں مدہم پڑتے دھبے دکھائی دیے۔ ہاتھوں اور بازوؤں پر نشان تھے۔ جگہ جگہ سے جلد اکھڑی ہوئی سرخ تھی۔ کئی زخم بھر گئے تھے اور کچھ پہ کھرنڈ جما ہوا تھا۔

"یہ جلنے کے نشان ہیں نا؟ آئل یا گھی سے؟" وہ متفکر سا پوچھ رہا تھا۔ جوئی حیران حیران سی سر ہلانے لگی۔

"ذلیل کا بچہ، تم سے کام کرواتا تھا۔ تب ہی جب بھی بابا تمہارا ذکر کرتے تھے صرف ایک ہی بات دہراتے۔ جوئی برے حالوں میں ہے۔ جب تم آئی تھیں تب بھی تمہارے ہاتھ پہ نشان تھے۔ جانے لوگ اللہ سے کیوں نہیں ڈرتے۔ یتیموں کو ستاتے ہیں۔ وہ تمہارے رشتے دار تھے یا جانور؟ مجھے تو آج تک حیرانی ہے۔ آخر بابا نے تمہیں ان درندوں کے پاس کیوں چھوڑا؟ یہاں کیوں نہیں لائے؟ تمہیں اچھا ماحول ملتا، اچھی اسکولنگ ہوتی، بہترین خوراک ملتی۔ تب تم کسی اور جزا کے روپ میں ہوتیں۔ خیر میں اب بھی تمہیں ویسی جزا بنا دوں گا۔"

عدل بہت ملائمت، نرمی اور محبت کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک تھی جیسے ہلکی سی اوس گری ہو۔ بابا کی یاد میں یا پھر جوئی کی تکلیف کے احساس سے۔

"میں آپ کو بوندی کے لڈو بنا کر کھلاؤں گی۔ آپ نے ایسے لڈو عمر بھر نہ کھائے ہوں گے۔" وہ اسے تکلیف کے احساس سے باہر نکال لائی تھی۔ تب وہ چونک کر سر ہلانے لگا۔

"اس کافی جیسے مزے دار؟" وہ سہم گیا تھا۔ اور ہنسنے لگا۔ پھر اس کے سر پہ چپت لگا کر بولا۔ "ہاں ضرور میں دو لڈو کھاؤں گا اور جو بچ گئے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرے اور موسیٰ کے ٹریننگ آرڈر آنے والے ہیں۔"

پھر وہ اسے ٹیسٹ کے متعلق تاکید کر کے مڑ گیا۔ جبکہ جوئی پتھر میں ڈھلی مورت بن گئی تھی۔

"عدل جانے والا تھا، کہاں، کدھر؟ اسے تنہا چھوڑ کر۔" اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے ۔۔۔ وہ چکر کھا کر گر ہی پڑتی اگر غفیو چاچی کی آواز اسے زہریلی سوچوں کے بھنور سے نکال نہ لاتی۔ وہ جانے کب سے باہر کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھیں اور اب بہت گہری کاٹ دار نظروں سے اسے چھیدتی بظاہر ملائمت سے بولیں۔

"بوندی کے لڈو ضرور بنانا، مگر عدل کی شادی پہ مہندی کی رسم کے لیے تیار کرنا۔ آخر حلوائی کزن کا کوئی تو فائدہ ہو۔" وہ تیکھے لہجے میں کہتی بہت سرد آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔

"اور ہاں ۔۔۔ عدل سے دور ہی رہا کرو۔ ورنہ جلد ہی کوئی اور بندوبست کر دوں گی۔ اس کے ساتھ چپکنے کی ضرورت نہیں، وہ تمہیں منہ لگا رہا ہے۔ اپنے باپ کی وجہ سے۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔" وہ اسے پتھر کا بت بنا کر باہر نکل گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اس کے لیے وقت پھر سل کا درخت بن گیا۔ اونچا، لمبا، سیدھا اور طویل۔ جس پہ چڑھنا نہایت مشکل تھا اور وہ چڑھتے ہوئے، وقت کو برتتے ہوئے ہانپ ہانپ جا رہی تھی۔

غفیو اور مامن نے اس کے لیے خاموش محاذ کھڑا کر لیا تھا۔ یہ خاموشی تب ٹوٹ جاتی جب عدل نظر سے اوجھل ہوتا تھا۔ اگرچہ اس کے سامنے بھی وہ کچوکے لگانے سے باز نہیں آتی تھیں۔ مامن تو پھر بھی لحاظ کر جاتی تھی۔ مروت برت جاتی تھی۔ مگر غفیو دو دھاری تلوار تھیں۔ کبھی شہد بن جاتیں، کبھی زہر اور انہیں جوئی کی ذات کو پیروں تلے کچل کر ذرا بھر نہ شرمندگی محسوس ہوتی تھی، نہ شرمساری، نہ ندامت اور اب تو وہ جوئی کو اس کی ماں کے حوالے سے بھی طعنے

دیتی تھیں۔

"تمہاری ماں والا جادو اب نہیں چلے گا۔ اس نے بھی کئی سال میرے شوہر کو اپنے دام میں پھنسائے رکھا۔ میں اپنے بیٹے کو تمہارے جال میں پھنسنے نہیں دوں گی۔"

وہ خون خوار نظروں سے اسے گھورتی تھیں اور جوئی سہم کر کسی کونے میں گھس جاتی۔ حرف شکایت تو اس کی زبان پہ کبھی آتا ہی نہیں تھا اور اس کی اتنی جرات بھی نہیں تھی جو وہ عدل کو غفیو کے بارے میں بتا سکتی۔ پھر اگر بتا بھی دیتی تو کیا خبر عدل ماں سے بدگمان ہو جاتا اور غفیو چاچی اس کا سانس لینا بھی محال کر دیتیں۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی چکی تھی کہ اب اس کا جینا مرنا بس یہیں ہے۔ اس کی عزت محفوظ تھی۔ بس اس کے قناعت پسند دل کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

اور اس کا سمندر جیسا وسیع دل تو عدل اور یامن کی محبت جان کر بھی قانع ہو گیا تھا۔ اسے عدل سے محبت تھی، عدل کو یامن سے محبت تھی اور جوئی کو عدل کی محبت سے محبت تھی۔

اس نے اب تک کی مختصر زندگی میں ایک کام بڑی دل جمعی سے کیا تھا۔ ایثار اور صبر لیکن کبھی کبھی صبر کی دیواروں میں دراڑیں پڑ جاتیں، غفیو چاچی اور یامن اکثر اس کے صبر کو پل صراط سے گزارتی تھیں۔

پھر ایک روز یامن زبردستی اسے ___ اوپر والی منزل لے آئی۔ آج پھر اس نے جوئی کو کچھ خاص دکھانا تھا۔ گول سیڑھیاں چڑھ کر یامن اسے کار نر والے ایک کمرے تک لے آئی۔ آبنوسی دروازے والا یہ کمرہ لوکیشن کے لحاظ سے بہت پرفیکٹ تھا۔ اس کے سامنے بالکونی تھی۔ جولان کے اس حصے کی طرف کھلتی تھی جس طرف صرف گلاب ہی گلاب بہار دکھاتے تھے، اوپر سے یوں دیکھنے والی نگاہ کو مبہوت کرتے کہ بندہ بس سحر زدہ رہ جائے۔

یہ کمرہ سفید فرنیچر سے سجا تھا۔ نیا نکور دمکتا فرنیچر، چمک ایسی کہ آنکھیں چندھیانے لگیں۔ سفید صوفہ، سفید کارپٹ، سفید پردے اور سفید پینٹ، جوئی جیسے مبہوت رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر چاچو کے گھر کا یہ کمرہ تو کمال کے آرٹسٹک ذہن کا شاہکار لگتا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ دیواروں پہ سفید ہی فریم میں بے شمار تصویریں سجی تھیں۔ عدل اور یامن کی بچپن سے لے کر اب تک، پالنے سے لے کر جوانی تک، جوئی دیوانہ وار دیکھتی رہی۔

"تم ہم حیران رہ گئیں نا؟" یامن نے مسکرا کر بڑے یقین سے پوچھا۔ "اتنی تمہاری عمر نہیں، جتنے سال سے ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔" وہ بے خیالی میں چلتی ہوئی کارنس ___ پہ رکھی تصویر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ عدل اور وہ دو اکرمیں تھے۔ دونوں منہ پھاڑ کر روتے ہوئے، کتنے خوب صورت پل ممانے کیمرے میں محفوظ کیے تھے۔

"میں نے عدل کا خواب تب دیکھنا شروع کیا، جب مجھے خوابوں کی خبر تک نہیں تھی۔" وہ خواب آگیں لہجے میں بول رہی تھی۔ گم صم سی بے دھیان سی، جوئی کا روم روم سماعت بنا ہوا تھا اور اس کے لفظ اسے پتھر کر رہے تھے۔

"تب میں بہت چھوٹی تھی گیارہ یا بارہ سال کی۔" یامن کی آنکھ میں کوئی سنہرا پل لہرایا اور جوئی کے اندر کوئی زور ___ سے کرلایا۔

"کیا مجھ سے بھی چھوٹی؟ میں نے تو تب اسے دل میں بسایا جب دل کو دھڑکن کا اور دھڑکن کو دل کا کچھ پتا نہیں تھا۔" جوئی کا سر جھک گیا، یامن کا رتبہ، اس کی حیثیت، عدل سے اس کی محبت سب بہت بلند اور بھاری تھی۔ جوئی کی ذات ہیچ تھی، حقیر تھی۔ اسے جھکنا ہی تھا۔ سرنگوں ہونا ہی تھا۔ سو وہ جھک گئی تھی۔

"میں نے عدل کو بہت چاہا۔" اب وہ بڑے غرور سے بتا رہی تھی۔

"کیا مجھ سے بھی زیادہ؟" جوئی کا دل رو پڑا۔

"میں عدل پہ کچھ بھی قربان کر سکتی ہوں۔" یامن اپنی محبت کی انتہا بتا رہی تھی۔ اپنی شدتوں کا احوال سنا رہی تھی۔

"مجھ سے زیادہ؟ میں نے تو اپنا دل قربان کر دیا۔ کیا

تم اپنا دل قربان کر سکتی ہو؟" وہ سراپا کرب بنی کھڑی تھی، سراپا درد بنی کھڑی تھی۔

"عدل کے معاملے میں میرا دل بہت تنگ ہے۔ میں اسے کسی کے ساتھ دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتی۔" یامن جیسے بے بس ہو کر بول اٹھی تھی۔ پھر اس نے تصویر دیوار پہ سجا دی۔

"اور عدل کے معاملے میں میرا دل بہت وسیع ہے۔ میں اسے تمہارے ساتھ دیکھ کر برداشت کرتی ہوں اور صبر کرتی ہوں۔" اس نے سر جھکائے اپنے لرزیدہ پیروں کو دیکھا، نم ہتھیلیوں کو دیکھا۔ کپکپاتے، کمزور نیلی ابھری رگوں والے ہاتھوں کو دیکھا۔

"جانتی ہو، یہ کمرہ کس کے لیے سجایا گیا ہے؟" اب وہ بہت فرصت کے عالم میں جوئی کے چہرے پہ پھیلے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ اس کی لرزتی پلکیں، نیلا پڑتا چہرہ، کپکپاتا وجود... پھر بھی اس کا دل مٹھی میں بھینچنے سے باز نہ آئی۔

"یہ شادی کے بعد میرا اور عدل کا کمرہ ہوگا۔ مما نے پہلے ہی تیار کروا دیا۔ اس کی دیکھ بھال تمہارے ذمے، سکینہ پہ مجھے بھروسا نہیں۔ تم اس کمرے کا خیال رکھو گی نا؟" اب وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ جوئی کو اثبات میں سر ہلانا پڑا۔ پھر یہ عدل کا بھی تو کمرہ تھا۔ وہ کیسے انکار کرتی؟

"تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ موم سے بنی، جیسے چاہو سانچے میں ڈھال لو۔" جانے اب کیا ہوا تھا جو یامن اس کی تعریفوں پہ اتر آئی تھی۔ دراصل یامن ایسی ہی تھی۔ جوئی کو لگتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اس کا دل نہیں دکھاتی۔ بس عدل کی وجہ سے بے بس ہو کر دل کی بھڑاس نکالتی تھی۔

یامن سے بمشکل اجازت لے کر وہ نیچے آئی تھی۔ پھر اپنا اسکول بیگ اٹھانے لاؤنج میں آئی۔ ابھی اس نے یونیفارم بھی نہیں اتارا تھا کہ اسے سٹنگ روم سے بولنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ چاچی اور یامن کی آوازیں تھیں۔ وہ غیر ارادی طور پہ رک گئی۔

"مما! یہ کیا ڈراما ہے؟ عدل کو آخر کیا ہوا ہے؟ اس لڑکی کو اٹھا کر گھر لے آیا۔ اوپر سے اس کی خاطر گھن چکر بنا ہوا ہے۔" یامن بہت بھری بیٹھی تھی۔

درحقیقت یامن کی بکھری بکھری شکستہ حالت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ بہت کچھ دیکھتے ہوئے بھی وہ چپ رہنے پر مجبور تھی۔ عدل کی پیشانی کے بل اسے خاموش کروا رہے تھے۔ وہ جوئی کے معاملے میں کسی کی سننے والا نہیں تھا۔ اس صورت حال میں یامن کی پوری ہمدردیاں اپنی بہن کے ساتھ تھیں۔

"آپ اس معاملے کو لٹکا کیوں رہی ہیں؟ بابا کا چالیسواں بھی ہو گیا۔ آپ عدل سے بات تو کریں۔ شادی نہ سہی، نکاح کے لیے ہی اسے راضی کریں۔ یامن کی حالت آپ دیکھ رہی ہیں۔" یامن جذباتی ہو کر چیخ پڑی تھی۔

"تم فکر مت کرو۔ بہت جلد عدل اور موی کی شادی کا فنکشن رکھوں گی۔ بس تھوڑا سا انتظار کرلو۔" انہوں نے سٹنگ روم کے دروازے پر کسی کی موجودگی محسوس کر کے آواز کچھ اور بلند کر لی تھی۔ انہیں یقین تھا باہر جزا کھڑی ہے۔ دونوں شادی کے معاملات ڈسکس کرنے لگی تھیں، جبکہ جوئی لرزیدہ قدموں سے چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کے انگ انگ میں تھکن اتر آئی۔ دل قطرہ قطرہ پگھلنے لگا۔

"اور یہ تو طے ہے کہ تم میرے نصیب میں کہیں نہیں۔" اس نے آنکھیں میچ کر بہت سے آنسو اندر اتارے۔ "پھر بھی میرے دل کے سکون، خوشی اور راحت کے لیے تمہارا سامنے ہونا، تمہاری ذرا سی توجہ اور محبت ہی کافی ہے۔" جوئی نے داہنے بازو سے بندھی تھیلی کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا، اس کا دل جیسے چین کے احساس سے بھر گیا تھا۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی قناعت تھی؟

"میں تم سے، تمہاری محبت سے، تمہاری خوشی سے جلوں گی؟ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تم میرے ہو یا نہ ہو، میری ہر دعا تمہارے لیے ہے۔" اس کی آنکھوں میں عدل کا سراپا چھم سے اتر آیا۔

"محبت حسد کرنے، چھین لینے، بددعا دینے کا نام نہیں۔ محبت تنگ دلی کا نام نہیں، محبت کسی اندھے جنونی جذبے کا نام نہیں، محبت انتہا نہیں، محبت بقا ہے، محبت وفا ہے، محبت ایثار ہے، محبت دل کو بوند نہیں، بحر کرتی ہے، تمہاری عدل سے محبت اور میری عدل سے محبت میں بہت فرق ہے ماسن! زمین اور آسمان جتنا فرق، تم اس فرق کی عمر بھر بھی پیمائش نہ کر سکو گی۔ تم میری طرح عدل کو کبھی نہ چاہ سکو گی۔" اس کی آنکھ میں ماسن کا تصور بھی اتر آیا۔

"عدل کو تم سے محبت ہے، تمہیں عدل سے محبت ہے اور مجھے تم دونوں سے محبت ہے۔ میری محبت کی معراج کو تم دونوں نہ پہنچ پاؤ گے۔"

اس نے آنکھ سے گرتے سارے آنسو پونچھ لیے۔

وہ عدل اور ماسن کی خوشیوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی راہ میں اپنے آنسوؤں کی ایک بوند بھی گرانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کے صبر کی ابتدا اور محبت کی انتہا تھی۔



دن پہ دن الٹتے گئے، تاریخیں بدلتی رہیں، مہینے گزرتے رہے، عدل اور ماسن کی ٹریننگ ختم ہوئی۔ بیچ میں کچھ دن کا ریسٹ آیا اور مسافروں نے سفر کے لیے سامان باندھ لیے۔ ان دونوں کی پہلی پوسٹنگ اردن میں ہوئی۔ نیا سفر تھا، نئی من چاہی منزل تھی۔ دونوں بے انتہا پرجوش اور خوش تھے اور ان دونوں کو خوش دیکھ دیکھ کر جوئی کا دل سجدۂ شکر بجالاتا تھا۔ عدل، ماسن کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا، جوئی عدل کو دیکھ کر مسرور رہتی تھی۔ ان دونوں کی خوشی اور سلامتی عمر بھر کے لیے جزا کبیر کی دعا بن گئی۔

یہ اس کی دعا کی تپش اور محبت کی گرماہٹ تھی جو عدل کے دل تک ہر گزرتے دن کے ساتھ خود بخود پہنچتی رہتی۔ اس کا دل جوئی کی طرف کھنچتا، لپکتا، مائل ہوتا اور وہ جیسے بے بس ہو جاتا۔ ہاں، تب وہ یہ سمجھتا تھا کہ جوئی کو اپنے پیچھے تنہا چھوڑ کر جانے کے احساس سے اس کا دل بے چین ہے۔ شاید مما اور یاسمن کے رویے کی وجہ سے۔ جانے وہ لوگ اس کے ساتھ کیسا سلوک کریں؟ اگر بابا ہوتے تو اسے جوئی کی فکر نہ ہوتی۔ مگر اب اس کا دل بہت بے چین تھا اور اس کی بے چینیوں کا رخ بدلنے کے لیے غفیرو نے شادی کا ہنگامہ جگا لیا۔ بہت شارٹ نوٹس پہ شادی تھی۔ محض دس دن کے اندر اندر۔۔۔ غفیرو نے عدل کو اپنی محبت کا واسطہ دے کر منا لیا۔ حالانکہ ابھی ایک سال تک اس کا شادی کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ مگر غفیرو کے آنسوؤں سے پسیج گیا۔

پھر شادی کے فنکشن شروع ہوئے۔ مہندی، برات، ولیمہ، ایک سے بڑھ کر ایک فنکشن تھا۔ بہت ہی شان دار، بہت دھوم دھام نظر آئی۔ عدل اور ماسن کے مشترکہ دوستوں نے محفل کے رنگ بڑھا دیے تھے۔ ولید، نمل، اسجد، وقاص۔۔۔ ان سب نے ادھم ہی ڈیرا لگائے رکھا تھا۔ گھر پہ چھایا جمود جیسے ٹوٹ گیا۔ اب قہقہے، ہنسی، ڈھولک کی تھاپ سنائی دیتی تھی۔ ان کے دوست بہت ہنگامہ پرور تھے، گھر میں ادھم مچائے رکھتے۔

اور اسی ہنگامے میں عدل کا دوست ولید موتی چور کے لڈو بنانی جزا کا اسیر ہو گیا۔ وہ اسے بہت اچھی لگی۔ اپنے کام میں مگن، دھیما دھیما ہنستی، بہت سادہ اور معصوم سی لڑکی۔ اس کے بنائے لڈوؤں کی جیسے دھوم مچ گئی۔ عدل کے دوست اس کے گرویدہ ہو گئے۔

"ہم تو لڈوؤں پہ مر مٹ گئے۔" یہ ولید تھا۔ چوری چوری جوئی کو آتے جاتے دیکھتا ہوا۔

"لڈوؤں پہ یا پھر؟" نمل اس کی چوری پکڑ لیتی۔

تاہم ولید اپنی پسندیدگی عدل تک نہ پہنچا پایا۔ وہ عدل کا بیچ فیلو تھا اور ماسن، عدل کے ساتھ ہی اردن جانے والا تھا۔ وہ تو نم نم آنکھوں کو جھپکتی دل پہ جانے کیسے بھاری بوجھ لیے چلتی پھرتی، اس اداس لڑکی تک بھی اپنی پسندیدگی پہنچا نہیں پایا تھا اور شادی کے فنکشن خیریت سے انجام کو پہنچ گئے۔ زندگی معمول پہ آ گئی۔ جزا کبیر ایک بڑے بھونچال سے بڑے ہی صبر اور حوصلے کے ساتھ گزر گئی۔

مگر اس سے پہلے کیا ہوا؟

عدل کی مہندی والی رات؟

جب خلقت پہ نیند چھا چکی تھی۔ جب رات نے سیاہ لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ جب وہ چھوٹی سی پہاڑی لڑکی ایک تاریک گوشے میں دبکی اپنے داہنے بازو سے بندھی تھیلی کو کھول کر اس خستہ سے پیلے کاغذ کو دیکھ دیکھ کر اپنے دل کو شانت کر رہی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور کوئی چپکے سے اندر داخل ہوا۔ جزا اچانک گھبرا گئی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر خستہ سے اس پیلے کاغذ کو سینے سے لگا کر اپنے تئیں چھپانے کی اور آنے والی ہستی کی نظر سے اوجھل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ غفیرہ نے نہ صرف وہ پیلا خستہ کاغذ دیکھ لیا، بلکہ جھپٹ بھی لیا۔ ان کے تیور بڑے بھیانک اور خطرناک ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے جیسے شعلے لپکنے لگے۔

"یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟" ان کا چہرہ خون رنگ ہو گیا۔ جبکہ جوئی کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ ان کے غیض پہ تھر تھر کانپنے لگی۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ جیسے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔ اس کی خاموشی نے غفیرو کو اور طیش دلا دیا تھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کی آہنی گرفت میں اس کا چہرہ دبوچ کر جھٹکا دیا۔

"بولو، یہ کہاں سے آیا؟ کس نے تمہیں دیا؟" ان پہ طیش چڑھتا جا رہا تھا۔

"میری نانی نے۔" اس نے بمشکل ہکلا کر بتایا۔ اس کی آنکھ جھک گئی، سر بھی جھک گیا۔

"اوہ۔ تو ثبوت لیے پھرتی ہو۔۔۔ مکار بڑھیا سارے سبق پڑھا کر مری۔" انہوں نے غیض بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس خستہ کاغذ کے کئی پرزے کر دیے تھے۔ جوئی کا دل جیسے پرزہ پرزہ ہو گیا۔ وہ غفیرو کے قدموں میں جا گری۔

"رب کا واسطہ چاچی، ایسا نہ کریں۔" وہ فرش پہ گرے ٹکڑے اٹھانے لگی۔ "یہ کیا ظلم کیا چاچی! یہ کیسا غضب کیا چاچی!" ننھے کاغذ کے پرزوں کو چومنے لگی۔ اپنی اوڑھنی میں اکٹھا کرنے لگی، جبکہ غفیرو اب پرسکون کھڑی اس کی بے قراری دیکھ رہی تھیں۔ ان کا طیش اتر چکا تھا۔ جیسے وہ ایک اور قصہ تمام کر چکی تھیں۔

"عدل کو دکھانے کے لیے ثبوت رکھا ہوا تھا۔ بہت چالاک اور میسنی ہو تم۔" ان کا زہریلا لہجہ جوئی کو زہر زہر کر گیا۔

"عدل کو دکھانا ہوتا تو کب کا دکھا چکی ہوتی۔ آپ مجھے خود غرض سمجھتی ہیں چاچی! میری آپ کے بیٹے سے محبت ایسی خود غرض نہیں جو اسے کاغذ کا یہ ٹکڑا دکھا کر آزمائش کے پل صراط سے گزارتی۔ میں ایسا کبھی نہ کرتی۔ مگر آپ نے میری زندگی کا کل سرمایہ لٹا دیا۔ آپ نے اچھا نہیں کیا۔" وہ زمین پر بے حال بیٹھی تھی اور اس کے لفظوں نے غفیرو کو پتھر کر دیا تھا۔

"میری آپ کے بیٹے سے محبت ایسی نہیں، جو اسے آزمائش کے پل صراط سے گزارتی۔" جوئی کے الفاظ ان کے منہ پر طمانچے کی طرح پڑ رہے تھے۔ ان کے دل پر عجیب سا بوجھ لد گیا۔

"آپ کا بیٹا آسمان کا چاند ہے چاچی! اور چاند کا سنگی ماسن جیسا روشن ستارہ ہو سکتا ہے۔ میں بھلا عدل جیسے چمکتے آسمان کے چاند کو زمین پر اترنے اور اپنے برابر کھڑا کرنے پہ کیسے مجبور کرتی؟ میں عدل کی ماسن کے ساتھ محبت کو کیسے امتحان میں ڈالتی؟ میں عدل اور ماسن کے درمیان کیسے آ جاتی؟ میں ان پڑھ، غریب، کم عقل، نادان اور اجڈ ضرور ہوں۔ پر میں خائن نہیں، حاسد نہیں، میری ایسی اوقات کہاں تھی جو عدل کی طرف ہاتھ بڑھاتی۔ میں تو صرف اس کے لیے دعا کر سکتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔" اس کی آواز مدھم ہو گئی۔ اس کے آنسو خشک ہو گئے۔

"بہت۔۔۔ بولنا آ گیا ہے تمہیں۔" غفیرو چاہ کر بھی لہجے میں جلال نہ بھر سکیں۔ جوئی کے الفاظ نے انہیں بری طرح کوڑے مارے تھے۔ وہ جیسے اندر سے بری طرح شرمسار تھیں۔

"مجھ جیسی کمزور لڑکی سے کیسا خوف ہے غفیرو چاچی آپ کو؟" وہ اپنا کرچی کرچی وجود سمیٹتے بمشکل اٹھ پائی تھی۔ غفیرو جو اسے منہ توڑ جواب دینا چاہتی تھیں۔ بالکل گنگ ہو کر رہ گئیں۔ وہ اسے برا بھلا کہنا چاہتی تھیں۔ مگر اس کے برعکس ان کے منہ سے عجیب الفاظ نکلے۔

"میں ماہین کو دکھ میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی۔" وہ خود بھی حیران رہ گئیں۔ وہ اس لڑکی سے کیسی باتیں کرنے لگی تھیں۔ یہ دو ٹکے کی لڑکی اور وہ اس لڑکی کے سامنے اپنے محسوسات بیان کر رہی تھیں۔ انہیں جیسے خود پہ بھی تاؤ آگیا۔ ورپردہ جیسے انہوں نے ثابت کر دیا تھا۔ کہ اگر جوئی' عدل کے سامنے کچھ سچ اٹھا لاتی تو ماہین کے دل کو دھچکا پہنچنا تھا' سو جوئی کا یہ احسان تھا جو اس نے عدل کو کچھ بتایا نہیں تھا۔

"آپ۔" کیوں سمجھتی ہیں کہ میں ماہین کے دکھ کا باعث بنتی؟ اگر ماہین کو دکھ دیتی تو عدل کے دل کو ٹھیس پہنچتی۔ میں بھلا ایسا کس طرح کر سکتی ہوں۔" اس کی آواز اور بھی مدھم ہو گئی تھی۔ یوں کہ غفیرو بمشکل سن پائی تھیں۔ پھر ان سے وہاں کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔ وہ جیسے جوئی کے احسان کے بوجھ تلے دب گئی تھیں۔ ان کے پیر من من بھر کے ہو چکے تھے۔ وہ سر جھکائے پلٹ گئیں۔ جوئی کو نہ گالی دے سکیں' نہ جھاڑ سکیں نہ غصہ کر سکیں۔ جیسے جوئی کے الفاظ نے ان کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کروا دی تھی۔



پھر وقت تھوڑا اور آگے کو کھسک گیا۔ عدل اور ماہین کے اردن جانے کی تاریخ آگئی۔ وہ جانتی تھی۔ عدل کے چلے جانے کے بعد پھر کوئی موسم بہار اس کے دل کی سرزمین پہ نہ اترے گا۔

ادھر عدل کو جوئی کی فکریں کھا رہی تھیں۔ وہ اسے پڑھنے' اپنا خیال رکھنے کی تاکیدیں کرتا رہا تھا۔ اس شب عدل نے جزا سے بہت سی باتیں کیں۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے زمانے کی اونچ نیچ سمجھا رہا تھا۔ وہ اس سے عہد لے رہا تھا کہ اسے خوب پڑھنا ہے۔ بہت آگے جانا ہے۔ عدل اسے پراعتماد دیکھنا چاہتا تھا۔ بہت کامیاب دیکھنا چاہتا تھا۔ عدل نے اسے بتایا تھا۔ وہ جوئی سے بہت پیار کرتا ہے اور یہ کہ جوئی کبھی بھی خود کو تنہا نہ سمجھے۔ عدل ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا۔ وہ جب بھی پکارے گی۔ عدل کو موجود پائے گی۔ عدل نے اس سے کہا۔

"میری زندگی کے تین اصول ہیں جزا! ایک اگر میں غلطی کروں تو اس شخص سے ضرور معافی مانگ لیتا ہوں جس سے میں محبت کرتا ہوں دوسرا میں اسے کبھی نہیں چھوڑتا جو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مجھے چاہتا ہے اور تیسرا میں اس شخص سے کچھ نہیں چھپاتا جو مجھ پہ اعتبار کرتا ہے۔ انہیں یاد رکھنا۔ بابا کے بعد میں تم کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں اور یاد رکھنا۔ زندگی میں جب بھی کبھی کوئی نیا موڑ آئے' مجھے ضرور بتانا۔" عدل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دبایا۔ اس کے ہونٹوں پہ بڑی پیاری مسکراہٹ تھی۔ اس کی شفاف آنکھوں میں بڑی پیاری چمک تھی۔

یہی چمک ماہین کی آنکھوں میں بھی نظر آتی تھی۔ عدل سے شادی کے بعد وہ کسی فاتح شہزادی کی طرح جوئی کو آتے جاتے نخوت سے دیکھتی تھی۔ شادی کے بعد اس کی شخصیت میں اتراہٹ کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اس کے نخرے بھی بڑھ گئے تھے۔

حالانکہ یہاں ہار جیت کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ ماہین اسے شکست سے دوچار کرنے کے زعم میں تھی جبکہ جوئی نے یہ جنگ بنا لڑے ہی انجام تک پہنچا دی تھی۔ ماہین کی چھوٹی سوچ اس چھوٹی سی پہاڑی لڑکی کے دل کی وسعت تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ اگر جزا کبیر خان اس جنگ میں فتح چاہتی' عدل کے دل کو نہ سہی سوچ کو پلٹنا چاہتی تھی تو یہ کھیل اتنا مشکل تو نہیں تھا۔ اس کے عشق میں اتنی طاقت تو ضرور تھی جو عدل کبیر کو ایک دفعہ تو پلٹنے پر مجبور کر دیتی۔ بس بلال کبیر خان کے چند قول ہی تو دکھانے تھے اور وہ باپ کے ہر قول اور عہد پہ جان دینے والا کیونکر انکار کرتا؟

لیکن بات یہ تھی اس بااصول پہاڑی لڑکی کو زبردستی کے تعلق' رشتے اور سودے منظور ہی نہیں تھے۔ اس کی تو صرف ایک ہی خواہش تھی۔ عدل خود تمام سچائیوں کو جان کر سچے دل کے ساتھ اس کی طرف پلٹتا۔ چاہے اس خواہش کی تکمیل میں دس سال لگتے یا دس صدیاں۔۔۔ اسے انتظار کے زہر سے گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی۔

اور ایک بات تو طے تھی' عدل کے نام' اس کے حوالے' تعلق اور رشتے کے علاوہ کوئی جزا کبیر کی زندگی میں نہ آنے والا تھا اور نہ آسکتا تھا۔۔۔ ایک نام کی لذت سے سرشار وہ عمر کی تمام۔۔۔ پونجی لٹا سکتی تھی۔ کیونکہ عدل کبیر کے نام سے بہتر حروف ابجد میں نہیں تھے۔

پھر ہوا کچھ یوں۔۔۔ اس شب عدل اسے زندگی کے نئے سبق سمجھاتا لحہ بہ لحہ بھٹکنے لگا۔ اس نے کہا تھا۔

"جب تمہاری زندگی میں کوئی نیا موڑ آئے مجھے بتانا۔"

وہ عدل کی آنکھوں میں بہتی چمک دیکھنے لگی اور عدل کبیر جیسے منجمد ہوگیا۔ حالانکہ جوئی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے تو سر جھکا لیا تھا۔ مگر بعض جواب خاموشی کے پیراہن میں لپٹے ہوتے ہیں۔ اس کی جھکی آنکھوں میں ٹوٹے خواب تھے۔ وہ خواب جو آنکھ کا سراب تھے۔ مگر جان سے پیارے خواب تھے۔

خاموشی نے بول بول کر عدل کو ایسی گھبراہٹ میں مبتلا کیا کہ وہ ایک ٹک جوئی کے چہرے پہ ابھرتے رنگوں کو دیکھنے لگا۔ کوئی کہانی' کوئی افسانہ' کوئی داستان جیسے کھل رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے پہ بکھرے رنگوں کی کھوج میں پڑ گیا۔ وہاں سنجیدگی تھی' ٹھہراؤ تھا' صبر تھا' ایثار تھا' نزاہت تھی' محبت تھی' ہاں محبت تھی' وہ اس کھلے سچ میں الجھ گیا' حیرت میں پڑ گیا۔ پھر خود کو جھٹلانے لگا' ملامت کرنے لگا۔ آخر وہ کس سوچ میں پڑ گیا تھا؟

اس نے بالآخر خود کو جھٹلا دیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر گفتگو کے تار جوڑ رہا تھا۔ مسکراتا لہجہ' مسکراتی آنکھیں' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چھیڑنے لگا' کچھ دیر پہلے کی کیفیت کے اثر کو زائل کرنے کے لیے باتوں کے سرے سے بے ربط جوڑ دیتا۔ جوئی اس کی چمکتی آنکھوں کو دیکھتی اور سوچتی رہی۔

مامن سے شادی کے بعد وہ کتنا خوب صورت ہوگیا تھا۔

خوشی اور مسرت نے اس کی صحت کو قابل رشک بنا دیا تھا۔ جوئی کی نظر اس پہ ٹھہر ہی نہ پائی۔

"پتا ہے جزا! کہتے ہیں دنیا میں رہنے کے لیے دو بہترین جگہیں ہیں۔ کسی کے دل میں' یا کسی کی دعاؤں میں۔ اب تم مجھے بتاؤ میں تمہارے دل میں ہوں یا دعاؤں میں؟؟" اس کی آنکھوں میں بڑی شرارتی چمک تھی۔ جیسے وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ یا شاید سچ میں کوئی سوال کر رہا تھا۔

"دونوں میں۔۔۔" اس کا دل نرمی سے پکارا تھا۔ دل کی آواز شاید عدل تک پہنچ گئی تھی۔ تب ہی تو وہ اچانک چپ ہوگیا تھا یا شاید جوئی کے چہرے پہ پھیلے تاثرات اور رنگوں نے اسے منجمد کر دیا تھا۔ وہ اچانک اٹھا اور چلا گیا۔ اک طویل ترین مدت کے لیے۔۔۔ جوئی انگلیوں پہ حساب کرتی تھی۔ اک اک دن جیسے بھاری تھا اور رینگ رینگ کر گزرتا تھا۔

عدل اور مامن کے چلے جانے کے بعد زندگیوں پر جمود طاری ہوگیا تھا۔ تنہائی کے اژدھے نے غفیو کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شروع شروع میں وہ بہت خوش تھیں جیسے عدل کو جزا کے شر سے محفوظ کرنے کے احساس سے شاد تھیں۔ مگر گزرتے وقت نے انہیں تنہا' خاموش اور اداس کر دیا۔ وہ بھی جوئی کی طرح انگلیوں پہ حساب رکھنے لگیں۔ دن' ہفتے اور مہینے گنتیں۔ عدل اور مامن کے چلے جانے کے بعد ان کا جوئی سے رویہ بھی بہتر ہوگیا تھا۔ احساس تنہائی نے انہیں جوئی کے بہت قریب کر دیا تھا۔ پھر وہ آنے والے وقت میں نہ اسے طعنے دے سکیں' نہ پڑھائی سے روک سکیں' کیونکہ عدل کی جوئی کے لیے دی گئی ہدایات بہت سخت تھیں۔

اس کی پڑھائی کا سلسلہ جاری رہا۔ جب اس نے

میٹرک کیا تب عدل کی پہلی بیٹی ہوئی۔ غفیو کو جیسے زبان و مکاں بھول گئے۔ وہ پہلی فلائٹ سے اردن چلی گئیں۔ پھر ان کے آنے جانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ جب جوئی نے انٹر کیا' تب عدل تین بیٹیوں کا باپ بن چکا تھا۔ اس دوران وہ ایک مرتبہ بھی پاکستان نہیں آسکا تھا۔ تاہم وہ جوئی سے غافل بھی نہیں تھا۔ اس کی کامیابیوں پہ تحفے بھیجتا' الگ سے جیب خرچ دیتا۔ البتہ لمبی لمبی کالز کرنے کا اب اسے وقت نہیں ملتا تھا۔ جاب' مامن اور بچیوں نے اسے الجھا لیا تھا۔ غفیو جب بھی عدل اور بچیوں کے لیے اداس ہوتیں تو چلی جاتیں۔ واپس آتیں تب بھی اداس رہتیں۔

پھر پتا چلا۔ مامن نے جاب چھوڑ دی ہے۔ تب غفیو کے من کی مراد بر آئی۔ انہوں نے مامن کو بہت مجبور کیا۔ وہ اسے واپس آجانے کو کہتی رہیں۔ مگر مامن کے پاس سو بہانے تھے۔ وہ عدل کو تنہا چھوڑ کر بوڑھی پھوپھی کے لیے کیوں آتی؟

غفیو کو ایک چپ لگ گئی تھی۔ وہ سارا دن کمرے میں بند رہتیں اور اکثر لیدر کے سوٹ کیس کھول کھول کر جانے کیسے کیسے کاغذات نکال کر پڑھتی تھیں۔ تاہم جوئی کو ان کاغذات کی بھنک بھی نہ پڑنے دیتیں۔ ایسے ہی بہت سا وقت گزر گیا۔

عدل کے مجبور کرنے اور احساس دلانے پر غفیو نے زبردستی جزا کی منگنی کی۔ پھر اس کی منگنیوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ اگلے دس سالوں میں اس کی سات منگنیاں ہوئیں اور ٹوٹیں۔ بس آخری منگنی پانچ سال برقرار رہی۔ پھر اچانک وہ بھی ٹوٹ گئی۔ عدل کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ حیران اور متعجب تھا کہ جوئی کی منگنیاں کیوں ٹوٹ جاتی تھیں؟ اسے اپنی ماں کا ہی قصور نظر آتا تھا۔ ان دس سالوں میں وہ تین' چار دفعہ پاکستان آیا تھا۔ ہر دفعہ وہ جوئی کی منگنی کر کے شادی کی ڈیٹ رکھ کے جاتا اور اس کے وہاں پہنچتے ہی ادھر منگنی ٹوٹ جاتی۔ یہ صورت حال خاصی تشویش ناک تھی۔

وہ عمان میں پوسٹڈ تھا' ان ہی دنوں کی بات ہے۔ عدل پاکستان آنے کی تیاریوں میں تھا۔ اس کا ارادہ تھا وہ جوئی کی شادی کر کے ہی واپس آئے گا۔ اسے ماسٹرز کیے اور جاب کرتے ایک سال ہو چکا تھا اور اب وہ جوئی کی نیا پار لگا کر اپنی ذمہ داری اور فرض ادا کرنا چاہتا تھا۔

جس دن عدل کو یہاں آنا تھا' اسی دن ان کی زندگیوں میں بھونچال آگیا تھا۔ بچیوں کو اسکول چھوڑ کر واپس آتی مامن کا بہت شدید۔۔۔ ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ یوں کہ اس کی جان تو بچ گئی تھی۔ مگر دونوں ٹانگوں سے معذور ہوگئی۔

یہ صدمہ غفیو کے لیے قیامت تھا۔ مامن میں ان کی جان تھی۔ تب اس کی معذوری کے صدمے نے غفیو کو بستر پہ ڈال دیا۔ پھر ایک مدت لگی تھی عدل اور غفیو کو سنبھلنے میں۔ عدل خود گھن چکر بن گیا۔ وہ مامن کو لیے ملکوں ملکوں گھوما' اس کے علاج پہ پانی کی طرح پیسہ بہاتا رہا۔ مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ مامن پھر بستر سے اٹھ ہی نہ سکی۔ عدل کا غم' اس کی پریشانی' اس کے الجھے حالات' بچی زندگی کی بے ترتیبی کچھ بھی غفیو اور جوئی سے ڈھکا چھپا نہ تھا۔ عدل دفتر سے آکر گھر' بچیوں اور مامن کی دیکھ بھال کرتا' اس پہ ذمہ داریوں کے انبار لگ گئے تھے۔ وہ الجھا' پریشان اور بدمزاج رہنے لگا تھا۔ بچیوں کو پڑھانا' ان کو سنبھالنا' گھر کی دیکھ بھال' کھانا پکانا' کپڑے دھونا اور مامن کی ذمہ داری۔ اس کے اعصاب جیسے شل ہوگئے تھے۔ وہ نرسیں بدل بدل کر تھک چکا تھا۔ آئے دن نئی میڈ گھر آتی' مگر مامن کے مزاج میں اتنی تلخی آچکی تھی کہ کوئی بھی ایک ماہ سے زیادہ نہ ٹک پاتی۔

ولید اسے طرح طرح کے مشورے دیتا۔ کبھی کہتا' مامن اور بچیوں کو پاکستان بھجوا دو' کبھی کہتا مما کو یہاں بلوا لو۔ بچیوں کو عدل خود نہیں بھیجتا تھا۔ تینوں بیٹیاں اس سے بہت اٹیچ تھیں۔ پھر وہ مامن کو کیسے بھیجتا۔ وہ تو معذوری میں طوالت کی وجہ سے آدم بے زار' چڑچڑی اور غصیلی ہوتی جا رہی تھی۔ عدل اسے خود سے دور کرنے کی بات کرتا تو وہ دل ہی چھوڑ بیٹھتی۔ تین سال سے وہ ایک عذاب مسلسل میں مبتلا تھا۔ اسے کوئی حل ہی نظر نہ آتا۔ پھر ولید نے اسے مشورہ

دیا۔

"یار! اس طرح نظام چلنا مشکل ہے۔ تمہارے گھر، بچیوں اور مامن بھابھی کو ایک مستقل عورت کی ضرورت ہے جو ان کی دیکھ بھال کر سکے۔ تم اپنی اور میری شادی کروادو۔" ولید کے مشورے نے عدل کی آنکھیں کھول دی تھیں' وہ جیسے بدک گیا۔

"مجھ سے شادی کوئی پاگل عورت ہی کر سکتی ہے۔ یہاں کون اپنی زندگی آگ میں جھونکنے آئے گا۔ مامن کو اب نرسیں برداشت نہیں کرتیں۔ کسی عورت کا کیا حوصلہ ہوگا؟ جو خیر سے میری بیوی بھی ہوگی۔ پھر میری بچیاں ہیں۔۔۔ میں ان کو کسی بے رحم سوتیلی ماں کے حوالے کیسے کر سکتا ہوں۔ نا بابا! اپنے نادر مشورے اپنے پاس رکھو۔ البتہ تمہاری شادی کروادوں گا۔ مگر لڑکی تمہیں خود ڈھونڈنا ہوگی۔" عدل نے سرخ آنکھیں دکھا کر بات پلٹ دی تھی۔

"لڑکی تو ہے نا۔" ولید نے ذرا جوش سے کہا۔ وہ بیٹھے سے اٹھ گیا۔ ادھر عدل بھی چونکا۔

"کون؟" اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

"تمہاری کزن۔۔۔ جس نے موتی چور کے لڈو بنائے تھے۔ ارے۔۔۔ وہی جس کی نو' دس منگنیاں ٹوٹی ہیں۔" ولید کا جوش قابل دید تھا۔ تب عدل بھی ٹھٹک گیا۔ ولید نے دس سال کیریئر بنانے اور گھر تعمیر کرنے میں لگائے تھے۔ پھر بہنوں کو بیاہا تھا اور اب وہ ذمہ داریوں سے آزاد تھا۔

"ویسے یار! ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ تمہاری کزن بہت حسین ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ پھر تمہارے حوالے سے مضبوط بیک گراؤنڈ رکھتی ہے۔ اس کے باوجود اس کی اتنی منگنیاں کیوں ٹوٹیں؟"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" عدل تھوڑا اکھڑ گیا۔

"تمہیں احساس دلانا چاہتا ہوں۔ اپنے آس پاس نگاہ ڈالو۔۔۔ وجہ دریافت کر لوگے۔" وہ معنی خیزی سے بولتا اٹھ گیا تھا۔

پھر اسی شب تین سالوں میں پہلی مرتبہ عدل اور مامن کا ایک عجیب بات پہ جھگڑا ہوا۔ مامن کی معذوری کے تین سالوں میں یہ پہلا طویل ترین جھگڑا تھا۔ ولید کی باتوں کے بعد مامن کی بلاوجہ کی ضد نے عدل کو چونکا دیا تھا۔ وہ اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ جزا کو خدمت کے لیے یہاں بلوالے۔

"وہ ملازمہ نہیں ہے۔" عدل چیخ پڑا تھا۔

ایک دن تنگ آکر اس نے مما سے جھگڑنا شروع کر دیا۔

"میری آپ کو بہت فکر ہے۔ اس یتیم' لاوارث کا سوچا ہے؟ جسے گھر میں باندھ رکھا ہے؟ اس کو بیاہتی کیوں نہیں؟ کیوں اس کی منگنیاں تڑواتی ہیں؟" وہ ماں سے الجھ پڑا۔

"میں نے کبھی اس کی منگنی نہیں تڑوائی۔" مما کی صفائی نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ چیخ کر بولا۔

"پھر اب تک اس کی شادی کیوں نہیں ہوئی۔"

جانے وہ اتنا بد مزاج کیوں ہو رہا تھا۔

"مامن کی ضد مجھے اور اسے کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔ بلا کی احمق ہے۔ جان کر آگ میں ہاتھ ڈالنے لگی ہے۔" انہوں نے فون بند کر کے زیر لب بڑبڑانا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں وہ کھوئی کھوئی رہتیں۔ خود سے باتیں کرتیں۔ الجھتیں' غمگین رہتیں' پھر مامن کی مسلسل کالز اور ضد "جوئی کو بھجوادیں"۔ مامن نے جانے کیا ٹھان رکھی تھی۔ ان کا دل اس کے جذباتی فیصلوں پہ تھر تھراتا رہتا۔

"جوئی کو پہلے والی جوئی مت سمجھنا۔۔۔ وہ بہت بدل گئی ہے۔ سینکڑوں میں ممتاز ہو گئی ہے۔ نظر ٹھہرتی نہیں اس پر۔" وہ اسے خطروں کا احساس دلاتی تھیں۔ اس کی آنکھیں کھولتیں۔۔۔ مگر وہ کچھ سنتی سمجھتی نہیں تھی۔ جانے اس نے کیا ٹھان رکھی تھی۔

تب غفیو اچانک آگئیں۔۔۔ سچ تو یہ تھا گھر کی حالت' بچیوں کے اجڑے حلیے اور مامن کی شکستگی دیکھ کر انہوں نے زہر کا گھونٹ بھر کے مامن کے فیصلے سے اتفاق کر لیا۔

"آپ مجھے احمق سمجھتی ہیں مما! پل صراط سے گزر کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ خود سوچیں۔ آخر کب تک عدل میری بیماری سے سمجھوتا کیے رہے گا۔ پھر میری بچیاں کیسی اجڑ بچڑ گئی ہیں۔ کن حالوں میں ہیں' نہ اسکول کا کام کرتی ہیں۔۔۔ نہ پڑھتی ہیں' نہ ٹھیک سے کھاتی ہیں۔ مجھے' میری بچیوں کو ایک ہاؤس کیپر کی ضرورت ہے جو میرے گھر' بچیوں کو اور مجھے سنبھالے۔ خود کو مالک نہیں بلکہ ایک نگراں سمجھے۔ جو فطرتاً" دبو ہو' لاوارث ہو۔ کوئی خاندان نہ رکھتی ہو۔ جس کا آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ ایسی تنہا' لاوارث' بے زبان' دبو اور کمزور لڑکی بھلا کہاں مل سکتی تھی؟ میں نے بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا ہے۔"

وہ بہت سکون کے عالم میں انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر رہی تھی۔ غفیو کے اندر اطمینان چھلکنے لگا۔ انہیں مامن کا فیصلہ درست لگا۔ پھر وہ یہی اطمینان لے کر واپس چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

پھر ایک دن ایک شاپنگ مال میں عدل کی ملاقات ایک طویل عرصے کے بعد واجد صاحب سے ہوئی تھی۔ وہی واجد صاحب جو اس کے بابا کے اسسٹنٹ تھے اور بابا کے آخری وقت میں ان کے ساتھ ساتھ رہے تھے۔ عدل انہیں دیکھ کر ایسے خوش ہوا تھا جیسے اپنے بابا کو ہی دیکھ لیا ہو۔ واجد صاحب بھی عدل سے بہت محبت اور جوش سے ملے۔ وہ بہت خوش مزاج انسان تھے۔ اس سے بڑی بے تکلفی سے بولے۔

"اور شہزادے! کیسی گزر رہی ہے؟ بچے کتنے ہیں؟ اور تمہاری بیوی کیسی ہے؟" وہ اسے لیے کیفے میں چلے گئے۔

"تین بیٹیاں ہیں اور بہت اچھی گزر رہی ہے۔" عدل نے گہرا سانس کھینچ کر بتایا۔ وہ انہیں مامن کی معذوری اور اپنی نجی زندگی کی مشکلات کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔

"ظاہر ہے۔۔۔ جزا جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے اچھی ہی گزرنی تھی۔ تمہارے چچا کی بیٹی' ڈاکٹر صاحب کی بھتیجی۔۔۔ جس میں ڈاکٹر صاحب کی جان تھی۔ میں جزا سے مل نہیں سکا۔ تاہم بنا اسے دیکھے بھی ایک ایک نقش بتا سکتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی صبح اور شام اسی کے نام سے ہوتی تھی۔" واجد صاحب مسکراتے ہوئے کہیں کھو گئے تھے۔ جبکہ عدل کو کافی پیتے ایکدم اچھو لگ گیا۔ اس نے واجد صاحب کی غلط فہمی دور کرنا مناسب سمجھا تھا۔

"آپ غلط سمجھے ہیں۔ میری شادی جزا سے نہیں ہوئی۔ میری کزن مامن سے ہوئی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا' جبکہ واجد صاحب کا منہ کھل گیا۔ یہ اطلاع ان کے لیے حیران کن تھی۔۔۔ وہ جیسے بھونچکا رہ گئے۔

"جزا سے نہیں ہوئی؟ کیوں؟ کیا تم نے ڈاکٹر صاحب کی خواہش پوری نہیں کی؟ تم نے عہد نہیں نبھایا؟" وہ بے ربط بولتے چلے گئے تھے۔ پھر جیسے سنبھل کر چپ کر گئے۔ تاہم عدل بے چین ہو گیا تھا۔ وہ ان کی بات قطعاً" نہیں سمجھا تھا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔" عدل نے حیرانی کے عالم میں پوچھا۔ وہ ان کی بات سمجھنا چاہتا تھا۔ لیکن واجد صاحب اچانک معذرت کر کے اٹھ گئے۔

"کچھ نہیں بیٹا! ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔ یہ بتاؤ ڈاکٹر صاحب کا بریف کیس تمہیں ملا؟ وہ امانت چھوڑ گئے تھے تمہارے لیے میں نے بیگم صاحبہ کو دیا تھا۔"

وہ جاتے جاتے پھر پلٹ آئے۔ عدل نفی میں سر ہلانا چاہتا تھا۔ پھر اچانک رک گیا اور اس کے ہاں کہنے پر وہ عجیب سے انداز میں "پھر بھی۔۔۔ تم نے۔۔۔" زیر لب کہتے ہوئے پلٹ گئے تھے۔ ان کا رویہ اور انداز عجیب تھا۔ وہ جاتے جاتے زیر لب بڑبڑا کر رہ گئے تھے۔

"بس آج کل کے بچوں کو اپنی خوشیاں' چاہت' تمنا' محبت عزیز ہے۔ والدین کی خواہش' خوشی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے تھے۔ جبکہ عدل کے سامنے کئی سوالیہ نشان چھوڑ گئے۔ آخر انہوں نے جزا کا ذکر کیوں کیا؟ بابا کیا چاہتے تھے؟ ان کی خواہش کیا تھی؟ انہوں نے مجھ سے ذکر کیوں نہ کیا؟ مجھ سے کہتے'

مجھے جاتے تھے۔ وہ الجھتا ہوا گھر آگیا۔ تاہم ان سوالوں کے جواب کھوج نہیں پایا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر کچھ دن مزید گزر گئے۔ عدل کے ذہن سے واجد صاحب کی باتیں نکلتی نہیں تھیں۔ وہ اکثر تنہائی میں واجد صاحب کی باتیں سوچنے لگتا تھا۔ پھر اسے بابا کی گفتگو یاد آتی۔ ان کی باتیں ذہن کے دریچوں پہ دستک دینے لگتیں۔

"تم دو لوگوں کے لیے میں کچھ بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

"ایک میں اور ایک؟" اس کا الجھن بھرا سوال ان کے چہرے پہ روشنی بکھیر گیا تھا۔ وہ روشن آنکھوں سے عدل کو دیکھنے لگے۔

"عدل اور جزا۔" انہوں نے عدل کی زندگی کے افسانے کو تب ہی مکمل کردیا تھا۔ جب وہ کچھ جانتا نہیں تھا۔ وہ تو اب بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ جاننے لگا تھا۔ واجد صاحب کی گفتگو' بابا کی خواہش' ان کے الفاظ' ان کی پہلی اور آخری تمنا۔

عدل اور جزا؟

تو گویا اس کے بابا' عدل اور جزا کو عمر بھر ایک ساتھ دیکھنا چاہتے تھے؟ یہ ان کی خواہش تھی' ان کی جنونی خواہش۔ عدل کا دل مٹھی میں بھر آیا۔

اس نے اپنے بابا کی خواہش کے ساتھ کیا کیا تھا؟

اسے جوئی یاد آئی۔ ایک خاموش کردار' ایک صابر اور قناعت پسند لڑکی۔ ایک محنت کش' سیدھی سادی لڑکی۔ جو عدل کو چوری چوری' چھپکے چھپکے پہروں دیکھتی۔

پھر اس کے چہرے پہ پھیلتے تاثرات' ایک کہانی سناتے' لہروں کی شکل میں چہرے پہ بکھرتے رنگ' اس کی آنکھ میں اتری خاموش سسکتی بہت پرانی کہانی؟ اور ایک بلکتا ہوا جوش کھاتا بے بس سا ارمان۔ ایک روح میں اتر جانے والی خاموش بے چین مگر قانع محبت۔

وہ آخری ملاقات!

جو جوئی کے دل کا ہر حال اسے سنا گئی تھی۔ پھر عشق اور مشک بھلا چھپنے والے کہاں تھے؟

وہ جوئی کے اندر کا حال جان کا تڑپ اٹھا تھا۔ یہ نادان لڑکی کس راہ پہ چل پڑی تھی؟ وہ تھرا اٹھا تھا۔ پھر اٹھ گیا' مڑ گیا۔ اک لمبے سفر پہ نکل گیا۔

پھر سچ تو یہ تھا' عدل جان بوجھ کر پاکستان جانے سے کترانے لگا تھا۔ وہ مما کو یہاں بلوا لیتا۔ مگر جوئی کو نہیں۔ وہ اس کی آنکھوں اور محبت سے ڈرنے لگا تھا۔ وہ اپنے کمزور ہونے سے ڈرنے لگا تھا۔ وہ ماہین سے بے وفائی نہ کرے۔ اس بات سے خوف کھانے لگا تھا۔

لیکن ایک بات وہ نہیں جانتا تھا۔ جوئی کی محبت میں مقناطیس جیسی طاقت ہے۔ اس کا دل بلاوجہ کھنچتا۔ وہ خود کو بہلاتا رہتا۔ خود کو سمجھاتا رہتا۔ جوئی اس کی ذمہ داری ہے۔ اسی لیے اس کے بارے میں متفکر رہتا ہے۔ وہ خود کو جواز دے کر چپ کرواتا تھا۔ مگر اسے سوچنے سے خود کو روک نہیں پاتا تھا۔ پھر اس کی زندگی میں ماہین کی معذوری بھونچال لے آئی۔ وہ بکھرنے اور ٹوٹنے لگا۔ پھر ان ہی دنوں ماہین کا اصرار' ضد اور جھگڑے طول پکڑتے گئے۔

وہ جوئی کو یہاں بلوا رہی تھی۔ تب وہ اندر سے کھٹک گیا تھا۔ کیا ماہین اپنے کسی مقصد کے لیے جوئی کو استعمال کرنا چاہتی تھی؟ اتنی تو اسے خبر تھی کہ ماہین بہت مفاد پرست ہے۔ اپنے فائدے کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہے۔

☆ ☆ ☆

پھر ان ہی دنوں جزا آگئی اور اس کے آتے ہی جیسے اس کی زندگی کا ہر الجھاؤ' بے ترتیبی ترتیب میں بدل گئی۔ اس نے جادو کی چھڑی سے سب کچھ بدل دیا۔ اس کا گھر پھر سے بن گیا۔ اس کی بچیاں صاف ستھری اسکول جانے لگیں۔ انہیں وقت پہ کھانا ملتا۔ ان کا ہوم ورک مکمل ہوتا۔ گھر بھی صاف ستھرا نظر آتا۔ ماہین کی دیکھ بھال بہترین ہونے لگی۔ اس کی دوائی اور

خوراک وقت پہ ملتی۔ جزا اسے صبح سویرے بنا سنوار دیتی۔ اس کی کنگھی کرتی۔ کپڑے استری کرکے دیتی۔ اسے وقت پہ کھانا ملتا' دوا ملتی' وہ دنوں میں بہتری کی طرف آرہی تھی۔

جزا کے آتے ہی عدل کی زندگی میں سکون بھر گیا تھا۔

ادھر ماہین نے جیسا سوچا تھا ویسا ہی ہوا۔ اس کی توقع کے مطابق جوئی بے دام کی غلام ثابت ہوئی۔ ایک خاموش کردار۔ جس کا مقصد اس گھر کی بہتری اور گھر والوں کی خدمت کے سوا کچھ نہ تھا۔

اور خاص طور پہ ماہین کی صحت بہتر ہو رہی تھی۔ وہ جیسے تین سال میں پہلی مرتبہ پرسکون ہوا تھا اور اس کا سکون اب دھیرے دھیرے ماہین کو بے سکون کر رہا تھا۔ وہ اپنے فیصلے اور ضد پہ پچھتاتی۔

پھر اس نے آہستہ آہستہ بہت تکلیف دہ منظر دیکھنے شروع کیے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور اپنے ہی دماغ سے سوچتی تھی۔ اس کے اردگرد خطرے کے الارم بجنے لگے تھے۔ کیونکہ اس کی نگاہ جوئی اور عدل کا بڑھتا التفات دیکھ رہی تھی۔ عدل کی نظروں کے نرم گرم تاثر' جوئی کی فکر کرنا۔ اس کا مشکور رہنا' اس کا خیال رکھنا۔ وہ بچیوں کے ساتھ آؤٹنگ پہ بھی جاتی بھی' پارک میں جاتی' ہر چھٹی کے روز عدل کے ساتھ گھریلو شاپنگ بھی کرتی۔ گھر کی سیٹنگ مرضی سے بدلتی' نئی چیزیں خریدتی' گھر سنوارتی' سجاتی۔

ان کا گھر پھر سے چمک دمک گیا تھا اور ماہین کے لیے جوئی کا ہر چیز میں گھسنا اور اپنی مرضی کرنا بہت تکلیف دہ تھا۔ پھر عدل اسے گھر سنوارنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں دیتا تھا' ملٹ کے حساب بھی نہ لیتا۔ اس کے لیے شاپنگ کرکے لاتا' اس کی ضروریات کا خیال رکھتا۔ وہ کچھ بھی پہن کے آتی' اس کی تعریف کرتا۔ اگر دیکھا جائے تو یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی جوئی کو اتنی توجہ' محبت اور عزت دیتا تھا اور اب تو جوئی نے اس کا گھر بار سنبھال رکھا تھا۔ اس کی بیٹیوں کا خیال رکھتی تھی۔ انہیں پڑھاتی' لکھاتی' توجہ اور بھرپور محبت دیتی تھی۔ وہ اس کا زیر بار رہتا تھا۔

تاہم ماہین اب کسی اور رنگ میں دیکھنے لگی تھی۔ اسے یہ التفات ڈپریشن میں مبتلا کرنے لگا تھا۔ وہ اپ سیٹ رہنے لگی' پریشان ہوتی۔ بے چین رہتی۔ پھر آہستہ آہستہ غصہ کرنے لگی' طنز کرنے لگی۔

اور جوئی ہمیشہ کی طرح نظر انداز کردیتی' درگزر کردیتی۔ وہ اس کی ذہنی کیفیت سمجھتی تھی۔ وہ ایک بیمار عورت کے خلاف کیونکر عداوت پالتی۔ لیکن اگلے چند ہفتوں میں وہ زہر بھی اگلنے لگی۔ ہاں' جب سلطانہ آگئی۔

سامنے والے فلیٹ میں ایک بیوہ عورت شفٹ ہوئی۔ وہ نہ صرف بیوہ تھی' بلکہ بانجھ بھی تھی۔ واجبی سی صورت' کچھ موٹی' تھوڑی بھدی۔ وہ اس کی بچیوں کے اسکول میں پڑھاتی تھی۔ بہت شریف' نیک اور صوم و صلوٰۃ کی پابند عورت تھی۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کو خصوصی توجہ اور محبت دیتی۔ بلکہ بچوں پہ جان چھڑکتی تھی۔

فارغ اوقات میں اکثر ماہین کے پاس آجاتی۔ بلکہ ماہین ہی اسے پیغام بھیج بھیج کر بلاتی تھی۔ وہ ماہین کے سیکڑوں کام کرتی۔ برتن دھوتی' کپڑے دھوتی' بچوں کو سنبھالتی' نہلاتی دھلاتی۔ اس سیدھی سادی عورت کو جیسے ایک خوب صورت مصروفیت مل گئی تھی۔

جبکہ یہ صورت حال جوئی کے لیے حیران کن تھی۔ اس کا کام بالکل ختم ہوگیا۔ وہ جیسے فارغ ہوگئی۔ ماہین' سلطانہ سے کھانا بھی پکواتی تھی اور بچیوں کو بھی اسی کے قریب رکھنے کی کوشش کرتی۔ بلکہ عدل کے بہت سے کام بھی سلطانہ کے سر ڈال دیتی اور سلطانہ ایسی مٹی کی مادھو کہ ماہین اسے نچائے جاتی اور وہ ناچے جاتی۔ بچوں کے لنچ بریک کی ٹیچر تھی اور چھوٹے چھوٹے بچے تک اسے الو' بے وقوف بنا کر چکمہ دے کر بھاگ جاتے تھے۔

ماہین کو جیسے مفت کی کل وقتی ملازمہ مل گئی تھی۔ جس کی طرف سے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ جس کی طرف عدل نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا اور سلطانہ نامی

عورت اس کا منصوبہ بھی مکمل کر سکتی تھی۔

اس گھر میں جوئی کو اپنا آپ مس فٹ لگتا تھا۔ مامن اب جوئی کو کسی کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی تھی۔ نہ کچن میں جانے دیتی اور نہ بچیوں کو اس کے قریب پھٹکنے دیتی۔

کچھ دن جوئی نے تحمل سے سب کچھ برداشت کیا۔ مامن کی بکواس' اس کی کٹیلی باتیں' اس کا غصہ' طنز اور یہاں سے جانے کے متعلق اہانت آمیز گفتگو۔۔۔ پھر اس نے عدل سے بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ یہاں گھر کی دیکھ بھال کے لیے آئی تھی۔ جب مامن کو اور بندہ مل چکا تھا۔ پھر جوئی کا یہاں رہنا بے کار تھا۔ وہ واپس پاکستان جانا چاہتی تھی۔ اس کا مدعا سن کر کچھ پل کے لیے عدل خاموش ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ اس کے جانے کا سن کر اس کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

"تم کیوں جانا چاہتی ہو؟ کیا مامن نے کچھ کہا ہے؟" وہ مضطرب ہو گیا تھا۔ ابھی تو وہ چند دن سکون اور چین بھی نہیں لے پایا تھا اور وہ جانے کی بات کرنے آ گئی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ مامن کیوں کچھ کہے گی۔ دراصل سلطانہ آپا گھر کی دیکھ بھال کر رہی ہیں۔ بچیاں بھی ان سے اٹیچ ہیں۔ سو میں نے سوچا' واپس چلی جاؤں۔ چاچی بھی تو اکیلی ہیں ادھر۔"

اس نے اپنی نرم' ٹھہرے لہجے میں بتایا۔ وہ مامن کی بدتمیزیاں چھپا گئی تھی۔ وہ ان دونوں میاں' بیوی میں جھگڑے' لڑائیاں' رنجشیں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ مامن نے اس کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا؟ وہ عدل کو کچھ نہیں بتاتی تھی۔

"یہ سلطانہ آپا کہاں سے ٹپک پڑیں اور مامن کو دیکھو' بے چاری سی عورت کو کام سے لگائے رکھتی ہے۔" عدل نے قدرے ناگواری سے کہا۔ وہ حیران تھا کہ مامن' سلطانہ آپا سے اتنی اٹیچ کیوں ہے۔

اسے تو کوئی بندہ پسند ہی نہیں آتا تھا۔

"سلطانہ آپا بہت بے ضرر خاتون ہیں۔ بہت اچھی ہیں اور میرا خیال ہے مامن نے انہیں ہاؤس کیپر کے طور پہ رکھ لیا ہے۔ انہوں نے بہت اچھے طریقے سے سب انتظام سنبھال لیا ہے اور فیچنگ بھی چھوڑ دی ہے۔ اس کا مطلب ہے' انہیں بھی یہ جاب پسند آ گئی۔"

جوئی نے بڑے تحمل کے ساتھ وضاحت کی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ اپنے تاثرات عدل پہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جانے اب عدل سے دوبارہ کبھی ملاقات ہوتی یا نہ ہوتی۔ جانے وہ اس چہرے کو کبھی دوبارہ دیکھ پاتی یا نہ دیکھ پاتی اور جانے زندگی میں اور کتنی ٹھوکریں باقی تھیں۔ جانے اس کے لیے کوئی پناہ گاہ تھی بھی یا نہیں؟

"تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد "سلطانہ آپا" کی تعریفوں کو نظر انداز کر کے وہ جوئی سے ایک الگ بات پوچھ رہا تھا۔ اپنے مسائل سے ہٹ کر۔

"کیا مطلب؟" جوئی کچھ پل کے لیے ہونق ہو گئی تھی۔ یہ عدل اب کون سا دفتر کھولنے والا تھا؟

"تم نے اپنی شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" عدل نے پھر سے وضاحت کی۔ جوئی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے سر کچھ اور جھکا لیا۔ یہ لفظ شادی ... اسے اذیت کی بھٹی سے گزار دیتا تھا۔

"یہاں میری بات کیوں چھیڑ دی؟ میرا کیا ذکر؟" وہ جز بز سی بولی۔

"تم میری ذمہ داری ہو۔ یہ بات کیوں بھولتی ہو؟ آج مجھے ایک بات بتاؤ۔ تمہاری منگنیاں کیوں ٹوٹ جاتی ہیں؟ کیا مما کی وجہ سے؟"

عدل نے بہت سوچ سمجھ کر نکتہ اٹھایا تھا۔ ولید سے دو ٹوک بات کے بعد اس نے جوئی سے اس ٹاپک پہ بات کرنے کا سوچا تھا۔ تاہم مصروفیت میں اسے وقت نہیں مل سکا تھا اور آج جب وقت ملا تو وہ سب کچھ واضح سننا چاہتا تھا۔

"چاچی کا اس میں کوئی قصور نہیں۔" اس نے جھکے سر کے ساتھ بتایا۔ اسے یہی کہنا تھا۔

"تو پھر؟" عدل حیران ہوا۔

"میں خود کسی کے قابل نہیں۔" وہ ہونٹ بھینچ کر بولی تھی' تب عدل کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

"یہ کیا جواز ہے۔" وہ خفا ہونے لگا۔

"میرے پاس یہی جواز ہے اور مجھے اس پہ مزید بات نہیں کرنا۔ آپ مجھے واپس بھجوا دیں۔ میری اب یہاں ضرورت نہیں۔ سلطانہ آپا یہاں کا انتظام سنبھال سکتی ہیں۔"

جوئی نے دو ٹوک بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ تب کچھ دیر تک عدل اسے بغور دیکھتا رہا۔ پھر بڑے تحمل کے ساتھ اس سے مخاطب ہوا۔

"تم واپس ضرور جانا۔ مگر اب ایسے نہیں۔ میں تمہاری شادی کروں گا۔ پھر اپنے شوہر کی مرضی سے جو دل چاہے کرنا۔"

اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔ گویا وہ کچھ ٹھان کے بیٹھا تھا۔ اس کی روح جیسے فنا ہو گئی۔ اسے بڑے زور کا چکر آیا تھا۔ وہ بے یقینی سے عدل کو دیکھے گئی۔ یہاں تک کہ اس کا دل بھر آیا۔ اس کے آنسو بے آواز گرنے لگے۔ عدل اس کے رونے پہ ششدر رہ گیا تھا۔

"مجھے شادی نہیں کرنا۔" وہ بے آواز روتی رہی۔ عدل اسے دیکھتا رہا۔ اسے جوئی کے رونے کی سمجھ نہیں آئی تھی اور جتنی سمجھ میں آئی تھی' وہ اسے واضح نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا۔ وہ جوئی کو روتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"میں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کے رونے کی وجہ سننا چاہتا تھا۔ حالانکہ وجہ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ مگر زبان تک کیسے آتی؟ وہ اتنا سمجھ تو نہیں تھا۔

"کوئی وجہ نہیں۔" اس نے بے دردی سے آنسو رگڑے اس کے انجان پن پہ جوئی کو دکھ ہوا تھا۔ وہ اس کے دل تک پہنچ ہی نہیں پایا تھا۔

"تو پھر اپنا مائنڈ میک اپ کر لو۔ میں ولید سے تمہارا نکاح کرنے والا ہوں۔" عدل نے جیسے فیصلہ سنا کر اسے فنا کر دیا تھا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔ وہ کیا کہہ رہا تھا؟

"میں نکاح نہیں کر سکتی۔"

"کیوں نہیں کر سکتیں۔" وہ ایک دم دھاڑا تھا اور اس کی دھاڑ نے جوئی کو سہما دیا۔ وہ پہلی مرتبہ بہت بلند آواز میں جوئی سے مخاطب ہوا تھا۔

"نکاح کے اوپر نکاح کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے سہم کر سوال کیا۔ بڑا غریب سا لاچار سا سوال تھا۔

عدل کے سر پہ جیسے آسمان آ گرا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھے گیا۔ وہ اچانک اسے بتا دے گی؟ یہ جوئی نے بھی نہیں سوچا تھا۔

"تمہارا نکاح؟ کس سے ہوا؟" عدل بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی بھر گئی تھی۔ اسے لگا جیسے کوئی قیمتی متاع اچانک لٹ گئی تھی۔ وہ اپنی کیفیات سمجھ ہی نہ پایا۔

"مامن اور چاچی کو پتا ہے۔ آپ ان سے پوچھ لیں۔" وہ پل صراط پہ چل رہی تھی۔ بالآخر اس نے آر پار ہونے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔

"اچھا۔۔۔ انہیں پتا ہے اور مجھے کیوں نہیں خبر؟" عدل اس جھٹکے سے بمشکل سنبھلا تھا۔

جوئی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ روشنی کی لکیر کو دیکھ رہی تھی۔ جو عدل کی آنکھوں تک آتی آتی پلٹ گئی۔ جوئی نے اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا تھا۔ کیونکہ وہیل چیئر گھسیٹتی۔۔۔ مامن آ گئی تھی۔ وہ جوئی کو طنزیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہنا چاہتی ہو۔

"کون سے راز و نیاز ہو رہے ہیں؟" مامن کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت تھی' حقارت تھی۔ وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

مامن کو دیکھ کر جوئی پلٹ گئی تھی۔ اسے اپنی پیکنگ بھی کرنا تھی۔ جوئی کے جاتے ہی عدل' مامن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مامن کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ ایک فائل بک' کچھ کاغذات' ایک کتاب یا پھر ڈائری' وہ سمجھ نہ پایا' یہ سب کیا تھا؟

وہ مامن سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے نئی بات شروع کر دی۔ وہ عدل سے دوسری شادی کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ ہر صورت اسے شادی کے لیے

رضامند کرنا چاہتی تھی۔ عدل کی شادی میں اس کے لیے بھلائی پوشیدہ تھی۔ وہ چاہتی تھی' عدل اس کی بات مان لے اور اس کی منتخب شدہ لڑکی سے شادی کرلے۔

وہ اپنی بیمار بیوی کو سمجھا رہا تھا۔ اسے شادی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنے سارے وہم نکال دے۔ عدل بے وفائی کرنے والا یا بدلنے والا نہیں۔ مگر مامن کو کون سمجھاتا؟ وہ آج عدل سے عہد لے کر اسے باندھ دینا چاہتی تھی۔ ایک بدصورت عورت کے ساتھ۔

"تم شادی کرلو عدل! اس گھر کو ایک سمجھ دار' نیک اور خدا ترس عورت کی ضرورت ہے۔" وہ ایک مرتبہ پھر اسے قائل کررہی تھی۔ شاید وہ قائل ہوجاتا' اگر روشنی کی ننھی سی لکیر اس کی توجہ نہ بٹاتی۔ لمحہ بھر کے لیے اس کی توجہ ہٹ گئی۔ وہ روشنی کی ننھی لکیر کو دیکھنے لگا۔ مامن اسے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی آخر عدل نے تنگ آکر کہہ ہی دیا۔

"اچھا۔ تو شادی کے لیے ایک عورت کی ضرورت ہوگی۔ ایسی عورت جو اس گھر کو جوڑ کے رکھے۔ ایسی عورت کہاں سے دستیاب ہوگی؟" وہ روشنی کی ننھی لکیر سے نظر ہٹا کر استہزائیہ بولا۔

"لڑکی میں نے ڈھونڈلی ہے۔" اس کی آنکھیں جگمگا گئی تھیں۔ جیسے من چاہی مراد بر آئی تھی۔

"کون لڑکی؟" وہ الجھ گیا۔ ذہن کی اسکرین پر جوئی کا چہرہ روشن ہوا۔ کیا مامن نے جوئی کو؟

اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہیں پایا تھا۔ اس کا ذہن جیسے بند ہونے لگا۔

"یہ سلطانہ۔۔۔" مامن نے اس کے سر پہ جیسے دھماکہ کیا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ہکا بکا رہ گیا۔

"سلطانہ آپا؟" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔ پھر اس کے تیور ہی بدل گئے۔ رنگ ہی بدل گیا۔

"اس حادثے میں تمہارا دماغ بھی متاثر ہوا ہے۔ مجھے تمہارے دماغ کا بھی ٹریٹمنٹ کروانا ہوگا۔ پاگل ہوچکی ہو تم۔" عدل کا دل چاہا مامن کے منہ پہ رکھ کے طمانچہ مارے۔ وہ ایک بیوہ مسکین عورت کو کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہ رہی تھی؟ وہ عورت جو ممتا کی پیاسی تھی اور اپنی پیاس مٹانے کے لیے اس کے گھر کا بوجھ بخوشی اٹھا رہی تھی۔

اسے مامن کی خود غرضی پہ تاؤ آیا' غصہ آیا' دکھ ہوا' اس کا شدید ردعمل مامن کو بھی اشتعال دلا گیا تھا۔ وہ اپنی سدھ بدھ بھلا گئی تھی۔

"تو تم نے کیا سوچ رکھا تھا؟ میں تمہاری شادی جوئی سے کروادوں گی۔ میری ناک تلے کھیل رچا رہے تھے۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ اور وہ دو ٹکے کی مکار عورت تم پر ڈورے ڈال رہی تھی۔ اٹھا کر باہر پھینک دوں گی اسے۔ پہلی فرصت میں اس کی سیٹ بک کرواؤ۔ میں اسے مزید برداشت نہیں کرسکتی۔"

مامن کا دماغ الٹ گیا تھا اور اس نے اپنے اندر کا زہر اگل دیا۔

"میں تمہارے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھی۔ تمہارے بدلتے انداز اور جوئی کی طرف جھکاؤ۔ اسی لیے تمہاری شادی کروانا چاہتی تھی۔ مجھے تمہارے ارادے نیک نہیں لگتے تھے۔ مگر جس کی طرف تم مائل ہورہے ہو۔ وہ پہلے سے کسی کے نکاح میں ہے۔ مجھے ممانے بتایا۔ وہ اپنے کزن کو چاہتی ہے۔ اسی کے لیے ابھی تک انتظار میں بیٹھی ہے۔ شاید اس کا کوئی پرانا عاشق' مورکھ کا باسی۔ اس کا ماموں زاد۔۔۔"

وہ جوش جذبات اور غصے کے عالم میں عدل کو جوئی کے پرانے فرضی عشق کی داستان سنا رہی تھی۔ اسی جوش میں اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈائری اٹھا کر عدل کی طرف اچھالی۔

"اس ڈائری کو پڑھو۔ جوئی کے عشق کا لفظ لفظ' وہ اپنے کزن کی محبت میں گرفتار ہے۔ جانے کتنے سالوں سے۔"

اس نے آگ بگولہ ہوکر وہیل چیئر گھسیٹی' اسی اثنا میں ہاتھ سے فائل بک نیچے گر گئی تھی۔ اک پیلا' خستہ اور کمزور کاغذ پھڑپھڑانے لگا۔ مامن خود حیران رہ گئی۔ یہ کاغذ بھلا کیسا تھا؟ اس کی نگاہ سے کیسے اوجھل ہوگیا تھا؟ اس نے پہلے کیوں نہ دیکھا۔

عدل نے جھک کر کاغذ اٹھایا۔ پیلا' خستہ حال

کاغذ۔۔۔ کئی سالوں کے راز کا امین۔ اتنے سال کے دبے راز کو آج ہی ظاہر ہونا تھا؟

روشنی کی لکیر نے آج ہی عدل کی آنکھوں میں گھسنا تھا؟ مامن جیسے ششدر رہ گئی تھی۔ یہ ممانے کیا کیا تھا؟ بابا کے بریف کیس میں کیسا اژدھا چھپا کر بھیجا؟ لیکن یہ فائل بک بریف کیس میں نہیں آئی تھی۔ یہ ڈائری بریف کیس میں تھی۔ فائل بک تو ڈاک کے ذریعے آئی تھی۔ آخر اسے کس نے بھیجا؟ اس کا دماغ الٹ گیا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ دبی آواز میں پھر سے چیخا تھا۔ مگر جواب مامن کے پاس نہیں تھا۔ جواب جزا کبیر کے پاس تھا۔ وہ عدل کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہ سر جھکائے اسے کچھ بتا رہی تھی۔ جانے وہ کب آئی تھی' جانے کب سے کھڑی تھی۔

"یہ نکاح نامہ ہے۔ بہت سال پہلے ڈاکٹر چاچو کی رضامندی سے ہونے والا نکاح۔"

اس نے کہنا شروع کیا تھا۔ اسے بولنا ہی تھا۔ آج صدیوں کے لاوے کو باہر لانے کا وقت آگیا تھا۔ آج عدل کو سب کچھ بتانے کا وقت آگیا تھا۔ وہ بولتی رہی' روتی رہی۔

"یہ دو بچوں کا نکاح تھا جو بہت کم سن تھے۔ یہ نکاح مورکھ میں ہوا۔ میری ماں کی خواہش اور آخری تمنا کے احترام میں۔۔۔ ڈاکٹر چاچو نے میری ماں سے محبت کا حق ادا کیا تھا۔ اس نکاح کے لیے عفیفو چاچی راضی نہیں تھیں۔ اس لیے کہ وہ میری ماں سے نفرت کرتی تھیں۔ میری ماں ڈاکٹر چاچو کی منگیتر تھیں۔

جب چاچو نے منگنی کو ختم کیا' تب نانی کی ضد پہ میری ماں کو میرے باپ سے بیاہ دیا گیا اور چاچو کو عمر بھر کے لیے معتوب ٹھہرایا گیا۔ پھر اپنی باقی عمر چاچو نے کفارے ادا کرنے میں گزار دی۔ وہ اپنے دل میں ملال کرتے تھے۔ میری ماں کے دل توڑنے کا ملال' میرے دادا کی پگڑی جھکنے کا ملال' میری اماں کا روگی دل کا ملال' نانی کو دکھ دینے کا ملال' نانی کی نفرت کا ملال' میری بدحال زندگی کا ملال اور اسی ملال نے چاچو کی جان لے لی۔

چاچو یقیناً "یہ سب باتیں آپ کو خود بتاتے۔ مگر موت نے انہیں مہلت نہیں دی تھی۔ پھر وہ یہ راز اپنے اسسٹنٹ واجد صاحب کے حوالے کرگئے۔ واجد صاحب نے موقع کی نزاکت دیکھ کر ایک عقل مندی کی اور چاچو کے پاس محفوظ نکاح نامے کی فوٹو اسٹیٹ کروالی۔ باقی سامان عفیفو چاچی کے حوالے کر آئے۔ جو آپ کے لیے امانت تھا۔ جو آپ تک کبھی نہ پہنچا۔

چاچو کا یہ بریف کیس پاکستان سے صرف پراپرٹی کے کاغذات لے کر آیا اور صرف ایک ڈائری۔ جو چاچی نے جان بوجھ کر بھجوائی۔ میرے سامان سے جانے انہوں نے کس طرح' کتنے سال پہلے ڈھونڈ نکالی تھی۔

اس ڈائری میں میرے معاشقے کا قصہ ہے۔ ایک پہاڑی لڑکی کے عشق کا قصہ۔۔۔ اس کے دکھوں کا حال' اس کی تکلیفوں کی داستان جسے حذف کرکے عشق اور محبت کے قصے کو واضح کیا گیا۔ وہ پہاڑی لڑکی اپنے ایک کزن سے محبت کرتی تھی۔ بہت لڑکپن سے جب اس نے اپنے کزن کا نام سنا اور اسی نام کی تسبیح کو اپنا ورد بنالیا۔

اس کا کزن اس پہاڑی لڑکی کے عذاب لمحوں کا ساتھی تھا۔ وہ اس کا پہلا اور آخری خواب تھا۔

پھر جب وقت اس کے خواب کی تعبیر بن کر آیا اور وہ پہاڑی لڑکی آبلہ پائی کا سفر تمام کرچکی تو اسے خبر ملی' جس رستے پہ وہ اندھا دھند دوڑ رہی تھی۔ وہ رستہ اس کی منزل تک جانے والا نہیں تھا۔ تب اس لڑکی کا دل فگار ہوگیا۔ جسم تھک گیا۔ روح نڈھال ہوگئی۔ پھر بھی ایک صبر نے اسے کبھی راہ سے بھٹکنے نہ دیا۔

وہ پہاڑی لڑکی چاہتی تو اپنے کزن کی مہندی والی رات سارے سچ سامنے اٹھا لاتی۔ اپنے داہنے بازو پہ بندھی تھیلی کا راز کھول دیتی۔ مگر اس لڑکی کے ظرف نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ کسی کی محبت کو تباہ کردے۔

بس اس لڑکی نے اپنی محبت کے ایک ایک بار کو خاموشی سے اس ڈائری میں اتار دیا۔ یہ ڈائری جو چند

سال پہلے غفیو چاچی کے ہاتھ لگ گئی۔

اور جلنے پہ صبر کی انتہا تھی یا ظرف کی جب چاچی نے اس لڑکی کے پاس محفوظ آخری ثبوت بھی پھاڑ دیا' تب وہ لڑکی بے بس ہو گئی' لاچار ہو گئی' پھر بھی اپنی زبان نہ کھول پائی۔ اس اصول پسند پہاڑی لڑکی کو کسی کے آنسوؤں کی سرزمین پہ اپنی محبت کا تاج محل بنانا گوارا نہ تھا۔ سو چپکے سے ہر اس رستے' ہر اس منزل سے ہٹ گئی جو عدل کبیر خان تک لے جانے والی تھی۔

اس لڑکی کی ڈائری میں بند یہ لاچار محبت ہر اس نامحرم مرد کے پاس پہنچی جس کے نام کی انگوٹھی اس لڑکی کی انگلی میں سجی تھی۔

آپ نے پوچھا تھا' میری اتنی منگنیاں کیوں ٹوٹیں؟ شاید اب آپ کی سمجھ میں آجائے۔ وہ آپ کا منہ بند کروانے کے لیے میری منگنی کروا کرتی تھیں' پھر میرے معاشقوں کے قصے خود ان لوگوں تک پہنچا دیتیں' تاکہ یہ نام نہاد منگنی ٹوٹ جائے۔

ظاہری بات ہے۔ اگر منگنی قائم رہتی تو شادی کا تقاضا ہوتا۔ پھر نکاح کے اوپر نکاح کروانے کا گناہ غفیو چاچی کیسے اپنے سر لے لیتیں۔ انہوں نے دس سال یہ کھیل کھیلا۔ دس سال اور بھی کھیل سکتی تھیں۔ مگر تقدیر نے ورق الٹ دیے۔

مامن کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ پھر اس کی معذوری... چاچی کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ آخر چاچی کو مامن سے ایسی ہی محبت تھی جیسی ڈاکٹر چاچو کو مجھ سے تھی۔ بس محبت کے تقاضے مختلف تھے' محبت نے چاچی اور مامن کو خود غرض بنا دیا۔

یہ مجھ پر میرے ماموں زاد کے حوالے سے کیچڑ اچھالنے والی مامن اس نکاح کے بارے میں تب سے جانتی ہے جب میں مورکھ میں ایک بدحال اور کیڑے مکوڑوں سے بدتر زندگی گزار رہی تھی۔ مامن کو خبر تھی۔ عدل کے نکاح میں اس سے پہلے جزا کبیر تھی۔ تاہم مامن کے نزدیک وہ پیلا خستہ حال کاغذ ذرہ بھر اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ غفیو چاچی کی نظر میں بھی کوئی اوقات نہیں تھی۔

اور میں تو ان دونوں کے نزدیک زمین پر رینگنے والے کیڑے سے بھی بدتر تھی۔ پھر اسی بدتر جزا کی انہیں ضرورت پڑ گئی۔ چاچی اور مامن کی مشترکہ پلاننگ سے مجھے یہاں بلوایا گیا۔ تب مامن کی نگاہ میں میرے علاوہ کوئی اور آپشن نہیں تھا۔ اسے مجھ جیسی دبو' لاوارث اور احسان تلے دبی نوکرانی کی ضرورت تھی۔ جس پر وہ آرام سے حکومت کر سکتی۔ تاہم مجھے دیکھ کر اس کے خدشات پھر سے لپک آئے۔

پھر اسے سلطانہ آپا نظر آگئیں۔ وہ بدصورت... لاوارث ..... ڈھلتی عمر کی ..... بانجھ ... وہ زیادہ فائدے پہنچا سکتی تھیں' وہ عدل کی بیوی بن جائیں۔ بس یہی کافی تھا۔ مامن کو ایک نرس' آیا' ملازمہ اور سوکن سب کچھ سلطانہ آپا میں میسر آجاتا۔ اس کی پلاننگ کوئی معمولی نہیں تھی۔ بہت ٹھوس تھی۔ سب کچھ بہت آسان تھا۔ آپ کو سلطانہ آپا کے لیے منانا آسان تھا۔ سو دلیلیں تھیں۔ ہزار جواز تھے۔ مگر اللہ کی پلاننگ کے سامنے سب کچھ ہیچ تھا۔

جب مامن نے اشتعال میں آکر مجھے گھر سے نکالا' تب واجد صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ میں کمپاؤنڈ میں بیٹھی رو رہی تھی۔ واجد صاحب نے مجھے پہچان لیا۔ وہ آپ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ تب میں بہت شکستہ تھی' ایک ہمدرد وجود کو پا کر سب کچھ بتانے لگی۔

واجد صاحب نے میری کمزوری اور بزدلی پہ مجھے بہت ڈانٹا انہوں نے کہا۔

"عدل کو بے خبر رکھ کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ اگر میں بزدلی کا ثبوت نہ دیتیں تو حالات مختلف ہوتے۔"

میں نے کہا۔ "میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔"

تب واجد صاحب نے مجھے تسلی دی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس ایک ثبوت موجود ہے اور وہ ثبوت اسی فائل بک میں واجد صاحب نے بھیجا۔

میں یہ سب کچھ کبھی نہ کہتی' کبھی نہ بتاتی اگر بات میرے کردار تک نہ آتی۔ دس سال گزر گئے تھے دس سال اور گزر جاتے مامن مجھ پر کیچڑ اچھالتی رہتی

اس نے میری ماں کو گالی دی... میرے لیے یہاں رہنا محال ہے۔ آپ مجھ پر ایک کرم کریں۔ مجھے واپس بھجوا دیں۔"

اس نے عدل کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ وہ خاموش ہوئی تو کمرے میں موجود تینوں نفوس کے سانس تک رک گئے۔ یہ معمولی سی دو ٹکے کی جوگی جسے کبھی بولنا نہیں آتا تھا۔ آج کیسے مامن کی اصلی صورت سے پردہ کھینچ گئی تھی۔ مامن کا دل چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس کے لیے عدل کی گرم نگاہوں کا سامنا کرنا آسان نہیں تھا۔

وہ تو اتنے انکشافات پہ دم بخود کھڑا تھا۔ وہ جوگی جو اس کی ذمہ داری تھی' بابا کی چھوڑی ہوئی امانت تھی۔ اس کے ساتھ ظلم ہوتے رہے۔

وہ اس کے نکاح میں تھی۔ اس کی منکوحہ تھی اور وہ بے خبر تھا۔ اتنے سال سے بے خبر تھا۔ اتنی بڑی حقیقت سے دور تھا۔ وہ جیسے پاگل ہو کر چیخ پڑا تھا۔

"میرے گھر کی عورتیں اتنی شاطر اور مکار؟ ایک میری ماں اور دوسری میری بیوی؟"

اس کا دماغ جیسے سنسنا رہا تھا۔ وہ ایک نمبر فون پہ ملا رہا تھا۔ "پورے دس سال..." وہ نمبر ڈائل کرتے ہوئے زیر لب بڑبڑایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ اس کا من ہوتا دماغ جھٹکے کھانے لگا۔ پھر فون کا ریسیور اٹھا لیا گیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کی آواز سنی۔ اس کے دماغ سے گرم شعلے نکلنے لگے۔ اس کے لبوں سے انگارے پھوٹنے لگے۔ وہ جیسے پھٹ پڑا۔

"جزا کی زندگی کے دس سال ضائع کرنے کا آپ کو کیا حق پہنچتا تھا؟ اسے فٹ بال کی طرح آپ دونوں نے اپنی ٹھوکر پہ رکھا۔ جب چاہا دھتکار دیا' جب ضرورت محسوس کی اٹھا لیا اور پھر جب چاہا ٹھوکر مار دی۔ پورے دس سال وہ آپ کے پاس رہی مما! اتنے سالوں اس نے آپ کی خدمت کی' آپ کو سکھ دیا۔ آرام دیا۔ اتنے سال کوئی پالتو جانور بھی پالیں تو اس سے بھی انسیت ہو جاتی ہے۔ پر آپ کو ایک لاوارث انسان سے محبت نہ ہو سکی؟ آپ کو محبت کیسے ہوتی؟ آپ کا دل نرم کیسے ہوتا؟ آپ کے دل میں تو سالوں کا غبار اور نفرت جمع تھی۔ ایک مری ہوئی عورت سے نفرت' اتنا ہی سوچ لیتیں بابا نے آپ کے بھائی کی دو بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں سمجھ کر پالا محبت دی۔ آپ ان کے بھائی کی ایک بیٹی کو برداشت نہ کر سکیں آپ کا ظرف اتنا چھوٹا نکلا۔

آپ نے تو مجھے میرے بابا کی قبر کے سامنے بھی شرمسار کر دیا ہے۔ آپ نے مجھے گناہ گار کر دیا ہے مما! میں اپنے باپ کا کوئی قول نہ نبھا سکا۔ میں ان کی چھوڑی ہوئی امانت کی دیکھ بھال نہ کر سکا۔ آپ نے مجھے جزا کی نظر میں بے مول کر دیا۔ آپ نے مجھے میری ہی نظر میں دو کوڑی کا کر دیا۔ کیا میں اتنا کمزور اور بے وقوف تھا؟ جو دو عورتوں کی چال کو سمجھ نہ پایا؟ میں اپنی زندگی کی مشکلات میں الجھ کر جزا کو نظر انداز کر گیا۔ آخر میں نے خود وجہ کھوجنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ اتنی صاف' سیدھی اور سچی کہانی تھی۔ پھر بھی میں جان نہ پایا اور آپ نے میرے انجان پن سے فائدہ اٹھا لیا۔ آپ نے اچھا نہیں کیا مما! جزا کی زندگی سے کھیل کر اچھا نہیں کیا۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

عدل کے الفاظ نے مامن کے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔ تو گویا اس کی نادانی اور چال بازی جزا اور سزا کی گھڑی اٹھا لائی تھی؟ اب کیا ہوگا؟ عدل کیا کرے گا؟ اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ مامن کو بیٹھے بیٹھے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اسے اپنی کشتی ڈولتی ہوئی نظر آئی۔ کل تک عدل اور جزا کی زندگی کے اختیار اس کے ہاتھ میں تھے۔ آج سارے اختیار چھن گئے تھے۔

عدل بقائمی ہوش و حواس جزا کبیر کو سارے اختیارات سونپ رہا تھا۔ وہ جوگی جس کی کوئی اوقات نہیں تھی۔ مورکھ کی اجڈ گنوار جوگی۔ جسے ڈھنگ سے بولنا بھی نہیں آتا تھا۔ آج مامن کی زندگی کا فیصلہ کرنے والی تھی۔ اسے یہ اختیار عدل نے دیا تھا۔ مامن کا عشق عدل' اس کی محبت عدل... آج جیسے سب کچھ

www.paksociety.com

لٹنے کا دن تھا۔ اس کی جلد بازی، بدزبانی، خود غرضی جوئی کو زبان کھولنے پر مجبور کر گئی تھی۔ آج جیسے قیامت آگئی تھی۔

عدل نے فون بند کر دیا تھا۔ اب وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ماہن کے پاس آرہا تھا۔ پھر وہ اس کے قریب تھوڑا جھک آیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ وہیل چیئر کی ہتھی پہ جما دیے تھے۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر سرد آواز میں زہر پھونک رہا تھا۔ وہ دیکھ ماہن کو رہا تھا اور مخاطب جوئی سے تھا۔

"میں عدل ہوں جزا! اپنے نام کی لاج نہ رکھوں تو لعنت ہے مجھ پر۔ آج بتاؤ تم۔ کیا حساب لوں؟ کیا سزا دوں؟ تمہارے دس سال کا بدلہ۔ دس سال کی سزا سنا کر لوں؟ کہو، کیا کہتی ہو، میں عدل ہوں۔ اور آج تمہارے سامنے عدل کرنا چاہتا ہوں۔ اسے طلاق نہیں دوں گا۔ خود سے جدا کر دوں گا۔ یہ اس کے کیے کا بدلہ ہے۔ پورے دس سال کی سزا۔ انگلیوں پہ گنے گی اور یاد کرے گی۔ تمہارے دس سال ضائع کرنے کی سزا۔"

وہ ایک ایک لفظ سے ماہن کو چھیدتا جوئی سے مخاطب تھا۔ اس کا لہجہ بہت ٹھوس اور مضبوط تھا۔ جیسے ماہن کی محبت اور آنسوؤں سے پگھلے گا نہ لڑکھڑائے گا۔ وہ اس کی آنکھوں میں پھلے آثار تابعت مدھم لہجے میں بول رہا تھا۔ پھر گم صم کھڑی جزا کی طرف پلٹ آیا۔ ویسے ہی نپے تلے قدم اٹھاتا۔ بہت سنجیدگی سے دیکھ کے جیسے کہہ رہا ہو۔

"اب بولو جزا! فیصلے کا اختیار تمہارے پاس ہے۔"

جوئی کی آنکھوں میں ریت بھرنے لگی تھی۔ ماہن کی زیادتیوں کے باوجود اس نے یہ کبھی نہیں چاہا تھا کہ عدل اور ماہن کبھی جدا ہوں۔ وہ ان دونوں کی محبت اور چاہت کی خود گواہ تھی۔

"اور میں جزا ہوں عدل! سزا کا اختیار نہیں رکھتی۔ بہت حقیر ہوں۔ ایسا اختیار لے کر متکبر بھی نہیں ہونا چاہتی۔ میرے ساتھ جو بھی ہوا۔ اسے اپنا نصیب سمجھتی ہوں۔ میرے ہاتھ کی لکیروں میں عدل نہیں۔

اس میں کسی کا کیا قصور؟ آپ کی زندگی کے تین اصول تھے۔ پھر ایک کیسے بھول گیا؟ آپ جس سے محبت کرتے ہیں۔ اسے معاف کر دیتے ہیں۔ آپ کا یہ اصول میں نے اپنا لیا۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ یہ میرا پہلا اعتراف ہے۔ میں ماہن سے بھی محبت کرتی ہوں، یہ میرا دوسرا اعتراف ہے۔ اور میں جس سے محبت کرتی ہوں، اسے معاف کر دیتی ہوں۔ آپ کے قول میرے لیے انمول ہیں۔ میری زندگی کا حاصل۔ آپ کی محبت کے صدقے سب کچھ بھلا سکتی ہوں۔ میری خواہش ہے آپ اور ماہن ہمیشہ آباد رہیں۔ میں رہوں یا نہ رہوں۔"

اس نے عدل اور ماہن کو منجمد کر دیا تھا۔ ماہن کا سر جھک گیا۔ نظر جھک گئی۔ وہ سامنے کھڑی لڑکی کے سامنے بہت حقیر ہو گئی۔ خود کو بونی سمجھنے لگی۔ اسے اپنا عمل یاد آیا۔ اپنے لفظ یاد آئے۔ جوئی کو دھتکارنا یاد آیا۔ اسے گھر سے نکالنا یاد آیا۔ اسے دی گئی گالیاں یاد آئیں۔ وہ رو پڑی، جب بازی ہاتھ سے نکل گئی تو اسے رونا ہی تھا۔

"مجھے معاف کر دو جزا! تم واقعی جزا ہو۔ کسی نیکی کا صلہ ہو۔ میرے پاس الفاظ نہیں۔ میں کس طرح تم سے معافی مانگوں۔" اس نے جھکنا ہی تھا۔

وہ عدل کی آنکھ میں اتری حقارت نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ عدل کی جدائی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ عدل تک پہنچنے کے لیے جزا تک آنا ضروری تھا۔ آج وہ کتنی قلاش ہو گئی تھی۔ اپنے برے عمل اور بری سوچ کی وجہ سے عدل تک جانے کے لیے سہارے ڈھونڈ رہی تھی۔ کوئی اس سے بڑھ کے مفلس تھا آج؟

"گناہ گار نہ کرو ماہن! میں کیا میری اوقات کیا۔" اس نے ماہن کے بندھے ہاتھ آگے بڑھ کے کھول دیے تھے۔ پھر بغیر عدل کی طرف دیکھے آہستگی سے بولی۔

"مجھے واپس بھجوا دیں۔" اس کا لہجہ اور آنکھ نم تھی۔ وہ کس قدر شکستہ نظر آرہی تھی۔ عدل کے دل پہ بوجھ آگرا۔

"میں تمہیں واپس بھیج دوں گا۔ مگر تم کہاں جاؤ گی؟ میرے گھر تو کبھی نہیں جاؤ گی اور مورکھ بھی نہیں جاؤ گی۔ اس بھری دنیا میں میرے گھر اور دل کے علاوہ تمہیں اور کوئی محفوظ ٹھکانا نہیں ملے گا۔ یہ تم بھی جانتی ہو۔ دس سال کیوں خاموش رہیں۔ کیسا صبر کا جام پی رکھا تھا۔ خود سارے اعتراف کر لیے۔ اتنے انکشاف کر دیے۔ تم اپنے جس کزن سے محبت کرتی ہو، تمہارا وہ کزن بھی تمہیں بہت چاہتا ہے۔ اس لیے کہ تم اس کے باپ کی روح کا سکون ہو اور اس لیے بھی کہ تم دلوں میں گھر کرنے کا فن جانتی ہو۔ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں جزا! تم جہاں بھی رہو۔ تم یہاں نہیں رہنا چاہتیں تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ مگر تمہیں اپنے لیے کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ کہو گی تو میں تمہیں آزاد کر کے کسی بہت قدر دان بندے سے بیاہ دوں گا اور اگر چاہو گی تو میرے دل کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں، تم جانتی ہو نا۔ میں اسے بھی نہیں چھوڑتا جو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ وہ جزا ہو یا ماہن۔"

عدل کی آنکھوں میں نرم گرم تاثرات ابھر آئے تھے۔ ماہن نے شدت جذبات سے آنکھیں موند لی تھیں۔ اس کی پلکوں کی باڑ سے ملال، ندامت، شرمندگی کے آنسو ٹکراتے رہے۔

جبکہ جزا کی آنکھ سے تشکر کے آنسو بہتے رہے۔ آخر عدل نے اس کے کانوں میں امرت اتارا تھا۔ اس کی جلتی بلتی پیاسی روح ذرا سی بوند پا کر ہی سیراب ہو گئی۔ اس کا دل سجدہ شکر بجا لایا۔ تو اللہ نے اسے عدل کبیر خان عطا کر دیا تھا۔ اس کا صبر اور دعا رنگ لے آئی۔

وہ ہاری بازی جیت گئی۔ جبکہ ماہن جیتی بازی ہار گئی تھی۔

وہ کتنی بدنصیب تھی نا؟



عدل کے لیے جزا کے بتائے گئے انکشاف معمولی نہیں تھے۔ کیا کوئی اتنا صابر ہو سکتا ہے؟ اتنے سال خاموشی کی بکل اوڑھ سکتا ہے؟ اتنے بڑے سچ کو چھپا سکتا ہے؟

اسے اپنی ماں سے بہت شکوے تھے۔ ماہن سے بہت گلے تھے اور سچ تو یہ تھا اپنی ماں اور ماہن کو جزا کے مجبور کرنے پر معاف کر دینے کے باوجود بھی اپنے دل کو بہت تنگ پاتا تھا۔

پھر وقت کچھ آگے کھسک گیا۔ عدل کی زندگی میں ترتیب آگئی۔ اس کا گھر اور دل آباد ہو گیا۔ جزا کے سلیقے، محبت، خلوص نے اس کے گھر میں رنگ ہی رنگ بھر دیے۔ اس کی بیٹیوں کی اچھی تربیت جزا کی محنت کا نتیجہ تھی۔ اس کی بیٹیاں ذہین، فرماں بردار اور بہت سلجھی ہوئی بچیاں تھیں اور جزا کی ہی کوششوں، محبتوں اور انتھک محنت کی بدولت ماہن بھی بیساکھی کے سہارے چلنے لگی تھی۔ ہر گزرتا دن عدل کو جزا کا اور بھی زیر بار کرتا تھا۔ اس کے دل میں جزا کی قدر اور محبت بڑھ جاتی تھی۔

عدل نے ایک مرتبہ ماہن سے کہا تھا۔

"یہ کیسی محبت تھی جو تم مجھ پہ اعتبار نہ کر سکیں۔ کیا میں اتنا دل پھینک تھا جو جوئی سے نکاح کا سن کر اس کا اسیر ہو جاتا؟ جب تم نے بابا کے سیف میں نکاح نامہ دیکھ لیا تھا، پھر مجھے کیوں نہ بتایا؟ کیا یہ جرم معمولی ہے؟ اس کے دس سال ضائع کر دیے، کیا یہ گناہ معمولی ہے؟ تم مجھے تب بتا دیتیں۔ میں اسے فارغ کر دیتا۔ اس کی شادی کر دیتا۔ وہ خوش حال زندگی گزارتی۔ مگر تم نے اور ممانے تو اس سے بیر باندھ رکھا تھا۔ میں حیران ہوں، تم اتنے اچھے منصوبے بناتی ہو۔ اتنی بہترین سازش کرتی ہو، اتنی جامع پلاننگ کرتی ہو۔ میں تو اب بھی حیران ہوں اور میری حیرت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ اور تم نے بڑی محبت کے ساتھ جزا کو ادھر بلایا تھا نا۔ مجھے تمہاری جزا کے ساتھ محبت کی وجہ اب سمجھ میں آئی ہے۔ تمہیں جزا سے بڑھ کے اس گھر کے لیے کوئی نوکرانی نہیں مل سکتی تھی نا۔ دیکھو، تم کو، مظلوم، لاوارث، جس کا کوئی خاندان نہیں تھا۔ جو ساری عمر

تمہارے اشاروں پہ ناچتی۔ لیکن اسے دیکھ کر تمہاری نیت بدل گئی۔ وہ اب پہلے والی جوئی تو نہیں رہی تھی۔ کچھ تعلیم بھی حاصل کرلی تھی۔ معمولی سا اعتماد بھی آگیا تھا۔ پھر اس کا حسن بھی تمہاری نیند اڑانے کے لیے کافی تھا۔ اسے دیکھ کر تمہاری مہربانیوں نے رنگ بدل لیے پھر تمہیں سلطانہ آپا بھی مل گئیں۔ مفت کی غلام' تمہارے اشارے پہ چلنے والی اور تم سدا کی مفاد پرست... تم نے جوئی کا پتا کاٹ دیا۔ سلطانہ آپا کو سامنے لے آئیں۔ تمہارے مفاد پرست ذہن نے اس ادھیڑ عمر عورت کی عزت کا بھی پاس نہیں رکھا۔ وہ بدصورت بھی تھی' کم شکل تھی' تنہا تھی' بے آسرا تھی' بیوہ تھی' بانجھ تھی... ہاں... وہ تمہارے کام کی تھی۔ تم نے اسے میرے ساتھ نتھی کرنے کا سوچ لیا۔ مگر اس سے بھی پہلے اپنی بدزبانی سے جوئی کو اذیت کے کچوکے لگا لگا کر یہاں سے نکالنا چاہا۔ اسے کئی دفعہ میری غیر موجودگی میں گھر سے نکالا۔ تم سوچ رہی ہوتا... یہ سب مجھے کس نے بتایا؟ تو جزا کے لیے دل میں عناد نہ پالنا... مجھے یہ سب واجد صاحب نے بتایا... وہی واجد صاحب جنہوں نے یہ فائل بک بھیجی۔ یہ راز تو کھلنا ہی تھا۔ جوئی نہ بھی بتاتی تب بھی واجد صاحب نے مجھے سب کچھ بتا دینا تھا۔ اس معذوری نے بھی تمہیں سبق نہیں دیا۔ تم جوئی سے خود کو افضل سمجھتی تھیں۔ اسے حقیر اور معمولی جانتی تھیں۔ اللہ نے تمہیں خود کی نظر میں حقیر کردیا۔ تمہیں لوگوں کا محتاج کردیا۔ تم نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ تمہاری بے صبری تمہیں کہاں لے آئی؟ جزا کے صبر نے اسے کہاں تک پہنچا دیا... مما اور تم نے کبھی سوچا ہی نہیں۔"

یامین اس دن کو سوچتی جب فائل بک اس تک پہنچی تھی۔ وہ بھی ایک بے زار ساون تھا۔ جب پوسٹ مین ڈاک دے کر گیا تھا۔ اس پر پاکستان کے ٹکٹ جان بوجھ کر لگائے گئے تھے۔

اسے امید تھی کہ مما نے جوئی کے لیے کچھ اور "سرپرائز" بھیجا ہوگا۔ مگر وہ "سرپرائز" تو سارے راز کھول گیا تھا۔ سارے ثبوت اپنے تئیں جلا دینے کے باوجود حقیقت کھل گئی تھی۔ حقیقت کو تو کھلنا ہی تھا۔ عفیو کی بدنیتی' یامین کے حسد اور خود غرضی نے عمر بھر کے لیے انہیں عدل کی نگاہ میں ہلکا کردیا تھا۔

وہ سب اکٹھے رہتے تھے' ایک ساتھ بیٹھتے' ہنستے مسکراتے... وہ عدل تھا۔ اسے دونوں بیویوں میں عدل کرنا' توازن رکھنا آتا تھا۔ وہ اسے بھی وقت دیتا' آؤٹنگ پہ لے جاتا۔ ڈاکٹرز سے چیک اپ کرواتا' دوائیاں کھلاتا... اس کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا۔ مگر جب بھی کبھی اس کے اندر دس سال پہلے والی یامین بیدار ہوتی۔ وہ بے چین ہو کر عدل کو کھینچ کے لگتی تھی۔

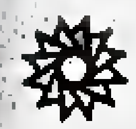
"عدل! تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔"

اس کا سوال' جواب کے انتظار میں سسکتا رہتا۔ عدل کی طرف سے کوئی جواب نہ آتا۔

یامین کے دل سے وہ آخری پھانس کبھی بھی نہیں نکلی تھی۔ اس رات جب جزا سالوں کے بند کھول رہی تھی۔ جب روشنی کی ہلکی لکیر عدل کی آنکھوں میں اتری کرچ کو واضح کررہی تھی۔ تب عدل نے صرف ایک بات یامین کے لیے کہی تھی۔ صرف ایک بات' صرف چند الفاظ... عدل نے بہت تنفر اور حقارت سے کہا تھا۔

"دنیا میں رہنے کے لیے دو بہترین جگہیں ہیں۔ ایک کسی کے دل میں۔ ایک کسی کی دعا میں... تو تم یامین! میرے دل سے اور جزا کی دعا کے حصار سے نکل کر کیسا محسوس کروگی؟"

یامین کے دل سے ان لفظوں کی پھانس کبھی نہیں نکلی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ وہ عدل کے دل سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی ہے اور یہ احساس اس کے ہر عمل کی سزا کے لیے بہت کافی تھا۔



آمنہ ریاض



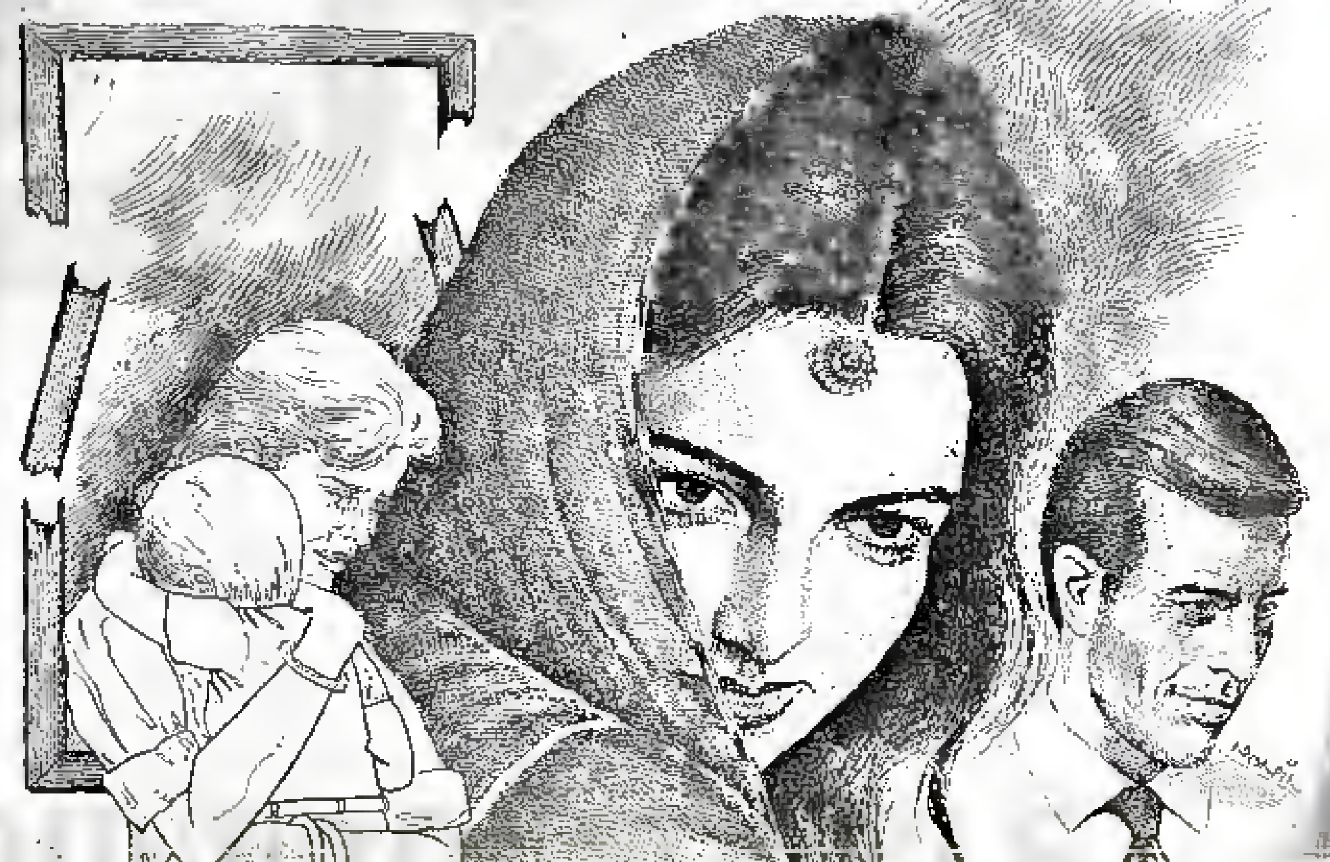
باقر لودھی اپنے منجھلے بیٹے تقی کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت سے سخت نالاں ہیں اور اسے ہر وقت بدحرامی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ تقی کو شوبز میں کام کرنے کا شوق ہے جبکہ لودھی صاحب اس کام کے سخت مخالف ہیں۔ دونوں باپ بیٹے میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ رضی اور جری سے البتہ باقر صاحب کو کوئی شکایت نہیں۔

شفا کو عمیر نے والدین کے بعد باپ بن کر پالا ہے۔ وہ عمیر کی بے حد لاڈلی ہے مگر عمیر کی بیوی ساہر کو اس سے شدید جلن ہے۔ وہ عمیر سے جھوٹ بول کر اسے شفا سے بدظن کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ عمیر کو اپنی بیوی پر پورا یقین ہے۔

ساہر اور عمیر کی شادی کے ابتدائی دنوں میں شفا ساہر سے بہت بدتمیزی کیا کرتی تھی۔ وہ اسے ہر وقت عمیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی اور جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر اسے عمیر سے ڈانٹ پڑوا دیتی۔ رات کے کھانے پر پاستا نہ بنانے پر اس نے ساہر سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور سیڑھیوں سے حادثاتی طور پر گر جانے کا الزام ساہر پر لگا دیا کہ ساہر نے اسے دھکا دیا ہے۔ اس بات پر عمیر ساہر کو دو تھپڑ مار دیتے ہیں۔ ساہر کو بہت دکھ ہوا ہے۔ شفا خود بھی گنگ ہو جاتی ہے۔

تقی کے گہرے دوست سمیر کے ابا اپنی پسند سے اس کی منگنی کر دیتے ہیں۔

ناولٹ



۱۳
تیرہویں قسط

ایک پورے دن اور رات کی خواری کے بعد بالآخر ہدیہ کا سراغ مل ہی گیا تھا۔ اسے اسی کی کلاس فیلو کی ماما اپنے گھر لے گئی تھیں۔

معاملہ کچھ یوں تھا کہ وین والے کو مقررہ وقت پر پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی ہدیہ اپنی کلاس فیلو کے ساتھ کھیلتی رہی۔ اس کلاس فیلو کا ڈرائیور اسے لینے آیا تو ہدیہ اسی کے ساتھ چل پڑی۔ ادھر ان لوگوں کے اپنے گھر میں کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی لہٰذا کسی کو بھی اس انجان بچی کو اس کے گھر پہنچانے کا خیال نہیں رہا۔ ہدیہ نے بھی ڈر کر آواز نہیں نکالی۔ اسکول والوں نے سارا مدعا وین ڈرائیور پر ڈال دیا۔ ڈرائیور نے گھبرا کر اپنا فون ہی آف کر لیا کہ نہ اس کا سراغ ملے نہ اس سے انکوائری ہو۔ بات معمولی سی تھی لیکن پورے ایک دن اور رات پر محیط ہو گئی۔

لیکن ساہر جانتی تھی یہ سارا قدرت کا کام تھا۔ اس کے گناہوں کا اعتراف اسی کی زبانی کروانے کے لیے اتنی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ ورنہ ہو تو یہ بھی سکتا تھا کہ اس کے عمیر کو کچھ بھی بتانے سے پہلے ہدیہ کا پتا چل جاتا۔ سو اب شرمساری تھی اور دکھ۔

عمیر نے دوبارہ اس سے ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ کہہ دیتے' چیختے چلاتے۔ لیکن اس طرح خاموشی نہ سادھتے۔ اتنے لاتعلق اور اجنبی نہ لگتے۔ یہ پچھتاوے تو اب ساری زندگی کے تھے شاید۔

☼ ☼ ☼

اب سب اپنے اصل مقام پر آگئے۔ سب خوش تھے سب سے زیادہ ابا خوش تھے۔ اتنے کہ بڑی سی دعوت کا اہتمام کروالیا۔ شفا اور امی نے مل کر پکایا۔ عمیر اور ساہر کو بھی بلوایا تھا لیکن صرف عمیر آئے۔ بچے بھی ساتھ تھے۔ سب ہی پوچھنا چاہتے تھے ساہر کیوں نہیں آئی لیکن کسی نے نہیں پوچھا جیسے اس سوال کا جواب سب کو معلوم ہی تھا۔ جب سب کھانا کھا چکے تو ابا نے شطرنج شروع کرلی۔

"آج میری جگہ عمیر بھائی کھیلیں گے۔" شفا نے کہا۔

"عمیر کو بھی دلچسپی ہے؟" ابا نے خوش دلی سے پوچھا۔

"ایسی ویسی۔" اس نے فخر سے کہا تھا۔ "اب تک میں آپ سے ہارتی رہی ہوں۔ آج آپ کی باری ہے۔"

"ایسی بات ہے۔ تو پھر آجاؤ عمیر میاں! دیکھ لیں ذرا تم بھی کتنے بڑے کھلاڑی ہو۔"

"شفا کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔" عمیر نے ہنس کر کہا۔ "اسے تو لگتا ہے اس کے بھائی سے آگے کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔" عمیر نے اس کا سر تھپتھپا کر کہا جواباً وہ ہنستے ہوئے برتن لے کر کچن میں چلی آئی۔ امی وہیں تھیں۔

"کیا کر رہی ہیں؟"

"قہوہ بنا رہی ہوں۔"

"آپ جائیں۔ میں بناتی ہوں۔"

"کتنا کام کرو گی؟ صبح سے کھانے کی تیاری میں لگی ہو۔ اب تو ٹک کر بیٹھ جاؤ۔"

"کیوں؟ آپ کو میرے ہاتھ کا قہوہ پسند نہیں ہے؟"

"ایسی بات نہیں ہے۔" ابھی جملہ یہیں تک پہنچا تھا کہ ڈائننگ ٹیبل پر تقی کا سیل فون بجنے لگا۔

"اوفوہ! کب سے بج رہا ہے۔" وہ بیزار سی ہو رہی تھیں۔ شفا نے بڑھ کر فون اٹھالیا۔

"مہک۔" زیر لب کہا۔ "امی! تقی کہاں ہے؟"

"پتا نہیں ابھی تو یہیں تھا۔"

"مہک کا فون ہے۔"

"اچھا۔" وہ اس کی طرف پلٹیں پھر لاپروائی سے بولیں۔ "رکھ دو تقی آئے گا تو خود ہی دیکھ لے گا۔ تم کیا کہہ رہی تھیں' مجھے تمہارا قہوہ پسند نہیں۔ پاگل ہو گیا۔ تم سے بہترین قہوہ تو کوئی بنا ہی نہیں سکتا۔ پانی کو جوش آگیا ہے ذرا بتانا۔ کتنی پتی ڈالوں۔"

وہ اسے دانستہ الجھا رہی تھیں۔ شفا فون رکھ کر ان کی مدد کرنے لگی لیکن مہک بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ بیل بج بج کر فون بند ہوتا' پھر بجنے لگتا۔ امی کسی کام سے باہر نکل گئیں تو اس نے اٹھالیا۔۔۔۔۔ مسلسل اتنی بیزار کن بیپ سنی بھی تو نہیں جارہی تھی۔

"ہیلو مہک۔" بڑی خوش دلی کا سا انداز تھا لیکن مہک کے ہوش پریانی پڑ گیا۔

"تم۔۔۔ تم ابھی تک یہیں ہو اور تقی کا فون تمہارے پاس کیا کررہا ہے؟"

شفا خفیف سی ہو گئی۔

"آں۔ وہ۔ تقی کا فون کچن میں پڑا تھا۔ وہ خود پتا نہیں کہاں ہے۔ بہت دیر سے تمہاری کال آرہی تھی۔ اس لیے میں نے اٹھالیا۔" وہ شرمندہ سی ہو کر وضاحتیں دینے لگی۔

"میں تقی سے کہوں گی تمہیں کال بیک کرلے۔"

"وہ تو خیر کر ہی لے گا۔" مہک نے برجستہ کہا اور انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو "کال بیک نہ کرے گا تو جائے گا کہاں۔"

شفا نے بے ساختہ کان سے ہٹا کر فون کو دیکھا تھا۔

"تم مجھے یہ بتاؤ۔ تم اب تک یہاں کیا کررہی ہو۔ سب کچھ ٹھیک ہو تو گیا۔ تمہارے بھائی کو تمہاری حقیقت پتا چل گئی۔ اب تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم تقی کی زندگی سے نکل جاؤ۔ یہی کہا تھا ناں تم نے۔"

شفا دھک سے رہ گئی۔ ہاں اس نے یہی کہا تھا۔ وہ تو بھول ہی گئی تھی۔

"وہ۔ میں۔" فوری طور پر کچھ کہہ ہی نہیں سکی۔

"بات سنو شفا! میں مانتی ہوں اب تک تمہارا تقی کے گھر رہنا تمہاری مجبوری تھا لیکن اب کوئی مجبوری نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں اب چلے جانا چاہیے۔"

"میں کل چلی جاؤں گی۔" اس نے تیزی سے کہا' مبادا وہ کچھ اور ہی نہ کہنے لگے۔

"اچھی بات ہے۔" مہک نے سرد لہجے میں کہا۔

"اب ایک کام کرو ذرا یہ فون تقی تک پہنچا دو۔"

"بہتر۔" فون بند ہو گیا۔ اس کے ہاتھ بے جان پڑ گئے۔ شفا نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے در و دیوار پر ایک نظر ڈالی۔ مکان چھوڑنا مشکل نہیں ہوتا۔ وابستگیاں تو مکینوں سے ہوتی ہیں۔ اسے دل پر بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔

"شفا! قہوہ بن گیا؟" امی کی آواز آئی وہ ہڑبڑا اٹھی۔

☼ ☼ ☼

تقی چھت پر تھا۔ گرل پر کہنیاں ٹکائے منہ اٹھا کر آسمان پر پتا نہیں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔

"تم یہاں ہو۔ سب لوگ تمہیں نیچے ڈھونڈ رہے ہیں۔" وہ اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور قہوے کا کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یار! کھانا بہت کھالیا تھا۔ میں نے سوچا تھوڑی واک کرلوں۔" اس نے کپ پکڑ لیا۔

"ایک تو امی بھی ناں۔ اتنے مزے کے کھانے بنا دیتی ہیں کہ انسان ہاتھ روک ہی نہیں پاتا۔" تھوڑا خفا سا ہو کر کہہ رہا تھا۔

"کھانا امی نے نہیں' میں نے بنایا تھا۔" شفا مسکرا کر گرل سے کمر لگا کر کھڑی ہو گئی اور آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

"اچھا۔" تقی نے کہا۔ "مجھے لگا امی نے بنایا ہے۔ ویسے ماننا پڑے گا میری امی سے تم کافی کچھ سیکھ گئی ہو۔" اس نے کبھی شفا کے سامنے اس کے کھانے کی تعریف نہیں کی تھی۔ اب بھی بن کر کہہ رہا تھا۔ "اچھا کیا جو کھانا بنانا سیکھ لیا۔ لڑکیوں کو اتنے کام تو آنا ہی چاہئیں۔ اب دیکھنا "اگلے گھر" جا کر کھانا بنانے پر تمہیں ہرگز طعنے نہیں ملیں گے۔" وہ بالکل بھی سنجیدہ نہیں تھا۔

شفا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ دیکھتی رہی' پھر سادگی سے بولی۔

"تمہیں پھر میرے اگلے گھر کی فکر پڑ گئی؟"

تقی شرمندہ سا ہو گیا۔ "ویسے ہی کہہ دیا تھا۔"

"میں کل جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟"

"وہیں۔ جہاں سے آئی تھی۔ اپنے گھر۔" اس نے زور دے کر کہا۔

تقی نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"بھول گئے؟ یہی تو طے ہوا تھا۔" وہ سمجھ نہیں پایا کہ کیا ردعمل ظاہر کرے، سو ہنس دیا۔ شفا بھی ہنس دی۔ دونوں نے ہی محسوس کیا کہ ان کی درمیان میں ایک دیوار تن گئی ہے۔

"تھینک یو تقی!" پھر اس نے کہا۔

"کس لیے؟" وہ حیران ہوا۔

"تم نے اب تک میرے لیے جو کچھ بھی کیا۔ اس سب کے لیے۔" شفا نے سادہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"مجھے مشکل سے نکالا۔ مجھے سہارا دیا۔ اپنا کیریر داؤ پر لگایا۔ محبت ہو تو بات دوسری ہوتی ہے۔ تم تو بے سبب میرا سہارا بنے۔ میں نے آج سے پہلے کبھی کہا نہیں۔ لیکن سچ کہوں، تمہارے احسان کا بدلہ میں ساری زندگی نہیں اتار سکوں گی۔ جب ساری دنیا میرے خلاف تھی۔ ہر کوئی مجھ پر انگلی اٹھا رہا تھا۔ سب چاہتے تھے کہ میں تسلیم کرلوں کہ میں بدکردار ہوں۔ تم نے اپنا نام دے کر مجھے معتبر کر دیا۔ میں تمہارا احسان ساری زندگی یاد رکھوں گی۔"

"وہ کم آن۔ اب اتنا بھی جذباتی مت ہو۔" وہ شرمندہ سی ہنسی ہنس کر بولا تھا۔ "ایسا بھی کچھ نہیں کیا میں نے کہ تم احسان مند ہی ہوتی رہو۔"

"یہی تمہاری سب سے بڑی کوالٹی ہے۔ احسان کرتے ہو اور چاہتے ہو کوئی یاد بھی نہ رکھے۔ خیر! میں دعا کروں گی اللہ تمہیں بہت کامیابیاں دے۔ تمہیں خوش رکھے۔" اس نے جانے کا ارادہ کیا، لیکن جا نہیں سکی۔ پتا نہیں کیوں؟۔ لیکن اس کا دل چاہتا وقت ٹھہر جائے۔ یہیں اسی مقام پر، اسی ساعت پہ۔ وہ خائف ہو گئی اپنے دل سے، اپنے جذبات سے۔

"مجھے اپنی شادی میں ضرور بلانا۔" فرمائش تھی یا کچھ اور، تقی خاموش ہی رہا۔

"بلاؤ گے؟" اس نے تقی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"تم۔ آؤ گی؟"

"تم بلاؤ گے تو ضرور آؤں گی۔" ترنت کہا۔

تقی ہلکی سی نا سمجھ مسکراہٹ لبوں پر رکھے اسے دیکھتا رہا پھر زور سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں بلاؤں گا۔"

شفا نے سر ہلایا۔ مسکرائی۔ چند قدم سیڑھیوں کی طرف بڑھائے پھر کچھ یاد آیا تو رک گئی۔

"تقی! وہ... میں تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ... وہ کچن کے پاس آئل میں نے جان بوجھ کر گرالیا تھا۔" اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے جھجکتے ہوئے بتایا۔ تقی نے اس کی بات پر آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا پھر بولا۔

"چلو حساب برابر ہوا۔"

"کون سا حساب؟"

"میں اکثر تمہارا کھانا کھا لیتا تھا اور بعد میں مکر جاتا تھا۔" تقی نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی تھی۔ بلکہ میں ہر بار جانتی تھی۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ تقی کو حیرت ہوئی۔

"تو کبھی کہا کیوں نہیں؟"

"تمہارے احسانات کا پلڑا بھاری تھا۔ اس لیے۔" وہ مسکرا کر پلٹ گئی۔

تقی کو ایسا لگا، ساری کائنات اس کے ساتھ ہی پلٹ گئی ہو۔ اس کا دل چاہا اسے روک لے۔

"شفا!" بے اختیار پکار بیٹھا۔

وہ پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھ چکی تھی، گردن موڑ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

تقی مخمصے میں پڑ گیا۔ اس نے تو بس پکار لیا تھا۔ یہ نہیں پتا تھا کہ کیوں پکارا۔

"وہ... وہ میں کہہ رہا تھا۔ تم کچھ دن رک جاؤ۔ میرا مطلب ہے۔ کچھ دن بعد چلی جانا۔"

"جانا تو ہے تقی! چند دن مزید رک بھی جاؤں تو بھی جانا تو پڑے گا۔" وہ آج بات بے بات ہی مسکرا رہی تھی۔

"ابا کی طبیعت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی۔ تم یہاں رہو گی تو وہ اچھا محسوس کریں گے۔" اس نے یہی کہہ دیا۔ اور کیا کہتا۔

"میں ملنے آتی رہوں گی۔"

"امی اداس ہو جائیں گی۔" اس نے پھر کہا۔

"تم جلدی مہک کو لے آنا۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔" جل کر ہی کہہ دیا۔

"مہک کو فون کر لینا۔ وہ تمہارے لیے پریشان ہو رہی تھی۔"

اس نے مسکرا کر آہستگی سے کہا اور چلی گئی۔ تقی کو لگا ساری کائنات پر خاموشی چھا گئی ہو اور وہ اس خاموش کائنات میں تنہا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

امی مستقل رو رہی تھیں۔ شفا تھک کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"اس طرح روتی رہیں گی تو میں جاؤں گی کیسے؟" بڑی لاچاری سے کہا۔

"ہاں تو جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" انہوں نے روتے ہوئے خفگی سے کہا تھا۔

"آپ سے ملنے آتی رہوں گی۔"

"ملنے بھی مت آنا۔ اس احسان کی بھی کیا ضرورت ہے۔" انہوں نے جل کر کہا۔ شفا ہنس کر ان سے لپٹ گئی۔

"ایسے تو مت کہیں۔ اتنی پیاری امی کو میں خفا کر کے تو نہیں جا سکتی۔"

"بس پھر ٹھیک ہے۔ میں ساری زندگی کے لیے خفا ہو جاؤں گی، جو دوبارہ جانے کا نام لیا۔"

"ایسے مت کہیں۔ آپ نہیں جانتیں، میں کتنی مشکل سے جا رہی ہوں۔ اتنے خوبصورت رشتے ملے ہیں مجھے اس گھر میں کہ چھوڑ کر جانے کو دل ہی نہیں چاہتا لیکن پڑے گا۔ یہ تو پہلے دن سے طے تھا کہ مجھے جانا ہو گا۔"

"اور یہ کس نے طے کیا تھا۔ تم نے اور تقی نے؟ دونوں ہی عقل کے پورے ہو۔"

"اچھا میں نہیں جاتی۔ لیکن خود بتائیں میں نہیں جاؤں گی تو کیا مہک آئے گی؟ ہرگز نہیں۔"

"ہاں تو نہ آئے۔ میری بلا سے۔" انہوں نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ شفا کو زور سے ہنسی آگئی۔

"آپ کی بلا سے۔ تقی کی بلا سے نہیں۔ محبت کرتا ہے وہ مہک سے۔"

"ایسی دو چار محبتیں ہر لڑکا جوانی میں کرتا ہے۔"

"اچھا۔ آپ تقی سے پوچھیں۔ مہک کو چھوڑنے پر راضی ہے تو میں نہیں جاتی میں۔ رک جاتی ہوں۔"

"ایں۔ مذاق تو نہیں کر رہیں۔ واقعی رک جاؤ گی؟"

شفا نے آنکھیں بھینچ کر آنسوؤں کو اندر اتارا اور گہرا سانس لے کر ان کی طرف پلٹی۔

"آپ کی محبت پر شک نہیں ہے مجھے۔ لیکن پلیز آپ مجھے مجبور نہ کریں۔ میں نے تقی سے وعدہ کیا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہوتے ہی ان کی زندگی سے نکل جاؤں گی تاکہ وہ مہک کے ساتھ ایک اچھی زندگی شروع کر سکے۔ لیکن اب یہاں رک کر میں خائن کہلانا نہیں چاہتی۔ تقی مہک کا حق ہے اسی کو ملنا چاہیے۔ مجھے مجبور نہ کریں۔"

اس کی نم آنکھیں اور لاچار لہجہ دل کی چغلی امی کے سامنے بیان کر گیا تھا۔ ان کا اپنا دل غم سے بھر گیا لیکن دوبارہ انہوں نے اسے مجبور نہیں کیا۔ خاموش ہی رہیں۔

☼ ☼ ☼

ایک آخری کوشش کے طور پر تقی سے بات کی تو وہ آدھا جملہ سن کر ہی چڑ گیا۔

"ایک ہی بات کو کیوں چیونگم کی طرح چبائے جا رہے ہیں آپ لوگ؟ جب ایک بار کہہ دیا کہ ساتھ

نہیں رہتا تو نہیں رہتا۔ اس میں بحث کی گنجائش کہاں ہے۔"

امی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ایسا غصہ جس کی کوئی تک ہی نہیں۔

"ٹھیک ہے دوبارہ کہوں گی ہی نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے پچھتاؤ گے۔"

وہ چلی گئیں۔ تقی اپنے غصے پر قابو پاتا رہا۔ پتا نہیں اسے اتنا غصہ کیوں آرہا تھا۔ بے وجہ چڑچڑاہٹ میں مبتلا ہو رہا تھا۔

"یہ بھی کوئی بات ہے۔ جب نہیں نبھانا رشتہ تو نہیں نبھانا۔ یہ کیا کہ سب پیچھے ہی پڑ گئے۔ جب سب کچھ پہلے سے طے تھا تو وہ دونوں کیسے ساتھ رہ سکتے ہیں۔" وہ سوچتا رہا' جھنجلاتا رہا۔ کمرے سے بھی نہیں نکلا۔ وہیں لیٹ کر کروٹیں بدلتا رہا۔

پھر اچانک سمیر آگیا تو اسے دیکھ کر جیسے تقی کو سر سے پیر تک آگ ہی لگ گئی۔

"چلو اب تم بھی آجاؤ۔ مجھے سمجھانے۔" ایسا پھاڑ کھانے والا استقبال تھا کہ سمیر بھی جل گیا۔

"کیوں؟ مجھے کوئی اور کام نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ سر کھپاتا پھروں۔ تمہیں تو وہ سمجھانے کی کوشش کرے' جس کے برے دن شروع ہو رہے ہوں۔ ہمارے تو اچھے دن چل رہے ہیں بھائی!" ایک ترنگ میں لہرا کر وہ اسی کے بیڈ پر نیم دراز ہو گیا اور سر کے پیچھے ہاتھ باندھ لیے۔

تقی نے بری طرح پیچ و تاب کھائے

"اٹھو۔ ابھی نکلو میرے کمرے سے۔" کتاب کھینچ کر ماری۔ سمیر اس ناگہانی افتاد کے لیے تیار نہیں تھا۔ بوکھلا گیا۔

"بس جل گئے! ہونہہ۔ خوشی برداشت نہیں ہوتی ناں میری۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"سمیر! میں پہلے ہی بہت ٹینشن میں ہوں۔ دماغ کھانے آئے ہو تو فورا" چلے جاؤ یہاں سے۔"

"اس میں ٹینشن والی بات کیا ہے؟ صاف صاف کہہ دو' رک جائیے' نہ جائیے۔" سمیر۔ ایک ہی سانس میں کہہ گیا اور اتنے آرام اور لاپروائی سے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ تقی نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"کون؟ کس کو کہوں؟"

"وہی۔ جس کی محبت آپ کے چہرے پر لکھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ مانیں گے نہیں۔ جب پانی سر سے گزر جائے گا تب مانیں گے۔"

"سمیر! بونگیاں مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو بھی اچھی طرح جانتا ہے' محبت مجھے صرف مہک سے ہے۔" اس نے زور دے کر کہا تھا۔ اسی لیے سمیر بھی زور سے ہنسا۔

"جھوٹ بالکل جھوٹ۔" اس نے پرزور تردید کی۔

"یہ ہی سچ ہے۔" وہ غصے سے بولا۔ "اور اب اس بارے میں کوئی بھی بات کی ناں تو میں ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔"

"اچھا اگر یہ سچ نہیں ہے تو پھر اتنا غصہ کرنے کی کیا بات ہے؟" سمیر نے تحمل سے کہا۔ "میرا مشورہ ہے تقی! اس سے پہلے کہ بھابھی چلی جائیں۔ ایک بار بالکل ذہن خالی کر کے اس رشتے کے متعلق سوچ!"

"سمیر! ہم دونوں کے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"اختلاف بھی تو کوئی نہیں ہے۔" اس نے ترنت کہا تھا۔

"رشتے توقعات کی بنیاد پر بنتے ہیں اور اختلافات کی بنیاد پر ختم ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ مانتا ہوں تم دونوں کا نکاح ایسے حالات میں نہیں ہوا کہ اسے اہمیت دی جائے لیکن یار! رشتے رشتے ہوتے ہیں۔ آج توڑ دو گے تو کل پچھتاؤ گے۔ میری بات یاد رکھنا۔"

"ہاں تمہاری بات نہ ہو گئی شیخ سعدی کی حکایت ہو گئی کہ یاد رکھوں۔" اس نے چڑ کر کہا اور ساتھ ہی سمیر کو کمرے سے باہر دھکیل دیا۔

"دوبارہ مت آنا۔" دروازہ ٹھاہ۔

"خبیث آدمی! سچ مچ ہی کمرے سے نکال دیا۔" اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

"میں اب دوبارہ تیرے گھر نہیں آؤں گا۔ کیسی بدتمیزی سے نکالا ہے' بندے کی کوئی عزت بھی ہوتی ہے۔" وہ بری طرح تاؤ کھا رہا تھا۔

دروازہ کھلا' تقی کا سر باہر نکلا۔ "بندے کی عزت ہوتی ہے' بندر کی نہیں۔" دروازہ پھر ٹھاہ۔

سمیر ابھی پہلی چوٹ سہلا نہیں پایا تھا کہ اور ضرب لگا دی گئی۔

"بدتمیز۔ خبیث۔ چغد۔ آدمی! جا رہا ہوں میں واپس نہیں آؤں گا۔ میری طرف سے پچھتاتے پھرو۔ یا مجنوں بن کر گھومنا۔ دوبارہ بات نہیں کروں گا۔ ہونہہ!" زیادہ ہی جذباتیت میں آکر دروازے کو ٹھوکر ماردی تھی جو کچھ زیادہ ہی زور سے لگ گئی۔ وہ پیر سہلاتا لنگڑاتا وہاں سے چلا گیا۔

اندر تقی بیڈ پر لیٹا پرسکون ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب اسے اس موضوع پر کسی سے بات نہیں کرنی تھی خود سے بھی نہیں۔

☼ ☼ ☼

شفا واپس آگئی۔

ساہر نے دیکھا۔ اتنی شان سے وہ اس گھر میں رہتی نہیں تھی' جتنے طمطراق سے واپس آئی تھی۔ وہ سچی ثابت ہوئی تھی۔ کیسے نہ سر اٹھا کر واپس آتی۔ وہ عمیر کے ساتھ سر اٹھا کر آئی۔ سارے گھر میں گھومتی پھری۔ اس کی آواز اس کی ہنسی سے سارا گھر گونجتا تھا۔

بچوں کے ساتھ کھیلتی رہی۔ ایک آدھ بار ساہر سے سامنا بھی ہوا تو نظروں کا رخ پھیر لیا۔

ساہر کا دل کٹ سا گیا تھا لیکن وہ مانتی تھی۔ وہ اسی سلوک کی حق دار تھی۔

عمیر نے پہلے ہی بات چیت بند کر رکھی تھی۔ انہوں نے کچھ کہا نہیں' لیکن اسے اس گھر میں اجنبی مان لیا تھا۔

ساہر نے دونوں' بہن بھائی کو شفا کے اسی کمرے میں جاتے دیکھا جو اس نے شفا کے جانے کے بعد بہت شوق سے بچوں کے لیے سیٹ کر لیا تھا اور اپنے کمرے میں آگئی۔ اس گھر کی اصل مالکن واپس آگئی تھی۔ ساہر کی اب وہاں کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ۔" شفا نے کمرے پر نظر ڈالی۔

"یہ میرا کمرا ہے پھپھو!" ہدیہ نے جلدی سے اور پرجوش ہو کر اسے اطلاع دی۔

"آپ جب چلی گئی تھیں ناں تو ماما نے یہ روم مجھے دے دیا تھا۔"

"میں ہدیہ کا سامان دوسرے کمرے میں شفٹ کروں گا۔ تم اس کمرے کو اپنے لیے سیٹ کر لو۔" عمیر نے ذرا شرمندہ ہو کر کہا۔

"ہدیہ کا سامان دوسرے کمرے میں کیوں رکھیں۔ ہدیہ اور میں ایک ہی روم شیئر کر لیں گے۔ کیوں ہدیہ؟" شفا نے پیار سے کہا۔ ہدیہ کا اترا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔

"میں پھپھو کے ساتھ رہوں گی۔ میں ماما کو بتا کر آتی ہوں۔" وہ جلدی سے کہتی باہر بھاگ گئی۔

"شفا!" ہدیہ چلی گئی تو عمیر نے اس سے کہا۔ "آئی ایم سوری بیٹا! اگرچہ یہ چند الفاظ تمہاری تکلیف کو گھٹا تو نہیں سکتے۔ لیکن جو کچھ بھی ہوا' اس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔" عمیر نے اس کے سامنے ہاتھ بھی جوڑ دیے تھے۔

شفا دھک سے رہ گئی۔

"کیا کر رہے ہیں عمیر بھائی! اس طرح مت کریں۔" اس نے فورا" عمیر کے ہاتھ کھول دیے۔ "اور جو بھی ہوا' اس میں آپ کی تو کوئی غلطی نہیں ہے۔ انسان آنکھوں دیکھے پر ہی بھروسا کرتا ہے آپ نے بھی وہی کیا۔"

"لیکن تمہارے ساتھ ساہر نے تو برا کیا۔" عمیر نے زور دے کر کہا تھا۔ "اس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔"

"جو ہونا تھا ہو چکا۔ بار بار اس موضوع کو دہرانے کا

کیا فائدہ؟ کیا بہتر نہیں ہو گا بھائی! کہ ہم اس موضوع پر بات ہی نہ کریں۔"

تمیر سمجھ گئے کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ آہستگی سے اس کا سر تھپتھپا دیا۔

"تم اپنا سامان سیٹ کرو۔ کھانا میں باہر سے لے آتا ہوں۔"

شفا نے نرمی سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔



گھر میں غیر معمولی سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ تقی گھر میں داخل ہوا تو اسے بری طرح محسوس ہوا۔

اندر آیا تو ٹی وی چل رہا تھا سب ہی موجود تھے لیکن سب ہی خاموش تھے اس وقت ابا خبریں سنتے تھے اور ساتھ ساتھ تبصرہ فرماتے تھے۔ شفا ان کا ساتھ دیتی تھی۔ آج وہ نہیں تھی تو تبصرے کا سلسلہ بھی موقوف کر دیا گیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی!" اس نے اس سوئے ہوئے ماحول کو اپنے لہجے سے ذرا جگانے کی کوشش کی تھی۔

جواباً" ابا اور رضی نے گردنیں موڑ کر اسے ایسے گھورا کہ بے چارہ چپ ہی ہو گیا۔ اور تو اور جری نے بھی ناک چڑھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

تقی اپنا سامنہ لے کر امی کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر ٹی وی دیکھتا رہا پھر امی کے کان میں گھسا۔

"مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ سب اداس ہونے کی ایکٹنگ کر رہے ہیں۔" اس نے شرارت بھری سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ امی نے غضب ناک ہو کر گھورا۔

"کیونکہ تم خود بے حس ہو چکے ہو۔ خود ایکٹنگ کرتے ہو تو تمہیں لگتا ہے سب یہی کر رہے ہیں۔"

"ہائیں۔ آپ اتنی ایموشنل کیوں ہو رہی ہیں؟"

"کیونکہ میں سچ مچ اداس ہوں۔" وہ آواز دبا کر لیکن ناراضی سے بولی تھیں "اتنا سمجھایا تمہیں لیکن مجال ہے جو تمہاری ناقص عقل میں کوئی بات آئی ہو۔ لے کر میری بہو کو بھیج دیا۔"

"شفا چلی گئی؟" حیران ہوا۔ "آپ چاہتی تھیں میں اسے روک لوں اور اس سے اتنا نہ ہوا مجھ سے مل کر ہی چلی جاتی۔" ایسے ہی منہ سے نکل گیا تھا۔

"ہونہہ! مل کر ہی جاتی۔"

"کچھ کھانے کو ملے گا یا آج صرف طعنے ملیں گے؟"

امی گھورتی ہوئی سر جھٹک کر اٹھ گئیں۔ وہ کچھ دیر وہیں بیٹھا پھر کمرے میں آ گیا۔

سر بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔ عجیب سی بے زاری تھی۔ تھوڑی ہی دیر لیٹا تھا کہ موبائل فون کی بپ بجنے لگی۔ وہ منہ دھونے کے خیال سے اٹھا تھا۔ فون اٹھا کر دیکھنے لگا تو امی آ گئیں۔

"کھانا رکھ دیا ہے میز پر۔ ہائے! کیسا ویران سا لگتا ہے گھر۔ کیسی رونق لگی رہتی تھی شفا کے دم سے۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"جی ہاں۔ وہ تو ڈگڈگی بجا کر بندر کا تماشا دکھایا کرتی تھی آپ کو۔"

"چپ کرو۔ اور ایسے طنز سے تو ہنسنا بھی مت۔ میری بہو کے بارے میں ایک بھی لفظ مت کہنا۔ کیسا دل لگا دیا تھا اس نے میرا۔" پھر ٹھنڈی سانس۔

"فکر نہ کریں۔ آپ کا دل لگانے کے لیے دوسری بہو لا دوں گا۔"

"دو نمبر چیز ہمیشہ دوسرے نمبر پر ہی رہتی ہے۔ کبھی پہلے کی جگہ نہیں لے سکتی۔ یہ بات میری یاد رکھنا بیٹے۔" طنز سے کہا۔

"آپ جتنا مرضی مجھے روک لیں۔ مہک سے شادی تو میں ضرور کروں گا۔" اس نے بھی سادگی سے لیکن اٹل لہجے میں کہہ دیا۔

"اور یہ میرے جیتے جی تو نہیں ہو سکے گا۔"

وہ کہہ کر چلی گئیں۔ تقی ہاتھ میں پکڑا سیل فون دیکھتا رہا پھر بے زار ہو کر اسے بیڈ پر اچھال کر واش روم میں گھس گیا۔



رات کے دوسرے پہر شفا پانی پینے کچن میں آئی اور بالکل سامنے زمین پر بازوؤں میں سر دیے کر بیٹھی ساہر کو دیکھ کر بری طرح ڈر گئی۔

"بھابھی آپ!" وہ دراصل یہاں ساہر تو کیا' اس وقت کسی کی بھی موجودگی کی توقع نہیں کر رہی تھی' اسی لیے اسے دیکھ کر ڈر گئی تھی۔

ساہر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اور آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔

شفا ٹھٹکی پھر خاموشی سے بڑھ کر کیبنٹ سے گلاس نکالنے لگی۔

ساہر بے ارادہ اسے دیکھ رہی تھی۔ شفا نے گلاس نکالا فلٹر سے پانی بھرا۔ ذرا سا شیلف پر ٹک کر تین گھونٹوں میں پانی پیا۔ گلاس کھنگال کر ریک میں رکھا اور واپس جانے کے لیے پلٹ گئی۔

"تم ہر بار کیسے جیت جاتی ہو؟"

شفا ابھی دروازے میں ہی تھی کہ اس نے ساہر کی آواز سنی۔ اس کے لہجے میں آنسوؤں کا بھاری پن تھا۔ نفرت تھی۔ غصہ تھا اور... اور پچھتاوا بھی تھا۔

شفا نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"ہر بار... ہر بار قسمت تمہارا ہی کیوں ساتھ دیتی ہے۔ تمہیں پتا ہے شفا! تم ایک آسیب کی طرح شادی کے پہلے دن سے میرے ساتھ چپکی ہوئی ہو۔ اس آسیب سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ میں نے دعائیں کیں۔ جھوٹ بولے۔ پیروں فقیروں کے پاس بھی چکر لگا لیے اور عمیر کی بھی پروا نہیں کی پھر بھی... پھر بھی ہر بار اللہ تمہیں کیوں بچا لیتا ہے؟" وہ سر پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی تھی۔ رات کا وقت تھا اور اس کی آواز گھر میں پھیلے سناٹے کو دہشت ناک بنا رہی تھی۔

"کیونکہ آپ ہمیشہ مجھے ہی ہرانے کی کوشش کرتی رہیں۔ کبھی اپنی جیت کے لیے کوشش نہیں کی۔" شفا نے اس کے خاموش ہوتے ہی ٹھوس لہجے میں کہا۔

ساہر رونا بھول گئی لیکن نظریں اٹھا کر شفا کی طرف نہیں دیکھا۔

"آپ مجھے ہرانے کی کوشش نہ کرتیں۔ اپنی جیت کی کوشش کرتیں۔ دعائیں تو کرتیں لیکن جھوٹ نہ بولتیں۔ قسمت نے کبھی میرا ساتھ نہیں دیا۔ وہ آپ کی چالیں الٹی کرتی رہی ہے اور آپ پھنستی رہیں۔ قسمت نے پہلی بار میرا ساتھ دیا اور دیکھ لیں... آپ اپنے ہی جال میں پھنس گئیں۔ میں آپ کے سارے گلوں سے واقف ہوں۔ سارے شکوے جانتی ہوں۔ میں نے جو بھی کیا۔ وہ میری نادانی تھی۔ کم عمر تھی میں بہت ساری چیزوں کی سمجھ نہیں تھی مجھے۔ لیکن کیا میں نے آپ سے معافی نہیں مانگی تھی۔ اپنی ہر غلطی کے لیے' اپنی ہر نادانی کے لیے۔ اور ایک بار ہی نہیں کئی کئی بار۔ آپ نے زبان سے مجھے معاف کیا اور دل میں عناد پالتی رہیں۔ یہ تو بہت برا کیا نا آپ نے۔ یا تو معاف نہ کرتیں یا بغض نہ رکھتیں۔ آپ تو سمجھ دار تھیں بھابھی! پھر بھی آپ نے وہ سب کیا جو ایک سمجھ دار عورت کو زیب نہیں دیتا۔ جھوٹ بول کر مجھے مری بھجوایا۔ عمیر بھائی کو مجھ سے متنفر کیا۔ ان کے دل میں ثمر کے لیے برائی ڈالی۔ عمیر بھائی کو مجھ سے اتنا دور کر دیا کہ میں ان سے بات کرنے سے بھی ڈرنے لگی۔ برا کیا بھابھی! بہت برا کیا۔"

"ہاں کیا میں نے برا۔" اس کا صبر چھٹا تھا۔ "کیونکہ مجھے عمیر چاہیے تھے اور تم ہمیشہ ہمارے درمیان حائل رہیں۔"

"آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں عمیر بھائی آپ کے ہی تھے۔ کبھی نہ کبھی میں یہاں سے چلی ہی جاتی۔ میری شادی ہو جاتی تو آپ کی جان چھوٹ ہی جاتی نا۔"

ساہر نے ہکا بکا ہو کر اسے دیکھا۔ وہ تو وہی کہہ رہی تھی جو اب تک اسے اس کی امی سمجھانے کی کوشش کرتی رہی تھیں۔

"لیکن آپ تو انتقام لینے میں اتنی اندھی ہو چکی تھیں کہ میں تو کیا اپنے بھائی کو بھی نہیں بخشا۔" طنز سے کہا۔

"اتنا سیاہ پڑ چکا تھا آپ کا دل کہ جسے تنگ رہی تھی'

اس کی بھی پروا نہیں کی۔ بچے، بچوں کے لیے بھی نہیں سوچا۔ کچھ بھی کرتیں۔ میرے کردار کو تو نشانہ نہ بناتیں۔ آپ نے ایک بار بھی سوچا تھا اگر یہ سب عمیر بھائی کو پتا چلا اور انہوں نے آپ کو چھوڑ دیا تو آپ کے بچوں کا کیا ہوگا۔"

"ایسے مت کہو شفا! میں عمیر اور بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اس نے دہل کر کہا۔

"یہ خیال تو آپ کو پہلے آنا چاہیے تھا نا۔" شفا استہزائیہ ہنسی۔

"کیا مطلب عمیر مجھے چھوڑ دیں گے؟" وہ خوف زدہ ہو کر اس کے پاس آگئی۔ "انہوں نے تمہیں کہا ہے کچھ۔"

"میری ان سے اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"بات ہوگی بھی تو تم کون سا میرے حق میں بولو گی۔" ساہر نے دکھی لہجے میں کہا۔

شفا پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"دیکھا آپ نے پھر مجھے غلط سمجھا۔ آپ کے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں گے، عمیر بھائی کریں گے۔ میرا ان کے فیصلے میں کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔" اس نے کہا۔

ساہر تنہا سی وہیں کھڑی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح ساہر ہمت کر کے عمیر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"مجھے سزا دے لیں عمیر! لیکن ایسا رویہ مت رکھیں پلیز۔ آپ کی یہ بے اعتنائی برداشت نہیں ہوتی مجھ سے۔" وہ رو پڑی۔

"ہٹو میرے آگے سے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" عمیر تو پتھر کے ہی بن گئے تھے جیسے۔ ایک نظر بھی اس پر نہیں ڈالی۔

"عمیر!" اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "آپ بھول گئے، آپ کو مجھ سے محبت تھی۔" اس نے بری طرح روتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہا تھا اور عمیر کے بازو کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ عمیر نے بھڑک کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔" ان کا چہرہ اشتعال سے بے پناہ سرخ ہو رہا تھا۔ "تم سے محبت کی۔ تمہیں اپنا آپ سونپا۔ یہ گھر تمہیں دیا۔ تم پر اعتماد کیا۔ میں نے کہا تھا ایک بار تمہیں کئی بار۔ شفا کو نند مت سمجھنا۔ بہن سمجھ لینا۔ بیٹی سمجھ لینا، اتنی اعلا ظرف نہ بن سکو تو دوست ہی سمجھ لینا اور تم نے کیا کیا۔ اس کی عزت کو دو کوڑی کا کر دیا۔ میری محبت بھی تم اپنے انتقام میں بھول گئیں۔ افسوس ہے مجھے کہ تم میری پسند ہو، افسوس ہے کہ میرے بچوں کی ماں ہو۔ کاش میں اپنی زندگی سے تمہیں نکال کر سکتا۔"

اتنی نفرت اتنی نخوت۔ ساہر کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔

"میری غلطی معاف نہیں کر سکتے۔" لفظ مشکل سے اس کے حلق سے نکلے۔

"کاش یہ ہی کر سکتا۔" عمیر نے بڑے ضبط سے کہا۔

"اگر یہی بات ہے تو مجھے نکال ہی دیں اپنی زندگی سے۔ اب تک آپ کی محبت دیکھی تھی۔ آپ کی نفرت نہیں دیکھی جا رہی مجھ سے۔" اس نے آنکھیں بھینچ کر بڑے ضبط سے کہہ دیا۔

"نکال ہی دیا ہے۔ دل سے تو ہمیشہ کے لیے نکال دیا ہے۔ گھر میں بھی رہو یا نہ رہو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔" عمیر نے اپنا آفس بیگ اٹھایا اور باہر نکلتے چلے گئے۔

ساہر پر ایک بار پھر دکھ اور پچھتاوے نے ایک ساتھ حملہ کیا۔ کوشش کے باوجود اپنے آنسو نہیں روک سکی اور سسک سسک کر رو دی۔

جس وقت شفا اپنے کمرے سے نکلی۔ ساہر اس گھر سے ہمیشہ کے لیے جا چکی تھی۔ گھر ویران پڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

سمیر کا فون آیا۔ بڑا دل برداشتہ لگ رہا تھا۔

"اماں نہیں مان رہیں۔ دل چاہتا ہے خود کشی کرلوں۔"

"تو کرلو۔ مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔" تقی نے ترنت کہا۔

"یار! حد ہے۔ کسی کو میری خود کشی سے فرق ہی نہیں پڑتا۔ کل میں نے یہی بات ثمر سے کہی تو اس نے بھی یہی جواب دیا تھا۔" وہ روہانسا ہی ہوگیا۔

تقی دل کھول کر ہنسا۔

"او بھائی! تو واقعی خود کشی کرلے۔ ایسے انسان کے زندہ رہنے کا بھی کیا فائدہ جس کے جینے مرنے سے کوئی فرق ہی نہ پڑتا ہو۔" ایک اور مشورہ دے دیا، سمیر کو آگ ہی لگ گئی۔

"ایسے دوست کا بھی کیا فائدہ۔ جو غم سن کر تسلی بھی نہ دے۔"

"اچھا سچ بتانا۔ یہی بات سن کر بھابھی نے کیا جواب دیا تھا۔" تقی نے مزے سے پوچھا۔

"اونہہ۔" سمیر کا منہ حلق تک کڑوا ہوگیا۔ "اس نے بھی یہی جواب دیا تھا۔ افسوس کی بات یہ کہ تم اور ثمر میرا دل جلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے ہی نہیں دیتے۔"

اس بات پر تقی ہنسا اور دیر تک ہنسا۔

"بڑی ہنسی آ رہی ہے تمہیں۔" تقی سامنے نہیں تھا ورنہ سمیر اس کا سر نہ پھاڑتا تو ایک آدھ گھونسا تو ضرور ہی جڑ دیتا۔

"اتنا موڈ خراب تھا میرا۔ لیکن تم نے یہ بتا کر دل خوش کر دیا ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے اور اس کے غصے کی پروا کیے بغیر کہا۔

"موڈ کیوں خراب تھا؟" سمیر نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

"بس ویسے ہی۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔" اس کا کریدتا ہوا انداز۔

تقی نے لاشعوری طور پر سر جھٹکا اور بشاش لہجے میں بولا۔

"بس یار! ایک تو شوٹنگز کا شیڈول اتنا ٹائٹ ہے۔ اوپر سے سی این جی کی اتنی لمبی لائن۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے لائن میں سر پہ کھڑے موت کا فرشتہ آجائے گا لیکن سی این جی نہیں ملے گی۔ پھر ٹریفک جام۔ بہت تھک گیا آج۔"

سمیر اس کی رگ رگ سے واقف نہ ہوتا تو یہی نہ جان پاتا، وہ کتنا پوز کر رہا ہے۔

"بس یہی بات ہے؟" اس کے خاموش ہوتے ہی سمیر نے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ سوچ میں پڑ گیا پھر زور دے کر بولا۔ "ہاں یہی بات ہے۔"

"میں بتاؤں۔ موڈ کیسے ٹھیک ہوگا؟"

"بتاؤ۔"

"شفا بھابھی سے بات کرو۔"

"سمیر! میں نے منع کیا تھا۔ میں اس موضوع پر بات نہیں کروں گا۔"

"اس موضوع پر بات نہ کرو۔ بھابھی سے بات کرلو۔ میں گارنٹی دیتا ہوں۔ موڈ بھی ٹھیک ہو جائے گا اور تھکن بھی جائے گی۔"

"میں فون بند کر رہا ہوں۔ دوبارہ کال نہ کرنا۔" اس نے چڑ کر غصے سے کہا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں دوبارہ نہیں کہتا۔" سمیر نے فوراً ہی اس کی بات مان لی۔

"چکر لگالے گھر کا۔ اماں کو صرف تو ہی منا سکتا ہے۔" اس نے موضوع ہی بدل دیا اور منت بھرے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے شام کو آتا ہوں۔" تقی بھی دھیما پڑ گیا۔

اس نے فون بند کر دیا۔ اس کی ناپسندیدگی کے باوجود سمیر اس موضوع پر بات کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ بات بے بات وہ شفا کا حوالہ نکالتا ہی رہتا تھا اور ہر بار تقی کے غصے کا نشانہ بنتا تھا۔ گھر والوں نے تو اس کے غیر معمولی غصے کو دیکھ کر بات کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ امی تو بڑے دن خفا بھی رہیں لیکن تقی کے کان پر جوں تک

نہیں رہ سکی۔

وہ فیصلہ کر چکا اور اس پر قائم تھا۔

"سمیر کا دماغ خراب ہے جو مجھے شفا سے بات کرنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ مجھے شفا سے نہیں، مہک سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔"

وہ موبائل اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ بیل جا رہی تھی۔ وہ انتظار کرنے لگا۔

"تھوڑی دیر مہک سے بات کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔" اس نے دل میں خود سے کہا۔

"ہیلو۔"

آواز سن کر تقی ذرا حیران ہوا۔ "ہیلو۔ مہک؟" تصدیق چاہی۔

"مہک نہیں شفا!" آواز میں خفیف سا تبسم تھا۔ "کیسے ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" تقی شرمندہ سا ہو گیا۔ "میں مہک کا نمبر ملا رہا تھا۔ غلطی سے تمہارا ملا لیا۔"

بات تو یہی تھی لیکن بلاوجہ وضاحتیں دینے لگا۔

"ہاں۔ میں سمجھ گئی تھی۔ تم نے مہک کا ہی ملایا ہو گا۔" اس نے کہا۔ "میں بند کر رہی ہوں۔ تم مہک سے بات کرو۔"

فون بند ہو گیا تو تقی نے سر پکڑ لیا۔

"سب نے مل کر شفا کو اتنا میرے دماغ پر سوار کر دیا ہے کہ میں کچھ اور سوچ ہی نہیں پا رہا۔ حد ہے یار!"

اسے سخت غصہ آ رہا تھا۔

"میں نمبر ہی ڈیلیٹ کر دیتا ہوں۔ نہ ہو گا نہ غلطی سے کال ملاؤں گا۔"

اس نے فون بک سے نمبر ہی مٹا دیا اور دوبارہ جان بوجھ کر تو کیا غلطی سے بھی شفا کو فون نہ کیا۔ لیکن وہ پاگل تھا، جو یہ سمجھ رہا تھا نمبر مٹا دینے سے وہ انسان بھی یادداشت سے نکل جاتا ہے، جس کے معاملے میں ہم اپنے دل سے ڈرے ہوتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

شفا سارے کام سمیٹ کر ٹیرس کی گرل سے لگ کر کھڑی تھی۔

نیچے گلی سنسان اور اوپر آسمان ویران معلوم ہوتا تھا۔

یہ ایک اداس دن کا آغاز تھا۔

عمیر بھائی آفس جا چکے تھے۔ ہدیہ کو اسکول بھیج دیا تھا۔ جو اکا دکا کام تھے وہ بھی نمٹا چکی تھی اور اب پچھلے کئی دنوں کی طرح یہی سوچ رہی تھی کہ اب کیا کیا جائے۔ پرائیویٹ داخلہ بھجوا دیا تھا۔ کچھ وقت پڑھائی میں گزر جاتا لیکن پڑھا بھی کتنا جا سکتا ہے۔

اداسی جمع بے زاری جمع بوریت۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔

اب بھی ایسے ہی کھڑی تھی کہ ایک خیال آیا۔ اس نے چند منٹ سوچا پھر تیزی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ رائٹنگ ٹیبل پر نوٹس بناتے ہوئے وہ نوٹ بک ایسے ہی کھلی چھوڑ گئی تھی۔ پین بھی وہیں رکھا تھا۔ اس نے صفحہ پلٹا۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھی اور لکھنے کے لیے جھک گئی۔

"19 مئی 2014"

لکھ کر ذرا دیر کو سوچا اور روانی سے لکھتی چلی گئی۔

"19 مئی 2014ء"

"میں شفا فاروق ہوں۔ اس قدر نالائق ہوں کہ کبھی سمجھ ہی نہیں سکی کہ لوگ ڈائری کیوں لکھتے ہیں۔ لیکن آج ابھی اس وقت بہت اچھی طرح سے سمجھ گئی ہوں۔ ہو سکتا ہے میں غلطی پر ہوں لیکن میرا خیال ہے وہ لوگ بھی میری ہی طرح تنہا ہوتے ہوں گے تب ہی تو لکھ لکھ کر ڈائریاں کالی کرتے رہتے ہیں۔

آج سے میں بھی کیا کروں گی کیونکہ میرے پاس بھی ایسا کوئی نہیں ہے، جس سے اپنے دل کی بات شیئر کر سکوں۔ اپنی شادی سے بہت پہلے عمیر بھائی سن لیا کرتے تھے، پھر ان کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں رہی کہ میری باتیں سنتے۔ آہستہ آہستہ میری بولنے اور دل کی ہر بات انہیں بتانے کی عادت ختم ہوتی چلی گئی۔

وقت اور حالات عادتیں بدل دیتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عادتیں بدلنے سے دل بوجھل ہونا

چھوڑ دے۔ نہیں جی۔ دل تو اپنی مرضی پر ہی چلتا ہے۔ اب میرے ہی دل کو دیکھ لیں۔ مجال ہے جو اپنی ضد سے ہٹ رہا ہوں کہتا ہے تقی کے گھر جاؤ۔ امی کے گلے لگو۔ ابا کے ساتھ دیر تک شطرنج کھیلو۔ بھابھی سے گپیں لگاؤ۔ رضی بھائی سے آئس کریم کی فرمائش کرو اور جری کے ناز چھوٹے بھائیوں کی طرح اٹھاؤ اور۔ اور تقی سے محبت کرو۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اس گھر کے ہر فرد کے ساتھ ساتھ مجھے تقی سے بھی محبت ہو گئی اور پتا نہیں یہ کب ہوا تھا۔ تب جب وہ نکاح کر کے میرے کردار پر انگلی اٹھانے والوں کو خاموش کروا رہا تھا یا تب جب مہک سے میری خاطر الجھ رہا تھا یا تب جب اپنی پہلی کامیابی پر دیوانہ سا ہو رہا تھا۔

اس ایک لمحے کی نشان دہی کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے، جب اس کی محبت نے میرے دل پہ دستک دی تھی۔

سوچتی ہوں کاش! میں نے امی کی بات مان لی ہوتی۔ میں مہک کو اپنے اور تقی کے درمیان سے نکال سکتی تھی لیکن پھر خائن بن جاتی تو اللہ کے پاس کس منہ سے جاتی۔ اس بے چارے نے میری مدد کی اور میں اس کی محبت کو اس سے چھین لیتی۔ نہیں یہ ہرگز جائز عمل نہ ہوتا۔

ہاں لیکن اپنی ایک بدنیتی میں تسلیم کرتی ہوں اور وہ یہ کہ اس گھر سے واپس آئے مجھے تقریباً" تین ماہ گزر چکے ہیں اور میں نے خلع یا تقی کی جانب سے طلاق کے بارے میں سوچا تک نہیں ہے۔ زندگی میں بعض دفعہ یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں، آپ کی ترجیحات کیا ہیں؟

میں اس سے الگ ہی رہنا چاہتی ہوں لیکن اس سے طلاق کا میری ترجیحات میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ الگ ہو جائیں گے لیکن اس علیحدگی نے دل کا کیا حال کیا ہے، وہ میں جانتی ہوں یا میرا رب۔

بہرحال تقی جہاں رہے خوش رہے، ساہر بھابھی یہاں رہتیں تو اس کی شادی سے متعلق کوئی خیر خبر مل ہی جاتی لیکن وہ تین ماہ ہوئے اپنی امی کے گھر جا چکی ہیں۔ عمیر بھائی انہیں لانے پر راضی نہیں۔ وہ تو بچوں کو بھی اپنے ہی پاس رکھنا چاہتے تھے لیکن عادل بیمار رہنے لگا تو اسے چھوڑ آئے۔ ہدیہ پھر بھی مجھ سے الجھ ہے تو سنبھل جاتی ہے لیکن ہے تو وہ بھی بچی۔ جب ماں کی یاد ستاتی ہے تو رو رو کر برا حال کر لیتی ہے۔

میں نے ایک بار عمیر بھائی سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ ٹال گئے۔ زیادہ بات ہی نہیں کرتے۔ جب میں ان کی اتری ہوئی شکل دیکھتی ہوں تو گلٹی فیل کرتی ہوں۔ جو بھی ہوا اس میں مرکزی کردار تو میں ہی تھی۔ میرا خیال ہے مجھے ایک بار پھر عمیر بھائی سے بات کرنا چاہیے۔ اگرچہ بھابھی کو معاف کرنا میرے لیے مشکل ہو گا لیکن میری خاطر عمیر بھائی کو اپنا رشتہ خراب نہیں کرنا چاہیے۔ پھر ہدیہ اور عادل کو ماں باپ دونوں کی ضرورت ہے۔ ہم تو اپنا وقت گزار چکے۔ اب اس نئی نسل کی باری ہے تو ہم انہیں کیوں ٹوٹی پھوٹی شخصیات بننے دیں۔ میں عمیر بھائی سے ضرور بات کروں گی کہ ساہر بھابھی کو لے آئیں۔

ثمر کب سے کہہ رہی ہے۔ اس کی شادی کی تیاریوں میں تھوڑا ہاتھ میں بھی بٹا دوں۔ لیکن میں گھر سے نکل ہی نہیں پاتی۔ امید ہے شادی میں تقی سے ملاقات ہو جائے گی۔ اللہ کرے نہ ہی ہو۔ وہ سامنے آیا تو دل کو سمجھانا اور مشکل ہو جائے گا۔ ہماری زندگیوں میں ہمیشہ رشتوں کی کمی رہی ہے اب اگر کچھ رشتے مل ہی گئے تھے تو وہ بھی ایسے جیسے ادھار پر لیے ہوں۔ جنہیں ایک نہ ایک دن واپس کرنا ہی تھا سو کر ہی دیا۔ لیکن دل کا کیا کروں۔ یہ اداسی بھی تو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔"

اس نے قلم بند کیا اور کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پھر سر بھی پیچھے کر لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

☼ ☼ ☼

تقی کو اس روز بڑے دن بعد آف ملا تھا۔ جی بھر کر سویا۔ پھر ڈٹ کر ناشتا بھی کیا۔

امی الگ واری صدقے جارہی تھیں۔ جب سے وہ شوبز میں گیا تھا۔ گھر پر تو کم ہی نظر آتا' انہیں وہ دن بڑے یاد آتے تھے جب وہ ان سے فرمائشیں کرکے ناشتے کھانے بنوا تا تھا۔

آج گھر پر تھا تو انہوں نے چکن بھر کر پراٹھے بنائے۔ حلیم کا دیگچہ صبح ہی چڑھا دیا تھا۔ میٹھی لسی کا جگ بھر کر لائیں اور اب اصرار تھا کہ ایک کے بعد دوسرا پراٹھا بھی کھائے۔

"لو بھائی! ثابت ہو گیا پیسے کی قدر ہے یا شہرت یافتہ کی۔ ورنہ وہی تقی ہوں' جسے اس گھر میں کوئی نہیں پوچھتا تھا۔" اداس سی آواز بنا کر کہہ رہا تھا لیکن سنجیدہ نہیں تھا۔ سراسر انہیں چڑا رہا تھا۔

"ہاں بیٹے! اب یہی دور آگیا ہے کہ ماں کی ممتا کو بھی پیسے اور شہرت کے ترازو میں رکھا جائے۔" وہ بھی اس کی امی تھیں۔ پلیٹ میں زبردستی پراٹھا بھی رکھ دیا اور بات بھی سنادی۔ تقی کھل کر مسکرایا۔

"مذاق کر رہا ہوں۔ آپ کی ممتا کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں لیکن اتنا مت کھلائیں مجھے۔ پہلے کی بات اور تھی۔ آپ جو بھی بناتی تھیں' کھا لیتا تھا لیکن اب اتنا نہیں کھا سکتا۔ تھوڑا سا بھی موٹا ہو گیا تو لوگ کاسٹ کرنا چھوڑ دیں گے۔ اس پروفیشن میں آنے کا ایک یہی نقصان لگ رہا ہے مجھے۔ اپنی مرضی سے کھا بھی نہیں سکتا میں۔" اس نے حسرت سے پلیٹ میں پڑے کرارا گرم پراٹھے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے آگ لگے ایسے "پروفیشن" کو۔ جو میرے بچے کو اچھا کھانا بھی نہ کھانے دے۔ تم کھاؤ میرا بیٹا! میں دیکھوں گی کون کاسٹ نہیں کرتا۔ اور کوئی موٹا کہہ کر تو دکھائے۔ میرے بیٹے کی اچھی صحت کو نظر لگانے والے کی آنکھیں اور زبان نہ کھینچ لوں میں۔" وہ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی تھیں۔ تقی ہنسنے لگا۔

"او میری پیاری۔ سلطان راہی کی جانشین امی! ہر پروفیشن کی اپنی کچھ ڈیمانڈز ہوتی ہیں۔ کچھ اصول ہوتے ہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ موٹا ہو گیا تو ہیرو نہیں لگوں گا اور جب ہیرو نہیں لگوں گا تو کوئی کاسٹ بھی کیوں کرے گا۔ اب ہر کوئی میں تو نہیں کہ آپ کی سات نمبر کی جوتی کے ڈر سے آپ کا ہر حکم مان لے میری طرح۔" اس نے شرارت سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔" انہوں نے آگے سے پلیٹ اٹھالی۔

"شام کو کہیں جانا تو نہیں' فارغ ہی ہو گے نا؟"

"ہاں جی۔ کیوں؟" سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"تھوڑی دیر کے لیے جوہر ٹاؤن چلے جانا۔ مکان کرائے پر چڑھ گیا ہے۔ تمہارے ابا کہہ رہے تھے پک اپ بجھوادیں گے۔ تم وہاں سے اپنا سامان اٹھوالو۔"

"خدا خدا کرکے ایک چھٹی ملی ہے مجھے۔ کم سے کم آج تو کوئی کام نہ کہیں۔ ایک دن تو آرام کرنا میرا حق بنتا ہے۔ اور وہاں کون سا اتنا قیمتی سامان تھا کہ اسے اٹھوانا ضروری ہو۔" اس نے بچوں کی طرح بسور کر کہا۔

"ارے کچھ نہ کچھ سامان تو ضرور ہو گا۔ ادھر گھر میں کون ہے جس کو کہوں۔ رضی آفس گیا ہے' جری کالج۔ آج تم فارغ ہو تو یہ کام کر ہی لو۔"

"امی!"

"اچھا ٹھیک ہے۔ اپنے ابا کو فون کرکے بتادو کہ تم نہیں جاسکتے۔" انہوں نے گیند اس کے کورٹ میں ڈال کر جان چھڑوائی' پتا تھا وہ انہیں انکار نہیں کرسکتا اور ہوا بھی یہی۔

"جی ہاں۔ انہیں فون کروں تاکہ وہ دو کاموں کی لسٹ اور پکڑا دیں۔" وہ چڑ ہی گیا پھر بولا۔

"ابا کو کہہ دیں۔ بجھوادیں پک اپ۔ چلا جاؤں گا میں۔" مرے ہوئے سے انداز میں کہا۔

امی مسکرا کر چلی گئیں۔ وہ چاہتی بھی یہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

تقی کا ارادہ نہیں تھا سوچا تھا کسی بھی بہانے سے ٹال دے گا لیکن ابا کے ڈر سے آنا ہی پڑا۔

بے شک وہ اس سے راضی ہو گئے تھے لیکن غصہ کرنے میں منٹ ہی لگاتے تھے۔ امی بھی ساتھ آگئی تھیں۔

"تقی بھائی کیا کیا اٹھانا ہے؟" دکان کا ملازم پوچھ رہا تھا۔

"جو نظر آئے لوڈ کرواتے جاؤ۔" وہ لاپروائی سے کہتا اندر آگیا اور برآمدے میں کرسی گھسیٹ کر آرام سے بیٹھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سستانے لگا۔

"تم یہاں آرام کرنے آئے ہو۔" امی کی آواز پر بھی اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کوئی کام نہیں کروں گا۔"

امی نے جواب نہیں دیا۔ انہیں تو یہاں کا سناٹا پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

"مجھے تو واپس چھوڑ آؤ۔ کیسی رونق لگی رہتی تھی شفا کے دم سے۔"

تقی نے جواب نہیں دیا۔ یوں ظاہر کیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔ امی یونہی شفا کو یاد کرتی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

آنکھیں بند کیے ایک دم سے شفا اسے بڑی شدت سے یاد آئی تھی۔

یوں لگا جیسے اس کی ہنسی آس پاس ہی گونجی ہو۔ چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

لیکن وہ تو کہیں بھی نہیں تھی اس کی متلاشی نظریں بھی لاشعوری طور پر سارے گھر کا چکر لگا آئیں۔

تب نظریں کچن کی دہلیز پر جار کیں۔ اسے یاد آیا۔ وہ یہیں پھسل گیا تھا اور ایسا برا پھسلا تھا کہ کئی دن تک کہنی سے درد نہیں گیا تھا۔ اسے لگا جیسے ابھی بھی شفا کمر پر ہاتھ رکھ کر وہیں کھڑی اس سے جھگڑا کررہی ہو۔

"ناشتا بنوانا تھا تو صاف کہہ دیتے۔ اتنا ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"او ہیلو۔ احسان جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تو نہیں کہا تھا تم خود ہی بنانے لگ گئیں تو اب اتنا اکڑ کیوں رہی ہو۔" تقی نے تب کہا تھا۔

"ایک تو میں نے بنا کے تمہارا ناشتا بنایا اور تم احسان بھی نہیں مان رہے' الٹا اکڑ رہے ہو۔" وہ ناک چڑھا کر کہتی تھی۔

"ایسی بات ہے تو جب تک ہم ساتھ رہیں گے ایک دوسرے کے لیے کوئی کام نہیں کریں گے۔"

"اور ہر کام برابری کی بنیاد پر ہو گا۔ ایک دن گھر کی صفائی میں کروں گی' ایک دن تم۔ ایک دن کچن تم صاف کرو گے' ایک دن میں۔"

اور جب تقی نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تو کیسے اس نے تیل گرا کر نہ صرف اس سے بدلہ لے لیا تھا بلکہ کام کرنے پر راضی بھی کرلیا تھا۔

اور وہ دن... جب شفا پہلی بار اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھی تھی۔ تقی یاد کرکے ہنس دیا۔ کتنی زور سے چیخی تھی وہ۔

"اسی لیے تم سے کہہ رہی ہوں آہستہ چلاؤ۔ عمیر بھائی تو مجھے پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ تم کہیں گرا ہی نہ دینا۔"

"گرانے کی گارنٹی نہیں ہے' البتہ پیچھے تمہیں

نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی گارنٹی دے سکتا ہوں۔"
اس وقت یہ بات کہہ کر تقی نے رفتار بڑھادی تھی لیکن اب وہ بات یاد کرکے خفیف سا ہو گیا۔ چھوڑ تو آیا تھا۔

عجیب لڑکی تھی۔ اسے اپنے رشتے کی کبھی پروا نہیں رہی۔ ہمیشہ اس فکر میں رہتی کہ تقی اور مہک کے رشتے میں دراڑ نہ آئے۔ جب موقع ملتا اسے سمجھاتی۔ اس روز بھی جب تقی اسے اپنا پہلا بل بورڈ دکھانے لے گیا تھا۔ وہ اسے مہک کو بتانے ' اسے اہمیت دینے کی تلقین کرتی رہی۔

"تم نے مہک کو بتایا؟" تقی نے نفی میں سر ہلادیا تھا۔

"تمہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ تمہاری کامیابی کا سن کر خوش ہوتی۔"

"صبح بتادوں گا۔ مجھے دراصل خیال ہی نہیں آیا۔ پہلا خیال تمہارا آیا تھا تو تمہیں ہی بتادیا۔"

"لیکن تمہیں سب سے پہلے اسے ہی بتانا چاہیے تھا۔ لڑکیاں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت اہم سمجھتی ہیں۔"

"اس لیے کیونکہ لڑکیاں بدھو ہوتی ہیں؟"

"جی نہیں۔ اس لیے کیونکہ لڑکیاں بہت حساس ہوتی ہیں۔" شفا نے اس سے زیادہ زور دے کر کہا تھا۔

"میں نے سب لڑکیوں کا کیا کرنا ہے۔ میرے لیے ایک مہک ہی کافی ہے۔"

"اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ ہر چیز کو اپنی لاپروائی کی نذر مت کرو۔ خیال رکھا کرو اس کا۔" کتنی فکر تھی اس کے لہجے میں۔

اور پھر ان دونوں کے جھگڑے ' جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔

"شام کی چائے کون بنائے گا؟"

"چائے تو میں ہی اچھی بناتا ہوں۔ لیکن چلو۔ تم بھی کیا یاد کروگی۔ میں آج تمہیں موقع دیتا ہوں۔"

"زیادہ سرمت چڑھو۔ چار روز سے میں ہی بنا رہی ہوں۔ آج تمہاری باری ہے۔"

"پہلے تم حلف اٹھاؤ کہ دوبارہ میری چائے کی برائی نہیں کروگی۔"

"خدا کو مانو تقی! میں خود پر ظلم کرتے ہوئے تمہاری بنائی ہوئی چائے پینے پر راضی ہو جاتی ہوں۔ یہ ہی بڑی بات ہے۔ تم اس پر بھی حلف لینا چاہتے ہو؟"

یہ بات اور ایسی ہی کئی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد کرکے وہ مسکراتا رہا۔

"تم دیکھنا! تمہارا میاں سر پکڑ کر رویا کرے گا۔" اسے چڑانے کے لیے تقی اکثر پیشن گوئی کیا کرتا تھا۔

"تم میرے میاں کے غم میں ہلکان مت ہوا کرو۔ دیکھنا! وہ دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوگا۔" وہ بھی آگے سے اترا کر کہتی۔

"جب تم سے شادی ہو جائے گی تو خوش قسمتی کیسی۔ اس سے تو اچھا ہے ' وہ بدقسمت ہی ہو جائے۔" وہ قہقہہ لگاتا۔ شفا بری طرح چڑ جاتی۔

"میں غلط کہتا تھا شفا! تمہارا شوہر واقعی دنیا کا خوش قسمت انسان ہوگا۔" وہ دل ہی دل میں اسے مخاطب کرکے بولا تھا۔

"تقی!" امی کی آواز پر وہ چونک کر ان یادوں سے نکل آیا۔ گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔

"مجھے نہیں پتا' شفا کو واپس لے کر آؤ۔ یہ گھر اس کا ہے یہاں وہی رہے گی۔" وہ آنکھوں میں آنسو لیے بچوں کی طرح کہہ رہی تھیں۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

رضیہ مہدی

محبت کا ہنر

ناولٹ



ماہ نور کو احساس ہو رہا تھا کہ ممی (اس کی ساس) کچھ پریشان ہیں۔ وہ بہت دیر سے ان کی بے چینی نوٹ کر رہی تھی۔ وہ کبھی اِدھر آ رہی تھیں۔ کبھی اُدھر جا رہی تھیں اور ان کا چہرہ خلاف معمول ان کی بے چینی کا غماز بنا ہوا تھا' مگر وہ جاننے کے باوجود ان سے کچھ پوچھنے کی جسارت نہیں کر سکی' کیونکہ اب دو سال ہو رہے تھے اسے اس گھر میں' اور وہ بخوبی جانتی تھی کہ ممی اس کا کچھ پوچھنا بھی پسند نہیں کریں گی۔

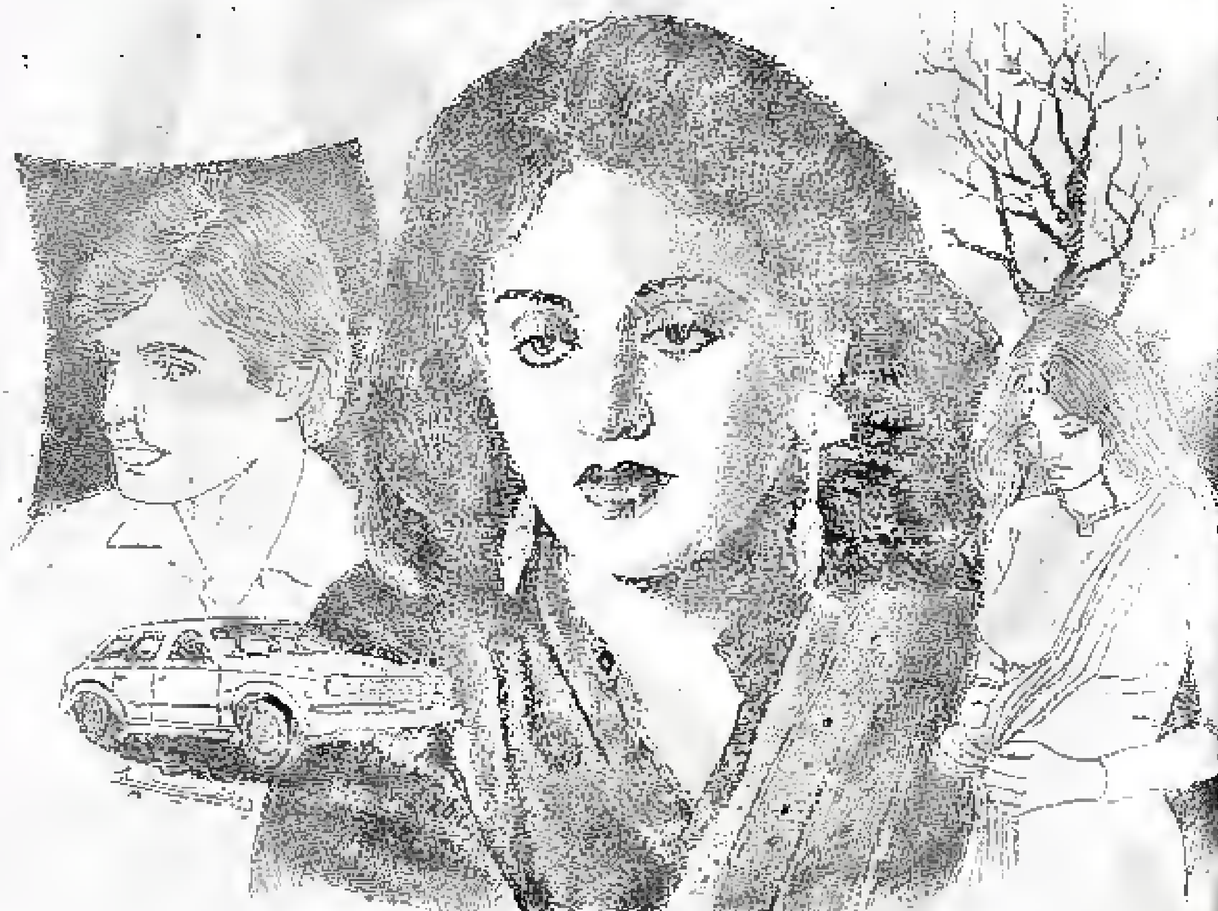
جب کافی دیر ہو گئی اور معاملہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آ گئی' اس کا موڈ خود آپ سیٹ سا ہو گیا تھا کیونکہ سسرال میں خود کو اچھی طرح ایڈجسٹ کرنے کی کوشش میں اس نے اپنی طبیعت میں کافی حد تک ٹھہراؤ کا سبق رچا بسا لیا تھا' مگر پھر بھی کبھی کبھی جی چاہتا تھا کہ اجنبیت کی نادیدہ

دیواروں کو گرا دے۔ گھر میں صرف وہ پانچ افراد ہی تو تھے یعنی وہ بابر ممی اور بابر کی چھوٹی بہن صبا اور سب سے چھوٹا بھائی ہمایوں' مگر ماہ نور کو لگتا کہ شاید یہاں کوئی بھی نہیں رہتا جبکہ اس کے اپنے گھر میں تو صرف چار ہی افراد تھے یعنی وہ اس کی امی' بابا اور دادی' مگر کیسی رونق رہتی تھی گھر میں۔

اسے لگتا تھا کہ یہ ساری رونق اس کے بابا کے دم سے تھی' وہ زندگی گزارنے کے قائل نہیں تھے وہ شان سے جیو کے قائل تھے اور جیو اور جینے دو' خوش

نکال لیتے تھے۔ وہ نرم اور مدلل بولتے تھے' مگر طرح طرح کی کہانیاں قصے انہیں آتی تھیں۔ فلم' آرٹ' کلچر سے دلچسپی حد سے زیادہ تھی۔

ماہ نور کو یقین تھا یہ ساری عادتیں انہوں نے دادی سے لی ہیں۔ دادی بھی لوگوں میں خوش رہتیں اور اس کی امی وہ اگرچہ انگلش میں ایم اے تھیں' مگر اب مکمل خانہ دار عورت نظر آتی تھیں۔ جنہیں ماسی کے ہاتھ کا کام پسند نہیں تھا سو سردی' گرمی ہو یا برسات۔ رات ہو یا دن وہ ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں الجھی نظر آتی تھیں



رہو اور خوش رکھو کہ وہ جنوں سبق سامنے والے کے ذہن نشین کرانے میں انہیں بس دو چار منٹ ہی لگتے تھے۔ وہ کھانے کھلانے کے شوقین' ہر ایک کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے' سو ان کے دوست بہت تھے۔ ہر عمر کے دوست حالانکہ بینک کی نوکری جس میں جانے کا وقت طے تھا' مگر آنے کا کبھی بھی مقرر نہ ہو سکا' اس کے باوجود وہ جانے کیسے سب ہی چیزوں کے لیے وقت

البتہ وہ یہ سب کچھ خوشی خوشی کرتی تھیں۔ ماہ نور نے کبھی کسی مہمان کی آمد پر ان کا منہ بنا ہوا نہیں دیکھا۔ وہ شوق سے پکاتی کھلاتی تھیں' تب ہی تو روایات اپنی پوری آن بان سے اس کے گھر میں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ ماہ نور کی دوستوں کو اس کے گھر میں بہت مزا آتا تھا وہ بڑے شوق سے آتی تھیں اور آنٹی سے فرمائشیں کر کر کے پکواتی تھیں۔

یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ امی کچن خود ہی سنبھالتی تھیں اگرچہ تین ماسیاں بھی گھر کے دوسرے کاموں کے لیے آتی تھیں اس کے علاوہ ایک لڑکی صبح سے رات تک ان کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ ان کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت تھا' بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ وہ امی سے زیادہ نئے نئے تجربے کرتی رہتی تھیں اور زیادہ اہتمام سے ناشتہ' لنچ اور ڈنر پیش کیا جاتا تھا۔ بس مہمان یہاں کم کم آتے تھے۔ صبا اس کی نند میڈیکل پڑھ رہی تھی۔ وہ اپنی ذات میں مگن لڑکی تھی' اس کی پڑھائی اسے مصروف رکھتی یا اس کا سیل فون اس سے ماہ نور کی ملاقات کم کم ہی ہو پاتی تھی۔

ہمایوں صبا سے چھوٹا تھا اور ایم بی اے کر رہا تھا۔ اس کی مصروفیات بھی بہن ہی جیسی تھیں' البتہ اس کے دوست بہت تھے' اور اسے پڑھنے کے ساتھ ساتھ گلوکار بننے کا شوق بھی تھا وہ ایک بینڈ سے وابستہ تھا اور کبھی کبھی وہ سب لوگ اس کے کمرے میں پریکٹس بھی کر رہے ہوتے تھے مگر گھر والوں کے لیے اس کے پاس بھی وقت نہیں تھا اور بابر کے پاپا انہیں تو ماہ نور گھر کا فرد ہی نہیں سمجھتی تھی کیونکہ وہ سال کے گیارہ مہینے شہر بلکہ ملک سے باہر رہتے تھے۔

ماہ نور کو بابا اچھے لگتے تھے وہ کم گو تھے مگر جب بولتے تھے تو اچھا لگتا تھا' وہ اپنے گھر میں بھی تو بابا سے زیادہ قریب تھی' بلکہ اس کی امی تو کبھی کبھی شکوہ بھی کرتی تھیں کہ اتنی دعاؤں سے مانگی گئی بیٹی ان کے بجائے اپنے بابا کے زیادہ قریب تھی۔

یہ واقعہ اس کی دادی بھی مزے لے لے کر سناتی تھیں کہ وہ جب دنیا میں آئی تو اتفاق سے اس کے بابا کو کسی ضروری میٹنگ کی وجہ سے آنے میں کچھ دیر ہو گئی وہ روتی ہوئی پیدا ہوئی جیسے کہ عموماً" بچے دنیا میں آتے ہیں مگر اس کا رونا اس وقت تک جاری رہا جب تک وہ بابا کی گود میں نہیں پہنچ گئی۔ بابا نے اسے گود میں لیا تو وہ آنکھیں موند کر اطمینان سے سو گئی' بابا کو دادی نے اس کے رونے کا احوال بتایا تو وہ اسے لپٹائے بیٹھے رہے اور جوں ہی امی کے پہلو میں لٹایا وہ پھر سے رونے لگی' وہ امی کے پاس بھی چپ نہیں ہوتی تھی' ہمیشہ بابا کے سینے پر سوتی تھی بعد میں وہ امی اور دادی کے پاس بھی رہنے لگی مگر امی اور دادی اس کے دنیا میں آنے اور رونے کا قصہ اکثر دہراتی تھیں۔

وہ بڑی منتوں' مرادوں سے شادی کے بارہ سال بعد دنیا میں آئی تھی سو دادی امی اور بابا کی آنکھ کا تارہ بنی رہی محبتوں نے اس کے اخلاق و کردار کو سنوار دیا سب عزیز رشتے دار ملنے جلنے والے سب اسے پیار کرتے تھے وہ تھی بھی تو نازک' خوب صورت اور اپنے بابا کی لاڈو۔

اس کو بابا سے جو محبت تھی اس سے کہیں زیادہ وہ اس کو چاہتے تھے کوئی فرمائش سچ تھا کہ زبان سے نکلی نہیں کہ پوری ہوئی نہیں۔ وہ اپنے بابا کی توقعات پر ہمیشہ پورا اترنا چاہتی تھی' سو جو وہ چاہتے تھے اس نے من و عن وہی کیا' بابا ہمیشہ سے انجینئرنگ پڑھنا چاہتے تھے اس کا این ای ڈی میں ایڈمیشن ہو گیا تھا کہ دادا ابو کے ایکسیڈنٹ میں موت نے ان کی زندگی کی گاڑی کو ریورس گیئر لگا دیا' انہوں نے اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹ دیا اور اپنی پڑھائی جاب کر کے جیسے تیسے مکمل کی مگر انہیں اپنی قربانی کا صلہ بہت اچھا ملا وہ بینک کی ملازمت کے حصول میں نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ کامیابی کے زینے تیزی سے چڑھتے چلے گئے ان کی محنت اور ان کا اخلاق ان کی ذہانت کے ساتھ ساتھ قسمت نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا۔

ماں کی دعائیں ساتھ رہیں تو خانگی زندگی بھی پرسکون رہی بس ایک اولاد کا خانہ خالی تھا' جسے ماہ نور نے آکر پُر کر دیا۔

ماہ نور نے جب پڑھنا شروع کیا تو اس کا رزلٹ ہمیشہ والدین کو خوش کرتا آیا وہ زینہ بہ زینہ شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتی گئی۔ امی چاہتی تھیں وہ میڈیکل پڑھے خود اس کا بھی رجحان تھا مگر جب بابا نے اپنی ناتمام آرزو کا ذکر کیا اس نے وہیں بائیولوجی (Biology) کو بائی بائی کیا اور اپنا رخ انجینئرنگ کی طرف موڑ لیا اور شاید قدرت کی طرف سے بھی یہ ایک اشارہ تھا کہ بابر اور ماہ نور کی ملاقات بھی انجینئرنگ یونیورسٹی ہی میں ہوئی تھی۔ وہ ماہ نور سے دو سال سینئر تھا اور اس کی طرح سول (civil) میں بی ای کر رہا تھا۔ پوری یونیورسٹی میں اس کی ذہانت اور قابلیت کی دھوم تھی اور ماہ نور بھی بہت سے اور جونیئرز کی طرح اس کی بھرپور شخصیت' اس کی ذہانت اور پروقار انداز سے متاثر ہوئی۔

بات صرف یہیں تک محدود نہیں رہی بلکہ ایک اتفاقی حادثے نے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔

شہر کے حالات جو دن بدن خراب سے خراب تر ہو رہے ہیں اس میں زندگی رُکتی ہے نہ کار زندگی' سب کچھ ہوتا ہے کرنا پڑتا ہے البتہ خوف' ڈر جسم و جاں کی ساری توانائی نچوڑے رکھتے ہیں۔ معمول کے مطابق شروع ہوا دن اختتام پذیر ہوتے ہوتے جانے خوف و دہشت کی کتنی ہی داستانیں رقم کر جاتا ہے کوئی نہیں جان سکتا۔ وہ دن بھی معمول کے مطابق ہی شروع ہوا تھا۔ ماہ نور کا اس دن کوئی ٹیسٹ تھا وہ اپنے پوائنٹ میں بیٹھی مطالعے میں محو تھی یوں اسے بروقت احساس ہی نہ ہو پایا کہ آج دہشت گردوں کا نشانہ اس کا پوائنٹ ہے۔ فائرنگ شدید تھی گولی ماہ نور کے بازو کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی مگر فائرنگ کی دہشت ناک آوازوں اور گاڑی میں موجود لڑکے لڑکیوں کی چیخوں سے دہل کر اسے لگا کہ اس کا دل ہی بند ہو گیا ہو وہ بے ہوش ہو کر لڑھک گئی تھی۔

جب بس آگے بڑھی تو کسی کی نظر بے ہوش ماہ نور پر پڑی اس کا زرد چہرہ اس میں زندگی کے آثار دور کر رہا تھا یونیورسٹی قریب تھی۔ بدحواس ڈرائیور یونیورسٹی جیسے تیسے پہنچ گیا بابر اس وقت وہاں پہنچا تھا ماہ نور کو جلدی جلدی دوسری دو زخمی لڑکیوں اور ایک لڑکے کے ساتھ گاڑی میں ڈالا گیا۔

اسپتال میں گزرے وہ چار چھ روز ماہ نور کی زندگی میں دبے پاؤں کسی کی آمد کا سبب بن گئے۔ وہ بابر کے پرخلوص انداز اور اپنے لیے اس کے چہرے پر پریشانی دیکھ کر اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ بابر کو بھی وہ ایک زخمی چڑیا سی لگی اور اس کا دل بھی ایک اور ہی لے پر دھڑکے گیا یوں دونوں ہی کو کیوپڈ نے اپنے نشانے پر رکھ لیا۔

بعد میں گو کہنے سننے کی کسی کو جیسے ضرورت ہی نہیں رہی وہ دونوں جب بھی سامنا ہوتا کچھ نا کہنے پر بھی سب کچھ کہہ جاتے۔

بابر بی ای کے بعد انگلینڈ چلا گیا اور جب وہاں سے ایم ایس کر کے آیا تو ماہ نور بھی اپنی پڑھائی مکمل کر چکی تھی۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی مگر ان ہی دنوں اس کے گھر رشتوں کی لائن سی لگ گئی۔

خاندان میں بھی کافی لوگ دلچسپی لے رہے تھے اور باہر سے بھی رشتے آ رہے تھے۔ ماہ نور بہت الجھن میں تھی وہ ڈر رہی تھی کوئی امی بابا اور خاص طور پر دادی کو پسند نہ آجائے۔ اس کے اندر سے سوال ابھرتا اور جو پسند آگیا تو؟

"پھر کیا! چپ چاپ ڈولی چڑھ جانا۔"

اندر دل شور مچانے لگتا "نہیں' نہیں۔"

"کیوں شادی نہیں کرنی کیا؟" وہ دل کو ڈپٹ دیتی۔

"کرنی تو ہے کرنی پڑے گی۔" اس کے لیے بھی امی دادی اور خاص طور پر بابا کو چھوڑ کر جانا کہاں آسان تھا مگر دادی سمجھاتی آئی تھیں۔ خود اپنے دل میں بھی امنگیں سر اٹھاتی تھیں مگر کوئی ایسا ضرور تھا جو خواب دیکھنے سے پہلے اس کی آنکھوں سے نیند اور نیند سے خواب چرا رہا تھا۔

وہ خود سے بے نیاز رہنے لگی تھی' حالانکہ پہلے اسے سجنے سنورنے کا شوق تھا۔ شہر کی ہر اچھی بوتیک کے چکر لگانا ضروری تھا' کہاں کیا نیا ہے دوستوں کے درمیان ہاٹ ٹاپک رہا کرتا تھا۔ لپ اسٹک کے ہر نئے کلر کی دریافت وہ ہی کرتی تھی اور ڈریسنگ میک اپ کے جدید اور خوب صورت سامان سے ہمیشہ سجی ہی پائی

جاتی تھی۔ یکایک جیسے وہ ہر چیز سے بے نیاز و بے زار ہو گئی۔

گھر میں آنے والے مہمانوں سے بھی اسے چڑ سی ہونے لگی۔

"یہ کیا تک ہے، جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آرہا ہے۔" امی اور دادی اس کے بدلے بدلے انداز دیکھ رہی تھیں۔ بابا بھی پریشان تھے۔

"کیا بات ہے یوں ہماری لاڈو گم صم سی کیوں رہنے لگی ہے؟" وہ امی سے پوچھتے۔

"پتا نہیں شاید گھر میں ہونے والی ہماری باتوں سے پریشان ہو گئی ہے۔"

"ظاہر ہے گھبرا تو رہی ہو گی۔ ابھی بہت چھوٹی ہے ابھی سب کو منع کر دو۔ ہمیں اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنی ہے۔"

ان ہی دنوں بابر کا میسج آیا۔

"کیسی ہو؟"

اسے پتا نہیں کیا ہوا وہ جواب ہی نہ دے پائی۔

"نور! تم ٹھیک ہو؟" دوسرا میسج سامنے تھا۔

"پتا نہیں۔" وہ بس یہ کہہ سکی۔

"تمہیں پتا نہیں کہ تم ٹھیک ہو یا نہیں تو میں بتاتا ہوں کہ تم ٹھیک نہیں ہو تم اچھی ہو بہت اچھی۔"

"اور تم برے ہو، بہت برے۔" اس نے جواباً لکھا۔

یوں دونوں کے درمیان میسج میسج کا کھیل شروع ہو گیا جس کا اختتام یوں ہوا کہ ایک دن بابر کا میسج آیا کہ شام میں میری می اور پاپا آرہے ہیں تمہارے گھر۔

اس اچانک اطلاع پر وہ بوکھلا گئی مگر امی کو بتانا پڑا۔

"کون؟ کیوں؟ کس لیے؟" کے جواب میں اس کی ایک شرمیلی مسکراہٹ نے انہیں بہت کچھ بتا دیا۔

پھر جانے امی نے سب کچھ کیسے سنبھالا مگر شام کی چائے پُر لطف رہی۔ امی اور دادی بابر کی می کے رکھ رکھاؤ سے متاثر ہوئیں تو بابا کو اس کے پاپا کے دلنشیں انداز گفتگو نے موہ لیا اور امی بابا اور دادی تینوں کو بابر بہت پسند آیا۔

"بولتا ذرا کم ہے ہماری گڑیا ہی وہاں چہکتی رہے گی۔" دادی نے کہا۔

اب ماہ نور دادی کی یہ بات یاد کر کے کڑھتی رہتی تھی، وہ واقعی نہیں بولتا تھا۔ اس کے بار بار متوجہ کرنے پر بھی ہوں ہاں نہیں سے زیادہ نہیں اور وہ اندر تک جل جاتی تھی۔ بھلا کوئی دیواروں سے بھی باتیں کر سکتا ہے۔

"ماں کا چہیتا لگتا ہے جیسی ہماری چہیتی۔" اس کے بابا کا تبصرہ تھا۔

جو سو فیصد درست نکلا، وہ اتنا چہیتا تھا کہ ماں اس کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں اور دیکھتے ہی رہنا چاہتی تھیں نتیجہ یہ نکلا تھا کہ شام سے رات گئے تک وہ گھر کے لاؤنج یا ڈائننگ ٹیبل یا پھر اپنی ماں کے بیڈ روم میں ماں کے سامنے ہی بیٹھا رہتا۔ ماہ نور نیند سے جھومنے لگتی تو خود اپنے بیڈ روم میں آجاتی تھی اور کبھی کبھی چڑ کر سو بھی جاتی تھی یا سوتی بن جاتی تھی مگر اس پر اثر ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ ابھی تک اپنی می کے اشاروں کا منتظر رہتا تھا۔

"مجھے تو بہت ذمہ دار اور اپنی فیملی کے ساتھ کمیٹڈ لگتا ہے۔" یہ امی کا خیال تھا اور ماہ نور سوچتی ایک ہی ملاقات میں امی نے کیسا درست اندازہ لگایا۔ بابر ایسا ویسا کمیٹڈ تھا اپنے گھر والوں سے، وہ سب کا دوست سب کا راز دار سب کے قریب تھا۔ ماں کی تو خیریات ہی کیا تھی، صبا (بہن) کو کہیں آنا ہے جانا ہے۔ شاپنگ کرنی ہے یا یونہی گھنٹوں آپس میں بحث مباحثہ کرنا ہے۔

بابر ہی کے ساتھ سب کچھ ہوتا تھا می کے لیے ڈاکٹر سے ٹائم لینا انہیں دکھانا ان کے مسلسل خاندانی معاملات پر تبصروں کو بغور سننا بابر کے پاس ان کے لیے بھی وقت ہی وقت تھا۔ یہی نہیں ہمایوں (چھوٹے بھائی) کے دوستوں تک کا خیال رکھنا۔ اس کی پڑھائی سے متعلق مسائل سے آگاہی اس کی گائیکی میں ذوق و

شوق سے ساتھ دینا۔

"ارے گا نہیں سکتا سن کر داد تو دے سکتا ہوں نا!" وہ مسکرا کر کہتا۔

اور ماہ نور سوچتی امی جی آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ بابر اپنی پوری فیملی سے بہت جڑا ہوا ہے وہ ہر ایک کے قریب ہے بس ایک بیوی کے۔۔۔

ماہ نور کے گھر والوں کو اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں بالکل دیر نہیں لگی کیونکہ ان دنوں ماہ نور کا چہرہ اندر کی خوشی سے ایک الگ ہی چھب دکھاتا محسوس ہوا وہ اس کی پژمردگی گم صم رہنا سب اڑن چھو ہو گیا وہ خوش تھی خوش نظر آرہی تھی چاہنے والے ماں باپ اور لاڈ کرنے والی دادی کو اور کیا چاہیے تھا۔



اپنی ساس کے مزاج کا اندازہ تو ماہ نور کو شادی کی شاپنگ کے دوران ہی ہو گیا تھا مگر ان دنوں اس پر محبت فاتح عالم کا اتنا زبردست پہرا تھا کہ وہ اور کچھ سوچنا سمجھنا چاہتی ہی نہیں تھی، راتوں کو دیر تک خوابوں اور بہاروں کی باتیں کرتے اور سنتے ہوئے وہ سو بھی جاتی تو جسے دھنک کے ساتوں رنگ اس کے ارد گرد بکھرے ہوتے اور وہ اس کے ساتھ بادلوں کی سیر کو نکل جاتی تھی۔

ماہ نور کو پاپا اچھے لگتے تھے خاص طور پر ان کا دلنشیں انداز گفتگو، مگر وہ اول روز سے گھر میں گم صم ہی پائے گئے، مارکیٹنگ کی جاب تھی اور مسلسل سفر جاب کا تقاضا، ویسے وہ گھر میں رہتے بھی تو ماہ نور سے کبھی خود مخاطب نہیں ہوتے تھے، وہ خود کوئی بات کرتی تو اچھی طرح جواب دیتے تھے، حالانکہ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بابا کی طرح پاپا سے بھی خوب باتیں کرے اپنی ہر اچھی بری بات شیئر کرے۔

وہ لوگ ہنی مون پر بھی نہیں جا سکے جس دن انہیں جانا تھا۔ اس دن پاپا اچانک سیڑھیوں سے پھسل کر گر گئے۔ ان کی ٹانگ میں فریکچر ہو گیا اور سر میں بھی چوٹ آئی وہ چار دن اسپتال میں رہ کر گھر آگئے تب بھی انہیں ایک فل ٹائم تیمار دار چاہیے تھا جو انہیں اٹھائے بٹھائے باتھ روم لے جائے وہ فرماں بردار بیٹا تھا گو شادی کو صرف دس دن ہوئے تھے مگر وہ پاپا کی پٹی پکڑے بیٹھا رہتا تھا جبکہ ہمایوں دیر تک دوستوں میں رہتا اور وہ اپنے کمرے میں پڑی کڑھتی رہتی۔

شادی سے پہلے ہی ماہ نور کو ایک اچھی جاب مل گئی تھی اور اس نے ایم ایس کی بھی تیاری شروع کر دی تھی شادی کے بعد جب چھٹیاں ختم ہوئیں تو اس نے بابر کو بتایا۔

"کل مجھے آفس جانا ہے۔ کتنا مشکل لگتا ہے نا بہت دنوں بعد جانا۔"

"تم آفس جاؤ گی؟" بابر کا جملہ سوالیہ تھا۔

"ہاں تو چھٹیاں ختم ہونی ہی تھیں۔ کہیں گئے بھی نہیں اور چھٹیاں بس یونہی گزر گئیں۔" اسے اپنے ہنی مون پر نہ جانے کا ملال تو تھا ہی۔

بابر نے اس کی پوری بات نہیں سنی وہ پہلے ہی سوال پر رکا ہوا تھا۔ "تم نے می سے اجازت لی ہے۔"

"کس بات کی اجازت؟" وہ حیران تھی۔

"آفس جانے کی اور کس بات کی؟" اس کا لہجہ جھنجھلایا ہوا سا تھا۔

"نہیں۔" وہ بہت حیران تھی۔

"کیوں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"وہ جانتی تو ہیں کہ میں جاب کرتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہیں کہ چھٹیاں بہرحال چھٹیاں ہیں ختم ہو ہی جاتی ہیں۔"

"تم می سے جا کر پوچھو۔ تمہیں پوچھنا چاہیے۔"

"کیا پوچھوں؟"

"یہی جاب کے بارے میں پوچھو۔"

"میں نہیں پوچھوں گی کچھ بھی اگر تم سمجھتے ہو کچھ پوچھنا ہے تو جا کر پوچھ لو۔" وہ بابر کے انداز پر خفا ہو گئی تھی۔

"وہ پسند نہیں کریں گی میرا پوچھنا۔ تم جا کر انہیں

بتاؤ۔" وہ اس دفعہ بڑے رسان سے بولا۔

"وہ کیا منع کردیں گی مجھے؟" وہ پریشان تھی۔

"شاید' پتا نہیں۔" اس کا لاتعلق انداز وہ دکھی ہو گئی۔

"بابر! میں جاب نہیں چھوڑوں گی۔ میری مرضی کی جاب ہے میں نے بھی بہت محنت سے پڑھا ہے۔" وہ خاموش رہا تو وہ سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔

"اب صبا میڈیکل کر رہی ہے تو کیا وہ جاب نہیں کرے گی؟"

"صبا کا یہاں کیا ذکر۔" بابر کا لہجہ و انداز دونوں ہی بدل گیا۔

شادی کے بعد وہ پہلی مرتبہ یہ لہجہ اور یہ انداز دیکھ رہی تھی۔ وہ سہم گئی۔ پھر اسے ممی سے بھی بات کرنی ہی پڑی۔

خلاف توقع انہوں نے اس کی بات پر کوئی سخت رد عمل نہیں دکھایا۔ تھوڑی دیر چپ رہیں پھر بولیں۔

"کب جانا ہے تمہیں' کل؟"

"جی!" وہ بس یہی کہہ سکی۔

"گاڑی تو ڈرائیو کرلیتی ہو نا!"

"جی کرتی تو ہوں مگر......"

"مگر؟" انہوں نے سر اٹھایا۔

"آفس چندریگر روڈ پر ہے بہت بزی روڈ ہے میں وہاں نہیں لے جاسکتی گاڑی!"

وہ ہنسنے لگیں "کراچی میں سڑکیں صاف ملیں' یہ ممکن ہی نہیں' کرچکیں تم ڈرائیونگ۔" وہ خاموش رہی۔

"پہلے کیسے جاتی تھیں؟" وہ اب بھی مسکرا رہی تھیں۔

"ڈرائیور چھوڑتا تھا۔" وہ اپنی انگلیاں آپس میں الجھائے انہیں توڑ مروڑ رہی تھی۔

"ڈرائیور تو یہاں صبح صبا کو لے کر جاتا ہے۔ بابر کو ہمایوں کو بھی چھوڑنا ہوتا ہے۔ دیکھ لو۔"

وہ کسی اور کام کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

وہ اپنے کمرے میں آئی بابر کے پوچھنے پر بتایا تو وہ بولا

"دیکھا' ممی کتنی اچھی ہیں' تم بلاوجہ ڈر رہی تھیں۔"

صبح آفس جانا ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ گھر کی دونوں گاڑیاں مصروف تھیں مگر خیر اسے بابا نے گاڑی دی تھی' اگرچہ وہ آج تک رش والی جگہوں سے گھبراتی آئی تھی مگر قہر درویش برجان درویش اس نے خود اپنے آپ کو ہمت دلائی۔

"کچھ نہیں ہوتا میں لے جاؤں گی گاڑی۔" وہ خود کو سمجھا رہی تھی۔

ایک دفعہ ہمت پکڑی تو پھر واقعی وہ گاڑی آرام سے لے بھی گئی اور واپس بھی لے آئی۔ اس کا خود پر اعتماد مضبوط ہوا۔

رات میں جب بابر کو بڑے اشتیاق سے بتا رہی تھی تو دل میں تمنا تھی کہ وہ سراہے گا' ویسے ہی جیسے بابا سراہتے تھے اس کے پہلے قدم اٹھانے سے لے کر اس کی ڈرائیونگ سیکھنے تک مسلسل شاباشی ملتی رہی تھی

وہ اسے حوصلہ دیتے آئے تھے میری بیٹی بہت ٹیلنٹڈ ہے یہ تو بیٹا ہے میرا بیٹا۔" وہ اکثر اسی کو ہنس ہنس کر جتاتے تھے۔

بابر نے جیسے بالکل توجہ نہیں دی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ بابر کی بے توجہی پر بھی غور نہیں کیا وہ تو جب بابر نے مضحکہ آمیز لہجے میں کہا۔

"کیا بچوں کی طرح خوش ہو رہی ہو اب تم بڑی ہو جاؤ...... درجنوں لڑکیوں پورے شہر میں گاڑی دوڑاتی پھرتی ہیں اور میں تو دس سال کا بھی شاید نہیں تھا پاؤں تک نہیں ٹھیک سے پہنچتے تھے بریک اور ایکسیلیٹر پر تب سے چلا رہا ہوں گاڑی۔"

وہ جیسے سن سی ہو گئی۔ "درجنوں لڑکیاں' درجنوں لڑکیوں سے کیا تمہارا وہی رشتہ ہے جو مجھ سے ہے بابر" اس کے دل نے اندر ہی اندر کہا وہ بس اس پر ایک زخمی سی نظر ڈال کر خاموشی سے اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔

تب ہی دروازہ کھٹکھٹا کر ہمایوں اندر آیا۔

"بھابھی! ذرا اپنی گاڑی کی چابی دیں۔"

"کیوں خیریت؟" بابر نے پوچھا۔

"وہ بھابھی نے اپنی گاڑی صحیح پارک نہیں کی ہے۔ مجھے بھی گاڑی کھڑی کرنی ہے۔"

بابر یک دم زور سے ہنسا اور پرس کے ساتھ پڑی اس کی چابی اٹھا کر ہمایوں کو دے دی۔

وہ اپنا چہرہ موڑ کر دراز پر جھک گئی۔ بابر کی ہنسی نے اس کی آنکھیں نم کردی تھیں۔ اسے لگا یہاں اپنا پن نہیں ہے وہ اجنبی لوگوں میں رہ رہی ہے۔

"ایک تو بات بے بات تمہارا منہ بن جاتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد بابر جھنجلا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ممی کو اصول بہت پیارے تھے وہ رسم و رواج طور طریقے کو بہت اہمیت دیتی تھیں اس دن وہ سب کھانا کھا رہے تھے۔ وہ شاید غائب دماغی سے کھانا کھا رہی تھی یا اچانک آنے والی کھانسی وجہ تھی مگر اس کا برا حال ہو گیا۔ کوئی ذرہ شاید سانس کی نالی میں اٹک گیا تھا۔ وہ کھانس کھانس کر پریشان ہو گئی اور تیزی سے واش روم کی طرف دوڑی۔ بابر اس کے پیچھے پانی کا گلاس لے کر بڑھا۔

"تم بیٹھو!" ممی نے ہاتھ سے بابر کو روکا اور صبا کو کہا "تم پانی دو اپنی بھابھی کو۔"

وہ بمشکل اپنی سانس برابر کرکے پلٹ رہی تھی جب ممی صبا کو ڈانٹتی ہوئی ملیں۔

"ہمارے یہاں کبھی مرد یوں پانی لیے بیوی کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں۔ تمہیں اٹھنا چاہیے تھا۔"

ماہ نور کو ان کی تقریر دکھ دے گئی اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ شادی سے پہلے اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا تو بابا فوراً" اٹھ کر اس کی پیٹھ سہلانے لگے۔ امی اور دادی سب نے کھانا چھوڑ کر اسے سنبھالنا شروع کردیا۔ کوئی پانی دے رہا کوئی اوپر دیکھو پانی پیو' سمجھا رہا ہے اسے

سب کو یاد کرکے رونا سا آنے لگا۔ "اس میں عورت اور مرد کی کیا تخصیص جو قریب ہو وہ پانی دے دے۔" وہ الجھ رہی تھی۔

پھر تو یہ الجھن اس کی زندگی کا حصہ بن گئی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے اپنے گھر کی طرح وہ اپنے نئے گھر میں بھی سب کی باتوں میں شریک ہو اسے معلوم تھا وہ سب کے دل میں جگہ بنالے گی مگر کوئی موقع تو دے۔

زندگی ایک روٹین پر دوڑنے لگی وہ صبح صبح آفس نکل جاتی کبھی بابر سے پہلے اور کبھی بعد میں گھر میں داخل ہوتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ شادی سے پہلے اس پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی اور کچن سے تعلق بھی بس ایسا ویسا ہی تھا۔ بس کبھی کبھی وہ شوق میں کیک بیک کرتی تھی جو سب کو بہت پسند آتے تھے دراصل وہ جو کام بھی کرتی بڑی باریک بینی سے کرتی' اس کے آفس میں بھی سب کہتے کہ ماہ نور بہت ذمہ داری سے کام کرتی ہے اسے ہمیشہ پرفیکشن کا خیال رہتا ہے۔

شادی کے بعد وہ نئے رشتوں کی نزاکتوں کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے کچن کا رخ بھی خود ہی کیا' سچ بات تو یہ ہے کہ ممی نے رواجاً" بھی اس کا ہاتھ کھیر یا کسی اور میٹھے وغیرہ میں نہیں لگوایا تھا۔ مگر اسے اچھا نہیں لگتا تھا وہ آخر گھر کی بڑی بہو تھی' کچن میں آئی تو ممی کام کر رہی تھیں ان کے ساتھ اختری (ہیلپر لڑکی) تھی جو صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک رہتی تھی اور اوپر کے ڈھیروں کام اس کے سپرد تھے۔ ممی نے جتایا تھا کہ یہ لوگ پرانے کام کرنے والے ہیں۔ صبح کو جھاڑو پوچا اس کی ماں اور کپڑے بڑی بہن دھوتی تھی۔

اسے کچن میں دیکھ کر ممی نے پوچھا۔

"تم یہاں' کچھ چاہیے تمہیں؟"

"نہیں ممی! میں یہ دیکھنے آئی تھی کہ آپ آج کیا پکا رہی ہیں۔ میں کچھ آپ کی مدد کروں۔" اس نے ہمت کرکے کہہ ہی دیا۔

"نہیں' تم جاؤ۔ مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں اور یہ اختری ہے ناں۔" ان کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ

جیسے کسی نے اسٹاپ کہہ کر روک دیا۔

وہ کچھ دیر کھڑی رہی پھر واپس پلٹ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

"دیکھو' یوں خود کو الگ تھلگ کمرے میں بند رکھو گی تو پھر اس فیملی کا حصہ تم کیسے بنو گی؟" بابر آج اچھے موڈ میں تھا' اسے سمجھا رہا تھا۔

"میں اس فیملی کا حصہ ہوں ہی کہاں۔" وہ بڑے دکھ سے سوچ رہی تھی۔

"ممی بہت اچھی ہیں۔" بابر کے منہ سے روزانہ یہ جملہ سن سن کر وہ عادی ہو گئی تھی مگر اس وقت اسے بہت برا لگ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔

"میں سمجھتا ہوں نور! تم بہت خوش قسمت ہو' تم بتاؤ ہے کوئی اور لڑکی ایسی تمہاری دوست یا آفس کولیگ یا رشتے دار جس کی ایسی ساس ہوں' ممی نے تم سے کبھی کوئی کام کرنے کے لیے کہا نہیں ناں تم پر کوئی پابندی لگائی؟ نہیں ناں تم جو چاہو کرو' کھاؤ پیو' جیسے چاہو رہو کوئی ذمہ داری نہیں سونپی تمہیں' ہے نا!"

وہ جو تمنائی رہتی تھی۔ بابر کوئی بات کر کے کچھ اچھا برا شیئر کرے' اس کے ممی نامے سن کر بیزار سی ہو گئی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ سلسلہ جاری رہا تو وہ خود پھٹ پڑے گی۔

"میری ممی گریٹ ہیں۔ وہ ساس بنی ہی نہیں۔ بن ہی نہیں سکتیں۔ شی از آ پرفیکٹ مدر۔" اس کی برداشت کی حد ختم ہو رہی تھی اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خود کو صبر کی تلقین کرنے لگی۔

"کیا ہوا سو رہی ہو کیا؟" اس کی مسلسل چپ نے اسے اکتا سا دیا تھا۔

"نہیں سن رہی ہوں۔" وہ بمشکل خود کو بولنے پر آمادہ کر پائی۔

"تم بہت اچھی ہو نور! تم پر یہ پنک کلر سوٹ بھی بہت کرتا ہے۔" وہ اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ مگر ماہ نور ممی نامے سے بہت بور ہو چکی تھی' اسے اس کے التفات نے بھی کوئی خوشی نہیں دی۔

"پتا ہے نور! جب میں نے تمہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا تب بھی تم یہی کلر پہنے ہوئے تھیں' تم ان دنوں پنک پہنا بھی بہت کرتی تھیں اور جب لڑکے تمہیں پنکی اور باربی ڈول کہتے تھے تو آپ ہی آپ میرے اندر اشتعال سا آنے لگتا تھا' میرے جیسے لڑکے کے دل میں سب کی ٹھکائی کرنے کا خیال ان ہی دنوں آتا تھا۔" وہ ہنسا۔

وہ بھی ہنس پڑی۔ دل سے رنج و ملال کی گرد بدلی خود بخود چھٹنے لگی۔

"تم سے تو خیر کیا کہتا۔ خود پر بھی واضح نہیں تھا کہ یہ مجھے اتنا برا کیوں لگتا ہے' خود کو سمجھاتا اور سر جھٹک کر سوچتا مجھے کیا کوئی کسی کو کچھ بھی کہے۔ مگر جب تم زخمی ہوئیں اور تمہارے زرد چہرے پر میری نظر پڑی تو مجھے خود بخود معلوم ہو گیا کہ۔۔۔" وہ رکا۔

"کیا؟" وہ اب مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"میں گیا۔" وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اور اپنا دوسرا ہاتھ دل پہ رکھتے ہوئے بولا۔

"پھر جب تمہارے قریب ہوا تو تمہاری معصومیت نے مجھے ایسا گھیرا کہ۔"

"کہ!" اب وہ بھی احساس کی گرمی سے پگھل رہی تھی۔

بابر شرارت کے موڈ میں تھا۔ اسے اس کی خمار آلود آواز بتا رہی تھی۔ وہ اس محبت کی مقناطیسیت کی کشش سے خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی کہ دروازے پر ہونے والی ٹھک ٹھک نے دونوں کو حصار محبت سے باہر کھینچ لیا۔

"کون؟" بابر کو اس وقت کی مداخلت ذرا نہیں بھا رہی تھی۔

"میں ہوں صاحب اختری۔ بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں آپ کو۔"

"ممی بلا رہی ہیں!" وہ جیسے کود کر بیڈ سے اترا۔

ماہ نور کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ وہ سر منہ لپیٹ کر مڑ گئی۔

تھوڑی دیر بعد اختری آئی اس کو بلانے تو وہ سوتی بن

گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"نور! تمہیں ہو کیا رہا ہے بیٹا! خود سے اتنی بے نیازی بھی ٹھیک نہیں' تم تو کبھی ایسی خود سے لاپروا نہیں رہیں۔" وہ تھوڑی سی دیر کے لیے امی کے پاس آئی تو انہوں نے اس کا بکھرا بکھرا وجود دیکھ کر پریشانی سے کہا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں امی!" اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"کہاں ٹھیک ہو۔ کوئی الجھن ہے تو مجھے بتاؤ۔ تم یہیں قریب ہی رہتی ہو۔ دنوں تمہاری شکل کو ترستے ہیں ہم لوگ۔ کیا کوئی پابندی ہے تم پر' مسئلہ کیا ہے؟" وہ اس کے بہت قریب بیٹھ گئیں۔

اس کا بھی جی چاہا کہ امی کی گود میں سر رکھ کر سو جائے مگر اس کی آنکھیں بھید کھولنے پر تل گئیں اور نم آنکھوں نے امی کو اور بھی زیادہ پریشان کر دیا۔

"نور بیٹا! بتاؤ' اپنی ماں کو اپنی پریشانی بتاؤ۔"

تو اس سے نہیں رہا گیا۔ وہ بتاتی چلی گئی۔ ممی کے رویے سے لے کر بابر کی نصیحتوں تک سب کچھ اس کی باتوں کے جواب میں اس کی سمجھ دار ماں نے اپنے احساسات کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ میں چھپا کر اسے تسلی دی۔

"تم نے تو مجھے پریشان کر دیا تھا۔ بابر ٹھیک کہتا ہے یہ مسائل کوئی مسائل ہیں۔ میری بچی! وہ ایک الگ گھر الگ دنیا ہے۔ تمہیں ان کے مزاج سمجھنے ہوں گے وہ تھوڑی آگے بڑھ کر تمہاری مشکل سمجھیں گے تم ان کے گھر گئی ہو۔ میری پیاری بیٹی! آگے بڑھ کر دوست بناؤ اور تم ایسا کر لو گی تم سے بھلا کوئی کہاں تک دور رہ سکتا ہے۔ اپنی نند کو دوست بناؤ۔ وہ تو تمہاری ایج گروپ کی ہے۔ دیور کے مشغلوں میں دلچسپی لو۔ اس سے بات چیت کیا کرو اور ہاں کتنے دن سے پارلر نہیں گئی ہو تم۔ ایک چکر لگاؤ وہاں کا۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ تمہارا چہرہ بہت ڈل ہو رہا ہے۔"

وہ بھی مسکرانے لگی بلاوجہ امی کو پریشان کرنے کا کیا فائدہ تھا۔

☼ ☼ ☼

امی نے سمجھایا تھا کہ وہاں دل لگانے کی کوشش کرو تمہاری نند تمہاری عمر کی ہے اس سے بات کیا کرو بیٹا بات چیت سے اجنبیت کی دیوار گرتی ہے۔ اتفاق سے دوسرے دن وہ آفس سے آئی تو سامنے ہی صبائی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" اس نے ایک دوستانہ مسکراہٹ چہرے پر سجا کر پوچھا۔

"کچھ ایسا خاص نہیں۔ آپ کو دیکھنا ہے؟" اس نے ریموٹ آگے کیا اور اپنی شرٹ ٹھیک کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ماہ نور ریموٹ پکڑے حیرانی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ کیا واقعی صبا یہ سمجھی ہے کہ مجھے ٹی وی دیکھنا ہے مگر وہ یہ کیسے سمجھ سکتی ہے۔ اس کا ذہن ذرا بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

امی نے شاید بابا کو بھی ماہ نور کی مشکلیں بتا دی تھیں تب ہی تو ان کا روز کوئی نا کوئی ایسا میسج آجاتا تھا۔

"اہم یہ نہیں ہے کہ زندگی کے کھیل میں ہمیشہ آپ کے پاس اچھے پتے ہوں۔ اہم بات یہ ہے کہ آپ کے پاس جو پتے ہیں آپ ان سے کیسا کھیلتے ہیں۔"

"میرے پیارے بابا میں کہاں کھیل رہی ہوں اچھا برا تو جب ہو جب کوئی کھیلنے دے میں تو بس منجمد کھڑی ہوں اپنی سسرال کے دروازے پر کوئی ہاتھ بڑھا کر اندر نہ کھینچے مگر راستہ تو دے۔"

وہ کیا کہتی مگر تھوڑی محتاط سی ہو گئی تھی بلاوجہ اس کے ماں باپ پریشان ہو رہے تھے وہ جب دوبارہ گئی تو اپنے ڈریس کا خیال رکھتے ہوئے شوخ لپ اسٹک بھی لگالی۔

امی اسے دیکھ کر خوش ہوئیں اسے سراہا بھی یہ

الگ بات کہ کپڑوں' میک اپ کے باوجود انہیں ماہ نور کے اندر چھپی اداسیاں اس کے جانے کے بعد دیر تک پریشان کرتی رہیں۔

اس کا چپ چاپ مغموم سا رہنا اب اس کے آفس کے ساتھی بھی محسوس کر رہے تھے۔ اس دن تو حد ہو گئی اسے کسی کام سے سر احمر کے آفس جانا پڑا وہ ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ تھے اور بڑے خاموش طبع انسان تھے عموماً" ان کا رویہ محتاط ہی ہوتا تھا مگر انہوں نے چونک کر ماہ نور کو دیکھا۔

"خیریت کچھ طبیعت خراب ہے آپ کی آج کل؟"

"جی' جی ہاں' جی نہیں۔" اس سے کوئی بات ہی نہ بن پائی۔

☼ ☼ ☼

بابر کی پھوپھی سعودیہ میں رہتی تھیں۔ وہ ماہ نور کی شادی میں آئی تھیں تو اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اسے وہ سادہ سی خاتون بہت اچھی لگی تھیں۔ بہت نرم نرم بولتی تھیں اور ان کے انداز میں ماہ نور کو اپنائیت سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ آج کل آئی ہوئی تھیں۔ اپنی سسرال میں کسی شادی کو اٹینڈ کرنے کے لیے۔ یہ ماہ نور نے سنا تھا مگر اسے ان کے اس پروگرام کا بالکل علم نہیں تھا کہ ممی نے ان کی دعوت کی ہے اور ان کے ساتھ ساتھ اور قریبی عزیزوں مثلاً" بابر کی تائی اور چچی کے گھر کو بھی مدعو کیا ہے۔ وہ تو حسب معمول اپنے آفس گئی تھی۔ واپسی میں اسے گھر بھرا ملا۔

بابر کی تائی اسے شروع ہی سے بڑی سخت مزاج سی لگی تھیں۔ انہوں نے اس کے سلام کے جواب میں فوراً" ہی پوچھا۔

"یہ تم اب آ رہی ہو آفس سے!" انہوں نے گھڑی دیکھی۔

"بھابھی تو روز تقریباً" اسی وقت گھر آتی ہیں۔" یہ صبا تھی۔

وہ کچھ نہ کر کے بھی چور سی بن گئی۔ وہاں کون سننے پر تیار تھا۔ کس کو بتاتی کہ اب دفتروں میں جانے کا ٹائم تو ہے وہاں سے واپسی کا ٹائم نہیں طے ہوتا۔

"خیر دلہن! دفتر تمہیں کم از کم آج نہیں جانا چاہیے تھا یا جلدی ہی آجاتیں بیٹی! سسرال کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔"

وہ کیا کہتی۔

سعدیہ پھوپھی نے اس کی مشکل کو سمجھ کر فوراً" ہی کہا "چلو جلدی سے فریش ہو کر آؤ۔ یہاں تمہاری ساری ساسیں اکٹھی ہیں اور تم سے باتیں کرنے کے لیے بے تاب بیٹھی ہیں۔"

وہ اپنے کمرے میں آئی تو بابر نہا کر نکل رہا تھا۔

"اب آ رہی ہو اتنی دیر میں؟ تمہیں کچھ خیال ہونا چاہیے تھا۔" وہ عجیب سے موڈ میں بول رہا تھا "گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے اور میزبان غائب۔" وہ طنزیہ ہنسا۔

ماہ نور پوچھنا چاہتی تھی "مجھے کس نے پروگرام بتایا تھا؟" مگر وہ چپ رہی دل نہیں چاہ رہا تھا مگر وہ کپڑے بدل کر مہمانوں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"بھئی فرزانہ (ممی) کے ہاتھ میں تو بڑا ذائقہ ہے۔ تم کیا اچھا بناتی ہو؟" تائی نے پھر اسے سوالات کے نشانے پر رکھ لیا۔

"بے وقوف!" یہ ہمایوں تھا۔ "بھابھی بے وقوف اچھا بناتی ہیں۔" وہ بابر کی طرف دیکھ کر ہنس رہا تھا۔

اور ماہ نور کو حیرت تھی کہ بابر اس کے اس مذاق پر سب کے ساتھ زور زور سے قہقہہ لگا رہا تھا۔ وہ جزبز ہوتی رہی اور ضبط کی کڑی منزلیں طے کرتی رہی۔

"ہاں بھئی فرزانہ! آج تو کچھ بہو کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانے کا موڈ ہے۔ کیا کھلوا رہی ہو؟" انہوں نے ممی کو آتے دیکھ کر پوچھا۔

"کھانا تو سب تیار رہی ہے!" ممی کے لبوں پر ہمیشہ کی طرح بڑی دلکش سی ہنسی تھی۔

"ہاں تو رات سر پر کھڑی ہے۔ کسی کے انتظار میں کوئی کام رکتا تھوڑی ہے۔" چچی نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

کھانے لاجواب لگے۔ ممی نے زبردست اہتمام کیا تھا۔ کئی طرح کی نمکین اور میٹھی ڈشیں تھیں حسب معمول کھانا کمال تھا اور اس کو پیش بھی بڑی سلیقے سے کیا گیا تھا۔ سب تعریفیں کر رہے تھے۔

"تم بھی سیکھو دلہن! اپنی ساس سے یہ ہنر سیکھو۔"

"سیکھ لے گی بھابھی! وقت بڑا استاد ہے۔" سعدیہ پھوپھی نے ایک مرتبہ پھر اس کی سائیڈ لی۔

"ارے وقت کی مار سے سیکھا تو کیا سیکھا۔ آج کل بچے خود مختاری کے زعم میں رہتے ہیں ایک ہم لوگ تھے بڑوں سے سیکھنے میں بھی کوئی عار نہیں سمجھا۔ ارے ڈانٹ کھا کھا کر کام سیکھا ہے۔ ایک تو کم عمری میں شادیاں ہوئیں' پھر سسرال میں اپنی جگہ بنانی۔ سب کو خوش رکھنا' یہ سب سیکھنا ہی پڑا۔ یوں الگ تھلگ رہ کر بھلا کوئی سسرال نبھانا جان پائے گی۔"

تائی مسلسل اسے ہی نظر میں رکھے تھیں جبکہ خود ان کی بہو فوزیہ اپنی ننھی منی سی بیٹی کو بٹھائے اسے بے بی فوڈ کھلا رہی تھی اور یوں لاتعلق سی تھی جیسے موضوع سے اس کا کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

فوزیہ کا میاں جنید بابر سے چھوٹا تھا یوں وہ ماہ نور کی دیورانی تھی اور بڑے احترام سے اسے بھابھی جان پکارتی تھی حالانکہ شادی پانچ سال پہلے ہوئی تھی اور وہ دیکھنے میں بھی ماہ نور سے کافی بڑی لگتی تھی مگر ماہ نور کو لگا اسے اپنی ساس کو ہینڈل کرنا آگیا ہے کچھ اس کا سبب اس کا میاں تھا۔ وہ سامنے ہوتا تو مسلسل اپنی بیگم ہی کی طرف متوجہ رہتا اور اماں کی بھی بولتی بند سی ہو جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ بابر کے فون پر حیران تھی یہ دن تو کبھی کے ہوا ہو چکے تھے جب وہ بابر سے درخواست کرتی تھی کہ اسے بہت ضروری کام ہے اور وہ کہتا تھا۔

"جانم! مجھ سے بات کرنے سے زیادہ اور کیا ضروری ہو سکتا ہے۔"

وہ کہتی "یہ دفتر ہے محترم۔۔۔!"

تو وہ کہتا "میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھ سے باتیں کرو بس بولتی رہو۔"

وہ گھبراتی۔ دفتر میں لوگ ہر وقت کانوں سے لگے سیل فون کو دیکھ ہی رہے ہوتے تھے اور گھر میں بھی دادی غصہ ہوتی تھیں۔

"اے یہ کیا۔ بس یہ موا فون ہر وقت تمہاری جان کے ساتھ رہتا ہے۔ اسے کہیں پھینک کر آؤ۔" مگر وہ حیران تھی کہ آج سورج کہاں سے نکلا ہے۔ بہرحال وہ خوش تھی اور اس کی بات سن کر اور خوش ہو گئی۔

"یار! آج لنچ کہیں باہر نہ کرلیں۔"

اس کے دل میں کئی سوال ایک ساتھ ابھرے مگر وہ اور کچھ تو کیا کہتی آج دفتر کا ایک بہت ضروری ایشو بھی سامنے تھا جس میں دیر کی ذرا بھی گنجائش نہیں تھی مگر اس نے کہا تو یہی کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

"کہاں چلیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"جہاں تمہارا جی چاہے۔" اس سے کوئی جواب نہیں بن پایا حالانکہ اس کے دوست احباب ہی نہیں کولیگز بھی اس سے پوچھتے تھے۔ کہاں کیا اچھا ہے' کیونکہ اپنے بابا کی لاڈلی ڈیفنس میں چلنے والے ہر نئے اور پرانے ریسٹورنٹ سے خوب واقف تھی۔

"اچھا ایسا کرو تم ڈیڑھ بجے تک نیچے آجانا۔ میں تمہیں پک کرلوں گا ٹھیک ہے نا!"

"ہاں بالکل۔" وہ فون بند کر کے جلدی جلدی کام نمٹانے لگی اب باہر جانا تھا تو جانے کتنی دیر لگتی۔

وہ حسب وعدہ آئی تو وہ منتظر ملا۔

"ارے تم کب آئے؟" اس نے گھڑی دیکھی ابھی تو دو چار منٹ باقی ہی تھے۔ ڈیڑھ بجنے میں۔

"بس یار! آج کام کرنے میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا تم اتنے دنوں سے روٹھی روٹھی' بجھی بجھی سی رہتی ہو۔ آج تمہیں منا ہی لوں۔" اس نے اس کے ٹھنڈے ہوتے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

وہ خوش ہو گئی۔ بابر اتنا بے خبر بھی نہیں تھا جتنا وہ

سمجھتی تھی۔

وہ اس ریسٹورنٹ میں آئے جہاں بابر کے اصرار پر وہ منگنی کے بعد آئی تھی اتفاق سے وہ میز بھی خالی تھی جس پر وہ لوگ اس دن بیٹھے تھے۔

ابھی کھانے کا آرڈر ہی دے پائے تھے کہ بابر کے فون نے اسے متوجہ کرلیا۔

بابر نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "ممی کا فون ہے۔" وہ سرگوشی میں بولا۔

"جی جی میں آتا ہوں بس دس پندرہ منٹ میں۔"

"کیا ہوا خیریت؟" اس نے گھبرا کے پوچھا۔

"ہاں سب خیریت ہے۔ خوش خبری ہے صبا کا رزلٹ آگیا ہے۔ ممی چاہ رہی ہیں کہ وہ میرے ساتھ بازار جائیں۔ دراصل وہ اس خوشی میں ایک پارٹی دینا چاہ رہی ہیں۔"

وہ یکدم بجھ سی گئی۔

"ارے یہ لاکیوں نہیں رہا۔" وہ اب سب باتیں بھول کر بس بھاگنے کی فکر میں تھا اور جب ویٹر کو بلا کر جلدی جلدی کی تاکید کررہا تھا تو وہ گھبرا گئی۔ کہیں اس کو اکیلا ہی چھوڑ کر بھاگ نہ جائے۔

کیسی باتیں کہاں کا روٹھنا منانا' کھانا جیسے ہی سرو ہوا وہ جلدی جلدی کھانے پر جھک گیا ماہ نور کا جی چاہ رہا تھا۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر اٹھ جائے۔ اسے رونا آرہا تھا کوئی ایک لمحہ بھی اس کی زندگی میں نہیں' وہ کچھ دیر خوش ہو سکے۔

وہ وعدے کے مطابق دس منٹ میں فارغ ہوگیا۔ وہ صرف پلیٹ' چھری اور کانٹے سے کھیلتی رہی مگر اس کو کوئی خیال تک نہیں آیا حالانکہ منگواتے وقت اصرار تھا "آج سب تمہاری پسند کا آئے گا۔"

"چلیں؟" اس نے پوچھا۔

ماہ نور نے گردن ہلادی۔

وہ جھٹ پٹ بل پے کرکے اٹھا اور تقریباً" دوڑتا ہوا گاڑی تک پہنچا' وہ ساتھ چل رہی تھی یا خود کو گھسیٹ رہی تھی۔ وہ بالکل بے خبر تھا۔

گاڑی میں بھی مکمل خاموشی تھی وہ شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی اور وہ ٹریفک پر غصہ اتار رہا تھا۔ ماہ نور کو لگا وہ شاید اسے ہی مصیبت سمجھ رہا ہے۔ پھر اس نے دفتر پر اتار کر وہ گاڑی بھگا لے گیا۔

وہ دفتر پہنچی تو سب سے پہلے اس کی کولیگ امبر نے پوچھا۔

"اتنی جلدی میں تو سمجھی تھی تم کافی دیر لگا کر آؤ گی۔"

اس نے کبھی امبر سے بابر یا اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا مگر آج جیسے اس کے پوچھنے نے اس کے ضبط کے بندھن توڑ دیے۔

"بابر کی ممی کو کوئی ارجنٹ کام پڑ گیا۔" اس کا لہجہ رندھا ہوا تھا اور انداز میں طنز سا تھا۔

"تو؟" امبر حیران تھی۔

"تو کیا ماما زبوائے ہے فوراً" بھاگا۔"

"تم بیوی ہو اس کی کوئی گرل فرینڈ نہیں۔ وہ اپنی ممی کو بتا دیتا کہ تمہارے ساتھ لنچ کررہا ہے۔"

"اتنی ہمت کہاں ہے اس میں؟"

"تم صبر کرکے آگئیں میں ہوتی تو بابر اور اس کی ممی دونوں کا حشر کردیتی۔"

امبر واقعی یہی کرتی۔ ماہ نور کو اندازہ تھا' وہ ایسی ہی تھی۔

ابھی کچھ ہی دن پہلے وہ دوسرے ڈپارٹمنٹ سے یہاں ٹرانسفر ہوئی تھی اور ماہ نور سے اس کا ورکنگ ریلیشن شپ بہت اچھا چل رہا تھا۔ لنچ ساتھ ہوتا تھا اور کبھی ٹائم ملتا تھا تو گپ شپ بھی لگ جاتی تھی۔ ماہ نور کو اندازہ ہوگیا تھا کہ امبر اپنی منوانے کی عادی اور تھوڑی سی ضدی بھی ہے۔ آج سے پہلے اس نے اپنا اور امبر کا مقابلہ کبھی نہیں کیا تھا مگر آج دل بہت بھرا ہوا تھا اس کے اندر آپ ہی آپ تقابل شروع ہوگیا۔

اس کی بھی لو میرج تھی۔ دونوں خاندان والوں میں طبقاتی اور معاشرتی بہت واضح فرق تھا۔ وہ ایک لوئر مڈل کلاس جگہ سے بیاہ کر اپر کلاس میں آئی تھی۔ زبان اور کلچر بھی بہت مختلف تھے مگر وہ دونوں بہت خوش تھے۔ ہفتے میں دو ایک مرتبہ ضرور وہ ایک ساتھ لنچ کرتے مگر ہر سال باہر کا ٹرپ ضرور لگتا۔ شادی کو تین سال ہو چکے تھے۔ فرخ اکلوتا تھا اس کے ماں باپ چاہتے تھے کہ ان کے گھر میں بھی بچوں کی چہکار گونجے مگر امبر ابھی نہیں چاہتی تھی وہ ایم ایس کررہی تھی اور فرخ اس کی مرضی میں خوش تھا۔

اور ماہ نور کو اس کی امی بھی سمجھاتی تھیں۔ خود اس کے دل میں بھی خواہش تھی مگر ممی نے صاف منع کردیا تھا کہ وہ اب بچے نہیں پال سکتیں اور نہ ہی کسی آیا وغیرہ پر انہیں اعتبار ہے "البتہ اگر بابر کی ساس یہ ذمہ داری اٹھانے کو تیار ہوں تو پھر ورنہ بابر کو خیال رکھنا چاہیے اور بابر... ماہ نور کو معلوم تھا۔ امی کی شوگر اور بلڈ پریشر کا مسئلہ مسلسل رہتا ہے پھر بھی وہ راضی تھیں مگر ان کی خدمات کا صلہ بھی اعتراضات کی صورت میں نکلنا تھا اس بات پر اس کی طبیعت آمادہ نہیں تھی۔

وہ سوچ رہی تھی اسے لوگ خوب صورتوں میں شمار کرتے ہیں جبکہ امبر عام سی شکل و صورت کی حامل تھی اسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بچپن سے آگیا تھا۔ اس کی پرورش ہی دوسرے ماحول میں ہوئی تھی وہ ہمیشہ اپنی ڈریسنگ میچنگ شوز اور پرس اور میک اپ کا خیال رکھتی آئی تھی۔ امبر کچھ تو جز بز تھی اور کچھ اس کے اندر وہ انداز بھی نہیں تھے۔

سوچنا شروع کیا تو بس سوچتی گئی۔ امبر سات بہنوں میں درمیانی تھی۔ ماں باپ کے گھر اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ فرخ اکلوتا تھا۔ یہاں وہ خود اکلوتی تھی گھر میں سب کی آنکھ کا تارہ تھی اس کی جہیز میں والدین نے وہ سب کچھ دیا تھا جو وہ دے سکتے تھے اور بعد میں بھی سب کچھ اس کا تو تھا جب کہ امبر کو جہیز میں کچھ نہیں ملا' فرخ کے ماں باپ نے منع کردیا تھا۔ یہ بات اس نے خود ماہ نور کو بتائی تھی۔

اور پھر سب سے بڑھ کر ماہ نور کی عادتیں سب سے محبت سے ملنا دھیمے لہجے بات کرنا اپنی بات منوانے پر کبھی زور نہ دینا یعنی امبر کے بالکل برعکس تھی۔

پھر بھی' پھر بھی وہ ایسی زندگی کیوں گزار رہی ہے جس میں ایک لمحہ بھی اس کا اپنا نہیں' وہ ہر سال باہر کا ٹرپ لگاتی ہے اور یہ چار دن کے لیے ہنی مون پر ملک کے اندر بھی کہیں نہ جاسکی۔

☆ ☆ ☆

وہ اس دن اتنی اداس اور مضمحل تھی کہ دفتر کا کام بھی اس سے نہیں ہو رہا تھا۔ سب جانے لگے مگر وہ بیٹھی رہی پھر جب کام ختم کرکے گاڑی میں بیٹھی تو وہ کچھ کول ڈاؤن ہوچکی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ بابر اور ممی سے ناراض ہے مگر صبا سے تو نہیں۔ اسے جا کر مبارک باد ضرور دینی چاہیے۔ اس سوچ کے ساتھ اس نے فوراً" گاڑی کا رخ موڑ دیا۔ بہت تلاش اور پسند کرنے پر ایک بہت خوب صورت سا بکے لیا پھر چاکلیٹ کیک ایک مشہور شاپ سے لیا وہ جانتی تھی صبا چاکلیٹ بہت پسند کرتی ہے۔

وہ گھر پہنچی تو سب سے پہلی نظر ممی پر پڑی۔ انہوں نے اس کے سلام کے جواب میں سامنے دیوار پر لگی کلاک کو دیکھا۔

وہ دونوں ہاتھوں میں بکے اور کیک کا بڑا سا ڈبا سنبھالے تھی۔ اس نے ممی سے صبا کا پوچھا۔

"وہ اس وقت کہاں جاتی ہے یہیں اپنے کمرے میں ہی ہوگی۔"

وہ ہلکی سی دستک دے کر صبا کے کمرے میں گئی۔ وہ اپنے فون پر بزی تھی۔ اس نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ سے بکے لے کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ دو منٹ' اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہی مگر جب وہ متوجہ نہیں ہوئی تو اس نے کیک بھی وہیں رکھ دیا۔ وہ عجیب سی سبکی کا احساس لیے ہوئی مڑی مگر صبا نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا' وہ کمرے سے نکل کر تقریباً" بھاگتی ہوئی اپنے کمرے تک پہنچی اور پرس ایک طرف اچھال کر خود کو بستر پر گرا دیا اور پھر سارے دن کے جمع کیے ہوئے آنسوؤں کو راہ مل گئی۔

وہاں کون تھا جو اس کے آنسو پونچھتا اس کی ہچکیاں سسکیوں میں بدلیں پھر جیسے اس نے اپنے دکھتے ہوئے وجود کو خود ہی سنبھالا اور منہ ہاتھ دھونے لگی' تب ہی

دروازے پر دستک دے کر (اختری) نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔

وہ دیر تک اپنی آنکھوں پر چھپاکے مارتی رہی۔ اس کی آنکھیں مسلسل رونے سے سوج گئی تھیں۔ اسے اپنا آپ حقیر سا لگ رہا تھا۔ وہ کیوں اتنی بے وقوف ہے۔ صبح وہ ذرا سا ہنس کر بولا اور یہ فوراً" تیار ہو گئی پھر سب کچھ بھلا کر صبا کے لیے خوار ہوئی اور صلہ کیا ملا۔ وہ اب خود اپنی تذلیل کر رہی تھی۔ احمق ' بے وقوف تمہیں واقعی جینا نہیں آتا۔ تم ہو ہی اس قابل جیسا لوگ تمہیں ٹریٹ کرتے ہیں۔

کوئی دوبارہ اسے بلانے نہیں آیا رونے کے بعد شاید دل کی بھڑاس نکل گئی تھی۔ اس نے دوپہر میں بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ اب اسے تھوڑی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ وہ اپنے گھر میں بھوک کی کچی مشہور تھی۔ بس جب بھوک لگے فوراً" ہی کچھ مل جائے۔ بس تھوڑا سا وہ کھاتی ہی کتنا تھی۔

اس نے خود کو آئینے میں ایک نظر دیکھا پھر جیسے خود کو گھسیٹ کر ڈائننگ روم تک پہنچی ابھی داخل ہونا ہی چاہتی تھی کہ ممی کی آواز نے اس کی بھوک پیاس سب اڑا دی۔

"مان لو بابر میاں! تمہاری بیگم صبا سے جیلس ہو گئی ہیں۔ ہوتا ہے جب لڑکیاں آگے پیچھے کی ہوتی ہیں تو ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی ہی ہیں۔ اب ہماری صبا تو شروع ہی سے ٹیلینٹڈ ہے۔ ایم بی بی ایس کرنا آسان تھوڑی ہے بڑا پتا مارنا پڑتا ہے اور وہ ٹھہریں نازک مزاج۔" شاید ہنسیں تھیں یا سب لوگ ہنسے تھے۔ وہ مڑ کر دیکھے بغیر تیزی سے واپس پلٹی۔

تب ہی بابر کمرے میں آیا۔

"کیا ہوا؟ تم کھانا کھانے کیوں نہیں آئیں۔" اس نے نظریں اٹھائیں مگر بابر کے چہرے پر ابھی پڑھا ہوا سبق اتنا واضح تھا کہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"یہی تو ہے کہ تم بالکل پست بن جاتی ہو۔ کس بات پر آخر اتنا غم ' اتنا ملال ہے تمہیں؟" اس کی نظر شاید ماہ نور کی سوجی ہوئی آنکھوں پر پڑ گئی تھی۔

"میں صبا سے جل گئی ہوں۔" وہ زور سے چیخی۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا جو اس سے اپنا مقابلہ کر رہی ہو۔"

اور ماہ نور سوچنے لگی بابر واقعی اتنا بے وقوف ہے کہ بن رہا ہے ' وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کیسی اسٹوڈنٹ تھی اور کیا بی اے کرنا کوئی آسان کام تھا۔

پھر وہ سوچنے لگی۔ ممی نے ایسے کمنٹس کیوں دیے۔ وہ شام میں اسے لدا پھندا آتا دیکھ چکی تھیں اور پھر صبا وہ بھی تو وہیں تھی وہ کیوں چپ رہی۔

"چلو خیر ' اپنا موڈ کل تک ضرور ٹھیک کر لینا۔ کل ممی پارٹی دے رہی ہیں۔ پارٹی تو خیر پی سی میں ہے مگر تم کل نہ جاؤ تو اچھا ہے۔"

"نہیں جانا ضروری ہے۔" اسے بولنا پڑا۔

"اچھا تو پھر جلدی آ جانا۔ ہم میزبان ہیں۔ ہمیں جلدی پہنچنا چاہیے۔"



پارٹی کے فوراً" ہی بعد صبا کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ صبا کسی کے ساتھ انگیج تھی۔ یہ اسے معلوم نہیں تھا مگر پارٹی میں وہ جس طرح کسی کے ساتھ تھی اس سے سب ہی کو اندازہ ہو گیا۔ شادی کی تیاریوں میں وہ قدم قدم پر خود کو اجنبی محسوس کرتی رہی اور پھر شادی کے ہنگامے میں بھی وہ مسلسل تائی اور چچی کی نظروں میں رہی۔

شادی کے چوتھے ہی دن جب صبا ہنی مون پر روانہ ہوئی تو اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ بابر سے اس کی زور دار جھڑپ ہوئی اور بابر نے سب کے سامنے اسے کہہ دیا۔

"وہ یہاں خوش نہیں ہے تو اپنے گھر واپس چلی جائے وہ لوگ بھی اب اس سے عاجز آ چکے ہیں۔ فوراً" ابھی چلی جاؤ۔"

اس نے دروازہ کھولا سامنے ہی ممی ' ہمایوں اور پاپا کھڑے تھے۔

"اپنے گھر؟" وہ ششدر تھی ' اس کا گھر کہاں تھا

اور یہ لوگ آخر اس سے کیوں عاجز آ گئے ہیں۔

وہ روتی دھوتی رات میں ہی امی کے گھر چلی گئی۔ سب ہی سامنے کھڑے تھے۔ کسی نے بھی اسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

دو مہینے تک کسی نے خبر نہیں لی ' اس کی امی پریشان تھیں اور بابا ' وہ بے چارے عجیب الجھن میں تھے انہوں نے کئی دفعہ کوشش کی مگر بابر ان کا فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ آخر بابا کی ایک دن بابر سے بات ہو گئی تھی۔ انہوں نے اسے گھر بلایا۔

اس نے صاف کہہ دیا میں ماہ نور کی ضدی اور ہر وقت چڑچڑی طبیعت سے بیزار ہو چکا ہوں اور میرے گھر والے بھی پریشان ہیں۔ وہ کسی سے گھلنا ملنا ہی نہیں چاہتی۔

بابا نے سمجھایا "آ کر اس سے بات کرو ہم بھی سمجھائیں گے۔"

اس نے فوراً" کہا۔ "نہیں میں اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔"

ماہ نور کو امی مسلسل سمجھاتی رہتی تھیں۔

"مرد کو غصہ نہیں دلانا چاہیے اور وہ نہیں فون کرتا تو تم کر لو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

مگر جب اس نے امبر کو بابر کی بابا کے ساتھ بدتمیزی کا بتایا تو وہ یکدم ناراض ہو گئی۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے اب بھگتو۔ تمہیں اسے پہلے دن ہی بتا دینا چاہیے تھا کہ تم بھی ایک انسان ہو ' اپنا الگ وجود رکھتی ہو تمہاری بھی کچھ پسند ناپسند ہے وغیرہ وغیرہ۔"

وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ کیا کہتی۔ اسے تو امبر کی ہر بات بالکل درست لگ رہی تھی۔

"سنو ' مجھے عورت کی تذلیل بالکل برداشت نہیں۔" وہ کچھ دیر بعد پھر بولی "اب جب تک وہ ناک نہ رگڑے تمہارے بابا سے معافی مانگے وہاں جانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں سمجھ گئیں نا!"



دو مہینے یوں ہی گزر گئے تب ایک دن اچانک ممی آ گئیں وہ دیر تک امی اور بابا کو اس کی خامیاں گنواتی رہیں۔

"ساری بات تربیت کی ہوتی ہے آپ لوگوں نے اپنی بیٹی کو پڑھایا ضرور مگر تربیت نہیں ہو سکی آپ لوگوں سے۔"

اس کے ماں باپ سر جھکائے سن رہے تھے۔

"عجیب ہیں آپ لوگ کوئی شادی شدہ لڑکی یوں اپنا گھر بار چھوڑ کر ماں باپ کی دہلیز پکڑے اور وہ مزے سے اطمینان کی سانسیں لیتے رہیں۔ آپ لوگوں نے کوئی کوشش ہی نہیں کی رابطے کی مجھ سے ـــ پوچھتے تو یہ وہاں کیا کیا کر کے آئی ہے۔"

بابا نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی بچی کو خوب اچھی طرح جانتے تھے اور یہاں کیا کیا کر کے آنے کا الزام۔

"خیر شکر کریں۔ آپ کا واسطہ ہم شریف لوگوں سے پڑا ہے۔ چلو ماہ نور! فوراً" تیار ہو جاؤ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ ہم لوگوں نے ہمایوں کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ کل وہ لوگ آ رہے ہیں۔"

ماہ نور کو فوراً" امبر کی بات یاد آئی اس نے اپنی ہمت کو مجتمع کرتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔

"میں آ جاؤں گی مجھے بابر خود لینے آئیں۔ آپ کے سامنے انہوں نے مجھے نکالا تھا گھر سے۔"

"یہ کبھی نہیں ہونے والا تم اچھی طرح سن لو اور سمجھ لو۔"

پھر وہ امی اور بابا کی طرف مڑیں۔

"دیکھ لی آپ لوگوں نے صاحب زادی کی زبان ' یہ تربیت کی ہے آپ لوگوں نے منہ بجوں کا کوئی لحاظ نہ چھوٹوں کا پاس۔"

امی نے بڑی ناگواری سے بیٹی کی طرف دیکھا مگر وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ گئی۔

ممی بکتی جھکتی چلی گئیں۔



رات کو دادی کو دل کا دورہ پڑا اور وہ اسپتال پہنچنے سے قبل ہی انتقال کر گئیں بابر کے گھر بھی اطلاع دی گئی مگر وہاں سے کوئی بھی نہیں آیا۔

ماہ نور کے دل پر ایک داغ اور لگا۔ اس کی دادی میں تو اس کی جان تھی اور یہ بابر کو اچھی طرح معلوم تھا۔

کچھ دن بعد بابر کا فون بابا کے پاس آیا اس نے کہا کہ ماہ نور نے ممی سے بدتمیزی کی ہے اب وہ عمر بھر بیٹھی رہے میں اس کو لینے کبھی نہیں آؤں گا بلکہ جلد ہی طلاق کا نوٹس اسے مل جائے گا۔"

"طلاق!" بابا کی تو جان ہی نکل گئی وہ پہلے ہی دادی کے جانے سے نڈھال ہو چکے تھے۔ انہوں نے بستر پکڑ لیا۔

اسے امی ابی سے پتا چلا تو اس کا غصہ بڑھ گیا۔

"وہ کیا طلاق دے گا میں خود اب اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔"

اس دوران اسے امبر کا ساتھ بڑا اچھا لگا۔ وہ اس کا سہارا سا بن گئی۔ صرف وہ تھی جو اس کے دل کا غبار نکلنے پر اس کا ساتھ دیتی تھی۔

ورنہ امی تو اسے ہر دم سمجھاتی تھیں۔

"لڑکیوں کو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے گھر ایسے نہیں بنتے تم ضد چھوڑ دو اور اپنی ساس اور بابر سے جا کر معافی مانگ لو۔ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ جھک جانا عورت کی شکست نہیں ہے۔"

"کیسی بات کرتی ہیں آپ۔ میں آپ کو وہاں لے کر جاؤں، کبھی نہیں۔ آپ نے اس دن جتنی باتیں سنیں میں شرمندہ ہوں میری وجہ سے میرے ماں باپ کی بے عزتی ہوئی اور میں کیوں اور کس بات کی معافی مانگوں ان سے۔ اپنے شوہر کے ساتھ جانے پر اصرار کرنا گناہ کبیرہ کیسے بن گیا؟"

☼ ☼ ☼

وقت گزر رہا تھا اسے تو گزرنا ہی ہے، اس کی برتھ ڈے بابر کی برتھ ڈے اس کی ویڈنگ اینورسری سب گزری، وہ رات رات بھر روتی رہی۔ سب باتیں ایک طرف مگر دل اسے بھلا کہاں پایا تھا۔ وہ سوچتی محبت کا دعوے دار کیسے مجھے بھول گیا۔

اس دوران اس کے یونیورسٹی کے مشترکہ دوستوں نے بھی کوشش کی مگر بابر کا رویہ بہت سخت دیکھا وہ سب احوال سنتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔

تب ایک دن امبر ہی نے اسے راہ سجھائی۔

اگر تم بلاوجہ یوں اس کے نام کے ساتھ بندھی رہنا چاہتی ہو اور اپنی زندگی برباد کرنا چاہتی ہو تو اپنے دل کو ٹٹولو۔ کیا ساری زندگی اپنے ماں باپ کو تنگ کرنے کا ارادہ ہے ابھی تمہارا بگڑا کیا ہے۔ تمہاری وجہ سے انکل اور آنٹی کا حال اب مجھ سے بھی دیکھا نہیں جاتا۔ تم بھی ان پر رحم کرو۔"

وہ سوچنے لگی واقعی اس کے ہنسنے بولنے والے بابا خاموشی سے بستر پر پڑے رہتے وہ بہت کمزور بھی ہو گئے تھے اور امی وہ کیسی مضمحل اور کمزور ہو رہی تھیں۔

"میں کیا کروں؟" اس نے امبر سے ہی صلاح مانگی۔

"معاملے کو ایک طرف کرو۔ آئندہ تمہارے لیے کوئی مثبت راہ بھی تو ممکن ہے۔ تم وہاں سے صرف عزت مانگ رہی تھیں اور کچھ نہیں۔"

"مجھے کوئی تجربہ اب نہیں کرنا۔" وہ بگڑ سی گئی۔

"چلو انہیں ہی اس خوش فہمی سے نکال دو کہ تمہیں ان کی پروا ہے وہ تمہیں بھول چکے ہیں تو تمہیں بھی ان کی اب کوئی پروا نہیں۔"

پھر امبر اور فرخ نے بھی اس کے ماں باپ سے بات کی اور یوں اس نے خلع لینے کے لیے نوٹس بھیج دیا۔

☼ ☼ ☼

نوٹس کے دوسرے دن بابر آ گیا۔

"مجھے اس سے نہیں ملنا۔" امی تو پھر پگھل رہی تھیں۔

اس نے پھر آفس کال کی، مسلسل فون پر ان سے صاف کہہ دیا۔

"مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔"

تمام کارروائی آخر کار مکمل ہو ہی گئی۔

وقت کا کام گزرنا ہے سو کبھی دیر سے کبھی جلدی جلدی وہ گزرتا جاتا ہے۔ اس نے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا۔ اپنے ماں باپ کو خوش کرنے کے لیے پھر سے اپنی ڈریسنگ پر توجہ دینے لگی، دفتر میں دلچسپی بڑھا دی تو اس کی زندگی تھوڑی ترقی کی راہ پر دوڑنے لگی۔ پروموشن ہو گئی وہ اب دوستوں کے ساتھ لنچ اور ڈنر بھی کرنے لگی۔ اندر خوشی کی رمق اترے نا اترے اس کا چہرہ اسے خوش ہی دکھاتا تھا۔

امبر اب اس دفتر میں کیا ملک میں ہی نہیں تھی۔ اس کا باہر سیٹل ہونے کا خواب پورا ہو گیا تھا اور اسی وجہ اب اس سے رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ زندگی مصروف ہے اور ہر شخص کے لیے اس کا دائرہ اسے گول گول گھماتا رہتا ہے۔ اس فون، نیٹ اور دنیا کے گلوبل ویلیج ہو جانے نے وقت کو کیسے سمیٹ کر رکھ دیا ہے اب کسی سے رابطے کا جی چاہے تو بس بات کل اور پرسوں پر ہی شفٹ رہتی ہے۔

خلع لینے پر امی بہت رنجیدہ تھیں اور کبھی کبھی وہ اس سے کہہ دیتی تھیں۔

"کہ تمہاری وہ دوست نہ ہوتی تو تم میری بات مان لیتیں۔ گھر بنانا مشکل کام ہے۔"

پھر جب لوگوں نے اس سے یا امی بابا سے رابطہ کرنا شروع کیا تو اس نے بڑی سختی سے کہہ دیا۔

"پلیز امی، میں اب شادی نہیں کروں گی کبھی نہیں۔"

"تو جب اس کے نام پر ہی مرنا جینا تھا تو یہ سب کیوں کیا۔ ہماری تو موت بھی اب مشکل ہو گئی ہے۔ ہر دم یہی خیال رہتا ہے۔ تمہارا کیا ہو گا ہمارے بعد بیٹا! یہ دنیا عورت کے لیے بہت مشکل جگہ ہے اور پھر اکیلی عورت۔ تم اپنے بابا کو دیکھ رہی ہو یہی غم ہے جو انہیں کھائے جا رہا ہے۔ چار سال گزر چکے ہیں اب۔ ہم دونوں بیمار ہیں کیا کریں۔"

ہمیشہ امی ہی کچھ نہ کچھ کہتی تھیں، بابا نے کبھی کچھ نہیں کہا مگر اس دن جب وہ شام میں ان کے پاس جا کر بیٹھی تو انہوں نے اس کا چھوٹا سا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر کہا۔

"نور! تم اپنے بابا کی جان ہو جانتی ہو نا!"

"جی!" وہ مسکرائی۔

"تم خوش نظر آتی ہو تو جیسے میری سانسیں بڑھ جاتی ہیں اور تم اداس نظر آتی ہو تو میری سانس اکھڑنے لگتی ہے۔ وقت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ تمہاری امی کی مسلسل بیماری سے بھی میں پریشان رہتا ہوں۔ بیٹی! ایک مرتبہ تمہارے دل کی خواہش تمہارے چہرے سے ہم نے پڑھ لی تھی۔ اب میں تم سے درخواست کر رہا ہوں۔"

"بابا!" وہ ان کے درخواست کہنے پر چیخی۔

"ہاں میری جان! کل میں نے کسی کو اپنے گھر بلایا ہے۔ تم مل لو اس سے اور پھر میری بیٹی میری گڑیا! اپنے ماں باپ کی مشکل آسان کر دو میں تمہارا احسان مند ہوں گا۔" انہوں نے نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بابا! ایسے نہ کہیں آپ بھی میری جان ہیں۔ میں آپ کے حکم سے کبھی باہر نہیں تھی۔"

وہ رات بھر الجھی الجھی رہی۔ دوسرے دن چھٹی کا دن وہ سارا دن گھر میں رہی مگر رات اور دن میں بار بار بابر کا چہرہ اس کے سامنے آتا رہا۔

کبھی کبھی تو اسے لگتا وہ اسے پکار رہا ہے۔ "نور!" وہ افسردہ تھی پر اپنے ماں باپ پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

شام میں احسن کو آتے دیکھ کر وہ تھوڑی سی حیران ہوئی۔ احسن بابا کے ساتھ ہی بینک میں تھا۔ وہ اب ایک دوسرے بینک میں چلا گیا تھا جہاں وہ مزید اچھی پوسٹ پر تھا اس نے یہاں آئی بی اے، ایم بی اے کیا پھر باہر سے بھی کچھ کورس کیے وہ اس سے پہلے بھی کئی بار مل چکی تھی اور اس کی بابا اتنی تعریفیں کرتے تھے۔ اتنا ذکر کرتے تھے کہ وہ ہی نہیں امی اور دادی سب کو اس کے بارے میں سب پتا تھا۔

وہ بابا اور امی کے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر بابا کے اشارے پر وہ اسے چھوڑنے آئی تو وہ اس کی بات سن کر حیران رہ گئی۔

"ماہ نور! مجھے آپ کی علیحدگی کا سن کر افسوس ہوا تھا۔ مگر ہر انسان کا دل عزت اور محبت حاصل کرنے کو چاہتا ہے۔ یہ اس کا حق بھی ہے میں پتا نہیں کب سے چاہتا تھا مگر مجھے بات کرنے میں دیر ہو گئی اور آپ کی شادی ہو گئی۔ میں آپ کے بابا کے ساتھ کافی عرصہ رہا ہوں آپ کے بابا ایک نفیس انسان ہیں اور ایسے انسان نایاب نہیں کمیاب ہیں۔ میری آرزو ہے کہ میں ان کا بیٹا بن جاؤں اگر آپ اجازت دیں؟ میرا وعدہ ہے کہ آپ کو میرے گھر میں عزت اور محبت دونوں ملیں گی۔" وہ تیزی سے دہلیز پار کر گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ چپ چاپ لوٹ آئی 'یہ رات بھی جاگ کر کٹی' امی کی آرزو بابا کی درخواست اور احسن کی باتیں سب اپنی جگہ مگر یہ دل اس میں تو شاید وہی بے وفا اب تک قبضہ جمائے تھا۔

وہ خود کو ڈانٹنے لگی 'وہ تمہارا کون ہے کیا رشتہ رہ گیا ہے باقی؟' مگر وہ اس کے اعصاب پر سوار رہا صبح ہوئی وہ آفس پہنچ گئی مگر تصور اور تصویر ادھر ادھر ہو ہی نہیں رہی تھی۔ وہ جھنجلا رہی تھی اسے ماں باپ کا مان رکھنا تھا۔ یہ دل تو بس اس کی دوستوں نے لنچ کا پروگرام بنایا اس کا دل بالکل آمادہ نہیں تھا مگر اس نے سوچا خود کو بہلا لے گی اسی طرح اس کی اداسی اور غیر معمولی خاموشی اس کی دوستوں کو بھی کھٹک رہی تھی۔

"کیا بات نور! کچھ پریشان ہو؟" مدحت نے پوچھا۔

"نہیں بس ایسے ہی۔"

وہ ان ہی لوگوں کے ساتھ جب ریسٹورنٹ پہنچی تو وہ اور شدت سے یاد آنے لگا کہ یہی تو وہ جگہ تھی جہاں وہ پہلے پہل لے کر آیا تھا۔

ابھی کھانے کا آرڈر ہی دیا تھا کہ نور کی نظر اس کارنر کی میز پر پڑی اور وہاں بابر کو بیٹھا دیکھ کر اس کا دل جیسے بند ہونے لگا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چور نظروں سے بار بار ادھر دیکھ رہی تھی وہ بہت کمزور اور قدرے عمر رسیدہ سا لگ رہا تھا۔ شاید بیمار تھا۔

تب ہی بابر کی نظر بھی اس پر پڑ گئی وہ یکایک اٹھا اور آ کر اس کی دوستوں سے بولا۔

"ایکسوزمی! کیا میں آپ کی دوست کے دس منٹ لے سکتا ہوں۔"

مدحت اور نادیہ حیرانی سے دیکھنے لگیں۔

ماہ نور اسے جواب دینا چاہتی تھی مگر جیسے بے اختیاری میں اٹھی اور اپنی دوستوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔"

"نور! تم تو آج بھی ویسی ہی ہو' بدنصیب تو میں ہوں تمہاری قدر ہی نہ کر پایا' ہمایوں کی شادی کے فوراً" ہی بعد مجھے احساس ہونے لگا اپنی غلطیوں کا' تمہارے ساتھ کی گئی زیادتیاں ستانے لگیں مگر تب تک دیر ہو گئی تھی۔" وہ ہاتھ مل رہا تھا۔

وہ چپ چاپ سنتی رہی اور وہ جیسے بولنے بتانے احوال سنانے کے لیے بے قرار تھا۔

"تم تو شاید بھول ہی چکی ہو مگر میں اس میز پر اکثر آ کر بیٹھتا ہوں یہیں تو ہم تم پہلی مرتبہ بیٹھے تھے دل کی باتیں کرنے۔ میرے پاس اب اور ہے ہی کیا ماضی کی یادیں اور بس۔"

"ممی تو آج بھی تمہیں ہی قصوروار مانتی ہیں۔ مگر وہ کیا جانیں' میرے دل میں تو آج بھی بس تم ہی تم ہو۔ نور۔" اس نے اس کے میز پر دھرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"تمہیں یاد ہے میں نے تم سے پوچھا تھا تم محبت میں وحدت کی کتنی قائل ہو اور میں میں تو اپنی محبت کے گرد حصار سا کھینچ دیتا ہوں نہ خود نکلتا ہوں نہ محبت اپنا قبضہ چھوڑتی ہے۔"

وہ مسکرا رہا تھا یا مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی آنکھیں اس کی ڈبڈباتی آنکھیں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

"صبا کی اپنی سسرال سے نہیں بنی۔ وہ علیحدہ ہو کر ہمارے گھر آ گئی مگر شاہانہ ہمایوں کی بیوی وہ بہت تیکھے مزاج کی ہے اس نے اس کو دو دن بھی رہنے نہیں دیا۔ وہ خود بھی برائے نام ہی ٹکتی ہے گھر میں دراصل اس کی اور ممی کی بالکل نہیں بنتی۔"

وہ سانس لینے رکا۔ ماہ نور نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

"پلیز نور! میری بات سن لو مجھے کہہ لینے دو میں چپ رہ رہ کر گونگا بن گیا ہوں۔ ممی نے انہیں بارہا گھر سے نکالا مگر وہ لوگ ہنستے ہیں۔ اس گھر اور جائداد کے ہم ہی تو وارث ہیں بابر بھائی تو۔ شاہانہ تمسخر اڑاتی ہے اور ہمایوں اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ممی چاہتی ہیں میں پھر شادی کر لوں۔ ہونہہ شادی تم مجھے ایک موقع تو دیتیں میں سب ٹھیک کر لیتا نور! سب ٹھیک ہو جاتا ہے تم میری پہلی اور آخری محبت۔ میں نے تمہیں طلاق نہیں دی۔ تم نے خلع لی ہے اب بھی۔۔۔"

وہ سوچنے لگی امی ٹھیک سمجھاتی تھیں' بلاوجہ وہ امبر کے کہنے میں آ کر جلدی نہ کرتی تو آج وہ اسے معاف۔

تب ہی بابر کے سیل نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"جی جی ممی! میں بس ابھی آیا۔" وہ فوراً" کھڑا ہو گیا اور آج اس نے اپنا کھانا سرد کرنے تک کا انتظار نہیں کیا۔ میز پر کچھ روپے پھولوں کی ارینجمنٹ کے نیچے دبائے اور تیزی سے پلٹا۔

وہ ایک دو لمحے یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"بابر تم نے ٹھیک کہا تم تو واقعی وحدت محبت کے زبردست قائل ہو بس ہوا یہ ہے کہ تم نے اپنی پہلی محبت کے گرد جو حصار کھینچا ہے اس سے تم وقتی طور پر زندگی اور احساسات کے تقاضوں کے تحت نکل آتے ہو مگر پھر مڑ کر وہیں پناہ لے لیتے ہو۔ کسی بھی دوسری محبت کے لیے نہ تمہارے پاس کل کچھ تھا اور نہ آج ہے۔"

وہ اپنی آنکھوں کی نمی کو پونچھتے ہوئے اپنی میز کی طرف بڑھی۔

"کون تھا؟" نادیہ نے پوچھا۔

"تھا بیچارا ایک پرانا جاننے والا چھوڑو اسے 'کیا کیا منگوایا ہے۔'" اس نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"جو بھی آ جائے 'خوش خوش کھانا۔ جب پوچھ رہے تھے تو پرانے زمانے کی ہیروئن بنی بیٹھی تھیں۔"

تینوں ہنسنے لگیں۔

دل نے فیصلے کا قدم اٹھا لیا تھا اس لیے اب وہ مطمئن تھی۔ وہ بھی تو اپنے بابا کو بہت چاہتی تھی جا کر انہیں اور ہاں امی کو بھی خوش کر دے گی محبت کا ہر دائرہ الگ ہوتا ہے اور ایک محبت سے کہاں دوسری محبت کا دائرہ کمزور ہوتا ہے۔ دراصل محبت کا ہنر ہی عورت کو آتا ہے ماں باپ 'بھائی بہن' احباب پھر شوہر بچے وہ کبھی کہاں سوچ سکتی ہے کس کی محبت کا پلڑا بھاری ہے بس اپنی ساری محبتوں کے لیے ہی تو جیتی ہے۔

☆

عنیزہ سیّد



میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں۔" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا کہ یہ لڑکی تو ویسی ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اس ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی۔ "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

۲۶

چھبیسویں قسط



"میں سعدیہ بول رہی ہوں ماہ نور باجی' کھاری کی بیوی سعدیہ۔"

"ہاں ہاں سعدیہ پلیز بولو۔" ماہ نور جلدی میں تھی' گھر میں اس کے بابا آئے ہوئے تھے' وہ خاص طور پر اس سے ملنے کچھ دیر پہلے اسلام آباد پہنچے تھے۔

"کھاری کہتا ہے آپ اس کے جاپانی دوست کا نمبر مانگ رہی ہیں۔" سعدیہ کے لہجے میں ابھی بھی شک کا عنصر جھلک رہا تھا۔

"ہاں ہاں' پلیز سعدیہ! مجھے وہ نمبر دے دو' میں تو کب سے انتظار کر رہی ہوں۔" ماہ نور چلتے چلتے لونگ روم کے دروازے تک پہنچی۔

"میں آپ کو نمبر بتاتی ہوں ماہ نور باجی! اگر مجھے بھی آپ سے ضروری کام ہے۔"

"ہاں پلیز بولو سعدیہ مگر جلدی کرلو میں ذرا جلدی میں ہوں۔" ماہ نور اسی جگہ رکتے ہوئے تیزی سے بولی۔

"ماہ نور باجی! آپ کی بات کھاری سنتا ہے' سمجھتا ہے' اسے آپ سمجھائیں وہ کملا ہو گیا ہے' عجیب عجیب باتیں کرنے لگا ہے۔"

"ہیں اچھا بھلا تو تھا تو وہ اس روز کیا ہوا اسے؟"

"پتا نہیں جی! اسے کیا سودا ہو گیا ہے' کہتا ہے کہ وہ سعد باؤ صاحب کا بھائی ہے۔"

"ہیں!" ماہ نور کو جھٹکا سا لگا۔ "سعد کا بھائی ہے۔"

"ہاں جی' میں اسے روکتی ہوں' منع کرتی ہوں کسی سے یہ بے وقوفوں والی بات نہ کرے' پر وہ کہتا ہے چوہدری صاحب واپس آئیں سب کو پتا چل جائے گا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"چچا سردار واپس آجائیں۔" ماہ نور کے ذہن میں ایک عجیب سی کشمکش شروع ہو گئی۔

"ہاں جی وہی جی۔" سعدیہ کہہ رہی تھی۔

"چچا سردار' سعد' کھاری۔" ماہ نور کی نظروں کے سامنے کچھ دن پہلے پڑھے کچھ الفاظ گھومنے لگے جن پر اس نے اپنی دھن میں مبتلا ہوتے ہوئے غور ہی نہیں کیا تھا۔



سیمی نے فرش پر وائپر ڈنڈے سے مچا پوچا (پ) پھیرا اور پھر اسے کچن سے باہر والی بالکنی میں رکھنے گئی' اس بالکنی سے فلیٹس کے نیچے والی سڑک کا وہ حصہ صاف نظر آتا تھا جہاں سے فلیٹس والی عمارت میں آنے جانے والے لوگ دیکھے جا سکتے تھے۔ سیمی نے عادتاً" سر جھکا کر نیچے دیکھا فلیٹس کی عمارت کے قریب ایک قیمتی لمبی چمکتی سیاہ گاڑی آکر رکی تھی۔ سیمی تجسس کے مارے وہیں کھڑی نیچے دیکھتی رہی۔

"کس کے ہاں کون آگیا بھائی؟" وہ دل میں سوچ رہی تھی' نجانے کیوں اسے یہ گاڑی دیکھ کر سعد یاد آنے لگا تھا۔ اس کا دل تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا "کیا پتا سعد واپس آگیا ہو' ایسا ہوا تو سارہ تو خوشی کے مارے پاگل ہو جائے۔" اس نے سوچا اور ایک بار پھر دیکھا۔ باوردی شوفر پچھلی سیٹ کا بایاں دروازہ کھول رہا تھا۔ گاڑی سے باہر آنے والے شخص کا چہرہ سیمی کو واضح نظر نہیں آیا' مگر اس کا قیمتی سوٹ اور چمکتے جوتے ضرور نظر آرہے تھے۔ وہ شخص سعد نہیں تھا۔ سیمی کو مایوسی ہوئی۔

"ان فلیٹس میں ایسا تو کوئی نہیں رہتا جس کے ہاں اتنی قیمتی گاڑی میں بیٹھ کر کوئی آئے۔" وہ سوچتے سوچتے واپس کچن میں آگئی۔

"آج مونگ کی دال اور املی کا گڑمبا بنا لیتی ہوں۔" اس نے ہاتھ دھوتے ہوئے مینو ترتیب دیا۔

"سارہ تو لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظریں جمائے ایک ہی گانا سنے جا رہی ہے' صبح سے ارد گرد کا کچھ ہوش نہیں' ون ٹو تھری۔ ون ٹو تھری کے علاوہ جس میں کوئی اور الفاظ سمجھ نہیں آتے۔"

وہ سوچے چلی جا رہی تھیں۔ جب ہی داخلی دروازے پر دستک سنائی دی۔ کال بیل ہمیشہ کی طرح اس روز بھی خراب تھی۔

"دیکھو تو کب سے انجم کو کہہ رہی ہوں۔ مجال ہے جو سن لے' سعد یہاں نہیں ہے اسے بھی پتا چل گیا شاید جب ہی نہیں سنتا' سعد کے ہوتے اس کی مجال نہیں تھی کسی کام پر کان نہ دھرتا۔" سیمی ایپرن سے ہاتھ پونچھتی داخلی دروازے کی طرف آگئی۔

"کون ہے بھئی؟" اس نے رسماً" پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر دروازہ کھول دیا۔ قیمتی لمبی' چمکتی سیاہ گاڑی میں بیٹھ کر آنے والا اسی کے فلیٹ کے دروازے پر کھڑا تھا۔

If you ever find yourself stuck in
the middle of the sea,
I'll sail the world to find you
If you ever find yourself lost in
the dark and you cant see
I'll be the light the guide you
Find out what were made of when we
are called to help our friends in need
You cant count on like 123
I'll be there

سارہ کے کمرے سے برونو مارز کے گانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ گانا جو سعد سلطان کو بہت پسند تھا۔

"مجھے بہت اچھا لگا جو تم نے مجھ سے صاف بات کر دی۔" زوار نے فلور کشن پر اپنے قدموں میں بیٹھی ماہ نور سے کہا۔

"لیکن یہ ایک بھاری بوجھ ہے جو تم نے میرے حوالے کر دیا۔" انہوں نے بات مکمل کی۔

"میں جانتی ہوں۔" ماہ نور نے گھٹنوں پر رکھا سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ "لیکن آپ کے علاوہ میرے پاس کوئی دوسرا کون تھا ممی؟" وہ دکھ سے مسکرائی "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ممی میری کسی ایسی بات کو سن کر آسانی سے ہضم کر جاتیں' مجھے کھری کھری نہ سناتیں یا کسی بھی طرح مجھے سپورٹ کرتیں؟"

"نہیں۔" زوار نے سر ہلایا "وہ تمہاری ایسی بات کو نہ تو آسانی سے سن کر ہضم کر سکتی ہیں نہ ہی تمہیں سخت سست سنانے سے باز رہ سکتی ہیں نہ ہی وہ کسی بھی طرح تمہیں سپورٹ کر سکتی ہیں۔۔۔ یہ تینوں کام ان کے بس میں نہیں۔"

پتا نہیں انہوں نے ماہ نور کی بات کی تائید کی تھی یا اسے اس کی ماں کے ممکنہ رد عمل سے ڈرایا تھا۔

"پھر آپ بتائیے وہ کون سا دوسرا انسان ہے جسے میں اپنے دل کی بات سناتی۔" ماہ نور کی آواز بھاری ہو گئی۔

"میں نے کہا نا تم نے بہت اچھا کیا جو مجھے سنا دی اپنے دل کی بات۔" زوار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ لڑکا یونہی تمہارا انتخاب نہیں بنا ہو گا اس میں کچھ ایسا ضرور ہو گا

جو وہ تمہاری نظروں میں سمایا اور تمہارے دماغ کا فتور بن گیا۔"

"آپ اسے دماغ کا فتور سمجھتے ہیں؟" ماہ نور نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" زوار نے سر ہلایا۔ "جب کسی کے خیال میں ڈوبتا ہوا انسان اس بات کی پرواہ کرنا بھول جاتا ہے کہ اس کی یہ ڈبکی اس کے ارد گرد رہنے والوں کے لیے کیا منظر ثابت ہو رہی ہے تو اس خیال کو دماغ کا فتور ہی قرار دیا جاسکتا ہے یا ہو سکتا ہے 'میری اردو کمزور ہو اور میں اس کے لیے غلط لفظ استعمال کر رہا ہوں۔"

"آپ کا مطلب ہے میں غلط کر رہی ہوں۔" ماہ نور کا اپنے بابا سے پر امید دل مایوس ہوا۔

"نہیں تمہارے خیال کو میں غلط نہیں کہہ رہا۔ خیال میں کھو کر بے خودی کے اس عالم پر البتہ میری کچھ ریزرویشنز ہیں۔" زوار نے کہا۔

"مثلاً"؟" ماہ نور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"مثلاً" اپنی اسٹڈیز کو اپنے کیریر کو بھول جانا' اپنے گھر والوں کو چھوڑ چھاڑ دوسرے کسی شہر میں آبسنا' اس خیال کو پانے کی خاطر ادھر ادھر بھٹکتے پھرنا۔" زوار نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"کیا آپ بھی سمجھتے ہیں کہ ہر چیز سے زیادہ اہم چیز ڈگری ہے۔" ماہ نور کو علم تھا کہ وہ ایک احمقانہ سوال کر رہی تھی مگر پھر بھی اس نے کیا۔

"میرے خیال میں ہر چیز سے زیادہ اہم چیز سیلف ریسپیکٹ ہے۔" زوار نے اس کی بات کا فوری جواب دیا۔

"گویا مجھے سیلف ریسپیکٹ کی پروا نہیں رہی" ماہ نور کچھ سوچتے ہوئے بڑبڑائی۔

"ہاں مجھے ایسا ہی لگا" زوار نے سچائی سے کہا "لیکن اگر میں باپ بن کر نہ سوچوں تو شاید اس لیے لوگ کہتے ہیں خود کو گنوا کر ہی کسی کو پایا جاتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" کچھ دیر تک زوار کی باتوں پر غور کرنے کے بعد ماہ نور نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "شاید میں بے اختیاری کی اسٹیج میں داخل ہو چکی ہوں' لیکن بابا! میں سچ میں بے اختیار ہو چکی ہوں۔" اس نے تڑپ کے زوار کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا۔

"میں سمجھ رہا ہوں۔" زوار نے سر ہلایا "اور میرا بس نہیں چل رہا کہ کس طرح کہیں سے اس نالائق لڑکے کو پکڑ کر تمہارے والے سین میں حاضر کردوں۔"

"کیا آپ کا دل ایسا کرنے کو چاہ رہا ہے؟" ماہ نور کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر جھلکی' زوار نے دیکھا اس کی آنکھوں میں پہلی بار ایک عجیب سی چمک اتری تھی۔

"ہاں میرا دل ایسا ہی کرنے کو چاہ رہا ہے۔" انہوں نے اپنے گھٹنوں پر رکھے ماہ نور کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے یقین دلایا۔

"آپ میرے ساتھ ہیں نا بابا؟" ماہ نور نے دوسرا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں' فی الوقت تو میں تمہاری بات سمجھ بھی رہا ہوں اور تمہیں سپورٹ بھی کرنا چاہوں گا بشرطیکہ تم ایک حد سے باہر نہ نکل جاؤ۔"

"نہیں میں ہرگز نہیں نکلوں گی۔" ماہ نور نے بچوں کی طرح سر ہلایا۔

"مجھے معلوم نہیں تم اس کے سلسلے میں کیا کرنے والی ہو لیکن میرا مشورہ ہے کہ ایک بار بھائی سردار سے بھی یہ راز شیئر کر کے دیکھو۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ تمہارے لیے ایک اچھی مدد ثابت ہوں گے۔" زوار نے کہا۔

"میں سب کچھ بہتر خطوط پر کر سکتی ہوں اگر آپ میرے ساتھ ہیں' اگر آپ ممی کو کسی طرح مجھے یہاں اپنا قیام بڑھانے پر کنوینس کرلیں گے تو۔"

"ہاں وہ میں کرتا ہوں کسی طرح۔" زوار نے سر ہلایا۔

ماہ نور نے ممنون اور مسکراتی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔ زوار کی نظروں میں اس کے لیے محبت تھی' یقین تھا اور اعتماد و بھروسہ بھی۔

☼ ☼ ☼

"سارہ!" سیمی آنٹی آنے والے شخص کو دروازے پر ہی چھوڑ کر سارہ کے کمرے کی طرف لپکیں۔ سارہ گود میں لیپ ٹاپ رکھے وہ گانا سن رہی تھی اور اسکرین پر نظریں جمائے اس کا ویڈیو بھی دیکھ رہی تھی۔

"سارہ!" سیمی آنٹی نے آگے بڑھ کر لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر جڑا بیک اسپیس کا بٹن دبا دیا۔

"کیا ہوا؟" سارہ نے چونک کر سیمی کی طرف دیکھا۔ سیمی آنٹی کے چہرے پر سراسیمگی تھی اور ان کی ٹانگیں جیسے کسی کے رعب کی وجہ سے کپکپا رہی تھیں۔

"ہوا کیا ہے' آپ بتا کیوں نہیں رہیں آخر؟" سارہ نے جھنجلا کر پوچھا۔

"وہ ادھر۔۔۔" سیمی نے کانپتی آواز میں کہتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"افوہ کیا ہے ادھر؟" سارہ نے گود میں رکھا لیپ ٹاپ اٹھا کر میز پر رکھا اور اس کا چارجر اور تاریں اٹھا کر سائیڈ پر لڑھکا دیں۔

"ہے کیا ادھر جن' بھوت دیکھ لیے یا کسی کا سایہ؟" وہ بڑبڑاتے ہوئے ساتھ والے کمرے کی طرف چلی۔ دونوں کمروں کے درمیانی دروازے تک آکر وہ رک گئی بلکہ اسے رک جانا پڑا۔ دوسرے کمرے میں موجود وہ شخص اس کے سامنے تھا جو قطعاً" اجنبی ہوتے ہوئے بھی نجانے کیوں اسے بے حد مانوس شکل لگا تھا۔ یوں جیسے اسے کئی بار دیکھ چکی ہو شاید وہ التباس کا شکار ہو رہی تھی' وہ دروازے پر ہاتھ رکھے وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

"کیا بات ہے تم وہیں رک کیوں گئیں؟" اس کے سامنے کھڑے شخص نے کہا۔ جواب میں سارہ سے کچھ کہا نہیں گیا بس وہ وہیں کھڑے ایک ٹک اس شخص کو دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

"یہاں تو میں تم ہی سے ملنے آیا ہوں۔" آنے والے نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
دروازے کے درمیان کھڑی 'سفید لباس میں ملبوس' زرد رنگت' سیاہ آنکھوں والی وہ لڑکی شاید اس شخص کو بھی خاصی مانوس لگی تھی جب ہی دوستانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے شانے پر بکھرے سیاہ بالوں کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظر دروازے پر رکھے اس کے ہاتھ پر رک گئی' ایک نحیف اور زرد ہاتھ' جس کی رگیں کھنچی ہوئی تھیں۔
"کیا وہیں کھڑی رہو گی؟" اس کے ہاتھ سے زبردستی نظریں ہٹاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔
"آپ کون ہیں۔" سارہ نے مسلسل اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھاری مگر نیچی آواز میں سوال کیا تھا۔
"میں بلال سلطان ہوں۔" اس شخص نے اپنا تعارف کروایا تھا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ سعد سلطان کے باپ کا نام بلال سلطان ہے۔"
"نہیں۔" سارہ نے پہلی بار صورت حال کو سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ "ہم اس سے متعلق کسی کو نہیں جانتے۔"
"ہم!" وہ شخص مسکرایا "اور کسی کو نہیں جانتے۔" اس نے ابرو چڑھا کر سارہ کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "سوچ لو کیا واقعی تم اس سے متعلق کسی کو نہیں جانتیں۔"
"ماہ نور کو بھی نہیں؟" اس نے سوال کیا۔
"ماہ نور میری دوست ہے۔" سارہ نے وہیں کھڑے کھڑے ایک ٹانگ سے جسم کا بوجھ دوسری ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔
"بالکل' دوست کا دوست بھی دوست ہی ہوتا ہے۔" وہ مسکرایا "اور میں تو دوست کا باپ ہوں' یقیناً" میں اس سلوک کا مستحق نہیں ہوں کہ مجھے اتنی دیر تک یہاں کھڑا رکھا جائے۔"
سارہ نے ایک نظر ان پر ڈالی اور دروازے کا سہارا چھوڑ کر پیر گھسیٹتی آگے بڑھی۔
"آپ پلیز تشریف رکھیں۔" اس نے اس لاؤنج کم ڈائننگ روم قسم کے کمرے میں رکھے تو سیٹر صوفے کی طرف اشارہ کیا وہ صوفے پر بیٹھ گئے اور کمرے میں موجود چیزوں پر طائرانہ نظر دوڑائی' سیمی آنٹی بھی سارہ کے کمرے سے نکل کر ادھر آ گئیں۔ ان کے چہرے سے ابھی بھی گھبراہٹ عیاں تھی۔
"یہ سعد کے فادر ہیں سیمی آنٹی! آپ کیوں گھبرا گئیں اتنا؟" سارہ نے کہا۔
"سعد کے فادر ہیں' اسی لیے تو گھبرا گئی شاید۔" سیمی نے دل میں سوچا "یہ یہاں کیسے اور کیوں آ گئے' اب نجانے آگے کیا ہونے والا ہے۔"
"میں نے تمہارے بارے میں صرف سنا تھا' آج تمہیں دیکھنے اور ملنے بھی چلا آیا۔" بلال نے سارہ کے چہرے پر نظر آتی گھبراہٹ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
سارہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ فرش کو تک رہی تھی۔
"مجھ سے ملنے مجھے دیکھنے۔" اس نے سوچا "یقیناً" ماہ نور نے ان سے میرا ذکر کیا ہو گا۔ جو بات سعد نے ان کو نہیں بتائی وہ ماہ نور نے بتا دی
ٹیپیکل گرلش مینٹیلیٹی (Typical girlish mentality)" اسے غصہ آنے لگا۔
اس نے سعد کی محبت کا راز کیا پا لیا' لگتا ہے آپے سے باہر ہی ہو گئی یہ بھی نہیں سوچا کہ سارہ تو اس کے محبوب کا راز ہے' اسے عیاں نہیں کرنا چاہیے مگر نہیں۔" اس نے سوچتے سوچتے نفی میں سر ہلایا۔ "سعد کی زندگی میں میری حقیقت اچھی طرح جان لینے کے بعد بھی وہ جیلسی ہی کا شکار رہی اور یقیناً" ان صاحب سے جا کر جڑ دیا ہو گا۔ اب یہ۔" اس نے کن انکھیوں سے سامنے بیٹھے بلال سلطان کی طرف دیکھا "ہمیں یہاں سے بے دخل ہی

کرنے آئے ہوں گے اور بے دخل کر کے ہی چھوڑیں گے' کیونکہ وہ خود تو نہ جانے کہاں ہے' جو اگر میرے لیے اس دنیا میں کہیں موجود ہے تو ایک' دو' تین سے آگے گنتی تو نہ گننی پڑتی مجھے۔"
وہ سوچ رہی تھی اور اس کے سامنے بیٹھے بلال سلطان اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔
کمرے میں موجود تیسرا کردار سیمی آنٹی مسلسل اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے دعائیں پڑھنے میں مصروف تھیں انہونی کو ٹالنے کا ان کے پاس یہ واحد ذریعہ تھا۔
"بہت عرصے کے بعد میں نے یہ مخصوص ماحول دیکھا ہے۔" بالآخر کمرے کی خاموشی کو توڑتے ہوئے بلال سلطان نے سیمی ہی کو مخاطب کیا "اور یقین جانو' مجھے بہت اچھا لگا۔"
سیمی کی نظروں نے اجنبی مہمان کی نظروں کا تعاقب کیا۔ وہ دیوار کے ساتھ رکھے کنسول پر سجی چیزوں کو دیکھ رہے تھے۔
"اس کو ڈچ سیٹ بولتے ہیں غالباً"۔" انہوں نے اٹھ کر اس کنسول کے قریب جاتے ہوئے کہا اور اس پر رکھے سفید ٹیپسٹری پر سفید ہی کڑھت سے ابھرے پھولوں والے ڈچ سیٹ پر انگلی پھیری "کروشیا سے بنا یہ میز پوش۔" انہوں نے ایک اونچی گول تپائی کو ڈھانپتے میز پوش کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ کٹ ورک ہے' ہے نا۔" وہ پھر ڈائننگ ٹیبل پر رکھی ٹی کوزی کے سیٹ کی طرف بڑھے اور پھر سیمی آنٹی کی طرف مڑ کر بولے۔ "طویل عرصے کے بعد دیکھ رہا ہوں یہ سب۔" انہوں نے کہا "دیکھا تو شاید کئی جگہ پر ہو گا مگر ایک گھریلو عورت کی انگلیوں سے بنے شاہکار عرصے کے بعد دیکھ کر میں بہت امیزڈ (حیران) amazed ہو رہا ہوں اور اس کے لیے میں تم لوگوں کا ممنون ہوں۔"
سیمی اور سارہ نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا وہ مذاق اڑا رہے تھے یا پھر ان کی بات میں سچائی تھی۔
"میں نے ایک چھوٹی اکائی سے کروڑوں تک کا طویل سفر کر رکھا ہے۔ ایک صفر سے چلا اور ہر گام پر صفر بھی بڑھتے گئے اور اس کے ساتھ لگنے والے ہندسے بھی مگر میں تم لوگوں کو ایک بات بتاؤں' انسان لاکھ بھولنا اور بھلانا چاہے' وہ اپنی اکائی کو نہیں بھلا پاتا یا کم از کم میں نہیں بھلا پایا جب ہی تو اولین اکائی سے منسوب چیزیں دیکھ کر بھی اور اس آگے آنے والی ہر دہائی سے منسوب چیزیں دیکھ کر بھی میں اس کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہوں جسے ناسٹیلجیا کہتے ہیں۔"
انہوں نے باری باری سارہ اور سیمی آنٹی کی طرف دیکھا۔ ان پر مرکوز ان کی نظروں میں ایک ہی پیغام چھپا تھا۔ "اس وقت تم مختار ہو' تمہارے اختیار میں ہے جو چاہے کہو کہتے چلے جاؤ۔" وہ ہلکا سا مسکرائے اور آہستہ قدموں سے چلتے واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے۔
"میں معذرت خواہ ہوں' شاید میں نے تم لوگوں کو پریشان کر دیا۔ جبکہ میں تمہیں پریشان کرنے کی نہیں تمہاری پریشانیاں بٹانے کی نیت سے یہاں آیا تھا۔"
سارہ اور سیمی نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
"سارہ! کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی کہ تم کب اور کیسے سعد سے متعارف ہوئیں؟" پھر وہ نرمی سے بولے۔
"آپ کو ماہ نور نے یہ نہیں بتایا؟" سارہ کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔
"میں اس سے تمہارے بارے میں کیوں کچھ سنوں گا' میں تو تم سے تعارف حاصل کرنے خود یہاں تمہارے پاس آیا ہوں' ماہ نور کا اس بات سے کیا لینا دینا؟"
سارہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
"اور یہ بھی یقین کر لو' میرے یہاں آنے میں میری کوئی بدنیتی یا دل کا کھوٹ شامل نہیں ہے' میں تم سے صرف

تمہاری باتیں کرنے یہاں آیا ہوں۔"

"آؤ آج ہم مل کر صرف تمہاری باتیں کرتے ہیں۔" سارہ کو سعد کی کہی ایک پرانی بات یاد آئی۔ اس کے دل نے ایک دھڑکن چھوڑدی۔

"میری باتیں۔" اس نے ان کی طرف دیکھا "میری باتیں جتنی زیادہ ہیں۔ اتنی ہی غیر اہم بھی ہیں اور آپ کا وقت میں جانتی ہوں کہ بہت قیمتی ہے۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"میں تمہاری بہت زیادہ باتیں سننے کے لیے ہی وقت نکال کر آیا ہوں۔" انہوں نے سارہ کے جملے سے غیر اہم کا لفظ نکالتے ہوئے کہا اور پھر یمی کی طرف دیکھا "آپ مسلسل کھڑی کیوں ہیں خاتون! بیٹھ جائیے اور آپ بھی سنائیے یقیناً" اس بچی کی باتوں میں آپ کا کردار بھی خاصا اہم ہوگا۔"

یمی آنٹی کا ذہن متوقع صورت حالات کے بارے میں مسلسل سوچ سوچ کر ماؤف ہو رہا تھا وہ کسی روبوٹ کی مانند دو قدم چلیں اور ایک کرسی پر ٹک گئیں۔

"ہوں!" بلال سلطان نے سارہ کی طرف دیکھا "اب بولو۔"

☆ ☆ ☆

"یہ آب زم زم میں بھگوئی تسبیحاں، تھیلی بھر عجوہ کھجوریں اور چند جاء نمازیں، کب تک ہماری روزی کا وسیلہ بنے رہیں گے، محلے بھر کے لوگ اب ہماری اس انوکھی دکان داری پر ہمارا مذاق اڑانے لگے ہیں۔ جو چیزیں حاجی اپنی واپسی پر تبرک کے طور پر تحفے میں دیتے ہیں، وہ ہی چیزیں ہم بیچ رہے ہیں۔"

"تحفے اپنوں کو دیے جاتے ہیں اور ہمارا اپنا کون ہے یہاں بھلا۔ اسی لیے تو ہم لوگوں کو بیچ رہے ہیں۔"

"بھولی ہو تم بھی، چند روپوں کے عوض اگر ہم سے یہ کوئی خرید بھی لے جاتا ہے تو ان چند روپوں میں نہ آٹا پورا ہوتا ہے نہ دال۔ اور اب یہ بھی گنتی گئی ہیں چند ایک باقی ہیں۔ ان سے مزید کتنے دن گزریں گے۔"

"واہ رابعہ بی بی! اتنا وقت دیکھ لیا، اتنا وقت گزر گیا، تمہارا ایمان اسی طرح کمزور رہا جیسے پہلے تھا، حج کر آئیں، عمرے بھی کر لیے تم اپنی آنکھوں سے وہ سب دیکھ آئیں جن پر نظر پڑتے ہی کافر سے کافر دل بھی مومن ہو جاتے ہیں مگر تم ہو کہ ابھی بھی کل کی فکر میں پڑی ہو، کتنا کہا تھا کہ کلمہ پڑھ لو، ہو جاؤ مسلمان پر تم نے میری بات پر کان دھر کے نہ دیا۔"

"لو میں پیدائشی مسلمان، میرا ابا مسلمان میری اماں مسلمان، پھر بھی جب تم نے کہا کہ نہیں رابعہ تمہارا دل ابھی بھی کافر ہے تو کیا تمہارے کہنے پر میں نے وضو کر کے کلمہ نہیں پڑھا تھا، تمہارے بقول سچی مچی کی باقاعدہ مسلمان بننے کے لیے۔"

"میں بھی سمجھی تھی کہ تم کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئیں، مگر آج اپنے دل میں جھانکو تو پتا چلے کیسا کافر ہے وہ، آج پیٹ بھرا نہیں کل کی فکر پڑ گئی۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور معبود سے زیادہ عبد کی کسی کو فکر ہوگی رابعہ بیگم! کاش جو تم سمجھ جاؤ۔"

"میری سمجھ میں تو اللہ جانے تمہاری باتیں بالکل نہیں آتیں۔"

"چار لفظوں کے معنی جان جاؤ بس تو سمجھو پوری کتاب پڑھ لی تم نے، وہ چار لفظ سنو۔ توکل، فقر، غنا اور سادگی۔"

"مطلب؟"

"مطلب کہ یہ چار عناصر ہوں تو بنتی ہے زندگی آساں"

"ذرا ان کا مطلب تو سمجھاؤ ایک ایک کر کے۔"

"ایک ایک کر کے کیا بتاؤں، اصل میں چاروں ایک ہیں۔"

"سمجھ گئی، تم مجھے بتانا چاہ رہی ہو کہ فاقے کاٹنے سے ثواب ملتا ہے۔"

"اللہ کی شان ہے، ہر انسان اپنی بساط کے مطابق ہی سمجھتا ہے۔"

"فاقے کاٹنے کی عادت تو ڈالنے کی کوشش کرتی ہوں مگر پڑتی نہیں کیا کروں۔"

"سراج سرفراز کو جدھر نوکری مل رہی ہے، اسے کہو کہ وہ نوکری کر لے۔ تم وہ جی تو فاقے کاٹنے سے بچ جاؤ۔"

"نوکری معلوم بھی ہے کہ کدھر مل رہی ہے، جامع مسجد کے امام صاحب نے اس سے کہا ہے کہ یزمان منڈی میں ایک چھوٹی سی مسجد میں ضرورت ہے، بچوں کو قرآن پاک بھی پڑھانا ہے اور پانچ وقت نماز کی امامت بھی کرانی ہے۔"

"تو پھر سوچ کیا رہے ہو تم لوگ، سراج سے کہو نوکری سنبھالے۔"

"اللہ جانے یہ یزمان منڈی ہے کدھر، اللہ جانے وہاں کے لوگ کیسے ہوں، میں تو کبھی نہ جانے دوں۔"

"گھر آئی روزی رزق کو ٹھوکر نہیں مارتے، تم ہی کو تو گلہ تھا سراج سرفراز کوئی کام نہیں کرتا اب کام مل رہا ہے تو تم ہی روک رہی ہو۔"

"اچھا یہ بات ہے تو چلو پھر تینوں چلتے ہیں مسجد کے اندر چھوٹی سی رہائش بھی ہے، ادھر رہ لیں گے تینوں۔"

"مجھے ساتھ کدھر گھسیٹے پھرو گے تم لوگ، میں ادھر ہی اچھی ہوں، اب تو یہ نیا محلہ بھی اپنا اپنا لگنے لگا ہے۔ لوگ عزت احترام دیتے ہیں، حاجن بی بی کہہ کر پکارنے لگے ہیں، ہاں تم دونوں کا وقت ہے، تم دونوں کی زندگی کا آغاز ہے اگر بہتر موقع ملتا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

"تم جانتی ہو نا میں نے سراج سرفراز سے نکاح تمہاری خاطر کیا تھا، تمہارے کہنے پر ورنہ جو میں اس کے بارے میں خیالات رکھتی تھی وہ اسے ابھی بھی معلوم ہو جائیں تو ایک دم بھاگ جائے یہاں سے، پھر بھی کہتی ہو کہ تمہیں یہاں چھوڑ کر اس کے ساتھ چلی جاؤں۔"

"شوہر کے بارے میں ایسے حقارت آمیز لہجے میں گفتگو تمہیں زیب نہیں دیتی رابعہ۔ نہ کیا کرو ایسی باتیں گناہ ہوتا ہے۔"

"ہاں اور دل کی دل میں رکھ کر ثواب کے چکر میں پڑ جاؤں تمہاری طرح، اس کی خاطر دل کی دل میں رکھے بیٹھی ہو جس بے وفا اور ہرجائی نے مڑ کر دیکھا بھی نہیں، ہو کس حال میں اور کم بخت ہمارا بچہ بھی لے اڑا۔"

"رابعہ میں ان کے بارے میں ایک لفظ بھی گستاخی کا نہیں سن سکتی، وعدہ کرو آج کے بعد اس لہجے میں ان کے بارے میں بات نہیں کرو گی۔"

(کیا مشرقی عورت ہے یہ بھی بھئی، اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ یہ ہم سے بھی تعظیم کرائے جاتی ہے۔)

"اچھا... اچھا... ٹھیک ہے۔ نہیں کرتی۔"

"اور تم بھی سراج سرفراز کی عزت کرنا سیکھو۔ شوہر کی وفادار اور تابعدار بیوی ہی آخرت میں کسی اچھے کی امیدوار ہو سکتی ہے۔"

"تو تم کسی اچھے کے لیے دولہا بھائی کی وفاداری کر رہی ہو۔"

"میرے نامہ اعمال میں جتنی سیاہ کاریاں ہیں۔ ان کا دھلنا فقط ایک وفاداری سے کہاں ممکن ہے۔ میں تو فقط کوشش ہی کر سکتی ہوں کہ جو چند لکیریں رہ گئی ہیں، ان پر ہی میرے حق میں کچھ اچھا لکھا جا سکے۔"

"سیاہ کاریاں؟ ارے کاہے کی سیاہ کاریاں... گھر سے تم خود نہیں بھاگی تھیں۔ تمہارے باپ نے تمہیں بے

دخل کردیا۔ خاندان بھر میں سے کسی کو اشک شوئی کی توفیق نہیں ہوئی۔ اپنی روزی روٹی کے لیے برائی کا دھندہ نہیں کیا تم نے۔ ہاں اس خداداد صلاحیت سے فائدہ اٹھا کر توفیق بھر رزق ضرور کمایا۔ مارے گناہ کے خوف کے ریڈیو چھوڑا، اپنے ریکارڈ جلا دیے۔ ایک بظاہر نیک شریف مرد سے نکاح کیا۔ اس کا بچہ پیدا کیا، پھر بھی تقدیر نے تمہارے ساتھ کیا کیا۔ اگر کچھ غلط ہوا بھی تو اس کی سزا تو تم نے قدم قدم پر بھگت لی۔ پھر کون سی سیاہ کاری باقی رہ گئی تمہارے نامہ اعمال میں آخر۔"

"اپنے بیان کی صحت درست کرلو تو تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔ کیسی سیاہ کاریاں... ماں، باپ کی نافرمان... بغاوت کرکے گھر سے نکلی... خاندان شریف اعلا حسب نسب کا حامل "اسے تو مجھ پر تھوکنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ اشک شوئی کرنے کی بات کرتی ہو۔ حکم ہے کہ آواز کا بھی پردہ کرنا چاہیے ایک مسلمان نیک بی بی کو... میں اپنی آواز کی تانیں سُر کی لہروں پر بکھیر کر ہر سو پھیلاتی رہی۔ طیفے لاٹروں جیسی کی سرپرستی میں محافل موسیقی کا اہتمام کرتی رہی اور ان کے عوض ملنے والی رقم سے گھر کا خرچا چلاتی رہی۔ جو نکاح کیا تو بھی چوروں کی طرح... بچہ پیدا کیا تو بھی چوروں کی طرح... نہ میں طیفے لاٹر سے اپنے لیے پناہ طلب کرتی، نہ وہ یوں جان کا دشمن ہوتا۔ کوئی ایک سیاہ کاری ہو اعمال نامے کی تو کہوں۔ کچھ سیاہ عملوں کے نشان تو سزا کے طور پر میرے چہرے پر چھپے ثبت ہو گئے۔ آواز جس کا غرور تھا اور جس کے غرور پر ماں، باپ کی دل شکنی کرکے بغاوت کرکے گھر سے نکلی وہ آج ایسی ہے کہ کیا پھٹے ڈھول کی ہوگی۔ جو نے خوف کھائے، سزا کا عمل تو دنیا ہی سے شروع ہو گیا۔ آخرت کا سوچوں تو خوف کے مارے کانپ کانپ جاتی ہوں۔ اب بھی ہوش نہ آئے تو مجھ جیسا کوئی بدقسمت بھی ہوگا۔"

"ہائے میرے مولا! مجھے تو خوف کے مارے جھرجھری آگئی۔ اے اللہ کا واسطہ ہے، میرے بیان کی صحت مت درست کرنا۔ آئندہ کبھی، مجھے میرا بیان ہی ٹھیک ہے۔"

"تو پھر اتنا ہی کرلو کہ سراج سرفراز کی عزت کرنا سیکھ لو۔ یہ سیکھ لیا تو سمجھو آدھی آخرت تو سنور گئی۔"

"اچھا بھئی... کوشش کرتی ہوں۔"

"صرف کوشش نہیں، عمل... عمل کرنا سیکھو۔"

"ہاں... ہاں... وہی... وہی عمل۔"

"تمہارے لہجے کی ناگواری ہی مجھے تمہاری نیت کا پیغام دے رہی ہے۔"

"توبہ ہے، تم تو پیچھے ہی پڑ گئیں۔"

"پیچھے پڑوں گی ہی تو تم بھی مانو گی۔"

"اچھا... اس بات کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تسبیحیں اور کھجوریں ختم ہو گئیں تو آگے روزی کا کیا وسیلہ ہوگا؟"

"اللہ مسبب الاسباب ہے۔ وہ ہی روزی عطا کرنے والا ہے... ماسی صغراں ہے نا تندوروالی۔"

"ہاں... ہاں...!"

"وہ کل کہہ رہی تھی کہ لوگ بچیوں کو مسجد نہیں بھیجنا چاہتے۔ ناظرہ کے لیے... اگر میں بچیوں کو قرآن پڑھانا شروع کردوں تو... ایک وقت کی روکھی سوکھی کا انتظام بھی ہو جائے گا اور بچیاں بھی قرآن پڑھ لیں گی۔"

"اللہ تیری شان... ہوا کے دوش پر سُر کی تانوں کے ساتھ آواز کی لہریں بکھیرتی گائیک... بچیوں کو ناظرہ قرآن پڑھائے گی اور جو بچیاں معصوم تمہارا چہرہ دیکھ کر خوف کھا گئیں تو... اللہ توبہ اللہ توبہ میں بھی کیسی کیسی باتیں سوچنے لگتی ہوں... استغفار... استغفار..."

☼ ☼ ☼

اس کی سماعت سے کہیں قریب سے آتی ہلکی سی آواز ٹکرائی تھی۔ اس کے دماغ نے اس آواز کی لہروں کو وصول کیا تھا۔ اس کا ذہن جیسے ایک طویل نیند سے جاگا تھا۔ لیکن ابھی بھی اس پر غنودگی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس نے اپنی بند آنکھوں کو کھولنا چاہا، مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے قریب کھڑے لوگوں نے دیکھا۔ اس کی اس کوشش کے نتیجے میں اس کی پلکیں ذرا سا لرز کر پھر ساکت ہو گئی تھیں۔

"ردعمل ظاہر ہو رہا ہے۔" اسے محسوس ہوا اس کے کانوں نے یہ الفاظ سنے تھے۔ وہ ان الفاظ کا مفہوم سمجھ سکتا تھا۔ اس نے سوچنا چاہا وہ الفاظ کس زبان میں بولے گئے تھے۔ مگر اس کا ذہن مزید سوچنے کا بوجھ نہیں اٹھا پایا تھا... وہ پھر سے غنودگی میں جانے لگا تھا... وہ دوبارہ غنودگی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔

"آف...!" اس کے بند ہونٹوں سے ایک آواز نکلی تھی۔ اس کے اردگرد کھڑے لوگوں نے چونک کر یہ "آہ" سنی تھی اور ان کے چہروں پر مسرت اور امید کی ایک لہر دوڑ گئی تھی... یہ زندگی کی نوید کی لہر تھی... وہ سب لوگ جو اس کے سر پر کھڑے اس کی سانسوں پر نظر رکھے ہوئے تھے، ان میں سے ہر کسی کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ سکی ڈائیونگ کی تاریخ میں سر کے بل گرنے کے نتیجے میں آنے والی چوٹوں سے زندہ بچ جانے کی مثالیں کتنے فیصد تھیں۔ اس کے لیے بیٹھنے والے طبی بورڈ میں موجود صرف دو ڈاکٹروں کی رائے تھی۔

"ضرب کھوپڑی کے صرف اوپری حصے پر آئی ہے۔ اندرونی حصے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔"

اس کی زندگی کے سلسلے میں سب سے زیادہ پرامید ڈاکٹر مائیکل تھا۔

"بے ہوشی کی کیفیت قے یا ناک کے ذریعے خون نہ بہنے اور چوٹ کے اندر ہی جم جانے کی وجہ سے ہے۔ اگر سرجری کے ذریعے جمے ہوئے خون کو ہٹایا جا سکا تو زندگی کی امید بہت زیادہ ہے۔ شاید ننانوے اعشاریہ نو فیصد سے بھی کچھ زیادہ ہی..." ڈاکٹر پال نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا تھا۔

ڈاکٹر اپنی ہی کوشش میں مصروف تھے اور ڈاکٹروں کی اس سرگرمی سے ہٹ کر باہر ایک اور ذی روح اس کے ساتھ زندگی اور موت کی سی کیفیت میں گرفتار اپنی ہی کوشش میں مصروف تھی۔ اس نے بھی ڈاکٹروں کے ساتھ ساتھ اس کی آتی جاتی سانسوں کو گنا تھا۔ ڈاکٹر دوا اور سرجری میں مصروف تھے۔ وہ دعا اور پکار میں مگن تھی۔ اس نے اپنی اب تک کی زندگی میں اتنی شدت سے اپنے لیے کچھ نہیں مانگا تھا اور جب اپنے لیے مانگنے کو اپنے اللہ کو پکارنے لگی تھی تو شدت کی آخری حد تک پہنچ گئی تھی۔

"تم ایک عہد کرکے گزارش کرو گی تو مجھے یقین ہے تمہاری عرض داشت کا جواب جلد اور مثبت آئے گا۔" ڈاکٹر رضا حسین نے اس سے کہا تھا۔

"کیسا عہد؟"

"یہ عہد کہ دعا کا جواب جو بھی آئے، تم اس جواب پر راضی برضا ہو گی، شکوہ، شکایت، گلہ گزاریوں کی اندھی گلی میں پھنسنے سے گریز کرو گی۔"

انہوں نے اسے ایک کٹھن کام سونپا تھا۔ انسانی جذبات کی برداشت سے باہر کام... مگر شاید یہ ہی شرط تھی اور وہ اس راستے سے ہٹ کر کوئی اور راستہ اپنانے پر تیار نہیں تھی اور وہ اسی صبح کی شام تھی جب اس نے اپنے دل میں پختہ عہد کیا تھا کہ وہ اس کی رضا میں راضی رہے گی۔ صبح کو کیا گیا عہد شام کو زندگی کی نوید لے کر آیا تھا۔

"آف...!" ہر پندرہ، بیس منٹ کے وقفے کے بعد انتہائی نگہداشت کے شعبے میں بستر پر پڑے اس کے بھائی کے منہ سے نکلنے والی یہ آواز اس کے لیے گویا پہروں گفتگو کے برابر ثابت ہو رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹروں سے درخواست کرکے دو، تین مرتبہ اپنے کان لگا کر یہ آواز سنی تھی... یہ زندگی کی نوید تھی۔

زندگی ابھی باقی تھی... زندگی تھی تو سب کچھ تھا۔ وہ کتنے دنوں سے جن کانٹوں کے درمیان کھڑی تھی... وہ یکایک جیسے پھولوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ زندگی سے بھرپور رنگا رنگ پھول۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو۔ کیا یہ رضوان الحق کا نمبر ہے؟"

"السلام علیکم۔ جی جی۔ میں رضوان الحق ہی بات کر رہا ہوں۔"

"کیسے ہو تم رضوان الحق؟ میں ماہ نور بات کر رہی ہوں۔ شاید کھاری کے ریفرنس سے میں تمہیں یاد ہوں گی۔"

"میں معذرت خواہ ہوں' یہاں بہت شور ہے جہاں میں کھڑا ہوں' آپ مجھے صبح کے وقت کال کر سکتی ہیں کیا؟ یہاں میں آپ کی بات سن نہیں پا رہا۔"

"مجھے تم سے بہت مختصری بات کرنی تھی۔"

"نہیں جی۔ دیکھیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔"

"اف۔ آخر تم کھڑے کدھر ہو؟"

"میرے پاس آپ کا نمبر آگیا ہے۔ ایسا کرتا ہوں کہ میں آپ کو خود کال کرلوں گا فارغ ہونے کے بعد۔"

"تم مجھے مس کال دے دینا میں تمہیں خود کال کرلوں گی۔"

"اوف۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا۔"

اس نے فون بند کردیا اور ایک نظر کال کرنے والی کے نمبر پر ڈالی۔

"پتا نہیں کون تھی اور مجھے کیسے جانتی تھی اور مجھے کیوں کال کر رہی تھی۔" اس نے سوچا۔ اس کے پاس اس وقت اپنے ان تینوں ہی سوالوں کا جواب نہیں تھا اور مزید غور کرنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ فون بند کرکے اس نے اپنی قمیص کی جیب میں رکھا اور مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔

اس کے سامنے روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ قطار در قطار رکھی کرسیوں سے بھرے پنڈال میں تماشائیوں کی رونق بڑھ رہی تھی۔ شام کا شو شروع ہونے والا تھا۔ وہ ہولے سے مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر لگی سفیدی پھیلی اور اس کے رخساروں پر گول ٹکیا کی مانند لگی سرخی نمایاں ہونے لگی۔ اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑی سبز اونی بالوں والی وگ سر پر جمائی اور اس پر مسخروں والا ہیٹ رکھ دیا۔ جیب سے سفید پنگ پانگ گیند نکال کر اس کے کھلے حصے کو ناک پر جمایا۔ اس کا سبز گول دائروں والا پیلا پاجامہ اور ہری جیکٹ ایک دن پہلے ہی سل کر اس کے ہاتھ آئی تھی۔ جسے اس وقت زیب تن کیے اپنے دیگر لوازمات سے لیس وہ تماشائیوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرنے کو ایک مرتبہ پھر تیار تھا۔ تیز روشنیوں کے عین نیچے تماشائیوں کی تالیوں اور سیٹیوں پر ہاتھ ہلاتا اپنے کرتب دکھاتا وہ بلیو ہیون سرکس کے تماشائیوں کو کتنے سال بعد نظر آیا تھا۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اس انتظامیہ سے شدید ناراضی کے سبب اس سے منہ موڑ کر جانے والا مقبول عام مسخرہ نجانے کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے بعد ایک بار پھر ان کے درمیان واپس آموجود ہوا تھا۔ یقیناً "اس شہر میں قیام کے دوران ہونے والے سرکس کے تمام شوز میں پچھلے کچھ سالوں کی نسبت انہیں زیادہ آمدنی کی امید بندھ چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک بند کمرے میں ایک مرد اور ایک عورت کی گفتگو۔

کھٹ کھٹاک کی آواز۔

نسوانی آواز۔ "ارے کون ہے' کون ہے بھئی؟"

جواب میں کمرے کے ماحول پر خاموشی چھائی رہی۔

"کون ہے ایک تو اس بجلی کو بھی آئے روز خراب ہونا ہے۔ لالٹین میں بھی تیل بھرنا بھول گئی رابعہ۔"

قدموں کی آواز۔

"ک۔ کون ہے ادھر' رابعہ۔ ارے رابعہ؟"

"شور مت مچاؤ' یہ میں ہوں۔"

"ت۔ تم۔؟"

"ہاں میں۔"

"تم کہاں سے آئے؟ کدھر سے آئے؟ دروازہ کس نے کھولا؟"

"میں دروازے سے نہیں آیا ہوں' میں اس کھڑکی کے راستے آیا ہوں جو تم نے کھول رکھی ہے۔"

"کیوں اس طرح کیوں آئے۔ تم اتنا عرصہ رہے کہاں' تم مجھے چھوڑ کیوں گئے۔ میرا بچہ کدھر ہے۔ تم اسے ساتھ کیوں نہیں لائے۔ تم مجھے چھوڑ کیوں گئے' تم ہرجائی ہو' بے وفا ہو' دغا باز ہو' کیا ہو تم؟"

"آرام سے۔ آرام سے بیٹھو ادھر ذرا۔ میں اس لالٹین کی روشنی میں تمہیں دیکھ تو لوں' سوال بہت ہیں اور ان کے جواب بھی بے شمار۔ مگر میں جو تمہیں دیکھنے کو ترسا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی صورت تو دیکھ لینے دو۔"

"میرا ہاتھ چھوڑ دو' اور میرا مذاق مت اڑاؤ' جو میری صورت کا حال ہے' جیسی میں اب دکھتی ہوں' میں اچھی طرح جانتی ہوں' میری صورت کا یہ حال ہو جانے پر ہی تو تم بھاگ لیے۔ ٹھیک کہتے تھے تم۔ میرا حسن تمہیں مبہوت کردیا کرتا تھا۔ مبہوت ہونے کا وہ عالم ٹوٹا اور تمہاری دنیا اور سے اور ہی ہو گئی۔"

"اچھا۔ گویا تم بھی یوں ہی سوچتی ہو' قسم لے لو اگرچہ خود تمہارے منہ سے اور اپنے کانوں سے سن رہا ہوں سنی سنائی نہیں' مگر مجال ہے جو مجھے یقین آیا ہو کہ تم بھی ایسا ہی سوچتی ہو۔"

"رابعہ کہتی ہے کہ۔"

"رابعہ کی چھوڑو۔ اسے تو یہ ہی کہنا ہے۔ وہ ذات کی میراثن ہے۔ اس نے توصیف پر اترنا ہے تو آسمان کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش کرنی ہے اور اگر تبرا بکنا ہے تو زمین کی پستیوں میں اتار دینا ہے۔ تم اس کی نہیں اپنی سناؤ' مجھے تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"

"میرے۔" جھجکتا لہجہ۔ "میں نے کیا سوچنا ہے۔ مجھے کیا کہنا ہے۔ میں اپنے دل کو دیکھوں تو آج بھی اس حسین وادی میں کھڑا ہے جہاں تم اسے چھوڑ گئے تھے۔ مگر دماغ کی طرف دھیان دوں تو جو گزری' وہ ماہیت دماغ کے لیے اتنا کافی ہے کہ دنیا میں دل لگانے کو جی نہیں چاہتا اور یہ ایسی حقیقت ہے کہ دل کی مجال نہیں جو اس کے سامنے دم مارنے لگے۔"

"خیر۔ میں نہیں مان سکتا کہ تم نے اپنے دل کی دنیا سے مجھے نکال پھینکا ہے۔ کیونکہ جو مرضی تمہارے یہ خیالی سوالی کہیں' تم بھی جانتی ہو کہ میرے دل پر تمہارے حسن کی ہیبت کا عالم کبھی ٹوٹا نہ ٹوٹ سکتا ہے۔ تمہارا حسن' تمہاری شکل کے حسن تک ہی محدود تھوڑی ہے' تمہارا حسن تمہاری پوری شخصیت پر چھایا ہوا ہے۔ تمہارے کردار پر' تمہارے افکار پر' تمہاری گفتگو پر' تمہاری سوچ پر' شکل کا حسن تو یوں بھی وقت اور عمر کے آگے بڑھنے کے ساتھ ماند پڑتا چلا جاتا ہے۔ جو حسن تمہاری پوری شخصیت پر حاوی ہے' اس کا کوئی ثانی نہیں۔"

"باتیں بنانے میں ماہر تو تم ہمیشہ سے ہو' مگر عمل کے نام پر کیا کیا ہے' جانتے ہو' کتنے عرصے سے مجھے تنہا چھوڑے ہوئے ہو۔"

"ایک۔ ایک ساعت کہو تو گن کر بتادوں کتنے عرصے سے۔؟"

"پھر وہی باتیں بنانے کے فن کا مظاہرہ۔"

"دھیرے سے... آرام سے... بدگمانی کی فضا اس قدر پھیل چکی ہے تو مجھے بھی صفائی کا اتنا ہی وقت تو دے دو۔"

"ہاں بولو!"

"تمہاری ذات کے بارے میں... میں کیا کہوں... نظر شناس بھی ہو تم اور مردم شناس بھی... جب ہی تو عاشق کے بڑے بڑے جاگیردار' امین' تاجر' بزنس مین' عاشقی کے دعوے داروں کے ہجوم میں سے مجھ ایسے قلاش عاشق کو ترجیح دے بیٹھیں۔ نہ دی ہوتی تو آج کسی بڑے پیٹ والے کی دوسری بیوی بن کر ہی سہی عیش کر رہی ہوتیں۔"

"تم یہ بات پہلے بھی کئی بار کر چکے ہو' کوئی نئی بات کرو۔"

"سی پرانی بات میں ہی تو مضمر سب نئی باتیں ہیں' قلاش عاشق جب خود کو اپنی حسینہ عالم کے قابل بنانے کی تگ و دو میں ہو تو کئی کٹھن منزلیں راستے میں آتی ہیں اور اس خاکسار کا ٹکراؤ تو پہلے ہی قدم پر عبداللطیف عرف طیفے لاٹرے ہو گیا۔ جب ہی تو ہر گام پر باقی سب کٹھنائیوں کے ساتھ ساتھ طیفے صاحب نے ہم راہی کی گویا قسم کھا رکھی ہے۔"

"کیا مطلب...؟"

"مطلب یہ جان من کہ اس پچھلے محلے میں جہاں تم رہتی تھیں تو حکومت ہی ان صاحب کی تھی تا اور ادھر میرا آنا جانا تمہارے حادثے کے بعد اس نے پہلے سے ہی دو بھر کر رکھا تھا۔ آخری بار جب تم سے رخصت ہو کر سعد کو اس کی حفاظت کی خاطر ساتھ لیے جب میں یہاں سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ حضرت نامحسوس طریقے سے میرا پیچھا کر رہے تھے۔ اپنی عقل و توفیق کے مطابق اس کو جل دیتا' میں کسی طرح پنڈی پہنچ گیا۔ پنڈی میں تم جانتی ہو۔ میرے پاس کرائے کا ایک کمرہ تھا' سعد کی خاطر اس کمرے سے اٹھ کر ایک چھوٹے مکان کو کرائے پر لے لیا۔ سعد کی خاطر کام سے چھٹی کرتا رہا' پھر ایک دوست نے جسے کاروبار میں لگانے کو کچھ سرمایہ دے رکھا تھا تو یہ سنائی کہ کاروبار چل نکلا ہے۔ سعد کو دو بہت ہی نیک' سیدھے سادے میاں' بیوی کے پاس چھوڑنے کا انتظام کر کے دوست کے پاس جا رہا تھا کہ تمہارے عاشق بنام عبداللطیف لاٹرے نے راستہ روک لیا۔"

"ہائے میں مر جاؤں۔"

"مریں تمہارے دشمن' چپ چاپ سنتی جاؤ۔ اپنے ری ایکشنز آخر میں ایک مرتبہ ہی دکھا دینا۔ طیفا لاٹر اپنے مخصوص آلہ قتل یعنی "چھرے" کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ قریب تھا کہ سینے میں گھونپ دیتا۔ دور سے قریب آتی پولیس وین کی آواز سن کر مجھے ان زخموں سے ہی تڑپتا چھوڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا جو اس کے وار سے مزاحمت کے دوران جسم کے مختلف حصوں پر مجھے آئے۔ گشت پر نکلی پولیس وین میرے لیے لائف سیور ثابت ہوئی' مجھے اٹھا کر پولیس والے اسپتال لے گئے جہاں ڈیڑھ مہینہ میں زیر علاج رہا۔ ایک دو' دوست اس دوران میرے کام آئے اور علاج معالجہ ممکن ہو سکا۔ سعد' محفوظ ہاتھوں میں محفوظ جگہ پر تھا۔ اس کی مجھے فکر نہ تھی۔ مگر تمہاری بہت فکر تھی۔ دو مہینے کے وقفے کے بعد چھپتا چھپاتا لاہور آیا۔ پرانے محلے سے تم اپنے حوالی موالیوں سمیت کہیں اور جا چکی تھیں۔ وہ دن اور آج کا دن' تمہاری تلاش میں مارا مارا پھرتے اور خود کو معاشی طور پر مضبوط کرنے کی کوشش میں وقت گزر گیا۔ چند دن پہلے ہی تمہارے اس ٹھکانے کے بارے میں معلوم ہوا۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ طیفا صاحب بھی تمہارا پتا لگاتے یہاں تک پہنچ چکے ہیں۔"

"ہائے میرے خدا! اب کیا ہو گا۔ ہم تو بہت بچ بچا کر رہتے ہیں' کم ہی کسی کے سامنے آتے ہیں۔"

"تم اور وہ رابعہ بیگم تو کم ہی آتی ہوں گی کسی کے سامنے۔ مگر وہ تمہارا جو ٹریڈ مارک ہے سراج سرفراز' وہی کافی ہے دنیا کو بتانے کے لیے کہ تم یہاں رہتی ہو۔"

"ہائے میری قسمت... اب بھی تم کیوں آئے۔ وہ موا تمہاری ہی تو جان کا دشمن ہے۔"

"میں تمہیں باقاعدہ بسانے سے پہلے مرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے چھپتے چھپاتے رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح تم سے ملنے آیا ہوں۔ نہیں چاہتا کہ اسے خبر ہو' میرا تمہارا پھر سے رابطہ ہونے لگا ہے۔"

"ہائے میں مر جاؤں... اس ظالم نے تمہیں کدھر کدھر سے زخمی کیا۔ مجھے دکھاؤ' مجھے بتاؤ' مگر ٹھہرو پہلے اس رابعہ کو تو خبر کر دوں کہ تم بھگوڑے تھے نا بے وفا' تم صرف حسن پرست تھے' نہ خود غرض۔"

"آں ہاں... رکو ادھر ہی' تم نہیں بتا رہیں اس کو کچھ بھی۔"

"چھوڑو میرا ہاتھ' کیوں نہ بتاؤں اسے طعنے دے دے کر میرا کلیجہ چھلنی کرتی ہے ہر وقت۔"

"اسے مت بتاؤ ابھی' وہ پیٹ کی ہلکی ہے' سراج سے کہنے سے باز نہیں آئے گی اور سراج تو چلتا پھرتا اشتہار ہے گھر کے اندر کی باتوں کا۔"

"ارے واقعی ایسا ہے کیا... ہائے اللہ بندہ کس پر اعتبار کرے۔"

"بندی صرف اپنے بندے پر اعتبار کرے۔ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔"

"اللہ کدھر کدھر تمہیں زخم آئے تمہیں۔ اللہ پوچھے اس طیفے لاٹر کو' دیکھو تم نے میری وجہ سے خوامخواہ اس کی دشمنی پال لی' نہ میں ہوتی' نہ تم... میری زندگی میں آتے' نہ طیفے لاٹر سے واسطہ پڑتا۔"

"اگر تم نہ ہوتیں تو میں کیسے ہوتا... تم جانتیں نہیں کہ تم ہو تو میں ہوں' تم سے الگ میں کچھ بھی نہیں۔"

"اب تم ایسے دعوے کرتے ہو تو مجھے لگتا ہے میرا دل رکھنے کو کر رہے ہو' اب تو میری شکل وہ ہے جسے دیکھ کر بچے ماؤں کی گود میں چھپ جائیں۔"

"تمہارا دل رکھنے کی مجھے کیا ضرورت ہے' جب کہ وہ تو پہلے ہی میرے پاس رہتا ہے۔ رہی شکل تو اے پری چہرہ حسین' پہلے بھی کون کافر تمہارے نقش و نگار پر مرا تھا۔ نقش و نگار سے پرے ایک چہرہ تم پہلے بھی رکھتی تھیں اور وہ اب بھی زندہ ہے۔ میں نے تو اس سے پیار کیا ہے اور کرتا رہوں گا۔"

"میرا اسعد کہاں ہے' وہ کیسا ہے' کتنا بڑا ہو گیا۔ ہائے میرے دل سے پوچھو' میرے کلیجے کو دیکھو' کیسی آگ لگی ہے اس میں۔"

"تم سمجھتی ہو میں جانتا نہیں۔ ہر دم مجھے یہ ہی احساس گناہ رہتا ہے کہ ماں سے اس کا بچہ چھین لایا ہوں مگر تم کو یاد ہے یہ تمہاری تجویز تھی۔"

"ہاں... میں اسے یہ بھیانک چہرہ نہیں دکھانا چاہتی۔"

"حالانکہ ماں حسین ہو یا نہیں۔ بچے کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بچے کے لیے ماں کا تصور ہی سب سے حسین ہوتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے' لیکن نجانے کیوں مجھے یہ لگتا ہے وہ مجھے یوں قبول نہیں کر پائے گا۔ ابھی کتنا چھوٹا تھا جب تم اسے لے گئے تھے۔ یاد ہے اس وقت بھی مجھے دیکھ کر رونے لگتا تھا اور رابعہ سے چمٹا رہتا تھا۔"

"رابعہ سے چمٹا رہتا تھا۔ جب ہی میراثیوں والی عادات اس میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ پورے ایک سال کے بھی نہیں ہوئے موصوف اور ریڈیو یا کیسٹ پلیئر پر چلتا گانا سن کر ہلنے لگتے ہیں۔ کسی بھی محظوظ کر دینے والی چیز کو دیکھ کر تالیاں بجانے لگتے ہیں اور چاؤں چاؤں کرتے گویا اس چیز کی اونچی شانیں بیان کرنے لگتے ہیں۔"

"ہائے میں صدقے جاؤں' میرا لال میرے دل کا ٹکڑا' اس کی کوئی فوٹو ہی لے آتے تم۔"

"لایا ہوں... لایا ہوں... یہ دیکھو۔"

"ذرا اپنے لائٹر کی لو اونچی تو کرو' اس لالٹین نے تو جواب دے دیا۔ ہائے میں قربان کتنا پیارا ہے میرا بچہ' ہو بہو تم پر گیا ہے۔"

"ہاں اتفاق ہے۔"

"تم کہتے تھے پیسے جمع کر کے سب سے پہلے میری پلاسٹک سرجری کا بندوبست کرو گے۔"

"اسی میں تو لگا ہوا ہوں میری جان۔۔۔ کچھ وقت اور فقط کچھ وقت اور درکار ہے۔"

"خدا کے لیے جلدی کرو' کب میری شکل اس قابل ہو گی کہ میں اپنے بچے کے سامنے جا کر اسے سینے سے لگا پاؤں گی' تمہیں اندازہ نہیں جب وہ میرا یہ چہرہ دیکھ کر رونے لگتا تھا تو میرا دل کیسے کیسے ٹوٹتا تھا۔"

"میں جانتا ہوں اور میری زندگی کا اب سب سے اہم مقصد بھی یہ ہی ہے۔ کہیں سے کیسے اتنا پیسہ اکٹھا کر لوں کہ تمہارا علاج کرا سکوں۔ اسی لیے تو ہر دوسری طرف سے دھیان ہٹا لیا۔ ورنہ اتنا کم ہمت نہیں ہوں میں کہ اس طلیفے سے نمٹ نہ سکوں۔ مگر شاید اس کے پاس کچھ مہلت باقی ہے خدا کی طرف سے۔"

"کب تک ہو جائے گا اتنا پیسہ جمع۔"

"بہت جلد۔۔۔ بہت جلد میرے پاس اتنا پیسہ ہو گا کہ میں تمہیں وہ سب دے سکوں جس کی تم مستحق ہو۔ وہی چہرہ' اپنا گھر' آسائشیں' ملبوسات' زیورات۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں چاہئیں مجھے آسائشیں' ملبوسات اور زیورات' مجھے چہرہ بھی نہیں چاہیے تھا۔ اگر میں ماں نہ ہوتی' دنیا کی ان سب مادی اشیا سے میرا دل اٹھ چکا۔ میں ان کی حقیقت جان گئی ہوں۔ اب میں فقر' توکل' غنا اور سادگی کے راستے پر گامزن ہوں۔ اب میرے تھوڑے میں بھی میرے لیے بہت کچھ ہے۔ میں نے ایک بھورا کھجور اور ایک گھونٹ آب زم زم کے ساتھ پورا پورا دن گزارا ہے اور مجھے کسی دوسری چیز کی طلب محسوس نہیں ہوئی۔ میرا رب' مجھے قناعت کرنا سیکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

"ارے تم تو بہت اللہ والی بن گئیں۔"

"تم جانتے ہو کہ وہ رقم جو تم مجھے گاہے گاہے دیتے رہے ہو۔ وہ رقم جو وہ گاڑی بیچ کر حاصل ہوئی جو تم نے مجھے دی تھی۔ اس رقم کو جوڑ کر ہم تینوں حج کر آئے الحمدللہ پچھلے مہینے۔"

"ارے۔۔۔ اتنا بڑا کام اکیلے کر لیا تم نے۔ محرم کے بغیر۔"

"گروپ کے ساتھ گئی تھی۔ محرم تو ایسا کوئی نہیں تھا۔ مگر اللہ نیت قبول فرمائے۔"

"چلو۔۔۔ تم سے وعدہ رہا جیسے ہی تمہارا علاج ہو جاتا ہے' تمہیں اور سعد کو لے کر حج پر جاؤں گا۔"

"تم بس میرا علاج کرا دو۔ پھر بس۔۔۔ سعد اور تم کسی کٹیا میں بھی رہ کر زندگی گزار لیں گے۔"

"چٹنی پیس کر کھایا کریں گے اور سوکھی روٹی پانی میں بھگو کر وقت گزار لیں گے' ہے نا۔"

"ہاں بالکل۔"

"ہاہاہا۔"

"ہنس کیوں رہے ہو۔"

"اس لیے ہنس رہا ہوں میری جان کہ میرے تمہارے بارے میں کیا خواب ہیں اور تمہارے اکتفا کا عالم کیا ہے۔"

"ہنس لو۔ ہنس لو۔ مجھے تو بس اتنا ہی چاہیے۔"

"نہیں میں نہیں ہنستا۔۔۔ میں تو فقط کر کے دکھاؤں گا۔ بس میرا وقت آنے دو۔"

"اللہ جانے تمہارا وقت کب آئے گا۔"

"بہت جلد۔۔۔ بہت جلد۔۔۔ اور یہ تم اس وقت سے سعد کی تصویر ہی کو چومے جا رہی ہو۔ مجھے صرف باتوں پر ٹرخایا جا رہا ہے۔"

دبی دبی ہنسی کی آواز۔

"مجھے۔۔۔ بھی لفٹ کرا دو بیگم صاحبہ۔۔۔ نور کا تڑکا ہوتے ہی مجھے کھڑکی سے باہر کود جانا ہے۔ تمہارے عاشق بنام طلیفے لاٹری نظروں سے بچنے کے لیے۔"

"یا اللہ کیا اب یوں چوروں سی ملاقاتیں نصیب میں لکھی ہیں۔"

"مت سوچو کہ کیسی ملاقاتیں۔ شکر کرو کہ ملاقات ممکن تو ہوئی۔۔۔ میرے تو اکلوتے جوتے گھس چکے ہیں۔ تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔"

"اور وہ رابعہ کہتی تھی تم بھاگ لیے۔"

"مت ذکر کرو رابعہ کا اس وقت اور مت ذکر کرنا اس سے میرا۔۔۔ ان بھانڈوں' میراثیوں کو ہر بات اونچی تانیں اڑا کر دنیا بھر کو سنانے کے سوا آتا ہی کیا ہے میری شہناز بیگم۔"

"اچھا۔۔۔ نہیں بتاتی۔ میرے بلال سلطان۔"



"پتا نہیں کیوں مجھے شبہ ہونے لگا ہے کہ میری سہیلی کا دماغ چوپٹ ہونے لگا ہے۔"

"دماغ چوپٹ ہونے لگا' ارے رابعہ بیگم یہ دماغ کیسے چوپٹ ہوا کرتا ہے۔"

(اللہ میرے۔۔۔ اس سراج سرفراز کا تو اپنا دماغ چوپٹ ہے۔ اسے کیا پتا ہو گا کہ دماغ چوپٹ ہونا کسے کہتے ہیں۔)

"مطلب بے چاری غم سہ سہ کر حواس کھوئے دے رہی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ مجھے لگا رات بھر کمرہ بند کیے خود سے ہی باتیں کرتی رہتی ہے۔"

"اچھا واقعی۔"

"ہاں بالکل۔۔۔ آج رات جتنی بار بھی میں غسل خانے جانے کے لیے اٹھی' اس کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ بے چاری باؤلی ہونے لگی ہے۔ خود اپنے آپ سے باتیں کرتی ہے رات رات بھر۔"

"استغفراللہ۔۔۔ اللہ معاف فرمائے۔۔۔ کیا وقت آگیا ہے۔ اچھی بھلی' سمجھ دار آپا بیگم کا دماغ چوپٹ ہونے لگا۔"

(اب سمجھ میں آیا تمہیں سراج سرفراز کہ دماغ چوپٹ ہونا کسے کہتے ہیں۔)

"اچھا بھئی میں اب چلتا ہوں۔ پیش امام صاحب نے پیغام بھیج رکھا ہے ان سے مل لوں۔"

(ہاں جاؤ۔۔۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر چار باتیں تم بھی کہنے سننے کی سیکھ لو شاید۔)

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



نکہت سیما

ہری چگ

تائی جیراں کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا تھا' جب میری عمر دس سال تھی۔ میرے ابو آرمی میں میجر تھے اور آئے دن کی ٹرانسفر کی وجہ سے انہوں نے مجھے مری میں داخل کروا دیا تھا۔ دسمبر کا اینڈ تھا اور میں چھٹیاں گزارنے جہلم آیا ہوا تھا۔ ان دنوں ابو کی پوسٹنگ جہلم میں تھی۔ گاؤں سے نانا کا خط آیا تھا اور پتا نہیں اس خط میں کیا لکھا تھا کہ امی فوراً" گاؤں جانے کو تیار ہو گئیں۔ بیٹ مین کو ڈھیروں ہدایتیں دے کر امی صبح نکلیں اور ہم دوپہر سے پہلے گاؤں پہنچ گئے تھے۔

نانا کا گھر بہت بڑا تھا۔ پہلے ایک بڑا احاطہ پھر رہائشی گھر جس کا مین دروازہ احاطے میں کھلتا تھا۔ احاطے میں ہی ایک طرف جانوروں کا کوٹھا تھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی بڑا سا صحن تھا۔ صحن میں دیواروں کے ساتھ کیاریاں تھیں اور دھریک' جامن اور شہتوت کے درخت تھے۔ صحن پکا تھا سرخ اینٹوں کا اور صحن سے آگے دو اطراف میں کھلے برآمدے تھے۔ برآمدے میں دیواروں کے ساتھ دو' تین چارپائیاں تھیں جن پر ڈبیوں والے کالے کھیس بچھے رہتے تھے۔ مجھے نانا کے گھر آنا ہمیشہ ہی اچھا لگتا تھا۔

گاڑی احاطے میں کھڑی کر کے جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو سارا برآمدہ دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔ نانا برآمدے میں ہی کمبل اوڑھے چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اور ذرا فاصلے پر موڑھے پر تائی جیراں بیٹھی تھی۔

تائی جیراں کون تھی' میں تب نہیں جانتا تھا۔

امی تیزی سے نانا کی طرف بڑھی تھیں۔ نانا ہماری آواز سن کر اٹھ بیٹھے اور امی سے ملنے لگے تھے۔ میں اپنی چھوٹی بہن ایشاع کا ہاتھ پکڑے کھڑا تائی جیراں کو دیکھ رہا تھا' جو موڑھے پر بیٹھی تھی اور اس کے سامنے چلم پڑی تھی۔ وہ زمین پر پڑی تھیلی سے تمباکو نکال کر ہتھیلی پر رکھ کر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی سے رگڑتی اور پھر چلم کی ٹوپی میں ڈال کر تمباکو کو تیلی سے سلگاتی اور چلم کی نے سے جو اس نے ہونٹوں تلے دبا رکھی تھی کش لگاتی۔ میں کھڑا دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ جب ایشاع ہاتھ چھڑا کر امی کی طرف بھاگی میں نے چونک کر نظریں اس سے ہٹا لیں اور نانا کی طرف بڑھا۔

"ہوئے میرا شہزادہ آیا ہے۔"

میں دوڑ کر ان کے گلے لگ گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی برآمدہ سب لوگوں سے بھر گیا تھا۔ نانی اماں' چھوٹی مامی اور ان کے بچے۔ چھوٹے ماما نصیر۔ یہ سب میرے جانے پہچانے تھے لیکن وہ جو موڑھے پر بیٹھی حقہ پی رہی تھی' اسے میں نہیں جانتا تھا۔

"یہ تائی جیراں ہے۔" میرے ماموں زاد بھائی ظہیر نے جو میرا ہم عمر تھا' مجھے بتایا تھا۔

"جیراں!" مجھے یہ نام بڑا عجیب سا لگا تھا۔

"تایا منیر کی "ووہٹی (دلہن) ہے۔" ظہیر نے میری معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

منیر میرے بڑے ماموں تھے لیکن میں نے ہوش

سنبھالنے کے بعد انہیں نہیں دیکھا تھا۔ امی بتاتی تھیں کہ میں چار سال کا تھا کہ وہ نانا سے کسی بات پر ناراض ہو کر گھر سے چلے گئے تھے اور اب چھ سال بعد وہ چند دن پہلے گھر آئے تھے تو ان کے ساتھ تائی جیراں بھی تھی۔

ظہیر نے مجھے بتایا کہ دادا نے پھپھو کو خط لکھ کر بلوایا ہے۔ "برادری کی روٹی کرنی ہے۔ تایا اتنے برسوں بعد آیا ہے اور پھر دلہن ساتھ لایا ہے۔"

اب امی' تائی جیراں سے مل رہی تھیں اور میں ظہیر کو چھوڑ کر امی کے پاس کھڑا ہو گیا تاکہ تائی جیراں کو قریب سے دیکھ سکوں۔

وہ کھڑی ہو کر امی سے گلے مل رہی تھی۔ اس کا لباس مجھے بہت دلچسپ لگا تھا۔ اس نے آتشی گلابی رنگ کی ریشمی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اس کے گریبان پر مردوں کی قمیصوں کی طرح لمبی پٹی پر کاج بنے ہوئے تھے اور ان میں سونے کے مینے والے بٹن لگے ہوئے تھے۔ یہ بٹن زنجیر کے ساتھ ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ اسی طرح کے سونے کے مینے والے بٹن دادا کو عید پر بوسکی کے کرتے میں لگاتے دیکھا تھا۔ اس نے شلوار کے بجائے کالے رنگ کی ٹاسے کی لنگی باندھی ہوئی تھی۔ دادا کے گھر میں ان کا ملازم چار خانے والی لنگی باندھتا تھا۔ لیکن یہ تو عورت تھی۔ تائی جیراں تھی۔ ماموں منیر کی دلہن۔۔۔ میں نے اس سے پہلے کسی عورت کو ایسے کپڑے پہنے نہیں دیکھا تھا۔ وہ امی کے ساتھ کھڑی ان سے لمبی لگ رہی تھی۔ اس کا رنگ بے حد گورا تھا اور آنکھیں خوب بڑی بڑی جن میں کاجل کی لمبی دھاریں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹ بھرے بھرے اور بے حد گلابی تھے بغیر لپ اسٹک کے۔ اس کے کانوں میں بھی سرخ موتیوں والے جھمکے تھے۔

"یہ تمہارا بیٹا ہے۔ بالکل انگریز لگتا ہے یہ تو۔"

اس کی زبان بہت صاف تھی اور اس نے انگریز شاید مجھے میرے لباس کی وجہ سے کہا تھا۔ میں نے پینٹ شرٹ پر کوٹ پہن رکھا تھا۔ ورنہ میرا رنگ سانولا تھا۔

میں شرما کر امی کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر جھٹ پٹ میرے رخساروں پر کئی بوسے دیے اور اس طرح ایشاع کو بھی خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بسورنے لگی تھی۔

اور یہ میری تائی جیراں سے پہلی ملاقات تھی۔ رشتے میں تو وہ میری مامی لگتی تھی لیکن میں اسے ظہیر کی دیکھا دیکھی تائی جیراں ہی کہنے لگا تھا اور ہمیشہ تائی جیراں ہی کہتا رہا تھا۔

ہم نانا کے گھر دس دن رہے تھے۔ ان دس دنوں میں میری تائی جیراں سے بہت دوستی ہو گئی تھی اور وہ مجھے چھوٹی مامی سے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ حالانکہ وہ خود دلہن تھی لیکن وہ میرے اور ایشاع کے بہت ناز اٹھاتی تھی اور رات کو سونے سے پہلے امی اور نانی کے پاؤں اور ٹانگیں بھی دباتی تھی۔ پتا نہیں یہ ماما نے اس سے کہا تھا یا وہ خود ہی ایسا کرتی تھی لیکن وہ گھر کے ہر فرد کی بہت خدمت کرتی تھی۔

اس روز جب ہم آئے تھے تو ماما منیر بہت دیر سے آئے تھے۔ شام گہری ہو گئی تھی اور میں نانی کے لحاف میں گھسا تھوڑا سا چہرہ لحاف سے باہر کیے گلی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ جب ماما منیر اندر آئے۔ انہوں نے بہت سارے شاپر اٹھا رکھے تھے۔ میں پہلی بار ماما منیر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ گھوڑا بوسکی کا کرتا سفید لٹھے کی کڑکڑ کرتی شلوار اور پاؤں میں تلے والے کھسے' چھ فٹ سے قد۔ وہ تو کوئی فلمی ہیرو لگ رہے تھے۔

"بیٹھ جا منیرے' کھڑا کیوں ہے؟" نانی اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"وہ۔ وہ جیراں کدھر ہے؟" ماما منیر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

"تو جہلم سے تیری بہن آئی ہے' اسی کے پاس بیٹھی ہے باورچی خانے میں۔"

میں لحاف کا کونا اٹھائے نانی کے پیچھے سے چھپ چھپ کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ اتنے گورے چٹے لمبے بال زلفوں کی صورت کندھوں پر بکھرے تھے۔ سیدھی

مانگ نکالے وہ تو کچھ اور ہی لگ رہے تھے۔

یا اللہ یہ منیر ماما ہیں۔

☼ ☼ ☼

ماموں نصیر اور امی بھی خوش شکل تھے۔ لیکن منیر ماموں تو جیسے کسی اور ہی دنیا سے آئے لگ رہے تھے۔ مجھے ان سے شرم آرہی تھی۔ اس لیے میں نے رضائی میں منہ چھپا لیا تھا۔ ماموں سامان چارپائی پر ہی چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ نانی اٹھ کر ان کا لایا ہوا سامان دیکھنے لگیں۔ ستاروں والے اور کڑھائی والے خوب صورت رنگوں کے زنانہ کپڑے تھے۔ کچھ میک اپ کا سامان وغیرہ تھا۔ نانی نے مجھے بتایا کہ ماموں شہر گئے ہوئے تھے دلہن کے لیے کپڑے لینے۔ ابھی تو کسی کو علم نہیں۔ اب برادری کی دعوت کریں گے تو سب ہی منیر کی دلہن دیکھنے آئیں گے۔

تائی جیراں اگر بہت خوب صورت تھی تو ماموں منیر بھی کم نہ تھے۔ تائی جیراں کے بال بہت لمبے اور گھنے تھے اور وہ ان میں پراندہ ڈالتی تھی' جو اس کے گھٹنوں سے نیچے تک آتا تھا۔ ایک بار جب وہ برآمدے میں دھوپ میں بیٹھی بالوں میں تیل لگا رہی تھی تو میں نے حیرت سے اس کے بالوں کو دیکھا تھا۔

"کیا دیکھتا ہے کاکے؟"

"آپ کے بال۔۔۔ میں نے اتنے لمبے اور اتنے زیادہ بال کبھی کسی کے نہیں دیکھے۔ یہ بہت خوب صورت ہیں۔"

"تیرا ماما بھی یہی کہتا ہے؟" تائی جیراں کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اتنی بڑی عورت کو شرماتے ہوئے بھی میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ لیکن اس مسکراہٹ نے جیسے اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔ اس کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی اور وہ اپنی چٹیا کو بل دے رہی تھی۔ آج اس نے شلوار پہنی ہوئی تھی۔ سبز طوطے رنگ کی شلوار پر کالے رنگ کی گلابی پھولوں والی قمیص تھی۔ نئے فیشن کی سلی ہوئی۔ یہ کپڑے ماموں شہر سے لائے تھے۔ ان دس دنوں میں پہلے دن کے سوا پھر میں نے اسے لنگی باندھے نہیں دیکھا تھا۔ اس روز میں نے تائی جیراں سے کہا۔

"تائی! آپ ہمیشہ ایسے کپڑے پہنا کریں۔ دادا کے گاؤں میں تو مرد ایسی لنگیاں پہنتے ہیں' چار خانوں والی بھی اور سادی بھی۔"

اور تائی جیراں زور سے ہنس پڑی تھی اور اس کے موتی جیسے دانت میں مبہوت ہو کر دیکھتا تھا۔

"پر ہمارے چک میں تو عورتیں بھی لنگیاں باندھتی ہیں۔ عورتیں ریشمی اور مرد سوتی۔ لیکن میں جب اسکول جاتی تھی تو شلوار پہنتی تھی۔ پوری تین جماعتیں پڑھی تھیں میں نے۔ پھر میرا ابا مر گیا تو اماں نے گھر میں بٹھا لیا۔ میری اماں اور میری دادی بھی لنگی باندھتی تھیں۔ میری دادی اور میری ماں دونوں ہی بڑی طاقت ور اور ڈاھڈی عورتیں تھیں۔"

"تو آپ اس لیے لنگی باندھتی تھیں کہ طاقت ور لگیں۔" تائی جیراں کی بات سے مجھے ایسا ہی لگا تھا۔

تائی جیراں پھر ہنس دی تھی۔ "میرا دادا نہیں تھا اور میرا باپ بھی جوانی میں مر گیا تھا۔ بھائی بھی نہیں تھا۔ میری دادی اور ماں کھیتوں میں خود کام کرتی تھیں مزدوروں کے ساتھ مل کر۔ ہماری تھوڑی سی زمین تھی لیکن اتنی تھوڑی بھی نہیں تھی۔"

وہ پھر ہنسی تھی۔

"اگر دادی اور ماں اتنی ڈاھڈی نہ ہوتیں تو لوگ ہمیں کھا ہی جاتے۔"

وہ جیسے کھو سی گئی تھی۔ چپ چپ سی پتا نہیں کیا سوچتی تھی۔ شاید اپنی اماں اور دادی کو۔۔۔ پھر ماما آگیا تھا اور وہ جیسے سوچوں سے باہر آگئی اور شرمیلی نظروں سے ماما کو دیکھتی تھی۔ ساتھ ساتھ کھڑے دونوں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ دونوں کی جوڑی بڑی صحیح تھی پر مجھے تائی جیراں کا نام پسند نہیں آیا تھا۔ یہ کیا نام ہوا بھلا جیراں؟

اور میں نے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ تب تائی جیراں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کا اصل نام نذیر بیگم ہے

اور مجھے یک دم ہنسی آگئی تھی۔ نذیر تو ہمارے بیٹ مین کا نام تھا۔
"لیکن سب مجھے جیراں کہتے تھے۔ اماں، دادی اور گاؤں والے۔"
یہ نام بھی مجھے پسند نہیں آیا تھا اور ان کی شخصیت سے تو بالکل میچ ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ تو تنی نرم مزاج اور محبت کرنے والی تھیں۔ مجھے ایک دن بھی ان سے ڈر نہیں لگا تھا اور نذیر نے مجھے بتایا تھا اس کے نام کا مطلب ہے ڈرانے والا۔
"آپ کا نام میں نے شہزادی نیلوفر رکھ دیا ہے۔ بس۔"
ماما منیر نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر گھما ڈالا اور تائی جیراں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی۔
"سنو منیر خان! نور خان زمین دار کی بیٹی اور شہزادی۔ یہ کاکا بھی نا بس۔ شہزادیاں میرے جیسی تھوڑی ہوتی ہیں کاکے۔ وہ تو اونچے تختوں پر بیٹھتی ہیں اور جیراں تو کھیتوں کی مٹی میں رل گئی ہے۔"
"کاکا بالکل صحیح کہتا ہے۔ تو۔ تو سچ مچ شہزادی ہے۔ ہے جیراں۔ میرے دل کی شہزادی۔ میری راجدھانی کی ملکہ۔ میری شہزادی نیلوفر۔"
ماما نے ایک بار پھر مجھے گھما ڈالا۔ تائی جیراں کی آنکھوں میں اتنی چمک ابھری جیسے ہزاروں ستارے ان میں اتر آئے ہوں اور رخسار یوں لگ رہے تھے جیسے کسی نے ان پر گلال مل دیا ہو۔

☼ ☼ ☼

"ماموں منیر تو بہت خوب صورت ہیں امی! بالکل فلمی ہیرو کی طرح۔"
دسویں دن جب ہم واپس آ رہے تھے... راستے میں میں نے امی سے کہا تھا۔
"ہاں۔ منیر تو ایسا ہی ہے میرا ویر شہزادوں جیسا۔ جب بوسکی کا کرتا پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر گلیوں میں سے گزرتا تھا تو لڑکیاں چھتوں پر، منڈیروں کے پیچھے سے اور دروازوں کی اوٹ سے اسے دیکھتی تھیں۔ ایسی ایسی خاندانی لڑکیاں فدا تھیں اس پر۔ پر اس کا دل تو چک چوراسی کی اس کم ذات کمہارن پر آ گیا اور اسی کی خاطر ابا سے ناراض ہو کر گھر بار چھوڑ دیا تھا۔"
"لیکن تائی جیراں تو زمین دارن ہے۔ اس کے باپ کی ہماری طرح زمین ہے۔ جس میں وہ ہل چلاتا تھا۔"
"ہاں جیراں تو۔ پتا نہیں یہ جیراں کہاں سے اسے مل گئی۔ پتا نہیں اس کمہارن کا کیا ہوا۔ ویسے جیراں ہے اچھی۔ دل کی بھی اور شکل کی بھی۔ خاندانی بھی لگتی ہے۔ تولے بھر کے تو جھمکے پہنے ہوئے ہیں اور سونے کے بٹن بھی دو ڈھائی تولے سے کم کیا ہوں گے۔"
امی کے منہ سے تائی جیراں کی تعریف سن کر میں یوں خوش ہو گیا تھا جیسے امی نے میری تعریف کی ہو۔ ماموں منیر نے گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ جیراں انہیں کہاں ملی تھی اور انہوں نے کیسے اس سے شادی کی۔ وہ جب ماموں کے ساتھ آئی تھی تو اس کے تن پر وہی جوڑا تھا۔ کالی ٹاسے کی لنگی اور آتشی گلابی سونے کے بٹنوں والی قمیص اور ساتھ کچھ نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ بھگا کر لائے تھے یا... میں نے امی کو ابو سے کہتے سنا تھا۔
"بہر حال، جو بھی ہو۔ گھر آ گیا۔ اماں، ابا کی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ اب تو ابا بہت ہاتھ ملتے تھے کہ کیوں انہوں نے اسے تاجو سے شادی کرنے کی اجازت نہ دی۔ سب ذاتیں اللہ کی بنائی ہوئی اور سب انسان برابر ہیں۔"
"تو اس کا نام تاجو تھا جس سے ماموں پہلے شادی کرنا چاہتے تھے اور پتا نہیں وہ کیسی ہو گی۔ تائی جیراں جیسی یا اس سے زیادہ خوب صورت۔"
اس رات میں سونے سے پہلے سوچ رہا تھا اور پھر یہ سوال جیسے میرے دل کے اندر ہی کہیں کھبا رہ گیا تھا میں نے سوچا اگر پھر کبھی میں ماموں سے ملا تو ضرور پوچھوں گا کہ تاجو زیادہ خوب صورت تھی یا تائی جیراں۔

☼ ☼ ☼

"جب میں نے دوسری بار تائی جیراں کو دیکھا تو میری عمر چودہ سال تھی۔ یعنی پورے چار سال بعد۔
جنوری کا مہینہ تھا گاؤں سے نانا کی بیماری کی اطلاع آئی تھی۔ ہم افراتفری میں گاؤں کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان دنوں ابو کھاریاں میں تھے۔ میں جب بھی چھٹیوں میں گھر آتا تھا تو امی مجھے بتاتی تھیں کہ جیراں تجھے بہت یاد کرتی ہے۔ بہت پوچھتی ہے تیرا۔ پھر میں بھی پوچھ لیتا کہ تائی جیراں کیسی ہے۔
"ارے بہت اچھی ہے میری بھرجائی۔ قسمت کا دھنی ہے میرا ویر۔ سارے گھر کو یوں سنبھالا ہوا ہے کہ تیری نانی تو بس چارپائی پر بیٹھ کر عیش کرتی ہے۔"
میں اس کی تعریف سن کر خوش ہو تا تھا۔
صحن میں قدم رکھتے ہوئے میری نظریں بے اختیار برآمدے کی طرف اٹھی تھیں لیکن برآمدہ خالی تھا اور تائی جیراں احاطے کی طرف سے دودھ کی بھری بالٹی اٹھا کر اندر آ رہی تھی۔ اس نے پھول دار دوپٹا لیا ہوا تھا اور ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا تھا کہ وہ اسی طرح کالی ٹاسے کی لنگی اور ریشمی آتشی گلابی قمیص پہنے بے نیازی سے بیٹھی چلم پی رہی ہوتی۔
"ارے کاکے!" وہ بالٹی برآمدے میں رکھ کر میرے قریب آ گئی۔ "ارے یہ تو ہے کاکے! اتنا لمبا ہو گیا ہے تو۔" وہ بہت اشتیاق سے مجھے دیکھ رہی تھی اور میں اس کے پیار کرنے پر شرما گیا تھا۔
"میرا نام عثمان ہے۔ مجھے کاکا نہیں بلائیں۔"
"اچھا... نہیں بلاؤں گی پر مجھے تو کاکا ہی اچھا لگتا ہے۔"
پھر میں جتنے دن وہاں رہا، وہ مجھے کاکا ہی بلاتی رہی اور اس پہلے دن کے علاوہ میں نے پھر اسے کاکا بلانے سے منع نہیں کیا۔
اس بار ہم تقریباً "دو ہفتے رہے تھے۔ کیونکہ نانا کی طبیعت ٹھیک ہوتے ہوتے پھر خراب ہو جاتی تھی۔ ان دو ہفتوں میں تائی جیراں کو میں نے صبح منہ اندھیرے اٹھتے اور رات گئے تک کام کرتے دیکھا تھا۔
وہ صبح کاڑھنی میں بچا ہوا دودھ کوئلوں کی دھیمی آنچ پر رکھ دیتی تھی جو سارا دن کڑھتا رہتا۔ پھر رات میں اسے جاگ لگا کر رکھ دیتی تھی اور پھر صبح صبح اٹھ کر جب میں برآمدے میں آتا تو وہ برآمدے میں دائیں طرف پیڑھی پر بیٹھی لسی بلو رہی ہوتی تھی۔ مدھانی کی رسیوں کے ساتھ اس کے بازوؤں کی حرکت کو میں دلچسپی سے چارپائی پر بیٹھا دیکھتا رہتا۔ گاہے گاہے وہ مڑ کر مجھے بھی دیکھتی اور مسکراتی۔
وہ چاٹی میں سے مکھن نکال کر بڑے سے گول پیالے میں رکھتی جاتی تھی اور جب سارا مکھن تیار ہو جاتا تو وہ باورچی خانے کی طرف چلی جاتی۔
اس اثنا میں سب ہی اٹھ کر اپنے اپنے کمروں سے نکل کر باورچی خانے میں جمع ہو جاتے۔ باورچی خانہ بہت بڑا تھا۔ اسی باورچی خانے میں ایک طرف دیوار کے ساتھ گدا بچھا ہوا تھا جس پر نیلے رنگ کی گلابی دھاریوں والی چادر بچھی رہتی تھی۔ سب اسی گدے پر بیٹھ جاتے اور وہ گرم گرم پھلکے پکا کر ان پر مکھن رکھ کر سب کو دیتی جاتی۔ ساتھ میں رات کا بچا سالن اور چائے۔ سردیوں میں تینوں وقت سب باورچی خانے میں ہی کھاتے پیتے تھے۔ چولہے کے پاس بیٹھے ہوئے روٹیاں پکاتے ہوئے بھی گاہے گاہے وہ ماموں کی طرف دیکھتی اور اس کے گالوں پر وہی گلال بکھر جاتا تھا، جو چار سال پہلے ماما کی طرف دیکھتے ہوئے بکھرا تھا۔ ان دو ہفتوں میں اس نے مجھ سے بہت ساری باتیں بھی کی تھیں۔
وہ سارا دن کام میں مصروف رہتی۔ ماموں گھر آتے تو پھر جیسے وہ ان کے گرد چکراتی پھرتی تھی۔ کبھی دودھ گرم کر کے دے رہی ہے۔ کبھی پاؤں دبا رہی ہے۔ کبھی کپڑے استری کر رہی ہے۔ امی سچ تو کہتی تھیں۔ منیر بہت خوش قسمت ہے۔ چھوٹی مامی تو نصیر ماموں کی اتنی پروا نہیں کرتی، جتنی تائی جیراں منیر ماموں کی کرتی تھی، بلکہ تائی جیراں نے تو چھوٹی مامی کے بچوں کے بھی بہت سارے کام سنبھال لیے تھے۔ کبھی فاران کی تختی دھو کر اس پر گاچی لگا رہی ہے۔ کبھی ظہیر کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کپڑے استری کیے جارہے ہیں۔ بھی منی کو نہلایا جارہا ہے۔

ان دو ہفتوں میں۔۔۔ میں نے تائی جیراں کو سب کی خدمت میں کھڑے دیکھا تھا۔ سب ہی اس سے خوش تھے۔ ایک دن وہ بالٹی اٹھائے دودھ دوہنے احاطے میں جارہی تھی تو میں بھی ساتھ چل دیا۔ احاطے میں بھینس نہیں تھی' شاید کرما نہلانے کے لیے چھپڑ پر لے گیا تھا اور ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ تائی جیراں اور میں وہیں چبوترے پر بیٹھ گئے۔ تائی جیراں سامنے درختوں پر بیٹھے پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے وہ بہت اداس لگی تھی۔ گپ چپ سی' کچھ سوچتی ہوئی۔

"آپ کیا سوچتی ہیں تائی جیراں؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں یوں ہی چڑیوں کو دیکھتی ہوں۔ ہمارے گھر میں بھی درختوں پر صبح صبح ہی چڑیاں شور مچانے لگتی تھیں۔"

"آپ کو اپنی دادی اور اماں یاد آتی ہیں۔ کیا وہ ادھر ملنے آتی ہیں آپ سے اور آپ جاتی ہیں ان سے ملنے۔"

وہ کچھ دیر یوں ہی خاموش سی بیٹھی رہی' پھر سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"کاکے!" اس کی خوب صورت آنکھوں میں جیسے نمی سی پھیل گئی تھی۔ "مائیں بھی کبھی بھولتی ہیں۔ چاہے خود ماں' دادی' نانی بن جاؤ پر مائیں تو یہاں دل میں بستی ہیں کاکے! اٹھتے بیٹھتے یاد نہ بھی کرو تو منہ سے ہائے ماں نکل جاتا ہے۔ مجھے بھی پتا نہ اماں بھولتی ہے' نہ دادی۔ میری دادی تو میری شادی سے کچھ پہلے ہی مرگئی تھی اور اماں۔۔۔ اماں پتا نہیں کیسی ہوگی اب۔"

وہ پھر چپ ہو کر کچھ سوچنے لگی تھی اور میں تجسس سے اسے دیکھتا تھا۔ یہ پہلا موقع' جب وہ اپنے متعلق کچھ بتانے لگی تھی مجھے۔ ورنہ کبھی جو ای' چھوٹی مامی اور تائی اکیلی ہوتیں تو ضرور ایک' دوسرے سے کہتی تھیں۔

"چار سال گزر گئے۔ نہ منیر امنہ سے کچھ پھوٹا' نہ جیراں نے بتایا کہ کیسے اور کیوں۔۔۔ جیراں کے پچھلے بھی منیرے کے سنگ تور کر (بھیج کر) غافل ہوگئے۔"

میں اپنے اندر غبارے کی طرح پھول گیا۔ معتبر سا ہوگیا کہ یہ میں ہوں پورے گھر میں سے جیراں نے صرف مجھے چنا ہے اپنے متعلق کچھ بتانے کے لیے۔

"کیوں تائی جیراں! آپ اپنے چک کبھی نہیں گئیں' کیا ماموں نے منع کیا ہے؟"

"نہ۔۔۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بس جس رات تیرے مامے سے میرا نکاح ہوا تھا اس رات اماں نے مجھے کہا تھا۔ آج کے بعد سمجھنا تیرا میکہ کوئی نہیں۔ مڑ کر پیچھے نہ دیکھنا۔" اس نے ایک آہ بھری تھی۔

"کیوں تائی جیراں! کیا آپ کی اماں کو ماموں اچھے نہیں لگتے تھے۔"

"نہیں۔۔۔ یہ بات نہیں تھی۔ بڑی ڈونگی (گہری) باتیں ہیں یہ تو نہیں سمجھے گا۔"

"آپ بتاؤ ناں۔۔۔ میں کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہوں۔ پورے چودہ سال کا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ "ہاں تو بڑا ہوگیا ہے کاکے!"

کچھ دیر کے لیے وہ پھر کھو گئی تھی۔ میں کبھی سامنے درختوں کے پیچھے افق کے کنارے سورج کے سرخ گولے کو دیکھتا تھا اور کبھی تائی جیراں کو۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔

"میں نے تجھے بتایا تھا نا کاکے! میری اماں اور دادی بڑی ڈاھڈی (سخت) تھیں۔۔۔ پر پھر بھی عورتیں تھیں نا اکیلی۔۔۔ بے آسرا۔۔۔ وہ کھیتوں میں کام کرتی تھیں۔ خود غلہ منڈی لے کر جاتی تھیں۔ جانوروں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ چارہ کٹ کرلاتا' دودھ' شہد' صبح صبح ریڑھے پر لے کر جانا۔ پیسے دھیلے کی کمی نہیں تھی۔ میں نے کئی بار اماں سے کہا تھا۔ دادی کے بجائے مجھے کھیتوں میں لے جایا کر۔ پر نہ دادی مانتی تھی نہ اماں۔ پر ساری احتیاطیں دھری کی دھری ہی رہ گئیں۔ زمین دار شریف کا بیٹا ظریف میرے پیچھے پڑ گیا۔ "شادی کرلو ورنہ اٹھا کر لے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تجھ سے شادی کرنے سے اچھا ہے ساری عمر بیٹھی رہوں۔"

"کیوں تائی! بہت برا تھا کیا؟"

"شکل صورت کا اچھا تھا' لونچا لمبا۔ تیرے مامے کی طرح۔ خاندانی بھی تھا۔ پیسے دھیلے کی ادھر بھی کمی نہیں تھی۔ پر سو برائیوں کی ایک برائی۔ ہری چک تھا کمبخت۔۔۔ لالچی۔۔۔ زمینوں اور گھر پر بھی نظر تھی اس کی۔"

تائی جیراں نے کچھ اور بھی کہا تھا لیکن میں تو "ہری چک" میں الجھا ہوا تھا۔

"یہ ہری چک کیا ہوتا ہے تائی جیراں؟"

تائی جیراں کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"بس۔۔۔ جہاں اچھی لڑکی دیکھی' وہیں ڈھیر ہوگیا۔ پہلے ثریا کے پیچھے بھاگتا رہا۔ راجوں کی کڑی تھی۔ پھر مہرو کے دروازے پر نظر آنے لگا تھا۔ اس کے بعد میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔"

"یعنی بے وفا۔"

"ہاں بے وفا بھی اور لالچی بھی۔ جب میں نے اسے دھتکار دیا تو اس نے مجھے اپنی ضد بنالیا۔ ہماری کھڑی فصلوں کو آگ لگادی۔ دادی مرگئی تو ایک رات گھر کے صحن میں کود آیا۔ اماں ڈر گئی۔ اماں نے کہا۔۔۔ ضد چھوڑ دے جیراں! ہم اکیلی عورتیں ہیں۔ مقابلہ نہیں کرسکیں گی۔ پھر پیسے والا ہے۔ شکل وصورت والا۔۔۔ تجھے بھلا اس سے اچھا بر کہاں ملے گا۔ میں نے کہا۔۔۔ "بھلے کالا چوہڑا کیوں نہ ہو۔ بھوکا ننگا ہو' پر ہرجائی نہ ہو۔ در' در منہ مارنے والا۔" اماں بے چاری چپ کرگئی تھی۔"

"ماموں کہاں ملے تھے تائی؟" میں نے جلدی سے پوچھا' کیونکہ کرما بھینس اور اس کی کٹی کو ہانکتا ہوا احاطے میں لارہا تھا اور پھر تائی جیراں نے اٹھ جانا تھا۔

"تیرا ماما۔۔۔ چھنو کی شادی میں بارات کے ساتھ آیا تھا۔ چھنو میری سہیلی تھی اور بارات پار گاؤں سے آئی تھی۔ رات بارات نے ادھر ہی رہنا تھا۔ میں رات میں باہر نکلی تھی گھر جانے کے لیے اور تیرا ماما بھی کسی کام سے نکلا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا۔"

"اور پھر دیکھتے رہ گئے۔" میں نے بات کاٹی اور تائی جیراں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہی شرمیلی سی مسکراہٹ۔

"تیرے مامے نے رشتہ ڈال دیا چھنو اور اس کا خاوند آئے تھے رشتہ لے کر۔ پھر پتا نہیں کیسے ظریفے کو پتا چل گیا اور اس نے دھمکی دی کہ کوئی مائی کا لال جیراں کی ڈولی لینے آئے گا تو ٹوٹے کرکے پھینک دوں گا کھیتوں میں۔ اماں نے کہا جیراں مان جا اور میں پھر گئی۔ ہرگز نہیں اماں! تو چھنو کے خاوند سے کہہ دے' مجھے اس کے سنگی کا رشتہ منظور ہے۔

ماں نے کہا۔ تجھے کیا پتا جیراں! وہ کیسا ہے؟ شکل و صورت والا ہے۔ کیا پتا وہ کتنوں کے پیچھے لور لور پھرتا ہوگا۔۔۔ پر مجھے یقین تھا کاکے! تیرا ماما ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اماں سے کہا کہ یقین تو یہاں ہوتا ہے نا دل میں' پھر بھی تو اسے بلا' میں بات کروں گی۔ ہم عام عورتیں نہیں تھیں کاکے! ہم مردوں کی طرح کام کرنے والی عورتیں تھیں۔ میں نے تیرے مامے سے ایک ہی بات کی تھی۔ سو باتوں کی ایک بات۔۔۔ میرا دل شیشے کی طرح شفاف ہے اور تیرے آگے پیچھے دل میں اگر کوئی ہے تو بتادے مجھے۔ در' در منہ مارنے والے مجھے پسند نہیں۔۔۔ میرے دل میں بھی آگے' نہ پیچھے کوئی نہیں ہے۔ تیرے مامے نے کہا تھا۔ بس پھر اماں نے تیرے مامے سے کہہ دیا کہ چوری سے آکر نکاح پڑھوالے اور پھر لے جا اسے اور مڑ کر نہ آنا۔ ظریفا تجھے تو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اسے بھی رول دے گا۔"

"پر اماں۔۔۔!" میں کرلائی تھی۔

"بس اب چپ کرجا۔ میری حیاتی چار دن کی ہے۔" اور۔۔۔ یہ مائیں بھی بڑی عجیب ہوتی ہیں کاکے! میری ماں بھی ایسی ہی تھی۔ اس نے میری آنکھوں کو پڑھ لیا تھا اور خود تنہائی سے سودا کرکے مجھے تیرے مامے کے ساتھ بھیج دیا۔ عمر بھر کی جمع پونجی بھی ساتھ کردی' پر راستے میں ہم لٹ گئے۔ کوئی کمبخت اسٹیشن پر سے بکسا ہی اٹھا کرلے گیا۔ پتا نہیں کیوں آنکھ لگ گئی تھی ہم دونوں کی۔"

www.paksociety.com

کرنے نے جینس کلے سے باندھ دی تھی اور لب تائی جیراں کو آواز دے رہا تھا۔ تائی جیراں اٹھ گئی اور میرا سینہ جیسے کسی بھاری راز سے بوجھل ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا میں تائی جیراں سے کہوں گا کہ اگر وہ ظریف سے شادی کرلیتی تو کیا پتا‘ پھر وہ کسی اور دروازے پر نہ جاتا۔ اسی کا ہو کر رہ جاتا ہمیشہ کے لیے اور تائی جیراں تو ایسی تھی کہ جو ایک بار اس کا ہو جاتا ہمیشہ اسی کا رہتا اور اس طرح اپنی ماں سے بھی دور نہ ہوتی۔ لیکن میں یہ بات اس سے نہ کہہ سکا اور ہم واپس کھاریاں آگئے۔ لیکن آنے سے پہلے میرے منہ سے وہ سوال نکل گیا جو چار سال پہلے میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ ہم احاطے میں کھڑے تھے اور کرما ڈرائیور کے ساتھ مل کر ہمارا سامان گاڑی میں رکھ رہا تھا۔

ماموں منیر نے مجھے گلے لگایا تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ماموں! سچ بتائیں۔ تائی جیراں زیادہ خوب صورت ہے یا ماجو زیادہ خوب صورت تھی؟“

میں نے تائی جیراں کی طرف دیکھا‘ جو اشاع کو پیار کر رہی تھی۔ آج وہ ہر دن سے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ ماموں شہر سے اس کے لیے ناک کی لونگ لائے تھے۔ سفید رنگ جو دمکتا تو پورا چہرہ سج جاتا تھا۔ اس نے سرخ پھول دار سوٹ پر کالی سرخ پھولوں والی شال اوڑھ رکھی تھی۔

”تائی جیراں‘ ماجو کمہارن سے زیادہ خوب صورت ہے نا؟“

تائی جیراں کی آنکھوں میں حیرت اتری تھی اور وہ منہ اٹھا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

”یہ ماجو کون ہے کاکے؟“

”آپ کو نہیں پتا تائی جیراں! ماموں اسی کی خاطر تو نانا سے ناراض ہو کر گھر سے نکلے تھے۔“

اور مجھے لگا تھا جیسے تائی جیراں کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور ماموں ساکت کھڑے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا‘ جیسے میں نے کچھ غلط کر دیا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے کرمو نے آواز دی تھی۔

”آجائیں صاحب! سامان رکھ دیا ہے“ اور پھر سب ہم سے ملنے لگے اور ہم نانا کے گھر سے واپس کھاریاں آگئے تھے۔

☆ ☆ ☆

اور پھر تیسری اور آخری بار میں نے تائی جیراں کو تقریباً ”ڈھائی سال بعد دیکھا تھا۔ میں اپنا اے لیول کا امتحان دے کر فارغ ہوا۔ تو میں نے نانا کی طرف جانے کا پروگرام بنالیا۔ میرا ارادہ تھا کہ چند دن نانا کی طرف رہ کر دادا جان کے پاس چلا جاؤں گا۔ امی اور ابو راولپنڈی میں تھے۔

نانا کے گھر میں سب ہی مجھے دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔ نانا کافی کمزور ہو گئے تھے اور تائی جیراں بھی مجھے بجھی بجھی سی لگی تھی۔ وہ کام کرتے کرتے کھو جاتی تھی۔ گپ چپ پتا نہیں کیا سوچتی رہتی تھی۔ لسی بلوتے اس کے ہاتھ رک جاتے۔ نانی کی ٹانگیں دباتے دباتے کہیں کھو جاتی تھی۔ پتا نہیں تائی جیراں کو کیا ہو گیا تھا۔

ماموں منیر بھی گھر میں کم ہی نظر آتے تھے۔ ورنہ پہلے تو بہانے بہانے تائی جیراں کے آس پاس چکر لگاتے پھرتے تھے۔

”شاید اولاد نہ ہونے کی وجہ سے۔“ میں نے سوچا اور ایک دن تائی سے پوچھ بھی لیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ یہ دینے والے کی مرضی دے نہ دے۔ ہم بندے تو بس دعا ہی کر سکتے ہیں کاکے!“

”پھر آپ اتنی چپ چپ کیوں رہتی ہیں؟“

”بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اب کیا تجھے لگاتی اچھی لگوں گی۔“

وہ ہنسی تھی لیکن اس کی آنکھیں بالکل ساکت تھیں۔ ان میں دور دور تک کسی ہنسی کا نشان نہیں تھا اور یہ اسی رات کی بات تھی۔ میں ظہیر کے کمرے میں سونے کے لیے گیا تو ظہیر نے مجھے بتایا۔

”عثمان! تجھے ایک بات بتاؤں‘ پر دیکھ کسی سے مت کہنا۔“

”بول! نہیں کہوں گا۔“

”پتا ہے۔“ وہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر میری چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔ ”یہ جو منیر تایا ہے نا اس کا چکر چل رہا ہے۔ وہ چاچا فیروز نہیں ہے؟“

”کون چاچا فیروز؟“ میں گاؤں بہت کم آتا تھا۔ اس لیے بہت کم لوگوں کو جانتا تھا۔

”ارے وہی جو سردار ماما کی حویلی کے باہر پیپل تلے بیٹھا ہوتا ہے۔ جوتے گانٹھتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں چاچا فیروز۔“ مجھے یاد آگیا۔

”بڑا ہی نیک اور پرہیزگار بندہ ہے۔ سارے گاؤں والے عزت کرتے ہیں اس کی۔ اس کی بیوی کی بھانجی ہے میداں۔۔۔ نام تو اس کا حمیدہ ہے‘ پر سب میداں‘ میداں بلاتے ہیں اسے۔ بڑی فیشن ایبل اور طرح دار ہے۔ شہر سے آئی ہے۔ سنا ہے ماں‘ باپ مر گئے ہیں تو چاچا فیروز کی بیوی اسے اپنے ساتھ لے آئی ہے۔ بس اسی کے ساتھ چکر ہے تایا کا۔“

”تجھے کیسے پتا۔ منیر ماموں تو جیراں تائی سے۔۔۔ اور کیا وہ جیراں تائی سے زیادہ خوب صورت ہے؟“

”خوب صورت تو نہیں‘ پر ادائیں بڑی آتی ہیں اسے۔ تایا تو دیوانہ ہو گیا ہے اس کا اور وہ بھی۔ گاؤں میں ایسی باتیں چھپتی کہاں ہیں۔ سب کو ہی پتا ہے۔ اماں کہتی ہے‘ تایا تو شروع سے ایسا ہی تھا۔“

”پھر تو تائی جیراں کو بھی پتا ہو گا۔“

میں نے سوچا‘ تائی جیراں اسی لیے چپ اور کھوئی کھوئی رہتی ہے۔

”پتا نہیں۔“ ظہیر کو علم نہیں تھا۔

تائی جیراں نے ظریف سے اس لیے شادی نہیں کی تھی کہ وہ دل پھینک تھا اور اب ماموں۔۔۔

ظہیر اپنی چارپائی پر چلا گیا تھا اور میں تائی جیراں کے متعلق سوچتے سوچتے جانے کب سو گیا۔

صبح میری آنکھ منہ اندھیرے ہی کھل گئی تھی۔ کچھ دیر تو میں چارپائی پر لیٹا رہا۔ پھر اٹھ کر باہر آگیا۔ باہر چڑیوں کا شور تھا اور دور کہیں مسجد میں صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ میں صحن میں کھڑا ملگجے اندھیرے کو آہستہ آہستہ روشنی میں بدلتے دیکھ رہا تھا۔

میں نے تائی جیراں کو کمرے سے نکل کر برآمدے میں آتے دیکھا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے چھ سال پہلے والی کالی ناسے کی لنگی باندھی ہوئی تھی اور وہی آتشی گلابی ریشمی قمیص اور کالی پھولوں والی چادر۔ اس نے گردن اونچی کر کے برآمدے سے صحن میں اِدھر اُدھر دیکھے بغیر قدم رکھا تھا۔ جب بوکھلائے ہوئے ماموں منیر کمرے سے نکل کر اس کی طرف لپکے تھے۔

”سنو۔۔۔ سنو۔۔۔ جیراں کہاں جا رہی ہو۔ رکو تو بات تو سنو‘ مت جاؤ۔“

تائی جیراں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اس وقت کسی ملکہ کی طرح ہی لگی تھی۔ اتنا وقار‘ اتنی بے نیازی تھی اس کے چہرے پر کہ میں مبہوت سا کھڑا اس کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے رخ موڑ لیا اور قدم آگے بڑھائے۔ میں جیسے خواب سے بیدار ہو کر اس کی طرف لپکا۔ میرے کانوں میں ظہیر کی آواز آرہی تھی۔ ”تایا کا چکر چل رہا ہے۔“

”تائی۔۔۔ تائی آپ ماموں کو کیوں چھوڑ کر جا رہی ہیں۔“

وہ رکی اور اس نے ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے زمین پر تھوک دیا۔ ”تیرا ماما۔۔۔ ہری چگ ہے کاکے!“

اس کی آواز میں ہزاروں آنسوؤں کی نمی تھی۔ پھر وہ مڑی اور تیزی سے صحن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور یہ آخری بار تھا‘ جب میں نے تائی جیراں کو دیکھا تھا۔

تائی جیراں کے جانے کے ایک ہفتے بعد ماموں نے میداں سے شادی کرلی تھی۔ تائی جیراں نے صحیح کہا تھا۔

ماموں ہری چگ تھے۔

❁

شگفتہ جاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سب سے بہتر عمل یہ ہے کہ تم غربا اور مساکین کو کھانا کھلاؤ اور ہر شخص خواہ شناسا نہ ہو اسے سلام کرو۔

(بخاری)

غصے پر قابو،

کسی شخص نے امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز سے سخت کلامی کی تو آپ نے سر جھکالیا اور فرمایا۔

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ مجھے غصہ آجائے اور شیطان مجھے تکبر اور حکومت کے غرور میں مبتلا کردے اور میں تم کو ظلم کا نشانہ بناؤں اور بروز قیامت تم مجھ سے بدلہ لو۔ مجھ سے یہ ہرگز نہ ہوگا۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔

موتی مالا،

٭ اچھے لوگ سڑک کے کنارے لگی ہوئی برتیوں کی مانند ہوتے ہیں جو فاصلے کو کم تو نہیں کرتے البتہ راستے پر چلنے والوں کے لیے آسان اور محفوظ ضرور بنا دیتے ہیں۔

٭ طنز اور بحث سے رشتے کمزور ہوجاتے ہیں۔ بس کبھی بھی اپنوں سے ایسی لڑائی نہ لڑنا کہ لڑائی تو جیت جاؤ گے لیکن اپنوں کو ہار جاؤ گے۔

ڈسٹرب مت کرنا،

شوہر اور بیوی کرکٹ میچ دیکھ رہے تھے۔

بیوی: کون کھیل رہا ہے؟

شوہر: پاکستان۔

بیوی: ادھر کون سا کھلاڑی کھیل رہا ہے؟

شوہر: آفریدی۔

بیوی: یہ آفریدی کا کوئی بیٹا نہیں ہے نا؟

شوہر: پتا نہیں۔

بیوی: آج پھر انڈیا جیت گیا تو؟

شوہر: نہیں آج بنگلہ دیش سے میچ ہے۔

بیوی: اچھا بنگلہ دیش کی بھی ٹیم ہے؟

شوہر: ہے بابا ہے۔ تب ہی تو کھیل رہی ہے۔

بیوی: پاکستان کو کتنے کھلاڑی آؤٹ کرنے ہیں؟

شوہر: پاکستان ابھی بیٹنگ کررہا ہے۔

بیوی: تو کتنا اسکور ہوا پاکستان کا؟

شوہر: ایک سو بچاس۔

بیوی: تو مصباح نے کتنے رنز کیے ہیں؟

شوہر: مصباح تو کھیل ہی نہیں رہا۔

بیوی: تو کون کھیل رہا ہے؟

شوہر: شعیب۔

بیوی: یہ ثانیہ مرزا اور شعیب کا کوئی بچہ تو نہیں ہوا نا ابھی تک؟

شوہر: پتا نہیں۔

بیوی: ویسے یہ انڈیا میں رہتی ہے یا پاکستان؟

شوہر: پتا نہیں کہاں رہتی ہے۔ ملے گی تو پوچھ لوں گا۔

بیوی: غصہ کیوں کرتے ہو۔ ویسے ہی پوچھا ہے اچھا میچ کب ختم ہوگا؟

شوہر: آخری اوور ہے۔

بیوی: میچ والے دن تو آپ کو بس میچ کی پڑی رہتی ہے، بیوی بچوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا آپ کو۔

شوہر: لو جی۔ ختم ہوگیا میچ اب بنگلہ دیش کھیلے گا۔

بیوی: "ذرا ریموٹ دینا۔" بیوی نے چینل بدل کر ڈراما لگایا۔

شوہر: کون سا ڈراما ہے؟

بیوی: پلیز جب تک ڈراما لگا ہے، آپ مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔

نمرہ اقصرا۔ کراچی

خوش فہمی،

کسی ملک کے بادشاہ نے ایک مرتبہ فوج کے ایک چھوٹے افسر کو امتیازی نشان عطا کیا تو اس نے بادشاہ کو مخاطب کرکے کہا۔

"جہاں پناہ! میں خود کو اس کا حق دار نہیں سمجھتا۔ یہ تمغہ میں صرف میدان جنگ میں ہی وصول کرسکتا ہوں۔"

فوجی افسر کو یہ توقع تھی کہ بادشاہ اس کے جواب سے خوش ہوکر مزید انعام و اکرام سے نوازنے لگا یا کم از کم تحسین کے کلمات تو ضرور کہے گا۔ لیکن توقع کے برخلاف بادشاہ نے کہا۔

"عجیب احمق آدمی ہو۔ کیا تمہاری خاطر میں جنگ چھیڑ دوں۔"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

دو باتیں،

سلطان محمود غزنوی کے دربار میں بیسیوں ایسے مشہور و معروف نجومی جمع تھے جو زمانے میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ مگر سلطان کسی معاملے میں ان کی رائے نہ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی مصاحب نے دریافت کیا۔

"حضور! آپ کے پاس علم نجوم کے اتنے بڑے بڑے استاد جمع ہیں مگر کبھی ان سے کوئی بات نہیں پوچھتے پھر ان کی موجودگی کا فائدہ کیا ہے؟"

سلطان نے کہا۔ "ملک میں ہر علم اور ہر فن کے ماہروں کی موجودگی ضروری ہے ورنہ میرے معاملات کی بنیاد صرف دو باتوں پر ہے۔ اول خدا پر توکل اور دوسرے شریعت کا فتویٰ اور مخلص لوگوں کی رائے۔"

ندا یوسف۔ کراچی

دعا،

ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ کریم ہمیں پھولوں کا ٹوکرا عطا کرنے کے موڈ میں ہوتا ہے اور ہم صرف ایک پھول کی ضد لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔

(زاویہ ۔ اشفاق احمد)

نوال افضل گھمن۔ گجرات

خوف،

خوف دراصل خواہش سے جنم لینے والی کیفیت ہے۔ جو لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں، خوف زدہ رہتے ہیں۔

(بانو قدسیہ ۔ مردابریشم)

مدیحہ۔ فیصل آباد

افشائے راز کی سزا،

ابراہیم کہتا ہے کہ جس زمانے میں امیر المومنین مامون روم گیا ہوا تھا۔ ایک دن سوار ہوکر اپنے سپہ سالار عجیف سے بولا۔

"یا عجیف! آؤ میرے ساتھ گھوڑا دوڑاؤ۔ دیکھیں تمہارا گھوڑا کتنا تیز ہے؟"

عجیف ساتھ ہولیا اور دونوں نے باگیں اٹھادیں۔ جب لوگوں کی نظر سے دور پہنچ گئے تو مامون نے عجیف کو روک کر کہا۔

"سنو! اس دوڑ سے میرا مطلب مقابلہ نہ تھا بلکہ میں اس بہانے سے تنہائی میں تم سے ایک رازکی بات کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ مجھے اپنے بھائی معتصم کی طرف سے اندیشہ لگا رہتا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ اس کی نقل و حرکت کی نگرانی رکھو اور میری حفاظت کی کوشش کرو۔"

عجیف نے جھک کر سلام کیا۔ اور دونوں پڑاؤ کی طرف لوٹ گئے۔ لشکر گاہ میں پہنچ کر عجیف موقع کی فکر میں رہا اور جب موقع ملا تو معتصم کو سارا واقعہ کہہ سنایا۔ معتصم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آئندہ کے لیے احتیاط کرنے لگا۔

جب معتصم کی خلافت کا زمانہ آیا تو اس نے تخت پر بیٹھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ عجیف کو گرفتار کر کے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔

عجیف نے پوچھا "یا امیر المومنین! آپ کی بھلائی اور وفاداری کے سوا میں نے کون سا گناہ کیا ہے؟"

معتصم نے جواب دیا "تیرا گناہ یہ ہے کہ تو نے میرے بھائی مامون کا راز فاش کیا تھا حالانکہ اس نے تیرے حق میں بہت احسانات کیے تھے۔ تجھے پالا پوسا، نوکر رکھا، مرتبہ بخشا، ترقی دی۔ الغرض زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا۔ مگر تو اس کی ایک ذرا سی راز کی بات نہ چھپا سکا۔ پھر میں تیرا کیونکر اعتبار کر سکتا ہوں۔"

چنانچہ معتصم کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا۔ ایک بھید محفوظ نہ رکھنے کی وجہ سے اس کا سر محفوظ نہ رہ سکا۔

نمرہ، اقرا۔ کراچی

کم بری نہیں،

جو عورتیں پچھلی نشست پر بیٹھ کر گاڑی چلاتی ہیں وہ ان مردوں سے کچھ کم بری نہیں جو کھانے کی میز پر بیٹھ کر کھانا پکاتے ہیں۔

ہتھیار ضروری ہے،

مجھے اس بات سے بحث نہیں اسلام اخلاق سے پھیلا یا تلوار سے لیکن اسلام کی حفاظت کے لیے تلوار ضروری سمجھتا ہوں۔ جس قوم کے نوجوان دین چھوڑ کر فحاشی اور مردہ دلی پر زندگی گزارنا شروع کر دیں وہ قوم جنگ لڑے بغیر ہی ہار جایا کرتی ہے۔

(سلطان صلاح الدین ایوبی)

اشفاق احمد کہتے ہیں،

ہم میں سے وہی زندہ رہے گا جو دلوں میں زندہ رہے گا اور دلوں میں وہی زندہ رہے گا جو خیر بانٹے گا۔ محبتیں بانٹے گا اور آسانیاں پیدا کرے گا۔

جواب،

ایک خاتون صحافی نے ابن انشا سے سوال کیا۔

"آپ ادب کیوں تخلیق کرتے ہیں؟"

اس کا جواب ابن انشا نے یوں دیا۔

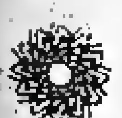
"آپ کی طرح ادب کے اور بھی کئی ہی خواہوں نے ہم پر یہ اعتراض کیا ہے۔ بھئی کیا کریں۔ عادت سے مجبور ہیں۔ پھر صحبت اچھی نہیں ملی۔ ہوش کی آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو ادیبوں اور شاعروں میں گھرا پایا۔ اس سے بہتر اور کوئی کام ہمیں آتا بھی تو نہیں۔"

(قرۃ العین حیدر)

روشن کرنیں،

- عاشق دنیا کو دوربین سے دیکھتا ہے اور حاسد خوردبین سے۔ (آئن اسٹائن)
- پرانے خطوط پڑھنے میں مزا اس لیے آتا ہے کہ ہمیں معلوم ہوتا ہے ان کا جواب نہیں دینا پڑے گا۔ (لارڈ بائرن)
- ہاتھیوں کی عمر انسان سے طویل اس لیے ہوتی ہے کہ انہیں ڈائٹنگ نہیں کرنا پڑتی اور وہ وزن کم کرنے کے لیے پریشان نہیں ہوتے۔ (بوب ہوپ)

کرن، بینش۔ فیصل آباد



امت الصبور



اسمبر گل کی ڈائری سے

امجد اسلام امجد محبتوں کے شاعر ہیں۔ لیکن بدلتے حالات ان کی شاعری پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ اب اس میں حالات کی تلخ حقیقتیں اور سچائیاں نظر آتی ہیں۔ ان کی کتاب "یہیں کہیں" سے ایک نظم قارئین کی نذر۔

سچ کی تلاش،

اپنے ہر جرم کی تاویل ہے ہر شخص کے پاس
کون ایسے میں کرے، کیسے کرے
جھوٹ کی اوٹ میں پوشیدہ کسی سچ کی تلاش
جتنی قدریں تھیں، بزرگوں کی امانت وہ سبھی
زائد بوجھ کی تمثال بنی جاتی ہیں
خواب بازار میں بکتے لگے چیزوں کی طرح
خواہشیں الجھا ہوا جال بنی جاتی ہیں
حق تھے جتنے بھی ہمارے، وہ ہوئے ضبط بحق سرکار
جتنے ایوال تھے ہمارے، ان میں
سج گئے اہل حشم کے دربار
بے حسی وہ کہ ضمیروں کو یہاں
کوئی ذلت نہیں کرتی بیدار
اس ہمہ گیر زبونی کا گلہ کس سے کریں
اپنی پہچان بھی جس دور میں مشکل ہو وہاں
آئنے تو ہی بتا اب کہ ملا کس سے کریں
اپنے ہر جرم کی تاویل ہے ہر شخص کے پاس

لالہ ماہ زیب کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر ادا جعفری کی یہ غزل جو مجھے بہت پسند ہے آپ سب کے لیے۔

کوئی سنگ رہ بھی چمک اٹھا تو ستارۂ سحری کہا
مری رات بھی ترے نام تھی اسے کس نے تیرہ شبی کہا

مرے روز و شب بھی عجیب تھے نہ شمار تھا نہ حساب تھا
کبھی عمر بھر کی خبر نہ تھی کبھی ایک پل کو صدی کہا

مجھے جانتا بھی کوئی نہ تھا، مرے بے نیاز ترے سوا
نہ شکستِ دل نہ شکستِ جاں کہ تیری خوشی کو خوشی کہا

کوئی یاد آ بھی گئی تو کیا، کوئی زخم کھل بھی گیا تو کیا
جو صبا قریب سے ہو چلی اسے منزلوں کی گھڑی کہا

بھری دوپہر میں جو پاس تھی وہ تیرے خیال کی چھاؤں تھی
کبھی شاخِ گل سے مثال دی، کبھی اس کو سرو سہی کہا

کہیں سنگ رہ، کہیں سنگ در کہ میں ہم سفر کے نگر میں ہوں
یہ نہیں کہ دل کو خبر نہ تھی، یہ بتا کہ منہ سے کبھی کہا

مرے حرف حرف کے ساتھ بھی آئنوں کی ہیں کرچیاں
جو زباں سے ہو نہ سکا ادا بہ حدودِ بے سخنی کہا

نخبہ اکرم کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر محسن نقوی کی یہ خوبصورت سوغات آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

سمندر سارے شراب ہوتے، تو سوچو کتنے فساد ہوتے
گناہ نہ ہوتے، ثواب ہوتے، تو سوچو کتنے فساد ہوتے

کسی کے دل میں کیا چھپا ہے، یہ تو رب ہی جانتا ہے
دل اگر بے نقاب ہوتے، تو سوچو کتنے فساد ہوتے

تھی خاموشی ہماری فطرت، جو چند برسوں بھی نبھ گئی ہے
جو ہمارے منہ میں جواب ہوتے، تو سوچو کتنے فساد ہوتے

ان کی نظریں نہ جان پائیں، اچھائیاں ہماری محسن
ہم جو سچ میں خراب ہوتے، تو سوچو کتنے فساد ہوتے

خبرگیری و سی گیری

واصفہ سہیل



متاثر

اداکارہ نور کا کہنا ہے کہ مجھے آئے دن شادی کی آفرز ہوتی رہتی ہیں (زور کس پر ہوا۔۔۔ آفرز پر) لیکن فی الحال میری تمام تر توجہ کیریر کی طرف ہے۔ وقت آنے پر شادی کروں گی۔ (وضاحت سے کہیے۔۔۔ وقت آنے "دو گی" شادی کروں گی) اور چھپاؤں گی نہیں (چھپا سکتی بھی نہیں ہیں آپ) شادی کے لیے بیرون ملک جانے کو ترجیح نہیں دوں گی (ریما! سن رہی ہیں۔۔۔؟) انہوں نے مزید کہا کہ وہ لگژری گاڑیوں سے متاثر نہیں ہوتیں بلکہ وہ ایسے شخص سے شادی کریں گی جس کے ملک میں اپنے ذاتی ہوائی جہاز ہوں گے (ہونہہ۔۔۔ لگژری گاڑی لیکن نور! اگر اس کے بعد آپ کی آنکھ کھل جائے تو۔۔۔؟)

اختلاف

میرا کو اچانک میرا سے نجانے کیا اختلاف ہو گیا ہے کہ وہ ان کے خلاف دشمنی پر اتر آئیں اور لگیں ان کے خلاف بیان بازی کرنے کہ پکی عمر والی میرا کو اب باعزت طریقے سے ریٹائرمنٹ لے لینی چاہیے میں تو میرا کے مقابلے میں آدھی عمر کی ہوں (میرا! اس طرح تو اپنی عمر کے راز بھی کھول رہی ہیں) اور تو اور میرا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اپنی کم ہوتی مقبولیت کو سہارا دینے کے لیے میرا نے اپنے متنازعہ ویڈیو اسکینڈل بھی خود ہی بنوائے ہیں (برادری کے لوگ ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں۔ ہم کیا عرض کریں۔)

ذمہ داری

پنجاب فلم سنسر بورڈ کی چیئرپرسن اداکارہ زیبا کی تنخواہ پنجاب حکومت نے دو لاکھ مقرر کر دی ہے۔ واضح رہے کہ پنجاب حکومت نے تقریباً" آٹھ نو ماہ قبل زیبا کو یہ ذمہ داری سونپی تھی لیکن تاحال سنسر بورڈ کا قیام عمل میں نہیں آسکا ہے (تو چیئرپرسن رکھنے کی اتنی جلدی کیا تھی؟) زیبا اس سلسلے میں بہت کوششیں کر رہی ہیں کہ کسی طرح بورڈ کا قیام عمل میں لایا جا سکے (بھئی ان کے دو لاکھ کا سوال ہے آخر) لیکن حکومت نے انہیں یقین دہانی کروائی ہے کہ جلد ہی ان کے لیے دفتر کا انتظام کر دیا جائے گا (زیبا۔۔۔ فرمایئے آپ کیا سنسر کریں گی۔ فلمیں تو بنتی ہی نہیں یہاں۔)



پرفارمنس

پچھلے دنوں سارک کے زیر اہتمام ناروے میں ایک میوزک کنسرٹ کا اہتمام کیا گیا جس میں سری لنکا اور انڈیا سے کلاسیکل ڈانسرز کے ساتھ ساتھ پاکستان سے اس کنسرٹ میں شرکت کرنے والے واحد پاکستانی پرفارمر گلوکار و موسیقار امانت علی تھے۔ انہوں نے اپنی پرفارمنس سے لوگوں کے دل جیت لیے۔ اس بارے میں امانت نے کہا کہ انہوں نے اس کنسرٹ میں اردو اور انگلش زبان میں گیت پیش کیے جسے شائقین نے بہت پسند کیا (نہ بھی کیا ہو تو تصدیق کے لیے ناروے تو جانے سے رہے) اور انہیں لوگوں کی طرف سے بہت اچھا رسپانس اور پیار ملا (نہ بھی ملتا۔ امانت! ہمارے لیے تو یہی کافی تھا کہ آپ نے انڈین کلاسیکل ڈانسرز کے ساتھ پرفارم کیا۔)

کوشش

آج کل جسے دیکھو وہ انڈسٹری کی بہتری اور بدلنے کی باتیں کرتا نظر آتا ہے۔ بھلے وہ خود ہی اس کی بربادی کا ذمہ دار ہو۔ اب اداکارہ صائمہ کو ہی دیکھ لیں کہتی ہیں فلم انڈسٹری کے لیے میں جو کر سکتی تھی کر رہی ہوں (نہ کریں تو زیادہ اچھا ہوتا۔۔۔ کیا خیال ہے؟) میری کوشش ہوتی ہے کہ جس فلم انڈسٹری نے مجھے بہت بڑا نام (سید نور کا۔۔۔؟) اور مقام دیا ہے (مسز شاہدی؟) میں بھی اس کو جو کچھ ہو سکے دوں (تو بس پھر۔۔۔ ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیں) اور میں مطمئن ہوں کہ فلم انڈسٹری کے دن بدلنے والے ہیں اور پھر ایک بار اسٹوڈیوز کی رونقیں بحال ہوں گی (اس قدر یقین کس بل پر صائمہ)

پذیرائی

عائشہ خان "وار" کی کامیابی پر بہت خوش ہیں انہوں نے کہا کہ وار کو میری سوچ سے بڑھ کر پذیرائی ملی (ہاں یعنی آپ کو اپنی صلاحیتوں پر خود بھی یقین نہیں تھا) اور اس کے بعد مجھے کئی فلموں کی آفرز ہوئی





ہیں (انہوں نے ہی کی ہوں گی) میں فلموں کی شوٹنگ میں مصروف ہوں۔ بہت جلد میرے پرستار مجھے کئی نئی فلموں میں دیکھیں گے۔ عائشہ نے مزید کہا کہ ڈرامہ انڈسٹری کے بعد اب پاکستان فلم انڈسٹری میں بھی ترقی کے دروازے کھل گئے ہیں (کس کی ترقی؟) اچھی اور معیاری فلمیں بننا شروع ہو گئی ہیں اور ہمارے ٹی وی کے فنکاروں نے ہی فلم انڈسٹری کو سہارا دیا ہے۔ (اف! اتنا اعتماد "ان" پر) جبکہ فلم انڈسٹری کی بحالی کے لیے بڑے بڑے دعوے کرنے والے آج بھی صرف باتوں کی حد تک ہی محدود ہیں جبکہ جنہوں نے کام کرنا تھا' وہ کر بھی چکے۔ (اتنا فخر عائشہ۔۔۔ ابھی "انہوں" نے ایک ہی فلم تو بنائی ہے۔) اپنے ڈراما سیریل "شک" کی کامیابی سے بھی وہ بہت خوش ہیں۔ اس میں عائشہ خان نے پہلی بیوی کا کردار بہت خوب صورتی سے ادا کیا ہے۔ (ویسے عائشہ! اب تو آپ کو پہلی بیوی کے جذبات و احساسات کا اندازہ ہو گیا ہو گا امید ہے اصل زندگی میں "دوسری" بیوی بننے کا اتفاق ہوا تو یقیناً" آپ ایک لمحے کو سوچیں گی ضرور۔)

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ مجرموں کے کسی ٹولے کا سرغنہ پکڑا جائے تو اسے اس لیے رعایت نہیں دی جاتی کہ اس کے دیگر ساتھی پکڑ میں نہیں آئے اور نہ وہ خود کہتا ہے کہ فلاں فلاں کو بھی تو پکڑو۔

(روزنامہ جسارت)

☆ افغانستان کے اندر امریکا کے قتل و غارت میں ہم کھل کر شامل ہیں اور ان کے ساتھی ہونے پر ہمیں ناز ہے۔ یہ وہ مشہور یوٹرن ہے جو ہم نے فخر سے اس صدی کے آغاز میں لیا اور آج بھی اسی کے گیت گاتے ہیں اور کتنے ہی منہ یہ راگ الاپتے نہیں تھکتے کہ یہ جنگ ہماری بقا کی ہے۔ اپنی ہی بقا کے لیے خود کشی ہے۔

نہیں نہیں خود کشی نہیں۔ ہم اپنے بچے تے خداؤں کے قدموں میں بھینٹ چڑھاتے ہیں۔

(جنرل شاہد عزیز۔۔۔ یہ خاموشی کہاں تک)

☆ جنرل کیانی کو بھی یقین نہیں تھا کہ بیت اللہ محسود نے بے نظیر بھٹو کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ در حقیقت حمزہ بن لادن' لال مسجد اور کراچی سے تعلق رکھنے والی ایک مسلح تنظیم بے نظیر بھٹو کی جان لینا چاہتی تھی۔

(امریکی مصنف ہارلو مونوز کا اپنی کتاب میں انکشاف)

☆ لال مسجد میں بھی علما کے ذریعے مذاکرات کیے گئے اور یہ مذاکرات تین مرتبہ کامیاب ہو گئے لیکن تینوں مرتبہ مشرف نے ان مذاکرات کو سبوتاژ کر دیا کیونکہ وہ معزول ججوں کی بحالی تحریک سے توجہ ہٹانے کے لیے لال مسجد میں کشیدگی کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

(قلم کمان۔ حامد میر)



فوزیہ ثمر بٹ ـــــــــ گجرات

دستکوں پر بھی جو نہ کھلتا تھا' وہ در کیسا تھا
نام لکھا تھا جس پر میرا' وہ گھر کیسا تھا
سنگ پھینکا نہ کسی نے اُسے مڑ کر دیکھا
جو ہری شاخ پر ٹھہرا تھا' ثمر کیسا تھا

ـــــــــ

ضبط کی کون سی منزل تھی' کس مقام پہ آ کے ہارے ہیں
اتنا تو مجھے معلوم ہی ہے' تیرے نام پہ آ کے ہارے ہیں
کب جیت کا دعوا ہم نے کیا؟ یہ ازل ابد کا قصہ ہے
ہم بے خبری کے عالم میں انجام پہ آ کے ہارے ہیں

ـــــــــ

جو حرف لوحِ وفا پہ لکھے ہوئے ہیں ان کو بھی دیکھ لینا
جو رائیگاں ہو گئیں وہ ساری عبارتیں بھی شمار کرنا

ـــــــــ

طوفاں ہے تو کیا غم' مجھے آواز تو دیتے
کیا بھول گئے میرے کچے گھڑے وہ

ـــــــــ

کس نے کھیل کھیلا ہے' کس نے ہجر جھیلا ہے
اب گزر گیا جاناں' اس سوال کا موسم

انیقہ انا ـــــــــ چکوال

ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے
ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے
عمرِ جاوید کی دُعا کرتے
فیض اتنے وہ کب ہمارے تھے

پرنسز عنوی اکرم ـــــــــ کراچی

جنہیں دیکھا نہیں دُنیا کی بے تعبیر آنکھوں نے
بہت سے لوگ ان خوابوں کے مستقبل میں رہتے ہیں

حرا قریشی ـــــــــ ملتان

رُکا ہوا ہے عجب دُھوپ چھاؤں کا موسم
گزر رہا ہے کوئی دل سے بادلوں کی طرح

نمرہ' اقرا ـــــــــ کراچی

وفورِ بے خودی میں اب یہ عالم ہے محبت کا
جبیں وقفِ حدودِ آستاں معلوم ہوتی ہے
جنونِ عشق کا حاصل ہے سجدوں کی فراوانی
یہی اب جادۂ عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

خالدہ جیلانی



میری بیاض سے

راشدہ لیسین راؤ ـــــــــ کوٹ ادو

زندگی تیرے تعاقب میں لوگ
اتنا چلتے ہیں کہ مر جاتے ہیں

امبر گل ـــــــــ جھڈو (سندھ)

میری نظروں کی بلندیاں تجھے کس مقام تک لے گئیں
وہ تیرے قدموں کی دُھول تھی' مجھے کہکشاں کا گماں ہوا

ـــــــــ

روٹھا ہوا تھا ہنس پڑا مجھ کو دیکھ کر
مجھ کو اس قدر بھی دلاسا بہت لگا
صحرا میں جی رہا تھا جو دریا دلی کے ساتھ
دیکھا جو غور سے تو وہ پیاسا بہت لگا

طیبہ نواز ـــــــــ اٹک

قبریں ہی جانتی ہیں کہ اس شہرِ جبر میں
مر کر ہوئے ہیں دفن کہ زندہ گڑے ہیں لوگ

شفاعت بتول نین تارا ـــــــــ جام پور

بیٹھا رہا وہ پاس تو میں سوچتی رہی
خاموشیوں کی اپنی بھی تاثیر ہے بہت

نوشابہ منظور ـــــــــ بھیرہ روڈ

عجیب رنگ جہاں ہے' عجیب نظامِ حیات
تلاشِ حق کسی کو ہو' خدا کسی کو ملے

خدیجہ تکبری ـــــــــ کھڈیاں خاص

نگاہ میری اُٹھی تھی سوال کی صورت
نظریں جھکا لیں اس نے جواب کے بدلے

جگنو بوزدار ـــــــــ گڈو کالونی

دُھوپ کے زمانوں میں اعتبار کا موسم
موم کی حقیقت تھی یوں پگھل گئی جیسے



نادیہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی.
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

امبر گل۔۔۔ ٹھٹھہ

زندگی کی شاہراہ پر اچھے بھلے چلتے چلتے آپ کا کوئی بہت اپنا، دوست، ہمراز، آپ کو اچانک سے چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور آپ تنہا ہو جاتے ہیں۔ امی کے ہوتے ہوئے مجھے کبھی بہن کی کمی محسوس ہوتی نہ ہی کسی دوست کی، ماں نے ہر رشتے کی سہولت دے رکھی تھی مجھے، اور جب وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تو پھر بس کچھ نہ پوچھیں۔

ٹائٹل تو سالگرہ نمبر کا جتنا خوبصورت ہونا چاہیے تھا۔ تو وہ تو بالکل ہی توقعات کے برعکس نکلا، بہت مصنوعی سا تاثر پیش کر رہی تھی۔

عفت سحر کا ناول آہستہ آہستہ انٹرسٹنگ ہوتا جا رہا ہے۔

گھر اک نگر کی نورالعین کے کردار میں نجانے کیوں مجھے خود راشدہ ہی کی جھلک نظر آئی ہے کیونکہ بشریٰ جی نے بتایا تھا نا ایک بار کہ خود راشدہ بھی شرعی پردہ کرتی ہیں۔ بہت زبردست تحریر تھی، سحر ساجد کی "پہلا اور آخری داؤ" اور امثل کی "بارش روٹھ بھی جائے" تو بس نارمل تحریریں تھیں۔ افسانوں میں سب سے پہلے "زرد کون" ہی پڑھا تھا، پھر صلہ اور پھر حصار مگر "حصار" پہلے پڑھ تو لیا، مگر پڑھنے کے بعد پھر میں بے تحاشا روئی، سچ ہی تو ہے کہ ماں کی دعاؤں کا حصار، ماں کا ساتھ چھوٹتا ہے تو انسان کسی میلے میں گم ہوئے بچے کی مانند ہو جاتا ہے، سچ کہا ہے کسی نے کہ ("مائے نی میں کنوں آکھاں، درد وچھوڑے دا حال نی") پھر مصنفین سے کیا گیا سروے پڑھا، سب سے اچھے جوابات "سمیرا حمید" کے ہی لگے، لاکھ شکر ہے کہ اس نے پہلے میری ماں کو اور ماں سے ــــــ مجھے ایک ایسا ہنر دیا کہ جس کی وجہ سے میں بہت چھوٹی سی عمر سے ہی اپنے آپ پر انحصار کرنے لگ گئی تھی، اور میں تو کہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ میرے ہاتھوں کو دینے والا ہی رکھے۔ شاہین آپی سے ایک مودبانہ سی درخواست ہے کہ اب آپ ARY نیوز کی فیمیل اینکرز قرۃ العین اقرار اور صمیہ رضوان کے انٹرویوز بھی کروا لیے۔

ج۔ پیاری امبر! ہم آپ کے جذبات و احساسات سمجھ سکتے ہیں۔ زندگی کے کسی موڑ پر بھی ماں سے بچھڑ جانا بہت بڑا سانحہ ہے اور اس کی کو کوئی بھی پورا نہیں کر سکتا۔ ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کی مغفرت فرمائے اور آپ کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنا دے۔ آپ نے ان کے ہنر کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہمیں اس بارے میں ضرور بتائیں، ان کا ہنر آگے بڑھانا، کسی کو سکھانا بھی صدقہ جاریہ ہو سکتا ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سیدہ نسبت زہرہ۔۔۔ کھروڑپکا

تین سال پہلے ایک پرابلم کی وجہ سے میں دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گئی تھی۔ اپنے والدین کی دعاؤں کی بدولت آج پھر سے پہلے جیسی ایکٹو ہو گئی ہوں۔ اب تو ہمارا یہ تعلق قائم رہے گا۔

ہو گئی ایک خوبصورت سی غلطی مجھ سے
تم سے محبت اور صرف تم سے محبت

ج۔ پیاری زہرہ! ہمیں بے حد خوشی ہے کہ آپ صحت یاب ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اسی طرح ایکٹو رکھے۔ آپ کی "خوبصورت غلطی" کی ہمارے دل میں بے حد قدر ہے اور یہ خوبصورت غلطی ہم سے بھی سرزد ہو چکی ہے۔ ہم بھی اپنی قارئین سے دل لگا کر رکھتے ہیں۔

اقراء ملک۔۔۔ گوجرانوالہ

اپنی پسندیدہ رائٹرز کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی خاص طور پر سمیرا حمید کے بارے میں۔ افسانوں میں حصار بازی لے گیا۔ انوشہ کو بھی اس کی محنت کا صلہ مل گیا۔ "کوہ گراں تھے ہم" اب مسلسل تجسس پیدا کرنے لگا ہے۔

عدنان بھائی بھی بہت اچھا مشورہ دیتے ہیں صبا سحر سے گزارش ہے کہ بل دار پراٹھے بنانا سکھا دیں مجھے انیقہ انا عائشہ خان فوزیہ ثمر کے خط اچھے لگتے ہیں۔

ج۔ پیاری اقرا! بل دار پراٹھوں کی ترکیب تو لکھی جا سکتی ہے۔ لیکن پراٹھے بنانا سیکھنے کے لیے آپ کو کراچی آنا پڑے گا۔ اسے لکھ کر سمجھانا قدرے مشکل ہے۔

سحر سہیل۔۔۔ کراچی

سالگرہ نمبر بہت اچھا تھا خاص طور پر سحر ساجد کا ناول بے حد پسند آیا۔ طویل عرصہ بعد تنزیلہ ریاض کی تحریر دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ ابھی کہانی واضح نہیں لیکن تنزیلہ کا انداز بیان زبردست ہے۔ پلیز عہد الست کے معنی بتا دیں۔

ج۔ پیاری سحر! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ

عہد الست کا مطلب اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے کا وہ اقرار یا عہد ہے جو انسان نے عالم ارواح میں کیا تھا۔

قرآن پاک میں آیا ہے کائنات کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ــ انسانوں کی روحیں پیدا کیں تو ان سے خطاب کرتے ہوئے پوچھا۔ الست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں)

انہوں نے جواب دیا۔ بلیٰ (کیوں نہیں تو ہی ہمارا رب ہے۔)

عہد الست سے مراد عالم ارواح میں خدا تعالیٰ کے حضور اس کے معبود ہونے کا یہی عہد یا قول و قرار ہے۔

نور، صبا، سعدیہ شیخ۔۔۔ ملتان

ماہ تمام اور بن مانگی دعا بہت اچھی جا رہی ہیں۔ پہلا اور آخری داؤ سحر ساجد کا بہترین تھا۔ تنزیلہ ریاض تو بے مثال ہیں بہت شاندار۔ ثمرہ بخاری کے شدت سے منتظر ہیں۔

ج۔ نور، صبا، سعدیہ! بہت شکریہ ثمرہ بخاری کی تحریروں کا آپ کو ہی نہیں ہمیں بھی بے حد انتظار ہے۔

بیا۔۔۔ چیچہ وطنی

اس ماہ کا خواتین بہت اچھا تھا، ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ خواتین سے ہمیں بہت سیکھنے کو ملا ہے۔

ج۔ بیا! بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ خواتین کی کہانیاں صرف پڑھتی ہی نہیں ان سے سیکھتی بھی ہیں۔

بسمہ زماں، ندا بابر، ندا اہمایوں۔۔۔ ٹوپی صوابی

ادارہ خواتین کے تمام رسالے اپنی مثال آپ ہیں۔ تمام مصنفین آسمان پر چمکتے دمکتے ستاروں کی طرح خواتین ڈائجسٹ کو جگمگا رہے ہیں۔

ج۔ بسمہ، ندا اور ندا! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ، آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

جیا۔۔۔ نامعلوم شہر

ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی شمارہ زبردست رہا۔ زرد کون بہت اچھا تھا کہ ایک لڑکی کے لیے تعلیم ہی سب کچھ نہیں ہوتی اور خانہ داری میں بھی پاس ہونا ضروری ہے۔ بشریٰ احمد کی "صلہ" بھی اچھی تھی لیکن ہر بہو انوشہ جیسا صبر نہیں رکھتی ہے۔

امثل عزیز شہزاد کی "بارش روٹھ بھی جائے" زبردست ناولٹ تھا، لیکن کیا آپ یہ بتائیں گی ہمیشہ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے کہ انسانوں کے دل وہاں ٹھہرتے ہیں جو ان کے لیے نہیں ہوتے۔

اب آتے ہیں "سحر ساجد" کے مکمل ناول "پہلا اور آخری داؤ" کی طرف۔ میرے پاس اتنے اچھے الفاظ نہیں ہیں کہ میں اس ناول کی تعریف کر سکوں۔ کمال کر دیا واقعی آپ نے۔ اتنے خوبصورت انداز میں آپ نے سبق آموز کہانی بنائی کہ کمال کر دیا۔

ج:۔ حیا! آپ اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئیں۔ آئندہ خیال رکھیے گا۔
صبر بلاشبہ بہت مشکل ہے تب ہی نوید دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جہاں تک دل ٹھہرنے کا معاملہ ہے تو کم عمری کے شوریدہ سر جذبات آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں اور انسان سامنے کی چیز نہیں دیکھ پاتا۔ اکثر غلط جگہوں پر دل لگا بیٹھتا ہے اور پھر پچھتاتا ہے۔
"انسان اپنے لیے شر کو ایسے مانگتا ہے جیسے خیر کو اور بے شک انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔"
انسان ایسے کیوں کرتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسے مستقبل میں جھانکنے کی طاقت نہیں دی گئی۔ وہ نہیں جان پاتا کہ اس کے لیے کیا بہتر ہے۔ وہ نہیں جان پاتا کہ بظاہر خوش نما، خوب صورت نظر آنے والی چیزیں اس کے کتنی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہیں۔

سارہ، مریم، طوبیٰ، الشاع۔۔۔ سنجر پور

ٹائٹل ماڈل مصنوعی سی دکھ رہی تھی۔ اتنا میک اپ جو تھوپا ہوا تھا۔ سب سے پہلے مصنفین کے سروے پڑھے پڑھ کر بہت مزا آیا۔ ہمیشہ کی طرح پہلے آمنہ ریاض کی تحریر پڑھی۔ مہک ہمیں ذرا بھی اچھی نہیں لگتی۔ ایسے ہی کباب میں ہڈی بنی ہوئی ہے۔ ویسے یہ پہلی تحریر ہے جس کی اینڈنگ کے بارے میں کوئی تجسس نہیں ہے۔ اب آتے ہیں "کوہ گراں" کی طرف ہائے اللہ جی۔ کرداروں کی بھرمار، طیبغے، طوفے، میراثی مروتی، اتنی الجھی ہوئی کہانی ہمیں سارا پچھلا یاد بھول گیا ہے۔ یہ کہانی پڑھ کے سمجھتے سمجھتے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ آپ لکھ کیسے لیتی ہیں؟ ہمیں ایسے لگتا ہے جہاں سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی، وہاں پہ ہی آگئی ہے۔ ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ عنیزہ سید "علامہ اقبال" کے استاد مولوی میر حسن کی نواسی ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟ عفت سحر طاہر کی تحریر بن مانگی دعا اچھی جا رہی ہے۔ تنزیلہ ریاض آتے ہی چھا گئیں۔ "عہد الست" کہانی اپنے نام کی طرح بہت اچھی جا رہی ہے۔ ویسے ہم تنزیلہ جی کی پہلی تحریر پڑھ رہی ہیں۔ امثل عزیز کی تحریر بہت اچھی لگی۔ افسانے تینوں ہی بہت اچھے تھے۔
ج: سارہ، مریم، طوبیٰ، الشاع! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔
عنیزہ سید کی کہانی شروع میں تھوڑی سی الجھی ہوئی تھی لیکن اب تو سارے کردار واضح ہو چکے ہیں اور کرداروں کا آپس میں تعلق بھی۔ یہ درست ہے کہ تجسس کی وجہ سے کہانی رکی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے۔
عنیزہ سید مولوی میر حسن کی نواسی ہیں، اس بارے میں ہمیں علم نہیں ہے۔

حیا بخاری۔۔۔ ڈی آئی خان

آپی مجھے سائرہ رضا بے حد پسند ہیں اور سچ کہوں تو سحر ساجد بھی زبردست لکھتی ہیں۔ سائرہ رضا نے اپنے ناول "اب کریسی رفوگری" میں واضح طور پر بچیوں کے متعلق کئی خاندانوں کی بے جا ہٹ دھری، جس کا ہمارے دین سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔ آشکارا کی ہے۔ والدین کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ انہوں نے بچیوں پر بھی آشکار کر دیا کہ بڑوں کے فیصلے سے روگردانی صرف شرمندگی اور پچھتاوا ہے۔
رہی بات "پہلے داؤ" کی تو اس میں بہن سحر بار بار اپنے ہی الفاظ کی نفی کرتی رہیں۔ عنایا کو پہلے پڑھائی میں کمزور دکھایا گیا مگر بعد اس کی کاپیاں چوری کر لی گئیں تاکہ وہ ڈانٹ کھا سکے۔ جو بچی ایسے ہی ڈانٹ کھاتی ہے اس کے لیے مزید جواز پیدا کرنے سے کیا حاصل۔ دادا جان نے عنایا کو بہترین سبق دیا کہ اللہ ہمیں آزماتے ہیں۔ اس بچی نے سمجھ بھی لیا "تب خود سے پلان بنانا" اگر اسے واقعی پتا تھا کہ ثمن ایک مریض ہے تو اسے سچے دل سے اس کے لیے پلان بنانا چاہیے تھا۔ ایک اور جگہ بھی قرآن و حدیث کا سہارا لیا گیا کہ نیکی کرو تو کسی کو خبر نہ ہو۔ لیکن جسے یہ سبق دیا گیا اسی سے اپنی ہی پھوپھی زاد کو بے خبری میں ایسی مات دینا، تردید کرنے جیسا لگا۔ میں شاید یہ باتیں نہ لکھتی۔ مگر کیا کروں کہ میرے شوہر بھی اس رسالے کے بہت بڑے شیدائی ہیں۔ اور انہوں نے یہ سب صاف لکھنے کو کہا۔ باقی سالگرہ نمبر زبردست رہا۔ اور "بارش روٹھ بھی جائے" بہترین تحریر۔
ج: پیاری حیا! آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی۔ سحر ساجد کے بارے میں اداریے میں جو چند سطور لکھی گئیں۔ ان کا مفہوم سائرہ رضا سے موازنہ نہیں تھا۔ سائرہ رضا نے والدین کی بے جا ہٹ دھری پر لکھا تھا جبکہ سحر ساجد نے یہ

دکھایا کہ والدین اگر فیصلہ لڑکیوں پر چھوڑ دیں تو نو عمری کی جذباتیت میں ان سے غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ انہیں وہ نظر نہیں آتا جو والدین کی دور رس نگاہیں دیکھ سکتی ہیں۔ جیسے مریم سے غلطی ہوئی۔ لیکن یہ تو ایک ضمنی سی بات تھی۔ ناول کا اصل موضوع، مقصد اور پیغام یہ تھا کہ نصابی تعلیم ذہانت کو ناپنے کا پیمانہ نہیں ہے۔ جو بچے کلاس میں پوزیشن لیتے ہیں۔ فرسٹ آتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہی ذہین ہوں کم نمبر لینے والے، فیل ہونے والے طالب علم بھی ذہین ہو سکتے ہیں۔ کالم نگار ڈاکٹر صفدر محمود استاد رہے ہیں بعد میں سی ایس ایس کا امتحان دے کر سول سروس میں آگئے۔ پچھلے دنوں انہوں نے اپنے کالم میں اپنے تجربات کے حوالے سے لکھا۔
"ایک بڑا عجیب و غریب مشاہدہ اور تجربہ ہے جن کالج فیلوز کو ہم اپنا آئیڈیل سمجھتے تھے جو اچھے مقرر، اچھے لکھاری نہایت لائق فائق طلبہ تھے عملی زندگی میں کہیں ان کا نام بھی نہ پایا۔ ان ٹاپ کرنے والے لائق فائق طلبہ کے برعکس درمیانے درجے یا کم ترین درجے کے طلبہ میں سے نام اور دام کمایا۔ شہرت کے افق پر چھائے معزز، باوقار، باکمال کہلائے۔"
عنایا نصابی تعلیم میں کمزور تھی لیکن ذہین تھی۔ اور بات یہ ہے کہ کوئی اور تو کیا اس کی ماں بھی اس کی صلاحیتوں کو سمجھ نہ سکی، پہچان نہ سکی۔ آپ نے سوال کیا ہے کہ جو بچی ویسے ہی ڈانٹ کھاتی ہے اس کے لیے مزید جواز پیدا کرنے سے کیا حاصل؟
دراصل آپ یہ پوائنٹ نہیں سمجھ سکیں کہ ثمن منفی فطرت کی حامل تھی۔ وہ کیلوپٹیا کی شکار بھی بلا ضرورت عادتاً "چوری کرنے کی عادت، بڑی نامور دولت مند خواتین جو اس عادت کا شکار ہوتی ہیں۔ بڑے اسٹورز میں جاتی ہیں تو چیزیں چرا لیتی ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے عنایا ثمن کے بارے میں کسی کو بتاتی تو اس کا یقین کون کرتا۔ اسے تو سب کم عقل، کند ذہن بچی سمجھتے تھے۔ ثمن کی فطرت میں معاف کرنا نہیں تھا۔ پہلی بار جب عنایا نے اس سے معافی مانگی تو اس کی آنکھوں کا سرد تاثر دیکھ کر وہ سہم گئی تھی۔ پھوپھی زاد کو بے خبری میں مات دینا؟ آپ نے بالکل غلط سمجھا۔ ثمن کو مات دینے کا کیا سوال؟ ثمن داؤد کو چاہتی ہی نہیں تھی۔ اس کا مشغلہ تو لڑکوں کے جذبات سے کھیلنا اور انہیں ذلیل کرنا تھا۔ مختلف نام جو اس نے لکھے تھے وہ ان لڑکوں کے تھے جو اس کا شکار بنے۔ داؤد کے نام کے گرد جو دائرہ لگایا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اب داؤد کی باری تھی۔ عنایا نے داؤد کو اور خود کو بچایا۔ کیونکہ داؤد اس کی زندگی تھا۔ ثمن داؤد سے کھیل کر اسے ذلیل کر کے چھوڑ دیتی تو داؤد پر کیا گزرتی؟ وہ ثمن کو مات نہیں دینا چاہتی تھی، داؤد کو اور خود کو بچانا چاہتی تھی۔
اس نے سمجھ داری سے کام لیا اور بڑی ذہانت سے داؤد اور اپنی پھوپھی مریم تک یہ بات پہنچائی کہ ثمن ذہنی مریضہ ہے۔ اس کو علاج کی ضرورت ہے۔ اگر وہ یہ طریقہ اختیار نہ کرتی تو کوئی اس کا یقین ہی نہیں کرتا کیونکہ ثمن نے اپنی ذہانت کے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔

صائمہ سعید۔۔۔ لاہور

میں آپ کے ادارے کے شعاع اور خواتین ڈائجسٹ

بہت ذوق و شوق سے پڑھتی ہوں۔ مجھے ان ڈائجسٹوں کو پڑھتے ہوئے 21 سال ہو گئے ہیں۔ 21 سال گزرنے کے باوجود بھی میرا ذوق و شوق برقرار ہے۔ میری ٹاپ آف دی لسٹ رائٹر عمیرہ احمد ہیں۔ اب آتے ہیں اپریل کے ڈائجسٹ کی طرف۔ افسانوں میں سب سے اچھا افسانہ بشریٰ احمد کا رہا۔ راشدہ رفعت کا ناولٹ پڑھ کے کچھ دیر کے لیے ذہن زندگی کی دوسری ٹینشن سے آزاد ہو گیا۔ آمنہ ریاض کا ناولٹ ماہ تمام مجھے بہت بہت پسند ہے۔ پلیز آمنہ باجی تقی اور شفا کو الگ مت کیجیے گا۔ "کوہ گراں تھے ہم" کی رائٹر عنیزہ سید کے لیے کہوں گی کہ ان کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ کچھ عرصہ پہلے عنیزہ سید کا ایک ڈرامہ بھی دیکھا تھا۔ شب آرزو کا عالم اور شب آرزو کا عالم کا ناول بھی میرا خیال ہے ڈائجسٹ میں چھپ چکا ہے۔ میرا خیال ہے ایبہا کا نکاح معیز سے ہوا ہے امتیاز احمد سے نہیں۔
ج: پیاری صائمہ! یہ تو عفت سحر طاہر ہی بتا سکتی ہیں کہ ایبہا کا نکاح کس سے ہوا ہے۔ ویسے ہمارا اندازہ بھی یہی ہے کہ ایبہا کا نکاح معیز سے ہی ہوا ہے۔
آپ کا خیال صحیح ہے "شب آرزو کا عالم" ہمارے پرچے میں شائع ہو چکا ہے۔

کوثر پروین۔۔۔ میلسی

تنزیلہ آپی کی یہ تحریر گزشتہ تحریروں کے مقابلے میں سوا سیر لگتی ہے۔ کتنے خوبصورت پیرائے میں وفا کا مفہوم سمجھایا۔ انداز تحریر بہت ہی کمال کا ہے۔ پڑھتے پڑھتے جہاں بہت زور کی ہنسی آئی وہ جملے تھے "جھینگروں کا مشاعرہ" اور "مائی پھاتاں" ہاہا۔ ہائے بیچ میں آنسو آجاتے ہیں جب اس بچے کو باپ پہلا تھپڑ مارتا ہے اور پھر مسلسل پٹائی اور ماں کا خاموشی سے اٹھ کر چلے جانا ویری سیڈ۔ اور یہ سب شہروز کے کزن عمر کا ہے نا؟ سحر ساجد آپ کا ناول میں نے بہت ہی دقتوں سے ایک ہی نشست میں پڑھا کیونکہ یہ اس کا تقاضا تھا۔ بہت بہت مزا آیا' عنایا اگرچہ ذہین نہ تھی لیکن سمجھ دار تھی۔ لیکن شہن کے کردار نے افسردہ کیا اور سجاد کے کریکٹر نے تو بہت بہت تکلیف دی۔ پیاری رائٹرز سے مل کر اچھا لگا سمیرا آپی؟ میرا اور میرے اکلوتے بھائی کا بھی واحد مشترکہ شوق سیاحت ہے مگر ابھی وہ چھوٹا ہے ذرا بڑا ہوگا تو ان شاء اللہ پورا کریں گے۔ میمونہ صدف اور صدف آصف دونوں کی تحریروں کی طرح سروے کے جوابات بھی اچھے لگے۔ مصباح علی نے گدگداتے جوابات لکھے۔

ج ۔ پیاری کوثر! تنزیلہ کے ناول میں فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کریں۔ کہ یہ عمر کا بچپن ہے۔ ابھی بہت سے کردار واضح ہونے ہیں۔ تنزیلہ بہت اچھی رائٹر ہیں اور ان کی تحریروں نے ہمیشہ چونکایا ہے۔

سجاد برا انسان نہیں تھا۔ اسے مریم سے محبت بھی تھی لیکن وہ جس ماحول کا پروردہ تھا' اس سے بغاوت کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

نمرہ احمد کا ناول جون میں شائع ہوگا۔ • روشن حرف اور خامشی گویاں سلسلے بند نہیں کیے گئے۔

مصباح علی کا افسانہ اے جنون قلب نومبر 2012 شعاع میں شائع ہوا تھا۔

عائشہ خان۔۔۔ ٹنڈو محمد خان

سب سے پہلے ذوق و شوق' پڑھا اف کتنا پیارا لکھتی ہیں ہماری لکھاری بہنیں۔ ہم سے تو تبصرہ لکھنا بھی محال ہے۔ اور مصنف بہنیں۔ اف ایک ایک لفظ جیسے موتی۔ خاص طور پر سمیرا حمید نے بہت شان دار لکھا۔

رشک حبیبہ سے یہ کہنا ہے کہ آپ کتنا بھی تفصیل سے جواب دیں۔ ہم کبھی بھی آپ کو پڑھتے ہوئے بور نہیں ہوں گے۔ آپ تمام ہماری آئیڈیل ہیں۔ ہم آپ کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ ہم سب آپ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اور یہ کہ اپنے متعلق تفصیل سے بتایا کریں۔ تمام مصنف بہنیں کہ ان کی روٹین کیا ہے۔ بہن بھائی کتنے ہیں۔ کہاں رہتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ماہ تمام بھی زبردست چل رہا ہے۔ راشدہ رفعت کی تحریر گھر اک نگر زبردست تحریر تھی۔ جگہ جگہ مزاحیہ چٹکلے' میں اکیلی گھر میں پڑھ رہی تھی اور چٹکلوں پر قہقہے لگا رہی تھی۔ (ویسے میں ہنستی زیادہ ہوں بلکہ سب کو ہنساتی بھی بہت ہوں)

۔ تنزیلہ ریاض کا عہد الست بہت اچھا ناول ہے۔ اچھا چل رہا ہے۔ اسکول میں وہ غائبانہ کردار یقیناً "عمر" ہی ہے۔ 1973ء کا زمانہ اور روپ نگر کا علاقہ کے تقریباً" 10 صفحوں پر مشتمل تحریر زبردست لگی۔ جبار اوسے بات کرتا وہ لڑکا معلوم نہیں کون ہے۔ ذہن میں الجھن ہے۔ نور محمد کے متعلق بھی کچھ نہیں بتایا۔ لگتا ہے ناول کئی قسطوں پر مشتمل ہے۔ جب ہی ہر کردار پر تفصیل سے تنزیلہ نے لکھا ہے۔

تمام بہنوں کے خط اچھے لگے خاص طور پر کومل ساجد کوٹ بلوچ اور نجبہ اکرم گجرات کے خط اچھے لگے۔ اور انیقہ کو کہنا چاہوں گی کہ شکر ہے تمہارے خط میں (ہاہا) لکھا پڑھا۔ مطلع پر سے گرد و غبار چھٹ گیا ہے ہمیشہ خوش رہو۔ میری بیاض میں سب سے اچھا شعر ناہید شبیر رانا (رحمان گڑھ) کا لگا۔ رنگا رنگ پھول میں ثمرین اکرام میرپور خاص کا "ہار" بہت اچھا لگا۔ رالعہ انعم کی فرمائش پوری کردی آپ نے۔ شکریہ انٹرویو شائع کرنے کا۔ مجھے رالعہ انعم اور ماریہ میمن بہت اچھی لگتی ہیں۔

افسانوں میں صلہ بہت زبردست اور دلچسپ تحریر ہے۔ ویلڈن بشریٰ۔ اور زیرو کون بھی سمیرا عثمان کی اچھی کاوش تھی۔

امنل عزیز کے ناولٹ کا عنوان ہی اتنا پیارا لگا کہ بارش روٹھ بھی جائے' اور تحریر بھی اچھی تھی۔ ویسے مجھے شروع میں کہانی کا اندازہ ہوگیا تھا۔

ج۔ ہنسنا ہنسانا! بہت عادت ہے آپ کی' سارے غم ہلکے ہوجاتے ہیں اور گھر کا ماحول بھی خوش گوار رہتا ہے۔

تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا' عائشہ! آپ تو ہمارے پرچوں کی مستقل قاری ہیں' ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے خط لکھتی ہیں' آپ کو کیسے نظرانداز کرسکتے ہیں۔

سز علی۔۔۔ کراچی

ایسے ہی شب و روز میں بشریٰ احمد کی تحریر "صلہ" نے بری طرح الجھا دیا ہے۔ معاشرے میں ایک عام سوچ بہت مضبوطی سے جمی ہے کہ مثالی بہو وہ ہے جو سسرالیوں کی خدمت کرے' ساس نندوں کو ہل کر پانی نہ پینے دے' اپنا آرام و سکون گروی رکھ دے' تھکن سے ٹوٹے بدن کے ساتھ ہر طعنہ ہنس کر برداشت کرلے وغیرہ وغیرہ۔ ہم سب مل کر اس سوچ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اسی ناانصافی کی وجہ سے اکثر گھروں میں ناچاقی ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مذہبی نقطہ نظر سے بہو پر سسرالیوں کی خدمت قطعی فرض نہیں مگر ہوتا یہ ہے کہ سب کاموں کا بوجھ ایک اکیلی لڑکی پہ ڈال کر باقی نندیں بھاوجیں بیٹھی رہتی ہیں' وہ دن رات کام بھی کرتی ہے اور طعنے بھی سنتی ہے تو یہ صریحاً" ظلم ہے۔ ہمارے معاشرے کا چلن یہ کیوں بنا دیا گیا ہے کہ چاہے فرض نمازیں قضا ہوجائیں مگر سسرال کی خدمت لازم ہر صورت۔

کیا سسرال والوں کا کوئی فرض نہیں کہ بہو کو خوش رکھیں؟ اسے بیٹی سمجھیں؟ جب اس کے ساتھ غیروں سا سلوک ہوگا تو کیا جواباً" اس کا دل بھلائی پر مائل ہوگا؟ اس صورت حال میں لڑکی اپنا دفاع کرے تو فوراً" ناخلف بہو کا خطاب اور تحفتاً" الزام بھی کہ الگ ہونا چاہتی ہے جبکہ دین کی رو سے بیوی الگ گھر کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ جب ایک لڑکی بیاہ کر آتی ہے تو اس کے بہت سے ارمان ہوتے ہیں مگر جب اسے ایسی صورت حال سے واسطہ پڑے گا تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا برسوں بعد چند بول اس کی قربانی کا صلہ ہوسکتے ہیں وہ خواب جو اس نے نوچ ڈالے؟ وہ دن جو اس نے گنوا دیے۔ اس کا بدل ہوسکتے ہیں؟ کیا اس کا زندگی پر کوئی حق نہیں؟

ایک اکیلی لڑکی جب بھرے پرے سسرال میں جاتی ہے تو لازمی طور پر اسے اجنبیت محسوس ہوتی ہے جبکہ اس خاندان کے لیے یہ مشکل صورت حال نہیں ہے وہ تو ہمیشہ سے اس گھر کا حصہ ہیں تو بجائے اس کا ہاتھ تھامنے کے اس پر طنز کے تیر برسانا' عیب نکالنا' اس کو نظرانداز کرنا کہاں کا انصاف ہے اور صورت حال گھر کے مردوں خصوصاً" شوہر کا بھی ایک امتحان ہے مگر شوہروں کی اکثریت لاتعلق ہوجاتی ہے' یہ کہہ دینا کہ ہر لڑکی کے ساتھ یہ مسئلے ہیں' ہر لڑکی کو سسرال بھگتنا پڑتا ہے ہر لڑکی کو برداشت کرنا چاہیے کیونکہ وہ ایک عورت ہے' سراسر زیادتی ہے۔ ظلم خاموشی سے برداشت کرنا اور خاموشی سے کسی اور کا تماشا دیکھنا گویا ظالم کا پوری طرح ساتھ دینا ہے۔

ج ۔ اچھی بہن آپ نے جو کچھ لکھا' بالکل درست ہے۔ اپنے والدین کی خدمت کرنا اولاد کا فرض ہے کسی بہو یا داماد کا نہیں۔ شریعت کی رو سے ایک بیوی کا حق ہے کہ لڑکا اسے اپنی استطاعت کے مطابق ایک گھر فراہم کرے جہاں وہ رہ سکے اور کھانا پکانے کا اہتمام کرسکے۔ ہمارے مذہب میں دیور' جیٹھ سے پردے کی تاکید کی گئی ہے اگر ایک گھر میں ساتھ رہیں گے تو پردہ کرنے میں کتنی دشواری پیش آئے گی۔ یہ سمجھ سکتے ہیں۔

لیکن اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔

آج کل گھر کے کرائے اور قیمتیں آسمان سے باتیں کررہی ہیں۔ ایک لڑکا آدھی عمر تعلیم میں گزار کر نوکری کی تلاش میں نکلتا ہے تو بمشکل کوئی چھوٹی موٹی نوکری مل پاتی ہے۔ کاروبار کا اس سے بھی برا حال ہے۔ لاکھوں لگا کر ہزار بھی نہیں ملتے۔ کئی سال نوکری کرکے وہ اتنی رقم بچا پاتا ہے جس سے شادی کے اخراجات پورے ہوسکیں۔ اکثر تو شادی کے اخراجات کے سلسلے میں مقروض ہوجاتے ہیں۔ پھر سالوں قرض اتارتے رہتے ہیں' ان حالات میں گھر خریدنا یا کرائے پر گھر لینا آسان نہیں پھر علیحدہ گھر میں گیس اور بجلی کے بل۔ آدھی تنخواہ تو بل بھرنے میں نکل جاتی ہے۔ مجبوراً" جوائنٹ فیملی سسٹم میں ہی عافیت نظر آتی ہے۔ لڑکی کو صبر کی تلقین اس لیے کی جاتی ہے کہ اگر وہ دوبدو جواب دے گی تو گھر میدان جنگ بن جائے گا۔ صبر صرف بہو ہی نہیں کرتی۔ بہت سی صورتوں میں ساس' نندوں کو بھی صبر کرنا پڑتا ہے۔ ایک بات یاد رکھیے' ساتھ رہنے کے لیے دونوں فریقوں کو کچھ نہ کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ شوہر کو مورد الزام ٹھہرانا درست نہیں۔ اس کے لیے باہر کی دنیا کے مسائل ہی کم نہیں۔ وہ مصلحتاً" خاموشی اختیار کرتا ہے تاکہ گھر میں سکون رہے۔ خرابی یہ ہے کہ معاشرے سے درگزر' بردباری' سنجیدگی' صبر و برداشت کی روایات ختم ہوتی جارہی ہیں' گھر میں بڑی ہونے کے ناتے ایک ساس کا فرض اور ذمہ داری ہے کہ وہ گھر میں اچھا ماحول

رکھے یہ سوچے کہ یہ لڑکی جو بہو بن کر آئی ہے' اس دل میں کچھ امنگیں ہیں' شادی کے شروع سال ہی خوشی اور بے فکری کے ہوتے ہیں بچے ہونے کے بعد تو بہو ذمے داریوں میں گھر جاتی ہے۔ کہ اپنا آپ بھول جاتی ہے۔ لڑکی کو بھی چاہیے کہ وہ ساس کا ادب احترام کرے۔ لیکن زیادہ ذمے داری سسرال والوں پر ہی عائد ہوتی ہے۔ ویسے اس مسئلہ کا حل تو یہی ہے کہ شادی کے بعد لڑکی علیحدہ اپنا گھر بنائے لیکن اس کی گنجائش نہ ہو تو پھر دونوں ہی فریقوں کو صبر و تحمل اور برداشت سے کام لینا چاہیے۔

سعدیہ اعوان۔۔۔ گاؤں بوتالہ جھنڈا سنگھ

ہم تین دوست مل کر اسکول چلا رہی ہیں اور خوب محنت اور لگن سے اپنا اور اپنے اسکول کا نام روشن کر رہی ہیں۔ آپ کے رسالوں سے جو چیز میں نے سیکھی ہے وہ حوصلہ' جذبہ' لگن ہے۔ آپ کی رائٹر تمام کی تمام بہت اچھی ہیں ان کی تحریریں پڑھ کر زندگی گزارنے کا سلیقہ آتا ہے۔

ج ۔پیاری سعدیہ! آپ بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔ شہروں میں تو ہر طرح کی تعلیمی سہولیات مہیا ہوتی ہیں لیکن گاؤں میں صرف گورنمنٹ اسکول ہوتے ہیں جہاں استاد حاضری لگانے بھی نہیں آتے۔ اور بہت سے گاؤں تو اس سے بھی محروم ہیں ـــــ بچوں کو تعلیم دینا بہت بڑی نیکی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے کام میں برکت دے۔

خدیجہ کبریٰ مقامی۔۔۔ کھڈیاں خاص

اس دفعہ کا سارا رسالہ ہی بہت اچھا تھا۔ بن مانگی دعا کی تو کیا ہی بات ہے کوں گراں میں نہیں پڑھتی۔

ج ۔پیاری خدیجہ! آپ کی تحریریں موصول ہو گئی ہیں معذرت خواہ ہیں۔ فی الحال آپ صرف مطالعہ پر توجہ دیں۔

سحرش فاطمہ' آمنہ تبسم اور عدیلہ۔ جھنگ' شورکوٹ

عنبزہ جی بہت اچھا لکھ رہی ہیں مگر بہت گاڑھا فلسفہ ہے۔ سر کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ سعد کی ماں کا پتا ہی نہیں چل رہا دو چار قسطوں میں ہی اس کا اینڈ ہو جاتا تھا۔ مگر ناول اتنا لمبا۔

ج ۔سحرش' آمنہ اور عدیلہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

شاہدہ ظفر۔ گاؤں ڈیرہ ستی

سب کے جواب پسند آئے۔ سب سے زیادہ میرا جی کے جواب اچھے لگے تشنگی رہ گئی بشریٰ سعید' نگہت سیما' عنبزہ سید میں سے بھی تو کوئی ہوتا۔

اب تبصرہ ہو جائے سحر ساجد کے 63 صفحات پر مشتمل ناول کی۔ سحر آپی کی کہانی اچھی تھی۔ کچھ فقرے اقوال زریں کی صورت میری ڈائری میں محفوظ ہو گئے۔

1 ۔عورت کسی مرد سے تب متاثر ہوتی ہے' جب کوئی آپ کی بنائی دیواروں کے پار رہتے ہوئے آپ سے تعلق استوار کرلے۔

2 ۔جب بھی تین دوستوں میں ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تو کہیں نہ کہیں۔ اور کبھی نہ کبھی ٹرائی اینگل کی شکل خراب ہو ہی جاتی ہے۔

3 ۔دو اجنبی لوگ ملتے ہیں تو اس طرح سے ملتے ہیں کہ دونوں ہی اپنی ذات کے وہ سوچ آف کر دیتے ہیں جن سے ان کی خامیاں واضح ہوتی ہوں۔

آخر میں سیدھی سڑک کا حوالہ دیتے ہوئے وضاحت کے بعد سوالیہ نشان جس کا جواب یہ ہے سحر آپی زندگی سیدھی سڑک ہی ہے جس پر مختلف موڑ آتے رہتے ہیں ضرورت کرنے سے پہلے محتاط ہو کر چلنے کی ہے کیونکہ موڑ موڑتے ہوئے ذرا سی چوک زندگی کا چراغ بجھانے کے لیے کافی ہے۔

ج ۔پیاری شاہدہ! گاؤں ڈیرہ ستی سے موصول ہونے والا آپ کا یہ خط ظاہر کر رہا ہے کہ خواتین ڈائجسٹ ہر چھوٹے بڑے شہر اور گاؤں میں پڑھا جاتا ہے اور کس قدر ذوق و شوق اور توجہ سے پڑھا جاتا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کی قارئین حسن نظر رکھتی ہیں اور ان کا یہ حسن نظر ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ سحر ساجد کی تحریر سے آپ نے جو موتی چنے ہیں۔ وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

یہ سروے ان مصنفین سے لیا گیا تھا جنہوں نے ابھی لکھنے کا آغاز کیا ہے اور آگے ان کے روشن امکانات ہیں' بشریٰ سعید' نگہت سیما اور عنبزہ سید کا شمار صف اول کی سینئر مصنفین میں ہوتا ہے اور یہ اپنی صلاحیتوں کو منوا چکی ہیں۔

سعدیہ عزیز۔۔۔ نامعلوم شہر

ماڈل سے لے کر بیوٹی بکس تک ہر لفظ کمال' ہر سلسلہ بے مثال۔ سب سے زیادہ جو سلسلہ مجھے پسند ہے وہ "رنگا رنگ" ہے۔ آپ نے کیا پردہ میں "سب مایا ہے" بہت اچھی لگی۔ عدنان صاحب کو جو خط لکھتا ہے اس کو تو جواب مل ہی جاتا ہے لیکن بہت سے دوسرے لوگوں کے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہوتا ہے۔ اس دفعہ لاہور سے ایک بہن (ر۔ش) نے جو خط لکھا چند جملوں میں اپنی ہر بات واضح کر دی۔ یہ خط پڑھ کر بہت سی لڑکیوں کو لگا ہو گا کہ یہ تو ہمارا مسئلہ ہے اور جواب پڑھ کر اس مسئلے کو سلجھانے میں بھی مدد ملی ہو گی۔

ج ۔پیاری سعدیہ! آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی۔ ہمیں احساس ہے کہ چھوٹے شہروں اور گاؤں میں رسالہ بہت تاخیر سے پہنچتا ہے۔ آپ ہمیں خط ضرور لکھیں۔ شائع تو نہ ہو سکے گا لیکن ہم آپ کی رائے سے تو آگاہ ہو جائیں گے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

مسز افضل رانا۔۔۔ سرگودھا

26 سال سے خواتین ڈائجسٹ کی خاموش قاری ہوں سیکنڈ ایئر میں تھی تب پڑھنا شروع کیا اور اب ماشاءاللہ میری اپنی بیٹی گریجویشن کر چکی ہے۔ میں بچوں کو ناظرہ پڑھاتی ہوں۔ آج کل اپنی بیٹی کے لیے ایک اچھے رشتے کی دعا اور ساتھ کوشش بھی کر رہی ہوں۔ رشتے آسمان پر بنتے ہیں لیکن انہیں زمین پر ڈھونڈنے کے لیے کس قدر ذلیل خوار ہونا پڑتا ہے یہ وہی جانتا ہے جو اس تجربے سے گزرا ہو۔

نفسیاتی الجھنوں میں عدنان صاحب کو لاہور سے کسی بیٹی (ر۔ش) نے خط لکھا اور کیا کمال خط لکھا۔ جیسے کسی مصنف کی تحریر ہو۔ اس خط کا ہر لفظ دل کو چھو گیا۔ اس پیاری لڑکی کے لیے ایک مشورہ ہے کہ وہ لکھنا شروع کریں۔ مجھے یقین ہے بہت جلد اپنا نام بنا لیں گی۔

ج ۔بہت شکریہ مسز افضل! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ 26 سال سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہیں اور یہ تعلق اور وابستگی آج بھی اسی طرح قائم ہے۔

بہن ر۔ش کو آپ کا مشورہ پہنچا رہے ہیں ان کا خط پڑھنے کے بعد ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ وہ بہت باصلاحیت ہیں۔ لکھ سکتی ہیں۔

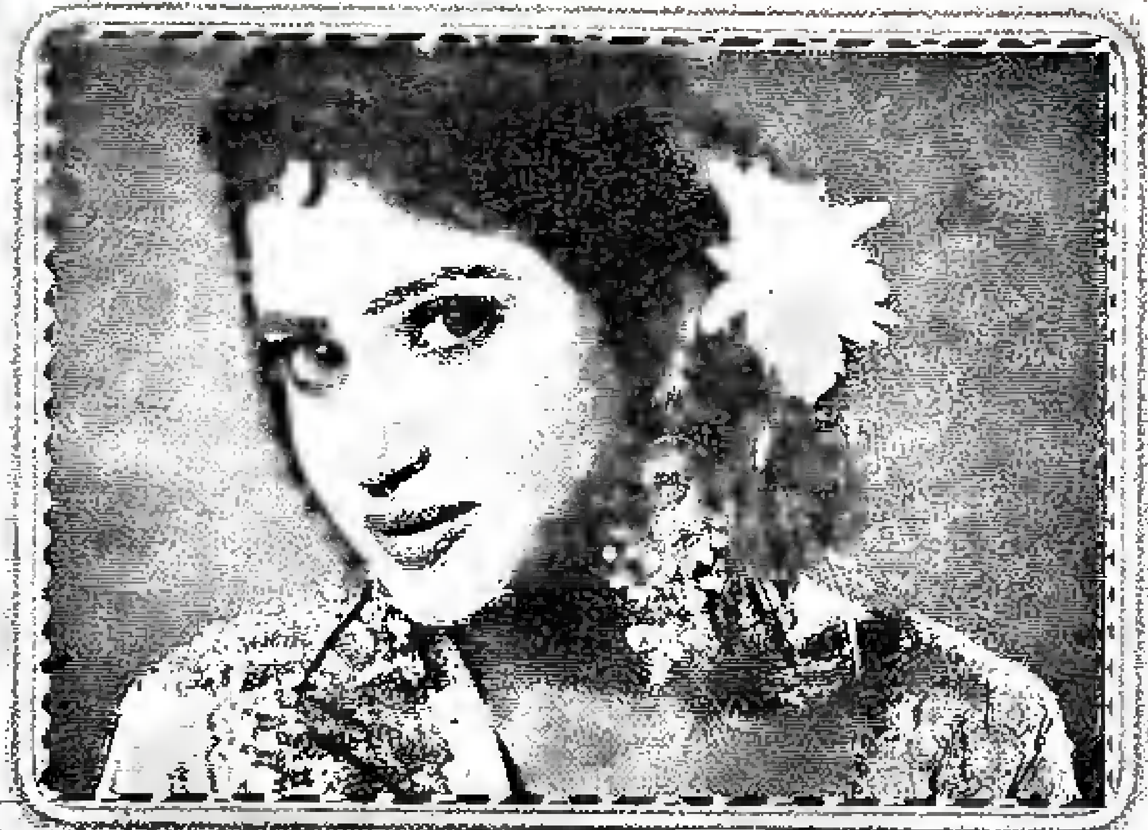
آسیہ خالد کوٹ لکھپت

سمیرا حمید کا نام نہ پا کر کچھ کمی محسوس ہوئی مگر سالگرہ نمبر کے خصوصی سروے میں ان کا نام دیکھ کر اور ان کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ ان کا تعلق کس شہر سے ہے پلیز یہ بھی بتا دیں۔ افسانوں میں فائزہ رابعہ کا "حصار" بازی لے گیا۔ "بن مانگی دعا" بہت اچھا جا رہا ہے۔ "ماہ تمام" بہت طویل ہو گیا۔ اب اسے ختم کریں۔ "ہمارے نام" تو جان ہے ڈائجسٹ کی میری نظر میں۔ "خبریں د بریں" بھی مزے سے پڑھتی ہوں بیوٹی بکس ضرور دیکھتی ہوں اور عمل بھی کرتی ہوں چاہے دو دن ہی کروں۔ ایک اہم بات جس کی وجہ سے میں نے خط لکھا۔ پچھلے سات سال سے ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ عدنان بھائی کے لیے آنے والے خطوط میں بہن ر۔ش کا خط نمبر ون رہا ہے۔ بہت سادہ اور جامع الفاظ میں لکھا جانے والا خط دل کو بھا گیا۔

ج ۔پیاری آسیہ! سمیرا حمید کا افسانہ انشاءاللہ جون کے شمارے میں شامل ہو گا۔ "ماہ تمام" طویل ضرور ہو گیا لیکن اس کی دلچسپی برقرار ہے۔

☼

سرورق کی شخصیت	
ماڈل ----------	رانیہ
میک اپ ----------	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ----------	موسیٰ رضا



نازک اور کومل

سجل علی سے ملاقات

شاہین رشید

اپنے نام کی طرح نازک اور کومل سی سجل ڈراموں کی دنیا میں چھا گئی ہے۔ اب ہر دوسرے تیسرے ڈرامے میں اس کا ہونا لازمی ہوتا ہے' بے شک سجل بہت اچھی پرفارمر ہے' لوگ اس کے کام کو پسند بھی کرتے ہیں' لیکن وہ کہتے ہیں ناکہ کسی چیز کی زیادتی بھی انسان کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہر ڈرامے میں سجل کو دیکھ کر لوگ چینل ہی بدل لیں کہ بس اب اس چہرے سے بور ہو گئے ہیں۔۔۔ یہ سوچنا سجل کا کام ہے اور ہمارا کام آپ کی ان سے ملاقات کروانا ہے۔

"کیسی ہو سجل؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"کیسے گزر رہے ہیں شب و روز؟"

"آپ کو تو پتا ہی ہے۔ کیسے گزر رہے ہیں' دن رات کام ہوتا ہے اور ہم۔۔۔"

"تھک نہیں جاتیں کیا؟"

"تھک تو جاتی ہوں' پر کام تو کام ہی ہوتا ہے۔ اب اس سے دور بھاگ ہی نہیں سکتی۔"

"تھوڑا کم کرو۔"

"کر تو دوں' مگر پتا ہے کہ کس کو انکار کروں وہ ناراض ہو جاتا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ لوگ کہیں کہ یہ لڑکی مغرور ہو گئی ہے۔"

"ہوں۔۔۔ یہ بات تو ہے۔۔۔ مگر کار کردگی تو متاثر ہوتی ہی ہوگی کام میں؟"

"نہیں تو۔۔۔ میں بہت محنت کرتی ہوں اپنے کردار پر' ریہرسل کرتی ہوں' ورائٹی دینے کی کوشش کرتی ہوں' اس کردار کو ذہن میں رکھ کر موڈ بناتی ہوں۔"

"گھر والے کہتے تو ہوں گے کہ شادی سے پہلے ہی بیٹی پرائی ہو گئی ہے۔ گھر آنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔"

قہقہہ۔ "جی' آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں' گھر تو میں صرف رات گزارنے کے لیے آتی ہوں اور اس کے لیے بھی کبھی کبھی رات گئے۔"

"مزہ آرہا ہے؟ اور امید تھی اتنا کام کرو گی؟"

"جی بہت مزہ آرہا ہے اور مجھے تو شوق بھی تھا اس فیلڈ میں آنے کا تو یوں سمجھئے کہ بہت کم عمری میں اللہ تعالیٰ نے میری خواہش پوری کر دی اور جہاں تک امید کی بات ہے تو بالکل امید تھی کہ میں شہرت حاصل کر لوں گی اور کامیاب ہو جاؤں گی۔"

"تمہیں آرام کرنے کا وقت نہیں ملتا تو اپنے ڈرامے دیکھ کر یا کسی سے بھی سیکھنے کا موقع کیسے ملتا ہو گا؟"

"نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے اور سیکھتی تو میں ہر لمحہ ہوں' کیونکہ میرے ارد گرد سینئرز لوگ ہوتے ہیں' بہت اچھے ڈائریکٹرز' بہت اچھے پروڈیوسرز ہوتے ہیں ان سے مجھے سیکھنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔"

"سینئرز تعاون کرتے ہیں؟"

"جی جی۔ بہت کرتے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا 2013ء میں میرا "مہندی" کتنا ہٹ گیا تھا۔ اس میں سب نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا کیونکہ زیادہ تر سینئرز لوگ ہی تھے' اسماء عباس۔۔۔ کے ساتھ کام کرنے کا تو بہت مزہ آیا تھا۔ بہت ہی اچھی انسان ہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے بہت احترام ہے اور اپنے ڈرامے دیکھنے کا وقت اگرچہ بہت کم ملتا ہے' مگر جب بھی ملتا ہے دیکھتی ضرور ہوں اور بہت غور سے دیکھتی ہوں تاکہ پتا چلے کہ میں نے کہاں کیسا پرفارم کیا ہے' کیونکہ میرے خیال سے انسان اپنے لیے خود بہت اچھا تنقید نگار ہوتا ہے۔ اسے خود کلک ہوتا ہے کہ کہاں کیسا کام کیا ہے۔"

"بہت سے لوگ کچھ پالیں تو مغرور ہو جاتے ہیں تمہیں اتنی کم عمری میں شہرت مل گئی تو کبھی دماغ خراب ہوتا ہے کہ میں کوئی شے ہوں؟"

"ارے نہیں۔۔۔ اللہ نہ کرے کہ وہ دن کبھی آئے' میں تو اپنے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں ورنہ تو اس دنیا میں اتنے اتنے قابل لوگ ہیں' مگر وہ اچھے روزگار کو ترس رہے ہیں۔"

"کچھ تمہاری شکل کا بھی کمال ہے' معصوم شکل ہے۔"

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ میرے ٹیلنٹ کی تعریف نہیں کریں گی کیا۔ شکلیں تو اور بھی لوگوں کی بہت اچھی ہوتی ہیں تو پھر وہ کیوں نہیں اسکرین پر آجاتے۔"

"ٹیلنٹ کو تو مانتے ہیں' لیکن اچھی شکل کا بھی کچھ نہ کچھ دخل تو ہوتا ہے نا؟"

"سچ۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت پیاری شکل دی ہے' میں جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔ میں جب عام سی شکل کے لوگ دیکھتی ہوں تب مجھے اپنی شکل پہ رشک آتا ہے۔ اس پر تھوڑا غرور میرا حق بنتا ہے' مگر پھر اللہ تعالیٰ سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔"

"شہرت کے کھو جانے کا ڈر لگتا ہے؟"

"اللہ نہ کرے۔۔۔ ابھی تو شہرت ملنے لگی ہے اور آپ کھو جانے کی بات کر رہی ہیں۔ ویسے ایسا تو تب ہی ہو گا نا جب میں اللہ کی ناشکری کروں گی' اپنا رویہ لوگوں سے خراب کروں گی تو جناب فیوچر میں میرا ایسا کچھ ارادہ نہیں ہے۔ شہرت بہت مشکل سے حاصل ہوئی ہے اس لیے اس کی بہت حفاظت کروں گی۔"

"ہوں۔ گڈ۔۔۔ ویسے فیلڈ میں حسد کرنے والے بھی بہت ہوتے ہیں ان سے ڈر لگتا ہے؟"

"نہیں' کیونکہ مجھے اپنے اللہ پر بھروسا ہے اور اگر میں خود اچھی ہوں تو کوئی مجھ سے کیوں حسد کرے گا' بلاوجہ میں۔۔۔؟ اور جب میں کسی سے حسد نہیں کرتی تو کوئی مجھ سے کیوں کرے گا۔۔۔ سوچیے نا۔۔۔"

"شوبز میں آنا آسان کام نہیں ہے۔ بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے' اگر کوئی سفارش نہ ہو تو۔۔۔ تمہیں جدوجہد کرنی پڑی یا سفارش کا سہارا لینا پڑا؟"

”نہیں جدوجہد کرنی پڑی نہ سفارش کا سہارا لینا پڑا‘ خالصتاً“ اپنے ٹیلنٹ کی وجہ سے آئی ہوں۔ مجھے تو بچپن سے ہی اداکاری کا جنون تھا تو بس آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے آپ کو آزماتی رہتی تھی کہ اگر میں اداکاری کرنا چاہوں تو کیا کرلوں گی! یہاں کراچی میں میری خالہ رہتی ہیں تو میں اکثر لاہور سے کراچی آتی رہتی ہوں۔ تو ایک مرتبہ جب آئی تو خالو نے بتایا کہ ہم ٹی وی میں آڈیشن ہو رہے ہیں تم نے جانا ہے تو چلی جاؤ اور میں چلی گئی۔۔۔ اور۔۔۔“

”بڑا انتظار کروایا ہوگا۔ پھر شارٹ لسٹ کیا ہوگا اور کئی مراحل کے بعد بلاوا آیا ہوگا۔۔۔ ہے نا۔۔۔“

قہقہہ۔۔۔ ”ارے نہیں‘ میں وہاں گئی‘ میں نے کہا کہ آڈیشن دینے آئی ہوں‘ انہوں نے مجھے دیکھا اور کہا سمجھیں آپ سلیکٹ ہو گئی ہیں۔ میں تو ہکا بکا رہ گئی اور پھر فوراً“ ہی مجھے سوپ محمود آباد کی ملکائیں میں بک کرلیا گیا اور بس یہاں سے ہی میرے کیریر کا آغاز ہو گیا۔“

”سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا تم نے تو سوچا بھی نہیں ہوگا؟؟“

”بالکل جی۔۔۔ اور جب گھر آکر سب کو بتایا تو سب حیران رہ گئے کہ اتنی جلدی۔۔۔“

”معصوم شکل بھا گئی ہوگی؟“

”جی نہیں۔۔۔ اس شکل میں کچھ کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو کب تک چلتی اور پھر آڈیشن لینے والے بہت ماہر ہوتے ہیں‘ انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون کتنا آگے تک جاسکتا ہے۔“

”مذاق کر رہی تھی میں ۔۔۔ تم نے واقعی ثابت کر دیا کہ تم بہت اچھی فنکارہ ہو۔ ہر رول میں ماشاءاللہ فٹ ہوتی ہو۔ رول لیتے وقت کسی سے مشورہ کرتی ہو‘ اپنے دل سے یا گھر والوں سے؟“

”اللہ کا شکر ہے کہ میرے سینئرز اور جن پروڈکشن ہاؤسز کے ساتھ کام کرتی ہوں‘ سب بہت مخلص ہیں اور مجھے ہمیشہ اچھے ہی رول آفر کرتے ہیں۔ پھر بھی میں خود بھی اسکرپٹ کا مطالعہ کرتی ہوں‘ اپنے رول کا مطالعہ کرتی ہوں اور اپنے گھر والوں سے بھی مشورہ کرتی ہوں تب کسی کردار کے لیے اوکے کرتی ہوں۔“

”کچھ اپنے بارے میں بتاؤ؟“

”جی میں سترہ جنوری 1994ء کو لاہور میں پیدا ہوئی‘ والدین نے تجل نام رکھا۔ تین بہن بھائی ہیں میں بڑی ہوں‘ بھائی اور بہن مجھ سے چھوٹے ہیں سب پیار سے سجا کہتے ہیں اور مزے کی بات بتاؤں کہ ڈرامے کا جو کردار مشہور ہو جاتا ہے لوگ اسی نام سے پکارنا شروع کر دیتے ہیں جیسے گزشتہ دنوں ننھی بہت مشہور ہوا تو جہاں لوگ دیکھتے تھے بے ساختہ بولتے تھے کہ وہ دیکھو ننھی جا رہی ہے۔“

”والدین کے بارے میں بتاؤ۔۔۔ اور تمہاری بہن بھی تو اس فیلڈ میں تھی اس نے کیوں چھوڑ دیا؟“

”بہن کو مزہ نہیں آیا اور کام بھی مشکل لگا شاید۔۔۔ مگر میرا تو جنون تھا اس فیلڈ میں آنا تو مجھے کوئی مشکل نہیں ہوئی بلکہ میں تو بہت انجوائے کر رہی ہوں اور والد میرے بزنس مین ہیں۔ سید صولت علی نام ہے ان کا اور میری امی معروف نعت خواں رہ چکی ہیں‘ ان کا نام ”راحت فردوس“ ہے اور انہیں بھی اداکاری کا شوق تھا تو انہوں نے تھیٹر میں تھوڑا بہت کام کیا ہے۔“

”تمہاری اسکول کالج لائف میں کیا سرگرمیاں تھیں؟ اور تعلیم۔۔۔“

”میں اسکول کالج کے زمانے میں بہت اچھی نعت خواں تھی‘ بہت اچھی ڈیبیٹر تھی‘ بہت اچھی اپنے آپ کو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ مجھے نعت میں اور ڈیبیٹ میں ایوارڈز مل چکے ہیں اور اب بھی کہیں محفل میلاد میں بلاوا آتا ہے تو ضرور جاتی ہوں اور نعت خوانی کرتی ہوں اور سیکنڈ ایئر سے فارغ ہوئی ہوں اب ”میڈیا“ میں ہی کچھ کروں گی۔“

”میڈیا کی لائن تو بہت وسیع ہے‘ کس میں نیچہ آزمائی کرنی ہے؟“

”پنجہ آزمائی۔۔۔! بس اداکاری اور ڈائریکشن میں پنجہ آزمائی کرنا چاہتی ہوں‘ بہت اچھی ڈائریکٹر بننا چاہتی ہوں اور بہت آگے تک جانا چاہتی ہوں۔“

”میرے قاتل میرے دلدار“ اس سیریل میں تمہارا نیگیٹو رول تھا اس کے بعد کسی سیریل میں نیگیٹو رول میں نظر نہیں آئیں۔ کیوں؟“

”پتا ہے کیوں۔۔۔؟ اس رول میں دیکھ کر کام کی تو تعریف ہوئی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ تمہیں ایسے رول نہیں کرنے چاہئیں۔ تمہارے بھولے بھالے چہرے پر ایسے کردار اچھے نہیں لگتے اور نہ ہی تمہیں ایسے رول کرنے چاہئیں کہ اس سے امیج خراب ہوتا ہے۔ بس تو پھر اس کے بعد میں نے نیگیٹو رول نہیں لیے اور نہ ہی کوئی رول آفر ہوا کہ جس پر غور کرتی۔“

”تم خود کیا چاہتی ہو۔“

”میں خود تو یہ چاہتی ہوں کہ ہر طرح کے رول کروں اور ضروری نہیں کہ ہر سیریل میں خوب صورت ہی لگوں‘ گیٹ اپ والے رول بھی کرنا چاہتی ہوں تاکہ لوگ سوچیں کہ یہ کون لڑکی ہے اور جب انہیں پتا چلے کہ یہ میں ہوں تو حیران رہ جائیں کہ اچھا یہ تجل ہے۔“

”تمہیں پہلے سیریل میں ہی بہت اچھا رسپانس ملا تھا۔ اچانک شہرت کیسی لگی تھی؟“

”بہت اچھا لگا اور آپ یقین کریں کہ سب سے زیادہ میرے ہی کام کو پسند کیا گیا اور میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ لوگ میرے کام کو پسند کریں گے۔ بس اس سوپ کے بعد تو آفرز کی لائن لگ گئی تھی۔“

”کراچی میں رہنا کیسا لگ رہا ہے؟“

”کراچی میرا آنا جانا لگا رہتا تھا‘ اس لیے کوئی اجنبیت نہیں محسوس ہوئی‘ ہاں درمیان میں کچھ مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا‘ مگر اب اللہ کا شکر ہے کہ سب سیٹ ہے اور اب بھی لاہور اور کراچی آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔“

”چلو فیلڈ سے ہٹ کر کچھ بات کرتے ہیں۔۔۔ سالگرہ مناتی ہو؟“

”سالگرہ کے لیے تو سارا سال انتظار کرتی ہوں۔ بہت اچھا لگتا ہے مجھے گفٹ لینا اور گفٹ دینا۔“

”فیس بک کا استعمال کرتی ہو؟“

”فیس بک سے میری بہت زیادہ دلچسپی ہے مگر کیا کروں کہ ٹائم ہی نہیں ملتا۔ کتنے کتنے دن ہو جاتے ہیں فیس بک کھولے ہوئے۔“

”اپنے لیے کن باتوں کو برا سمجھتی ہو؟“

”مجھ میں غصہ زیادہ ہے اسی کو برا سمجھتی ہوں اور غصے میں سارا غصہ کھانے پینے پر نکالتی ہوں اور کھانے پینے کا بائیکاٹ کر دیتی ہوں۔“

”ویسے کھانا خود پکاتی ہو کک یا مما؟“

”خود تو پکانے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ کھانا تو صرف مما کے ہاتھ کا ہی پسند ہے۔ بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں میری مما۔“

”ناشتے میں کیا پسند ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔۔۔ ناشتا کرنا مجھے پسند نہیں۔ البتہ گھر سے نکلتے وقت ایک گلاس ملک شیک پی لیتی ہوں۔“

”ہوں۔۔۔ اچھا۔۔۔ جھوٹ بول لیتی ہو کیا؟“

”ارے نہیں۔۔۔ میری آنکھیں سب کچھ بتا دیتی ہیں۔ جھوٹ تو بول ہی نہیں سکتی۔“

”گھر سے نکلتے وقت کیا کیا لے کر نکلتی ہو؟“

”موبائل فون جو کہ بہت ضروری ہے۔ پھر اپنا بیگ اور میک اپ کا کچھ سامان۔۔۔“

”موبائل ہماری زندگی کے لیے کتنا اہم ہے؟“

”اہم تو ہے۔۔۔ لیکن اگر نہ ہوتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ آخر لوگ پہلے بھی تو موبائل کے بغیر رہتے ہی تھے نا۔“

”گھر آکر کیا دل چاہتا ہے؟“

”کہ بس جلدی سے کھانا کھاؤں اور بستر پر لیٹ جاؤں‘ اگرچہ فوری نیند نہیں آتی‘ مگر سکون بہت ملتا ہے۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے تجل سے اجازت چاہی۔

☆

آپ کا باورچی خانہ

رحمہ فریال ملک

(1) والد صاحب فوج میں تھے۔ بے حد سادہ طبیعت کے مالک ' امی کو کبھی کچن میں جھانکتے نہیں دیکھا۔ کھانے پینے میں ہم پانچوں بہن بھائی نے کبھی نخرہ نہیں کیا۔ سادہ سا کھانا پکتا جو سب خوشی خوشی کھا لیتے۔ اسکول کے لنچ باکس میں کبھی جیم سینڈوچ ہوتا یا آملیٹ ٹوسٹ۔ اب تو بچوں کے لنچ باکس کے لیے ماؤں کو صبح سویرے ہراساں ہوتے دیکھا ہے۔ (میری طرح)

شادی بھی فوجی سے ہوئی۔ بادشاہ سلامت بہت خوش خوراک ہیں۔ ہر ڈش میں سو سو اعتراض کرنا ان کا معمول ہے۔ میں کہتی ہوں آپ کے جسم میں کسی "ساس" کی روح بستی ہے۔ ملازم کے ہاتھ کا کھانا بالکل پسند نہیں کرتے۔ سلاد ' رائتہ ' گرم گرم پھلکے ' تازہ بگھار ' خوش شکل سالن اور چم چماتے برتن بھی میز پر لازم و ملزوم ہیں۔ ٹرخانے والا کام بادشاہ سلامت کے غصے کو ہوا دیتا ہے۔

(2) میں نہ تو اتنی کری ایٹو ہوں اور نہ ہی ذہین کہ صحت اور لذت کو ساتھ ساتھ لے کر چل سکوں۔ ان خواتین پر رشک آتا ہے جو اپنے گھر کے افراد کی صحت کی خاطر سو جتن کرتی ہیں۔ یہاں تو دال پر اگر دیسی گھی کا تڑکا نہ لگاؤں ' تو گھر والے باقاعدہ ناراض ہو جاتے ہیں۔

(3) فوج میں ٹرینڈ ہی ہے کہ مہمان وقت لے کر اور اطلاع دے کر ہی آتے ہیں۔ کوشش کرتی ہوں کہ سارے لوازمات گھر پر ہی تیار کروں۔ جب ٹی ٹرالی پر آپ کے ہاتھ کے بنے ہوئے آئٹم نظر آتے ہیں تو مہمان کی عزت افزائی ہوتی ہے کہ آپ نے وقت نکال کر ان کی تواضع کے لیے سب خود تیار کیا ہے۔

مجھے بیکنگ کا جنون کی حد تک شوق ہے اس لیے ایک دو فرائیڈ اشیاء کے ساتھ کیک ' کوکیز یا کوئی پائی ضرور بیک کرتی ہوں۔

(4) موسم تو بھئی واقعی موڈ پر بہت اثر ڈالتا ہے۔

گرمیوں میں ٹھنڈی میٹھی لسی اور سردیوں میں گرم گرم سوپ ہو تو کیا بات ہے۔ مجھے یاد ہے بچپن میں گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم نانا نانی کے گھر جاتے تھے تو امی جان (ہماری نانی) چنے کا پلاؤ اور کھیرے کا رائتہ بناتی تھیں۔ بس اس سے بڑھ کر لذیذ دعوت آج تک نہیں اڑائی۔ کسی کے ہاتھ کی بنی بریانی یا پلاؤ وہ لطف دے ہی نہیں سکے۔ گرمیوں میں آم اور تربوز کے بغیر جینا محال ہے ' پھر میں سارا سال فروٹ نہیں کھاتی ' لیکن آپ سب سے درخواست ہے کہ پھل ضرور کھایا کریں۔ بہت مفید ہوتے ہیں۔

سردیوں میں کافی کے مگ کے ساتھ اوون سے گرم گرم نکلا ہوا کیک ہو تو کیا کہنے ' اور گرمیوں میں آئس کریم اور ملک شیک بنے تو کمروں میں گھسے بچے دوڑے آتے ہیں۔ پتا نہیں اس یاجوج ماجوج کی قوم کو کیسے پتا چلتا ہے کہ ملک شیک بن رہا ہے۔ شاید خاموش دوپہروں میں بلینڈر کی آواز دماغ کی بتی روشن کر دیتی ہے۔

(5) ویسے باہر کھانے کا تو مجھے بھی بہت چسکا ہے۔ بار بی کیو ' برگر یا پزا باہر کا ہی کھانے میں مزہ آتا ہے۔ گھر میں یہ سب بن تو جاتا ہے مگر ذرا بہانہ ہوتا ہے کہ آؤٹنگ بھی ہو جائے گی اور کچن سے ایک دن کی چھٹی بھی مل جائے گی۔ اور آپس کی بات ہے۔ میں بہت محنت سے کھانا بناتی ہوں اور گھر والے منٹوں میں صفایا کر دیتے ہیں۔ پھر بچے کہتے ہیں۔

"ماما! آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ ہمیں آپ کی کوکنگ پسند ہے۔"

اس وقت سمجھ میں نہیں آتا کہ ہنسوں یا روؤں (قسم سے!)

(6) ایک بات سچ سچ بتاؤں؟

ہمارے گھر میں جب بھی کوئی دعوت ہوتی ہے۔ میں باقاعدہ وضو کر کے اور اگر ہو سکے تو دو نفل ادا کر کے کچن میں گھستی ہوں۔ آپ یقین کریں کم وقت میں بہت اچھا کھانا تیار ہو جاتا ہے اور برکت بے تحاشا ' مجھے مہمانوں کی تعریف سے زیادہ بادشاہ سلامت کی ویل ڈن کا انتظار رہتا ہے اور کبھی کبھار تو بہترین کوکنگ پر حضرت کنیز کو چھوٹے موٹے انعام سے بھی نواز دیتے ہیں۔ الحمد للہ!

(7) اچھا! آپ بتائیے! ابھی آپ کسی ریسٹورنٹ میں جائیں اور بالکل غیر ارادی طور پر ان کے کچن میں جھانک لیں اور وہ بے تحاشا گندا ہو تو کیا کھانے سے جی اچاٹ نہیں ہو جاتا؟

بالکل اسی طرح گھر کے کچن کو بھی صاف ستھرا رکھیں گے تو بھوک چمک اٹھے گی۔ یہ بھی ایک آرٹ ہے میں گندے کچن کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ چاہے جتنی بھی تھکاوٹ ہو یا جیسی بھی مصروفیت ہو ' اپنے کچن کو ہمیشہ صاف رکھا ہے۔

ملازم مدد کرے یا نہیں ' میری دعا ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ پاؤں سلامت رکھے اور کسی کا محتاج نہ کرے۔ آمین! اپنے ہاتھ سے کیے گئے کام کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا اور آپس کی بات ہے۔ تسلی بھی نہیں ہوتی ہے نا۔

(8) میری ریسپیز کا تو بالکل بھی مت پوچھے۔ ایک دفعہ بادشاہ سلامت نے گوبھی گوشت کھانے کی فرمائش کی۔ جب میں نے میز پر کھانا لگایا ' تو پہلا نوالہ لیتے ہی وہ بولے

"واہ! مزہ آگیا! آج گوبھی گوشت کسی نئے طریقے سے بنایا ہے؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے اعتراف کیا کہ کنیز نے وقت کی قلت کے باعث ذرا سی ترکیب بدل دی ہے۔ بادشاہ سلامت کے اصرار پر جب میں نے ترکیب بتانی شروع کی تو پہلے تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں ' پھر ناگواری سے سکڑنے لگیں اور پھر انہوں نے دونوں ہاتھ بلند کر کے کہا۔

"بس! اس سے آگے ایک لفظ نہ کہنا! میں کچھ اور مزید نہیں سننا چاہتا!"

بس یار۔۔۔ وہ دن اور آج کا دن ' میں اپنی سیکرٹ ریسپیز اپنے دماغ تک ہی محدود رکھتی ہوں۔ بہت فاسٹ فارورڈ قسم کی ریسپیز ہوتی ہیں ' جو اکثر لوگوں کے سر سے گزر جاتی ہیں۔

بہرحال ایک آسان سی ترکیب لکھ رہی ہوں۔ سادہ سا حلوہ بنتا ہے جو ناشتے میں نان یا پوری کے ساتھ بہت مزے کا لگتا ہے۔

سادہ سا حلوہ

اجزا :

سوجی	1 کپ
چینی	1 کپ
دودھ	4 کپ
دیسی گھی	1 کپ
انڈے	3 عدد

سب سے پہلے گھی میں سوجی کو بھونیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو دودھ میں چینی اور انڈے پھینٹ کر آہستہ آہستہ سوجی میں شامل کریں ' لکڑی کے چمچ سے ہلاتے رہیں۔ جب سوجی پتیلی کے کنارے چھوڑنے لگے تو پستے بادام چھڑک دیں۔ اور چولہے سے اتار کر گرم گرم پیش کریں۔

ویسے تو کچن کی بے شمار ٹپس ہیں۔ میں چھپکلیوں کو بھگانے کے لیے انڈے کے چھلکے رکھتی تھی مگر کبھی کوئی فائدہ تو نہیں ہوا۔ سب سے بہترین اور کامیاب ٹپ تو ایک ہی ہے کہ جو کام آج ہو سکتا ہے۔ اس کو کل پر کبھی نہیں چھوڑیں۔

یہ ٹپ صرف کچن ہی نہیں ' زندگی پر اپلائی کر کے دیکھیں۔ کامیابی قدم چومے گی۔ ان شاء اللہ!

☆



موسم گرما کی سوغات

صباحت

گرمیوں کے موسم کی سب سے عمدہ بات اس کے مزے دار، رسیلے پھلوں کے بہار ہے۔ جو موسم گرما کی حدت کو سوفیصد ہی کم کرتے ہیں۔ اس ماہ ان مزے دار اور بے شمار پھلوں سے بننے والے اچار، چٹنیوں، مربوں اور مشروبات کی تراکیب ہمارے قارئین کے لیے ہماری طرف سے موسم گرما کا تحفہ ہے۔

اچار

سبزیوں کا اچار

گوبھی، شلجم، پیاز، پھلیاں اور دیگر سبزیاں ہم وزن تقریباً (ایک کلو) لے کر اسی طرح کاٹ لیں جیسے ترکاری پکاتے وقت کاٹتی ہیں۔ انہیں ململ کے کپڑے میں پوٹلی بنا کر اتنا ابالیں کہ وہ نرم ہو جائیں۔ پھر ابلی ہوئی سبزیوں کو پوٹلی سے نکال کر پھیلا دیں، تاکہ ان کا اضافی پانی بھی خشک ہو جائے اب ان میں ایک ایک چھٹانک رائی، میتھی دانے، سونف، آدھی چھٹانک کلونجی، تین چھٹانک نمک، چار کھانے کے چمچے پسی سرخ مرچ اور ایک کھانے کا چمچہ ہلدی ملا کر شیشے یا چینی کے مرتبان میں ڈال دیں اور تین دن دھوپ میں رکھیں۔ جب اچار کی مخصوص خوشبو آنے لگے تو پکا ہوا اتنا تیل ڈال دیں کہ سبزیاں ڈوب جائیں۔ تیل ڈالنے کے بعد مزید تین دن دھوپ لگائیں۔

شلجم کا اچار

ایک کلو شلجم چھیل کر گول گول قتلے کاٹ لیں۔ پھر ان کو ہلکا سا جوش دے کر پانی خشک کرنے کے لیے پھیلا دیں۔ چار، چار کھانے کے چمچے رائی اور سرخ مرچیں اور حسب مرضی نمک ملا کر کورے برتن میں بھر دیں۔ اوپر سے اتنا پانی ڈالیں کہ شلجم کے ٹکڑے ڈوب جائیں۔ برتن کا منہ ڈھانپ کر تین، چار دن تک دھوپ میں رکھیں۔ اس کے بعد استعمال کریں۔

لیموں کا میٹھا اچار

آدھا کلو لیموں کے دو، دو ٹکڑے کر کے شیشے کے مرتبان میں ڈال دیں اور اوپر سے نمک چھڑک کر تین دن تک اسی طرح رہنے دیں۔ اس دوران انہیں ہلاتی رہیں۔ تین دن بعد پانی پھینک دیں اور لیموں کو ململ کی پوٹلی میں باندھ کر لٹکا دیں، تاکہ اضافی پانی بھی نکل جائے۔ ایک برتن میں ایک کپ سرکہ، آدھا کلو چینی، آدھی چھٹانک پسی کالی مرچ، حسب مرضی سرخ مرچ اور آدھی چھٹانک ادرک کے باریک ٹکڑے کر کے ڈال دیں۔ اچھی طرح ہلا کر مکس کریں۔ مرتبان میں بھر کر منہ بند کر دیں اور ایک ہفتے تک اسی طرح رہنے دیں۔ آٹھویں دن لیموں کا مزے دار میٹھا اچار تیار ہو گا۔

چٹنیاں

آلو بخارے کی چٹنی

آدھا کلو آلو بخاروں کو ڈیڑھ گلاس پانی کے ساتھ ہلکی آنچ پر پکائیں۔ گل جائیں تو چھلکے اتار کر الگ کر دیں اور آدھا پاؤ چینی ڈال کر دوبارہ پکائیں۔ حسب ذائقہ مرچ اور نمک ڈال کر گاڑھا ہونے تک مزید پکائیں۔ پھر ٹھنڈا کر کے محفوظ کر لیں۔

آم کی چٹنی

ایک پاؤ کیریوں کو دھو کر چھیل لیں۔ گٹھلیاں پھینک دیں اور کاٹ کر سل پر باریک پیس لیں۔ ایک ایک چمچہ کلونجی، کالا زیرہ، کالی مرچ، لونگ کے چند دانے، ایک چوتھائی پودینے کی گٹھی، ایک چھوٹا ٹکڑا ادرک کوٹ کر حسب ذائقہ نمک و سرخ مرچ کے ساتھ کیریوں میں ملائیں۔ ذرا سے تیل میں فرائنگ پان میں پکائیں۔ خشک ہو جائے تو حسب ضرورت چینی ملا کر اتار لیں اور محفوظ کر لیں۔

انجیر کی چٹنی

پندرہ انجیروں کو دھو کر تین گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ پھر آدھا کپ املی پیسٹ، دو چٹکی دار چینی پاؤڈر، ایک چائے کا چمچہ پسا زیرہ، ایک چوتھائی کپ چینی اور دو چٹکی پسی سونٹھ ملا کر فرائنگ پان میں گاڑھا ہونے تک پکائیں، مزے دار چٹنی تیار ہے۔

مربے

کچے آم کا مربہ

دو کلو کیریاں باریک کاٹ لیں۔ ڈیڑھ کلو چینی، ایک کپ چائے کا چمچہ کلونجی اور حسب ذائقہ نمک کے ساتھ چولہے پر چڑھا دیں۔ جب کیریاں گل جائیں اور چینی کا شیرہ گاڑھا ہو جائے تو چھ سبز الائچی اور بارہ سرخ مرچ شامل کر کے مزید کچھ دیر پکائیں۔ جوش آجائے تو اتار لیں۔

گاجر کا مربہ

ایک کلو گاجر چھیل کے دو ٹکڑے کر لیں اور ڈیڑھ لیٹر پانی میں پانچ منٹ پکا کر اتار لیں۔ الگ دیگچی میں ڈیڑھ کلو چینی اور پانی سے گاجر نکال کر ڈال دیں اور ڈھکن بند کر کے دو تین گھنٹے تک ایسے ہی رہنے دیں۔ پھر ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ گاجر گل جائے، چاشنی بن جائے تو چھ کھانے کے چمچے کیوڑہ اور دس الائچیاں ڈال کر پانچ منٹ بعد اتار لیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو محفوظ کر لیں۔

خوبانی کا مربہ

آدھا کلو خوبانیاں دھو کر چھیل لیں اور دو ٹکڑے کر کے گٹھلیاں نکال دیں۔ ہم مقدار چینی کسی برتن میں پھیلا دیں۔ پھر خوبانیاں ڈال کر مکس کر لیں۔ دس سے بارہ گھنٹے بعد ہلکی آنچ پر چولہے پر رکھ دیں۔ جھاگ آجائے اور شیرہ بن جائے تو اتار لیں۔ مربہ تیار ہے۔

مشروبات

بادام کا شربت :۔

ایک ایک پیالی بادام اور چار مغز الگ الگ رات بھر کے لیے بھگو دیں۔ صبح بادام چھیل کر چار مغز کے ساتھ باریک پیس لیں۔ ڈیڑھ لیٹر پانی میں ڈیڑھ کلو چینی ملا کر چولہے پر چڑھا دیں۔ پھر پسا ہوا بادام کا آمیزہ بھی شامل کر دیں۔ قوام تیار ہو جائے تو اتار لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر آدھی پیالی روح کیوڑہ ڈال دیں۔ دس منٹ بعد بوتل میں بھر لیں۔

سیاہ انگور کا شربت

چھ کپ انگوروں کو دھو کر جوسر میں ڈال کر رس نکال لیں۔ چھ کپ پانی میں نو کپ چینی گھول کر چھان لیں اور ابالیں۔ ایک تار کا قوام بن جائے تو ٹھنڈا کر کے ایک چمچہ سٹرک ایسڈ ملا لیں۔ انگور کا مرکب ملا کر ایک دفعہ پھر بلینڈ کر لیں۔ چٹکی بھر نمک ملائیں اور محفوظ کر لیں۔

فالسے کا شربت

آدھا کلو فالسے دھو کر تھوڑے پانی میں ہاتھ سے مسل کر گٹھلیاں الگ کر لیں۔ ایک لیٹر پانی ملا کر جوسر میں ڈال کر پتلا رس نکال لیں۔ ڈیڑھ پاؤ چینی ملا کر ایک بار پھر بلینڈ کریں۔ آدھا چمچہ سٹرک ایسڈ ملا کر بوتل میں بھر لیں۔

تربوز کا شربت

دو یا تین کلو سرخ تربوز چھلکا اور بیج الگ کر کے ٹکڑے کر لیں اور آدھا کلو چینی چھڑک کر ڈھکن والے ڈبے میں بند کر کے فریزر میں رکھ دیں۔ بوقت استعمال دودھ اور تربوز کی برابر مقدار کو بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کریں اور گلاس میں نکال کر کچلی ہوئی برف شامل کر کے مزے دار شربت سے لطف اٹھائیں۔

نفسیاتی الجھنیں

ص-ب-ک-ٹوبہ ٹیک سنگھ

س:۔ بھائی میں آئی-کام سیکنڈ کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ اور میرا سب سے بڑا مسئلہ میرا غصہ ہے۔ جو کہ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ مجھے غصہ آنے کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اگر کوئی مجھے برا کہتا ہے یا کچھ اور تو صرف میرے غصے کی وجہ سے۔ اور اسی وجہ سے میری تمام دوست مجھ سے الگ ہی رہتی ہیں۔ اور اگر میں ان کو کوئی کام کہہ دوں تو ایسے بھاگ کر کرتی ہیں کہ میں خود ہی شرمندہ ہو جاتی ہوں۔ مگر وہ مجھ سے نہیں میرے غصے سے ڈرتی ہیں۔ اور میرا غصہ اس وقت ٹھنڈا ہوتا ہے جب میں رات کو سوتے ہوئے سب کو معاف کر کے سوتی ہوں (بچپن کی عادت ہے)

اور کبھی کبھار مجھے لگتا ہے کہ شاید میں گھر سے باہر ہی نہیں بلکہ گھر والوں کی موجودگی میں بھی الگ ہی ہوں کوئی بھی زیادہ مخاطب نہیں کرتا ہے۔ جو میں خود سے کہہ دوں تو اسی کا جواب دے دیتے ہیں بھائی! میں بہت پریشان ہوں کیا کروں۔

ج:۔ اچھی بہن! غصہ کرنا واقعی بہت بری بات ہے۔ غصہ میں انسان اکثر ایسی باتیں کر بیٹھتا ہے۔ جس کی بنا پر پھر اس کو پچھتانا پڑتا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ آپ کو خود اپنی کمزوری کا احساس ہے۔ آپ اسے تسلیم کرتی ہیں کہ بری عادت ہے۔ جب ہمیں اپنی خامی کا احساس ہوتا ہے تو اسے دور کرنا آسان ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آپ کی جسمانی صحت کیسی ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے جسم کے اندر کچھ ضروری اجزا کی کمی کے باعث غصہ یا مایوسی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنی صحت پر توجہ دیں۔ نیند پوری لیں۔ غصہ آئے اگر کھڑی ہیں تو بیٹھ جائیں ٹھنڈے پانی کا گلاس پئیں۔ اگر غصہ غیر معمولی ہے تو پھر آپ کو سائیکاٹرسٹ سے مشورہ لینا پڑے گا۔ لیکن آپ کے خط سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ سمجھ دار باشعور لڑکی ہیں اور تھوڑی سی قوت ارادی سے کام لے کر اپنے غصہ پر خود قابو پا سکتی ہیں۔

راضیہ ساجد-کراچی

پچھلے ماہ بہن ر-ش کا خط پڑھا "ایک لڑکی ہونے کے ناتے میں ان کی تکلیف سمجھ سکتی ہوں ـــــ یہ سو فیصد حقیقت ہے کہ رشتے آسمان پر بنتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زمین پر انہیں ڈھونڈنے کے لیے بہت دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لڑکیوں کے سلسلے میں تو ایک آسانی ہوتی ہے کہ آپ گھر بیٹھ کر دعا کرتے ہیں۔ لڑکوں کے سلسلے میں تو در در جا کر سوالی ہونا پڑتا ہے۔ اپنے بھائی کا رشتہ ڈھونڈنے میں مجھے بھی بہت تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑا۔

خاندان کی لڑکیاں دیکھی بھالی تھیں۔ پہلے خاندان میں ہی کوشش کی گئی۔ قریبی رشتہ دار چچا' تایا اور ماموں کے ہاں بھائی کے جوڑ کی لڑکیاں تھیں لیکن وہاں سے انکار ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ بہنوں کے سلسلے میں ہم نے ان کے بیٹوں کو انکار کیا تھا۔ قریبی رشتہ داروں میں انکار کے بعد خاندان کی ایک تقریب میں ایک لڑکی پسند آئی۔ وہاں رشتہ دیا لیکن کچھ وجوہ کی بنا پر یہ رشتہ بھی ختم ہو گیا۔

اب وہ سلسلہ ہوا جس کے بارے میں بہن ر-ش نے لکھا ہے۔ یعنی گھر گھر جا کر لڑکی دیکھنے کا سلسلہ "اس میں شک نہیں کہ بھائی کے سلسلے میں ہم نے بہت سے گھروں میں جا کر لڑکیوں کو دیکھا اور ریجیکٹ بھی کیا لیکن وجہ ہر مرتبہ لڑکی کی کوئی کمی یا خامی نہیں تھی۔

جن لوگوں نے لڑکیاں دکھائیں۔ ہم نے انہیں واضح طور پر بتا دیا تھا کہ ہمیں بہت کم عمر "اعلا تعلیم یافتہ لڑکی نہیں

چاہیے۔ اس کے باوجود وہ نہیں۔ جس لڑکی کے گھر لے کر گئیں وہ پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ لڑکی والوں کا اصرار ہے کہ آپ دیکھ تو لیں۔ اب اگر وہاں رشتہ دیتے تو یہ لڑکی کے ساتھ زیادتی ہوتی۔

شادی زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ بے جوڑ رشتے زندگی بھر رلاتے ہیں۔ بہرحال بھائی کا رشتہ ایک جگہ طے ہو گیا شادی ہو گئی۔ وہ بھابھی کے ساتھ بہت خوش ہیں لیکن جب اس طرح کے خطوط نظر سے گزرتے ہیں تو دل پر ایک بوجھ سا آ گرتا ہے۔

آپ ہی بتائیے کہ خاندان میں کوئی جوڑ کا رشتہ نہ ہو تو لڑکی کو دیکھنے کے لیے کیا طریقہ ہونا چاہیے؟ شادی بیاہ کی تقریبات میں تو خاندان کے افراد ہی ہوتے ہیں۔ اگر باہر رشتہ کرنا ہو تو لڑکی کے گھر جا کر ہی دیکھنا پڑے گا اس مسئلہ کو ناول افسانوں میں بھی ضرورت سے زیادہ حساس اور جذباتی انداز میں لکھا جاتا ہے۔ ممکن ہے جو لوگ دیکھ کر ریجیکٹ کر گئے وہ رشتہ دیتے تو انہیں آپ ہی انکار کر دیتیں۔ بیشتر انکار لڑکی والوں کی طرف سے بھی ہوتے ہیں "لڑکے تو اس بات پر کوئی رونا دھونا نہیں مچاتے نہ احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔

میرے اپنے بھائی کے سلسلے میں کتنی لڑکیاں ہم نے دیکھیں۔ کتنے لوگوں نے انہیں ریجیکٹ کیا۔ ظاہر ہے یہ سب اس لیے تھا کہ ان کی شادی جس کے ساتھ لکھی تھی۔ وہیں ہونا تھی۔

ج:۔ ساجدہ بہن کے اس سوال کا جواب کیا دیں۔ اس سلسلے میں قارئین بہنیں رہنمائی کریں۔ لڑکیوں کے رشتے کے لیے کوئی ایسا طریقہ ضرور ہونا چاہیے۔ جس سے لڑکیوں کی عزت نفس کو ٹھیس نہ لگے۔

ملائکہ کوثر-بسم اللہ پور

آپ کی باتیں بہت اچھی ہوتی ہیں اور سبق آموز بھی۔ اب مسئلہ بیان کرتی ہوں۔ کچھ سال پہلے جب ٹین ایج کا زمانہ تھا۔ مجھے کچھ اس قسم کے خواب آتے تھے۔ میں چارپائی پر سیدھی لیٹی ہوں کہ (خواب میں) اچانک چارپائی اوپر کی طرف پرواز کرنے لگتی ہے۔ بہت اوپر جا کر اڑان کی تیزی کی وجہ سے دہشت سے میری آنکھ کھل جاتی ہے دوبارہ آنکھ لگنے پر یہی خواب پھر شروع ہو جاتا۔ خوف زدہ ہو کر میں کوشش کرتی تھی کہ نیند نہ آئے اسی کشمکش میں رات بیت جاتی تھی۔ میں لاابالی سی لڑکی تھی۔ کورس کی کتابیں 'خواتین' کے رسالے پڑھنا یا ٹی وی دیکھنا یہ میرے شوق تھے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ خواب آنے بند ہو گئے۔ شادی کے بعد پھر اس طرح کے خواب شروع ہو گئے۔ کسی گاڑی یا ویگن میں بیٹھی ہوں۔ اس کی چھت بہت نیچی ہے تنگی کی وجہ سے میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اگر سیڑھیاں چڑھ یا اتر رہی ہوں تو اکثر تنگ و تاریک ہوتی جاتی ہیں۔ پھر ان خوابوں نے بھی پیچھا چھوڑ دیا۔ چند ماہ پہلے پھر اس طرح کا خواب نظر آیا "میں اور میرا بیٹا چھوٹی ویگن میں بیٹھے ہیں رش کی وجہ سے میرا دم گھٹ رہا ہے۔ ہم اتر کر کھلے رکشے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ میں سادہ مزاج گھریلو سی عورت ہوں۔ فارغ اوقات میں اسٹڈی کرنا۔ کام کاج کے دوران زیر لب کوئی دعا پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ بقول میرے بچوں کے خدا ترسی مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ سادہ طرز زندگی پر بچے کہتے ہیں 'ہماری ماما تو کوئی بابا درویش ہیں۔ دوسروں کی غلطی جلدی معاف کر دیتی ہوں دل میں کبھی کینہ نہیں رکھتی۔ پنجگانہ نمازیں پڑھنے کی بھی پوری کوشش کرتی ہوں۔

آپ یہ بتائیے کہ ان خوابوں کا تعلق انسانی ذہن کی کس نفسیات سے ہے۔

ج:۔ ملائکہ بہن! خواب کبھی مستقبل کے بارے میں کوئی اشارہ دیتے ہیں کبھی یہ موجودہ حالات کی عکاسی کرتے ہیں اور کبھی اس کا تعلق ذہنی کیفیت سے ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں صرف اندازہ لگایا جا سکتا ہے یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

شادی سے پہلے جو خواب آپ دیکھتی تھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ذہین لڑکی تھیں۔ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کچھ کرنا چاہتی تھیں "آگے بڑھنا چاہتی تھیں اپنے حالات میں بہتری لانے کی خواہش مند تھیں۔

شادی کے بعد نئی زندگی سے سمجھوتا کرنے میں کافی حد تک دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اب آپ اپنے ماحول سے سمجھوتا کر چکی ہیں اور آگے حالات مزید بہتر ہوتے نظر آتے ہیں۔ خصوصاً" آپ کی اولاد کے حوالے سے بہت بہتری نظر آتی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

☆



امت الصبور

بیوٹی بکس

طاہرہ..... سمہ سٹہ

س۔ میری شادی کو پانچ سال ہوئے ہیں۔ تین بچے ہیں۔ تیسرے بچے کی پیدائش آپریشن سے ہوئی۔ اس کی پیدائش کے بعد میرا پیٹ بہت بڑھ گیا ہے۔ کوئی ایسی آسان اور سادہ ترکیب بتائیں جو میں آسانی سے کرسکوں کیونکہ ہمارے ہاں گھر سے باہر نکلنے کا رواج نہیں ہے اور گھر میں بھی جوائنٹ فیملی سسٹم ہے۔

ج۔ ایک بہت سادہ اور ہلکی سی ورزش لکھ رہی ہوں۔ اسے آپ اپنے کمرے میں بھی کرسکتی ہیں۔

صبح کے وقت زمین پر بیٹھ جائیں اور ٹانگیں آگے کی جانب سیدھی پھیلالیں۔ اب پیروں کے دونوں انگوٹھے پکڑ کر آہستہ آہستہ سر زمین کی طرف لے جانے کی کوشش کریں۔ پہلے روز پانچ بار کریں۔ پھر آہستہ آہستہ بڑھا کر بیس بار تک لے جائیں۔ اس طرح آپ کا سر زمین سے لگ جائے گا۔ بادی چیزوں سے پرہیز کریں۔ رات کا کھانا کھا کر اس وقت تک نہ سوئیں جب تک کھانا ہضم نہ ہوجائے۔ روزانہ آدھا گھنٹہ چہل قدمی کریں۔

طاہرہ..... سرائے عالمگیر، جہلم

س۔ میرا رنگ تو قدرے صاف ہے، لیکن چہرے پر بالکل رونق نہیں ہے۔ جلد مرجھائی ہوئی ہے کوئی ایسا نسخہ بتائیں جس سے رنگ گورا ہوجائے اور چہرے پر رونق آجائے۔

ج۔ طاہرہ! رنگ گورا ہونے سے زیادہ اہم یہ ہے کہ آپ کی جلد شفاف چمک دار ہو۔ چہرے پر سرخی ہو۔ عموماً جب خوراک ٹھیک سے جزو بدن نہیں ہوتی تو چہرہ بے رونق ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھی جسم میں فولاد کی کمی سے بھی جلد کھردری اور زرد نظر آتی ہے۔ ممکن ہو تو کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرلیں۔

رنگ گورا کرنے اور شفاف، چمک دار جلد کے لیے ایک بہت آسان اور سادہ نسخہ ہے۔

تھوڑا سا پودینہ لے کر ایک گلاس پانی میں ابال لیں اور یہ مشروب باقاعدگی سے پئیں۔ آپ کے چہرے کا رنگ نکھر آئے گا۔

صالحہ کوثر..... گکھڑ منڈی

میرے چہرے پر دانے نکلتے تھے۔ گرمیوں میں تو مہاسے بہت زیادہ ہوجاتے ہیں۔ میں نے آپ کا بتایا ہوا پھٹکری والا نسخہ استعمال کیا تو دانے نکلنا بند ہوگئے۔ لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ دانوں کے داغ باقی رہ گئے ہیں۔ ان داغوں کی وجہ سے چہرے کا رنگ بھی کالا لگتا ہے۔ میں نے کئی سیرپ اور کریمیں استعمال کی ہیں، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ج۔ لیموں کے رس میں چنبیلی کا تیل ملا کر لگانے سے داغ دور ہوجاتے ہیں۔

ایک چمچ لیموں کے رس میں ایک چمچ دودھ ملا کر روئی سے چہرے پر لگائیں۔ اگر آپ کے شہر میں وٹامن ای کریم دستیاب ہے تو وٹامن ای کریم بھی ان داغوں کو دور کرنے کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

اگر وٹامن ای کریم دستیاب نہیں تو وٹامن ای کے کیپسول خرید لیں اور کسی بھی عام کریم میں ملا کر استعمال کریں۔

☆